۷۸۶

مقدمہ

اساتذۂ اُردو میں میر ببر علی صاحب انیس کے کلام کا پڑھنا سمجھنا پرکھنا اُس سے زبان و طرز بیان کا سیکھنا اُن کا تتبع کرنا اُن کے نقش قدم پر چلنا ہر شاعر و ادیب جو واقعہ نگار ہو سرمایۂ افتخار سمجھتا ہے فارسی ترکیبوں میں اُن کے تصرفات ایک اوستاد زمانہ ہونے کی حیثیت سے اُردو میں قابل استناد ہیں اسی اہمیت کو مدنظر رکھ کر جناب سید راس مسعود صاحب بی اے (اکسن) ناظم تعلیمات دولت آصفیہ نے اپنی اسکیم کی دوسری قسط کے طور پر اس کے شایع کرنے کی ضرورت محسوس فرمائی اور اعلحضرت قدر قدرت ہنر اگیز الٹڈ ہائی نس آصف جاہ جہاں پناہ ظل اللہ سپہ سالار مظفر الممالک نظام الملک محی الملتہ والدین نواب سر میر عثمان علی خاں بہادر نظام الدولہ فتح جنگ بالقابہ سلطان دکن خلد اللہ ملکہ کے شاہانہ عطیہ سے جو مستند شعرائے اُردو کے کلام کی اشاعت کے لیے سید صاحب موصوف کی درخواست پر مرحمت ہوا تھا مراثی انیس کی پہلی جلد شایع ہونے کی نوبت آئی۔ اس جلد میں میر صاحب کی آخر عمر کا کلام ہے اور اس میں بعض وہ مراثی ہیں جو ابتک طبع نہیں ہوئے درحقیقت یہ جلد میر صاحب کے اُس کلام کا مجموعہ ہے جس کی نسبت اُنھوں نے خود فرمایا ہے ؎

گھٹا زور مشق سخن بڑھ گئی

ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سید علی حیدر صاحب نظم طباطبائی المخاطب بہ نواب حیدر یار جنگ نے اس جلد کی ترتیب و تصحیح کی خدمت کو انجام دے کر ملک پر بالعموم اور اُردو داں پبلک پر بالخصوص احسان فرمایا ہے۔ آغا سید حسن صاحب بی اے صدر مہتمم تعلیمات بلدہ (حیدرآباد) بھی شکریہ کے مستحق ہیں جنھوں نے میر صاحب کا اصلی فوٹو عنایت

فرمایا جس کے بغیر یقیناً یہ مجموعہ نامکمل رہتا۔

اُمید تھی کہ اس جلد کے قابل مرتب مولانا طباطبائی صاحب اس کا مقدمہ لکھ کر اپنے کامل الفن ہونے کی حیثیت سے فن مرثیہ گوئی اور شاعری کے متعلق مفید معلومات کا ذخیرہ جمع کر دینگے جس سے ناظرین کو میر انیس اور ان کی شاعری کے متعلق صحیح رائے قایم کرنے میں مدد ملے گی۔ لیکن ہماری بدقسمتی سے مولانائے موصوف اپنی پیرانہ سالی اور مصروفیت کی وجہ سے ہماری اس خواہش کو پورا نہ کر سکے اُنھوں نے اپنے ایک نوازشنامہ کے چند فقروں میں اس جلد کی خصوصیات کا جو ذکر فرمایا ہے اس موقع پر اس کا نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اس جلد میں میر صاحب مرحوم و مغفور کے یا تو وہ مرثیے ہیں جن میں مصنف نے خود صراحتاً یا اشارتاً یہ بات ظاہر کر دی ہے کہ ان کی آخر عمر کا کلام ہے یا وہ مرثیے ہیں جو آخر عمر میں نواب ابو صاحب کی مجلسوں میں جناب مرحوم نے پڑھے اور یہی مرثیے مرحوم کے بستے میں تھے۔ جس دن جناب مرحوم نے منبر مجلس کو الوداع کہی تینوں صاحبزادے سامنے حاضر تھے چھوٹے فرزند میر محمد صاحب سلیس کو اشارے سے پاس بلایا بستہ اپنے ہاتھ سے اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دیدیا سلیس مرحوم مٹیا برج و حیدرآباد کی مجلسوں میں زندگی بھر یہی مرثیے پڑھا کیے یہ مرثیے منشی نولکشور کو نہ ہاتھ آسکے کہ ان کی مرتب کی ہوئی جلدوں میں شامل ہو جاتے اس کے علاوہ دو یا تین مرثیے ایسے بھی ہیں جن کا حال مجھے اپنے بزرگوں سے معلوم ہوا کہ یہ جناب مرحوم کے انتہائے مشق کا کلام ہے۔ لوگوں کی خاطر سے مرحوم کو یہ مرثیے بستے سے جدا کرنے پڑے۔"

مولانا طباطبائی کی طرف سے دیباچہ یا مقدمہ لکھنے کے متعلق جب مایوسی ہوگئی تو میں نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی وھو ہٰذا۔

تمہید

دنیا میں جس قدر روشن دماغ اور مہذب قومیں ہیں وہ قدرتی طور پر شاعری کی دلدادہ ہیں کسی قوم کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیے اس میں کچھ نہ کچھ ایسی روایات ضرور ملینگی جن کو نظم کا لباس پہنا کر مشاہیر کے شجاعانہ مذہبی اور اخلاقی کارناموں کو پیش کیا گیا ہے اسی وجہ سے جملہ اصناف سخن میں رزمیہ شاعری کو فوقیت حاصل ہے اور وہ آئندہ نسلوں میں جرات دلیری اور قومی غیرت کے جذبات پیدا کرنے کو صدیوں تک زندہ رہیگی۔ یونانی زبان میں ہومر نے الیڈ[1] کے صفحات پر رزم و بزم کی معرکہ آرائیاں پیش کی ہیں۔ لاطینی میں ورجل نے اینیڈ[2] کے اوراق میں اینیس[3] کے واقعات زندگی کا نقشہ کھینچا ہے سنسکرت میں مہابھارت کے واقعات آج تک انسانی دل و دماغ پر گہرا اثر ڈال رہے ہیں۔ انگریزی میں پیراڈائیز لاسٹ[4] میں ملٹن کے بیانات مہذب سوسائٹیوں کے دل پر نقش بٹھا رہے ہیں کہ جنگ تہذیب و تمدن کے رخ سے نقاب اُٹھا کر انسانوں کو علوم و فنون کا مالک بنا دیتی ہے عربی میں سبعہ معلقہ کے بعض قصائد ایسے ہیں جو دلوں پر برچھی اور بھالے کا کام کر جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں شاہنامہ فردوسی کی رزمیہ داستانیں مشہور و معروف ہیں مگر اردو میں رزمیہ شاعری کا چرچا اُس وقت تک نہ ہوا جب تک کہ ہندوستان میں ایک ایسا شاعر پیدا نہ ہوا جس نے اُردو کی رزمیہ شاعری کا نہ صرف فارسی سے رتبہ بڑھا دیا بلکہ یونانی۔ لاطینی اور انگریزی شاعری سے بھی ارفع کر دیا۔ وہ کون تھا **انیس**۔ اُس نے اپنے قلم کے سمند کو اس شان سے میدان میں دوڑایا کہ ہومر۔ ورجل اور کالیداس کی روحیں ٹاپوں سے اُٹھنے والے غبار کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنانے لگیں۔ بالمکی اور بیاس اس کی علم برداری پر آفریں کہہ اُٹھے۔ اہل عرب کی رجز خوانی اور شجاعان عرب کے نعرے اس کے شکوہ و تجمل سے خجل ہو گئے اور اُس نے اپنی تیغ زبان کے جوہر سے فردوسی کی فصاحت پر پانی پھیر دیا۔ انیس۔ نے اپنی شاعری کے لیے جس جاں گداز واقعہ کو انتخاب کیا وہ نہ صرف تاریخ کا ایک اہم جزو ہے بلکہ اس کو تہذیب و تمدن مذہب و اخلاق سے خاص تعلق ہے اور ان کی ممدوح وہ مقدس ذات تھی جو ان کی مدح سے مستغنی تھی اس لیے اس کی مدح خود مداح کے لیے باعث مباہات ہے۔ برخلاف اس کے فردوسی نے اپنی قوت مبالغہ اور چرب زبانی کے زور سے اپنے ہیرو کے شجاعانہ

داستانوں میں جان ڈالکر اس پر احسان کیا ہی۔ جیسا کہ وہ خود کہتا ہی ؎

منش کردہ ام رستم داستاں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

خلاصہ یہ کہ میر انیس نے جن واقعات کو نظم کیا ہی ان سے انسانی طبائع ہمیشہ متاثر ہوتی رہنگی اور ایک عظیم الشان مذہبی قربانی کے حالات عالم اسلام کے ستونوں کو جنبش میں لاتے رہنگے۔

میر صاحب کے اسلاف

میر انیس کے اسلاف ہرات کے سادات سے تھے پرانی دلی میں آکر آباد ہوئے۔ میر ضاحک، میر حسن میر خلیق کے نام ادبی دنیا میں آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ میر انیس کے دادا **میر حسن** عالم جوانی میں اپنے والد میر ضاحک کے ساتھ دلی سے فیض آباد (اودھ) چلے آئے تھے اور سرفراز جنگ کی سرکار میں ملازم ہو گئے تھے وہاں سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ آپ کی مثنوی "بے نظیر بدر منیر" اردو لٹریچر میں لاجواب چیز ہی جس میں زبان کی سلاست۔ محاورات کے خوش اسلوبی کے سوا جواہر نگار خامہ سے قدرت کے مرقعے کھینچے گئے ہیں۔

ولادت

میر انیس میر خلیق کے گھر ۱۲۲۰ھ کے قریب فیض آباد میں پیدا ہوئے بعض سوانح نگاروں نے ان کی جاے پیدائش دہلی کو لکھا ہی لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا دہلی میں تو کبھی ان کا جانا بھی ثابت نہیں۔

تعلیم و تربیت

ابتدائی تعلیم فیض آباد میں حاصل کی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر میں میر صاحب اور ان کے بھائی میر مونس لکھنؤ تشریف لائے۔ میر خلیق اور اُن کے منجھلے بیٹے میر انس عرصہ تک فیض آباد میں مقیم رہے میر صاحب کے دیکھنے کو خلیق اور انس دونوں اکثر لکھنؤ آتے جاتے رہے مدت کے بعد لکھنؤ کی کشش میر انس کو بھی فیض آباد سے کھینچ لائی میر خلیق اب بھی فیض آباد ہی میں اپنے بزرگوں کے مکان میں مقیم رہے لیکن خاک اُن کی بھی لکھنؤ ہی کی تھی ان کا انتقال لکھنؤ

میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ میر انیس کی مشق سخن اس وقت ترقی پر تھی اپنے مرحوم باپ کی قبر پر مجلسیں کرتے تھے اور ہر مجلس میں نیا مرثیہ پڑھا کرتے تھے مفتی محمد عباس صاحب مرحوم خود فرمایا کرتے تھے کہ صد امیر صاحب نے اُن کے سے اُن پڑھا تھا۔

علمی معلومات

میر صاحب کو ادبی علمی مسایل کی تحقیق او تدقیق کا بہت شوق تھا۔ چالیس سال کی عمر تک اُنھوں نے طالب علمانہ زندگی بسر کی وہ عالم نہ تھے لیکن تمام تذکرہ نویس اس بات کے معترف ہیں کہ علمی معلومات اعلیٰ درجہ کی تھی۔ جس طرح میر صاحب کا گھر تعلیم و تربیت کے اعتبار سے ایک علمی درسگاہ کا رتبہ رکھتا تھا اسی طرح علما و فضلا کی سوسایٹی نے ہر علم و فن کے رموز سے آگاہ کر دیا تھا۔ تلوار کی تعریف میں آپ کا ایک مصرع ہے " ہر جز و تن کو لا تیجزے بنا دیا"، ذوق مرحوم فرماتے ہیں ع " جو ہر فرد تھے بالفرض تو کیا نیست" یہ دونوں مصرعے اپنے اپنے مصنفوں کے مبلغ علم کو ظاہر کر رہے ہیں۔ ازرق کے قتل پر میر صاحب فرماتے ہیں ع
"لو کو فیو گرا دیا حرف ثقیل کو"، یہ مصرعہ خبر دیتا ہے کہ کوفیین و بصریین میں تحقیق زبان و نحو عربی میں جو جو مباحثے ہوئے ہیں وہ سب مصنف کے پیش نظر تھے۔

باپ بیٹے کی اصلاح کا مقابلہ

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خلیق اپنے دونوں بیٹوں انیس اور مونس سے ملنے کے لیے فیض آباد سے لکھنوٴ آئے ان کے منجھلے بیٹے مہر علی انس ان کے ہمراہ تھے میر خلیق نے میر انیس سے کہا مہر علی انس نے جو مرثیہ اس سال کہا ہے ذرا اسے سنو اس مرثیہ پر میر خلیق کی اصلاح تھی اور وہ بیٹے سے اس اصلاح کی داد کے طالب تھے چنانچہ انیس نے مرثیہ سُن کر بہت داد دی اسی کے ساتھ کہا کہ باوا جان میر نواب (مونس) نے جو مرثیہ اسی سال کہا ہے ذرا اسے بھی سنیے۔ مونس نے مرثیہ سنایا یہ کچھ چیز ہی اور تھا اس پر انیس کی اصلاح تھی۔ اس مرثیہ کو سنانے کی غرض بھی یہی تھی کہ میر خلیق بیٹے کی اصلاح کی داد دیں۔ خلیق چھوٹے بیٹے کے مرثیہ اور بڑے بیٹے کی اصلاح سے بہت خوش ہوئے۔

چھوٹے بھائی کے ساتھ محبت

میر صاحب کو اپنے چھوٹے بھائی مونس سے جو بچپن سے میر صاحب کے ساتھ لکھنو میں رہتے تھے کمال درجہ کی محبت تھی باوجود صاحب اولاد ہو جانے کے

کبھی شفقت مربیانہ میں فرق نہ آیا میر صاحب کے صاحبزادہ میر خورشید علی نفیس ہمیشہ رشک کرتے تھے اور کہا کرتے تھے ہمارا مرثیہ باوا جان کی اصلاح سے مہینوں محروم رہتا ہے اور چھوٹے چچا کے مرثیہ پر فوراً اصلاح ہوجاتی ہے۔

خودداری

میر صاحب اس قدر خوددار اور نازک دماغ تھے کہ کوئی شخص آپ سے ملنے کے لیے اُس وقت تک نہ جاسکتا تھا جب تک پہلے سے اس کی ملاقات کا وقت مقرر نہ ہوجائے روزمرہ کے آنے جانے والے بھی اطلاع کے بعد شرف ملاقات حاصل کرتے تھے

خودداری کی ایک مثال

حکیم مہدی سے لوگوں نے ذکر کیا کہ انتزاع سلطنت کے بعد سے میر انیس نے مجلسوں میں پڑھنا ترک کردیا ہے اکثر لوگوں نے بہت کچھ الحاح واصرار و اظہار شوق کیا مگر بے سود ہوا اور سب کا اشتیاق برسوں سے تقاضا کررہا ہے کہ پھر میر صاحب کو منبر پر دیکھیں حکیم مہدی نے کہا دیکھو میں پڑھواتا ہوں انیس کو رقعے چھپوا کر انھوں نے تقسیم بھی کردیئے کہ فلاں تاریخ مجلس ہے میر صاحب پڑھینگے میر انیس سے لوگوں نے پوچھا کہ حکیم مہدی کے یہاں آپ پڑھینگے میر صاحب نے کہا میں تو نہیں پڑھونگا حکیم مہدی کو یہ خبر پہنچی اُس نے اس برتے پر میر انیس کو پڑھوانے کا دعوے کیا تھا کہ نجف کے ذاکروں میں مبارک محل میر انیس کو بھی وثیقہ مقرر کرگئی تھیں وہ وثیقہ آج تک جاری تھا مگر میر صاحب خود پڑھنے کو نجف کی مجلس میں نہ جاتے تھے۔

میر نفیس مرحوم کو حکم تھا کہ میرے بدلے تم جاکر پڑھ آیا کرو اس وثیقہ کی تولیت حکیم مہدی کو تھی اُس نے نواب غضنفر الدولہ کی وساطت سے میر صاحب کے پاس کہلا بھیجا کہ میری مجلس میں آپ نہ پڑھینگے تو مبارک محل کے وظیفہ سے ہاتھ دھو رکھیے غضنفر الدولہ بہادر میر صاحب کے اخلاص مند دوستوں میں تھے اُنھوں نے بہت چاہا کہ میر صاحب کو مجلس پڑھنے پر راضی کریں جب دیکھا کہ اُنھیں بھی اس بات میں کد ہے کہ حکیم مہدی کے یہاں ہرگز نہ پڑھیں گے تو کہدیا کہ نجف سے جو وظیفہ آپ کو ملتا ہے وہ ظالم موقوف کردے گا میر صاحب کے پاؤں میں زردوزی اوگی تھی کہنے لگے میں جانونگا میری اوگی کے ستارے جھڑ گئے آخر نہ پڑھنا تھا نہ پڑھے وظیفہ کے موقوف ہوجانے کی کچھ پروا نہ کی زوال سلطنت

اودھ کا قلق میر صاحب کو برسوں رہا پڑھنا بلکہ مجلسوں میں جانا تو یک قلم موقوف کر دیا تھا کہتے بھی کم تھے یہ زمانہ مونس کی اصلاح میں بہت صرف ہوتا تھا ایک دفعہ نواب فدا علی خاں کے اصرار پر پڑھنے کا وعدہ کر لیا یہ خبر مشہور ہوگئی لکھنؤ کے چاروں طرف ریل نکل چکی تھی دور دور سے لوگ اشتیاق میں آتے تھے اہل مجلس منتظر تھے کہ انیس آئے پینس میں سے میر خورشید علی نفیس اُترے اُنھوں نے منبر پر جا کر پہلے یہ عذر کیا کہ سب حضرات جناب قبلہ وکعبہ کے اشتیاق میں جمع ہوئے ہیں میرے پڑھنے کا کوئی محل نہ تھا لیکن میں معذور ہوں ارشاد ہوا کہ میں اس وقت نہیں جا سکتا تو جا کے پڑھ دے امتثال حکم کرتا ہوں۔ مرثیہ انیس کا بنایا ہوا اور اُن کی نظر میں کھبا ہوا بھی تھا جانتے تھے انیس کے پڑھنے کی ضرورت نہیں یہ مرثیہ نفیس کی زبان سے بھی بے رنگ دکھائے نہیں رہیگا یہی ہوا ہر شخص مجلس سے یہی کہتا اُٹھا کہ میر خورشید علی کبھی ایسا نہیں پڑھے جیسا آج پڑھے اس کے چند مہینے بعد حیدر خاں کے یہاں میر خورشید علی پڑھنے والے تھے حیدر خاں نے آکر قدموں پر ٹوپی رکھدی اور کہنے لگا ایک میری مجلس میں شریک ہوکر مجلس کی رونق اور میری عزت بڑھائیے میر خورشید علی صاحب کو آپنے کبھی مجلس پڑھتے نہیں سنا سنیے گا تو نہایت خوشی ہوگی۔ میر صاحب حیدر خاں کی مجلس میں چلے آئے دیکھتے کیا ہیں کہ لکھنؤ کے تمام ماہرین فن اور نقادان سخن کا مجمع ہے اُن لوگوں میں ناسخ والوں میں سے بڑے خوش فکر مرثیہ گو سید صاحب تعشق بھی موجود تھے ان قدر شناسوں نے کچھ ایسا اصرار اور اشتیاق کا اظہار کیا کہ میر صاحب منبر پر چلے گئے ۱۸۵۷ء کے بعد لکھنؤ میں پہلی مرتبہ میر صاحب نے یہی مجلس پڑھی مگر آدھا مرثیہ پڑھا ہوگا کہ نواب فدا علی خاں پر نظر پڑگئی کہ وہ بھی مجلس میں موجود ہیں آنکھ ملتے ہی میر صاحب پر حجاب طاری ہوا مرثیہ بند کر کے اہل مجلس سے خطاب کیا کہ باقی مرثیہ نواب فدا علی خاں صاحب کی آئندہ مجلس میں پڑھوں گا پھر نواب فدا علی خاں کے یہاں بھی پڑھے نواب ابو صاحب کی مجلسیں بھی پڑھے یہ میر صاحب کا آخر عمر کا پڑھنا تھا۔

طبعی خصوصیات

شہسواری۔ سیف زنی پٹا۔ بانک۔ بنوٹ کے فنون سے بخوبی ماہر تھے۔ ورزش کا شوق آخر وقت تک قایم رہا۔ چند ڈنٹر اور پچاس ساٹھ ہاتھ مگدر ہلا لینا کبھی

ناغہ نہ ہوا۔ میر صاحب کی طبیعت حسن پرستی سے خالی نہ تھی اور وہ حسن پرستی انسانی خوبصورتی تک محدود نہ تھی بلکہ اُن کی نگاہ تمام موجودات عالم میں سے اپنے دل بہلاؤ کا ذریعہ پیدا کر لیتی تھی خوبصورت اور خوشنما پھولوں کو دیکھ کر اُن کا ذوق وجدانی ترقی کر جاتا تھا جمادات، نباتات و حیوانات کے مشاہدہ میں ان کی نظر قدرتی خوبیوں کو پا جاتی تھی۔

حلیہ اور وضع

میر صاحب کا قد لانبا تھا۔ سر کے بال باریک اور ملایم۔ چہرہ خوبصورت۔ کتابی۔ رنگ کھلا ہوا گندمی۔ آنکھیں بڑی بڑی۔ مونچھیں بڑی اور راگندہ مو۔ داڑھی صاف۔ گردن صراحی دار۔ سینہ کشادہ۔ چال نہایت نستعلیق۔ اپنی وضع کے نہایت پابند تھے جو وضع انھوں نے شروع سے اختیار کی تھی وہی آخر دم تک قایم رہی۔ سر پر بیضاوی پنج گوشہ ٹوپی رکھتے تھے اور اپنے سامنے آئینہ رکھ کر جب تک ٹوپی کو درست نہ کر لیتے اور وہ سر پر موزوں نہ معلوم ہوتی ہرگز چین نہ آتا بعض مرتبہ ایک ایک گھنٹہ اس شغل میں صرف ہو جاتا ایک خاص وضع کا گھیردار کرتہ گُل پردہ کا انگرکھ زیب جسم فرماتے تھے۔ ڈھیلا پائجامہ پہنتے تھے۔ ہاتھ میں پتلی چھڑی اور سفید رومال ہوتا تھا پاؤں میں لکھنؤ کا زرد مخملی اور اکثر زردوزی جوتا۔

معاصرین

جس زمانہ میں میر انیس لکھنؤ تشریف لے گئے شیخ امام بخش ناسخ اور خواجہ حیدر علی آتش کی غزل سرائی اور میر ضمیر و خلیق کی مرثیہ گوئی کے ڈنکے بج رہے تھے۔ میر خلیق نے اپنے پیارے بیٹے کو بھی مرثیہ گوئی اور مرثیہ خوانی کے آداب سکھائے اور خاص خاص مجالس میں ان کو اپنے ساتھ لیجانے لگے۔ آخر وہ دن آیا کہ شایقین کے اصرار سے میر خلیق نے انیس کو منبر پر بٹھا دیا۔ میر صاحب جب پہلی مرتبہ منبر پر تشریف لے گئے تو اول تو چند لمحہ تک خاموش بیٹھے رہے پھر ایک رباعی پڑھی۔ پڑھنے کے انداز اور جوانی کی آواز نے دلوں پر گہرا اثر ڈالا چاروں طرف سے واہ وا اور سبحان اللہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ آپ نے ایک سلام پڑھا جس نے تمام مجلس کو گرویدہ بنا لیا۔ پھر اس شان سے مرثیہ شروع کیا کہ آپ کی فصاحت اور بلاغت نے محفل کو گرما دیا رزم و بزم کی تصویروں پر ارباب سخن غش ہو گئے اور مرثیہ ختم ہونے کے بعد قدرشناس اپنی جگہ سے اُٹھ کر مصافحہ کرنے لگے اور ہاتھ

چومنے لگے۔ خوش نصیب باپ کی زندگی ہی میں آپ کی مرثیہ گوئی کا شہرہ ہوگیا اس وقت جبکہ لکھنؤ میں میر صاحب کے کلام کا چرچا ہو رہا تھا ناسخی گروہ کے بعض شعرا کو ماہرِ فن سمجھا جاتا تھا چنانچہ ان لوگوں نے جواب کہنے کی طرف توجہ کی۔ ہرملہ کے تیر مارنے کا ذکر میر علی اوسط رشکؔ نے اس طرح نظم کیا ؎

حلق اصغر بازوئے سرور دلِ زہرا چھِدا ۔ رن کہاں جنت کہاں اللہ رے پلہ تیر کا

عشقؔ کہتے ہیں ؎

علم کا جب پھریرا دوش پر عباس نے کھولا ۔ پکارے جعفرِ طیار شہپر ایسے ہوتے ہیں

علم کا لچکنا دیکھیے ؎

عالم عجب لچکنے میں ہے آب و تاب کا　　　پنجہ بجھا رہا ہے چراغ آفتاب کا

ان لوگوں نے زمین آسمان کے قلابے ملا دیے مگر میر انیس کا جواب نہ ہوا ؎

انیس کی شاعری کا جو خاص میدان تھا اُس کی ہوا بھی کسی کو نہ لگی تھی حرؔ شہید کا لشکرِ یزید سے علیحدہ ہونا ایک تصویر ہے جو انیس نے کھینچ دی ہے ؎

کس لشکرِ بدخو سے بگڑ کر نکل آیا　　　دو لاکھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا
تنتا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا

پھر حر کی آمد لشکرِ یزید میں تصویر نہیں کرامات ہے ؎

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے　　　دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
برچھیوں اُڑتا تھا دبکے فرس رانوں سے　　　آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے

پسرانِ زینب کی تصویریں دیکھیے ؎

وہ نیمچے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق　　　جرأت کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق
ہنس ہنس کے زخم کھائیں جوانوں کو اس کا ذوق　　　گیسو رخوں پہ۔ کانوں میں بندے، گلوں میں طوق
آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رخ بھولے بھالے ہیں　　　نذروں کے منتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

پھر دونوں بھائیوں کا ہجوم فوج میں ساتھ چھوٹ جانا اور پھر یکایک مل جانا میر صاحب کی معجز بیانی کا ایک کارنامہ ہی ملاحظہ ہو؎

وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا — دم بھر میں پیادوں کو بہ پامال کر آیا
جب شبیر سا پہنچا وہ اُدھر یہ اِدھر آیا — جان آ گئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا
بچ بچ کے نکلتے تھے جو تیغوں کے تلے سے
اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

لشکر یزید میں کیسے کیسے سنگدل تھے سب جانتے ہونگے مگر انیس نے اُن لوگوں کو آنکھوں سے دکھا دیا ؎

کہتا تھا کوئی تیر کو چلہ میں جوڑ کے — گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے
سوئیں گے جب زمین پہ جھولے کو چھوڑ کے — دونوں کڑے اُتار و نگا پہنچے مروڑ کے

شاہزادہ علی اکبر کی امام حسین سے رخصت ؎

تسلیم کر کے بولے علی اکبر غیور — لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور
فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور — برچھی لگا کے دل پہ خوش آمدید کیا ضرور

پھوپھی کو بھتیجے سے شکایت ہی ؎

کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی — بے میرے لیٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
بے ان کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی — روئیں پسر پہ ان کو رلاتی نہ تھی کبھی
میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے

ہرچند دونوں تھے مرے فرزند خرد سال — پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال — میں کہتی تھی ہٹو۔ علی اکبر ہی میرا لال
وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں ہوتے تھے

پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے

میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر بھی حریف بنکر مرثیہ گوئی کے میدان میں نمودار ہوئے۔ اور دونوں کی شہرت حضرت جانعالم محمد واجد علی شاہ بادشاہ اودھ کے گوش گزار ہوئی۔ مفتاح الدولہ کے ذریعہ سے دونوں مرثیہ پڑھنے کے لیے شاہی امام باڑہ میں بلائے گئے پہلے مرزا دبیر وقت پر پہونچے اور حضور میں باریاب ہو کر ایک جانب بیٹھ گئے۔ میر صاحب نے گھڑی گھڑی کی خبریں پہنچنے کا انتظام کر لیا تھا۔ جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ مرزا صاحب پہونچ گئے تو اپنے جانے میں قصداً دیر لگانا شروع کر دی۔ یہانتک کہ تمام مجلس حاضرین سے بھر گئی اور وقت معینہ سے کچھ وقت زیادہ آگیا تب شاہی چوبدار حاضر ہوا اور عرض کی کہ مجلس تیار ہے صرف آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ میر صاحب تیار تو تھے ہی پینس سامنے حاضر تھی اس میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ مجلس میں فرش پر پاؤں رکھتے ہی تمام ارباب مجلس تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے میر صاحب سیدھے منبر کی طرف گئے اور اپنے قاعدۂ مقررہ کے موافق منبر کے پاس بیٹھ گئے نواب مفتاح الدولہ سامنے آئے تو اُن سے کہا آپ حضرت جانعالم سے عرض کر دیں کہ انیس حاضر ہے اور آپ کو دعا عرض کرتا ہے۔ مفتاح الدولہ نے بادشاہ سے اطلاع کی دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ میر صاحب کو اپنی خودداری کا خیال کہانتک تھا۔

بادشاہ کی طرف سے پہلے مرزا دبیر کو پڑھنے کا حکم دیا گیا اُنھوں نے بادشاہ کی تعریف میں ایک رباعی پڑھی جس پر چاروں طرف سے آفریں کی صدائیں گونج اُٹھیں پھر میر صاحب کو پڑھنے کے لیے ارشاد کیا گیا۔ اُنھوں نے جناب امیر علیہ السلام کی منقبت میں ایک رباعی پڑھی جس کو سُن کر سامعین پر وجد طاری ہو گیا۔ اس کے بعد سلام شروع کیا جس کا مطلع یہ تھا ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر

مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

لکھنؤ سے باہر کی مجلسیں

لکھنؤ کے علاوہ میر صاحب کو عظیم آباد الہ آباد و حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا جہاں کہیں بھی آپ نے مرثیہ پڑھا ماہران فن کے دلوں پر

اپنی شاعری کا سکہ بٹھا دیا حیدرآباد میں آج تک یہ روایت مشہور ہی کہ وہاں ایک صاحب نے میر صاحب کی شاعری کی تعریف کرتے ہوئے اُن سے کہا کہ میر کی شاعری کا پایہ بھی آپ کے سامنے پست نظر آتا ہی فرمایا کہ میر غزل کے اُستاد تھے میں ایک مرثیہ گو مجھے اُن سے کیا نسبت اُنھوں نے کہا جناب عالی میرا قول بے دلیل نہیں مقابلہ کر لیجیے میر کا مطلع ہی ؎

"اُوس زلف پہ محو ہو گئے ہم
یعنی سرِ شام سو گئے ہم"

اور آپ (میر انیس) فرماتے ہیں ؎

ایک آہ میں سرد ہو گئے ہم
ٹھنڈی جو ہوا تھی سو گئے ہم

اپنے اور میر تقی کے مطلع کو سُن کر میر صاحب کو جواب دیتے کچھ نہ بن پڑا مسکرانے لگے

میر صاحب کی مرثیہ گوئی کا طرۂ امتیاز اور اس کی مثالیں

میر صاحب کی شاعری پر تنقید کرنا صرف اس شخص کا کام ہی جو خود بھی اس فن کے نکات سے آگاہ ہو لیکن ہر شخص جو ذوق سلیم رکھتا ہی کہہ سکتا ہی کہ اُردو زبان میں اُنھوں نے اس فن کو ایسی ترقی دی کہ ان کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائیگا۔ مرثیہ گوئی کا فن نیا فن نہیں ہی انسانی نسل کی نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کا بھی وجود پایا جاتا ہی۔ عربی تاریخوں کی ورق گردانی سے پتا چلتا ہی کہ جب قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر ڈالا تو حضرت آدم کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور اس وقت جو الفاظ ان کی زبان سے نکلے اپنی موزونیت کے اعتبار سے وہ شعر کا درجہ رکھتے تھے۔ ایام جہالت کے اکثر مرثیے عربی کی ادبی کتابوں میں موجود ہیں فارسی میں بھی مرثیہ گوئی کا رواج قدیم زمانہ سے پایا جاتا ہی مقبل مخلص محتشم وغیرہ شعرا نے فارسی زبان میں حسرت و یاس کے دردناک مناظر پیش کرنے میں کوئی بات اُٹھا نہیں رکھی ہی اُردو شاعری میں بھی میر انیس کے زمانہ سے قبل مرثیہ گوئی کا پتا چلتا ہی حضرت میر تقی

میر نے اپنے مشہور تذکرہ نکات الشعرا میں یکرنگ معاصر میاں آبرو کی تصنیف سے یہ اشعار درج کیے ہیں جو بطور مرثیے کے لکھے گئے تھے۔

زخمی برنگ گل ہیں شہیدانِ کربلا — گلزار کی نمط ہی بیابانِ کربلا

کھانے چلا ہی زخمِ ستم ظالموں کے ہاتھ — دو ہاتھ زندگی ستی میدانِ کربلا

اندھیر ہی جہاں میں کہ اب شاہیوں کے ہاتھ — ہی سر بریدہ شمع شبستانِ کربلا

اشعار مندرجہ بالا سے معلوم ہوتا ہی کہ قدیم اُردو میں جو مرثیے لکھے جاتے تھے بیس تیس بیت سے زیادہ نہ ہوتے تھے پھر ایک ایسا دور شروع ہوا جس میں مراثی مسدس کے طرز پر لکھے جانے لگے اور میر ضمیر و میر خلیق کے زمانہ میں یہ ایک مستقل فن ہو گیا اور آخر میں میر انیس کی طبع رسا نے ترقی دیکر اس کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ اور مرثیہ گوئی کے میدان کو وسیع کر دیا۔ میر صاحب نے مناظر فطرت کے جس حصے پر توجہ کی کمال کر دکھایا مثلاً صبح کا سین اُنھوں نے اس خوبی سے ناظرین کے سامنے پیش کیا ہی جس سے ظاہر ہوتا ہی کہ شاعر نے صحیفۂ فطرت کو کس قدر گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ کہتے ہیں ؎

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور — دیکھے تو غش کرے ارنی گوی اوجِ طور

پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور — وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور

گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

اسی مرثیہ کی بیت ہی ؎

طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

اس ٹیپ میں میر صاحب نے صبح کی جس کیفیت کو پیش کیا ہی اس کا پورا لطف اسی شخص کو آ سکتا ہی جس کو علم الحیوانات تک دسترس حاصل ہی۔ آفتاب کی تمازت کا جو قدرتی اثر انسان حیوان اور جمادات پر ہوتا ہی اس کا بیان جن الفاظ میں فرمایا ہی اس سے بہتر نقشہ کسی دوسرے شاعر کے

قلم سے کھینچنا ناممکن ہے۔ کہتے ہیں ؎

وہ دھوپ کی تیزی غضب اور لو کا وہ چلنا ۔۔۔ وہ دوپہر اس دشت کی اور دن کا وہ ڈھلنا
ہر ایک بدن سے وہ پسینے کا نکلنا ۔۔۔ اور تن پہ حرارت سے وہ ہتھیاروں کا جلنا
جنگل کے چرندے سبھی چھاؤں میں پڑے ہیں
اور دھوپ میں پیاسے شہ مظلوم کھڑے ہیں

وہ دھوپ ہے جس میں کہ ہرن ہوتے ہیں کالے ۔۔۔ اور ہانپتے ہیں شیر زبانوں کو نکالے
گرمی سے دو دو دام ہیں منھ آب میں ڈالے ۔۔۔ رستے میں دھریں پاؤں تو پڑ جاتے ہیں چھالے
آہن کی سی شیر موم صفت نرم ہوئی ہے
پتھر ہیں چٹکتے یہ زمیں گرم ہوئی ہے

ایک موقع پر خوفناک جنگل کا سماں اس طرح بیان کیا ہے ؎

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں ۔۔۔ تھرّاتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں جائیں ۔۔۔ روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

جس گھر میں اہل بیت اطہار کو یزید نے قید کیا تھا اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

شکل دل یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ ۔۔۔ تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا ہوا تھا دل جلی ہوئی اندوں کا دودِ آہ ۔۔۔ حجرے سے چشم تر کے نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا
روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشم غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر ۔۔۔ ظاہر تھے جا بجا حشرات زمیں کے گھر
تھے وقت آشیان ابابیل سقف و در ۔۔۔ نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر

گھر تھا اجل کا خانۂ رنج و بلا نہ تھا
برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

سید الشہدا کی سیف زنی کی تعریف میں لکھا ہے ؎

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار
چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار
افعی کی طرح زہر اگلنے لگی تلوار
پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار
پانی نے اثر زہر ہلاہل کا دکھایا
ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

حضور کا سراپائے مبارک لکھتے ہوئے کس قدر نفیس استعاروں اور تشبیہوں سے کام لیا ہے فرماتے ہیں ؎

وہ ریش پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب
نکلا ہے چیر کر شب یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب
رخصت ہو رہے ہیں گلے مل کے پیری و شباب
تا وقت عصر اور زمان حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

میدان جنگ کا نقشہ کھینچنے اور یزیدی فوج کے لوگوں کی کیفیت لکھنے میں جو کمال ظاہر کیا ہے اس کا اندازہ اس بند سے ہو سکتا ہے ؎

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے غل
خوف خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
مکار و اہل نار و دغا باز و پر دغل
شکلیں مہیب دیو سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہ خاندان رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

علی اکبر کو رن کی اجازت دینے کے موقع پر بی بی زینب کی زبان سے ماں کی فطرتی محبت کا موازنہ پھوپھی کی محبت سے کیا ہے وہ قابل ہزار ستایش ہے کہتے ہیں ؎

سچ ہی کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں ہوں لاکھ ان کی چاہنے والی وہ پھر ہی ماں
آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں آج انتہا کی ہی وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خیر ہی
ماں ہی تو ماں ہی خلق میں پھر غیر غیر ہی

گھوڑے کی تعریف میر صاحب نے اکثر موقعوں پر لکھی ہی لیکن جس طرح ایشیائی شاعر قصیدوں میں اپنے ممدوح کے گھوڑے کی تعریف میں انتہائے مبالغہ سے کام لیکر اپنے کلام کو مبتذل بنا دیتے ہیں اس سے میر صاحب کا کلام مبرا ہی اور ان کے بیاں بھی مبالغہ ہی لیکن لطف سے خالی نہیں اور اس کی صرف یہ وجہ ہی کہ اس میں بھی اکثر فطرتی مضامین میر صاحب کے قلم سے نکل گئے ہیں مثلاً کہتے ہیں۔

لکھتا ہی ادہم قلم اب سرعت عقاب نعل اس کے ماہ نو ہیں تو سم رشک آفتاب
پستی میں سیل ہی تو بلندی میں ہی سحاب سرعت میں برق گرم روانی میں جوئے آب

اُڑنے میں اس فرس کو پرندوں پہ اوج ہی
ایک شور تھا قدم نہیں دریا کی موج ہی

سمٹا۔ جما۔ اُڑا۔ ادھر آیا۔ اُدھر گیا چمکا بڑھا جمال دکھایا ٹھہر گیا
تیروں سے اُٹکے برچھیوں سے بے خطر گیا بہم کیا صفوں کو پروں سے گزر گیا

گھوڑوں کا تن بھی ٹاپ سے اس کی فگار تھا
ضربت تھی نعل کی کہ سروہی کا وار تھا

فطری مضامین میں اضطراب استقلال۔ فراق و وصال وفاداری نے ثباتی دنیا۔ انقلاب عالم غرض کوئی مضمون ایسا نہیں ہی جس میں میر صاحب کے قلم نے شیکسپیر اور کالیداس سے زیادہ ڈرامانگاری کی قوت نہ دکھائی ہو اگر یہ قوت میر صاحب کے قلم میں نہ ہوتی تو میر صاحب کو اعلیٰ درجہ کی رزمی شاعر (ایپک پوئٹ[1]) کا مرتبہ حاصل نہ ہوتا۔ مگر اس مختصر دیباچہ میں ہر مضمون کے

[1] Epic Poet

بندوں کو مثال میں پیش کروں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائیگی۔ اس لیے میں اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ ناظرین جب وقت ان مراثی کو جو اس جلد اول کے ذریعہ سے ان کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں مطالع فرمائنگے تو وہ خود انصاف سے کہدینگے۔ کہ میر صاحب بلاشبہ فطری شاعر تھے اور ان کی فطرت نگاری دلوں پر ایک خاص اثر ڈالتی ہے اُردو شعرا میں مناظر قدرت کی طرف ان کا میلان طبعی تھا۔ اور فطرت پسند اور فطرت شناس طبیعت رکھتے تھے۔۔ یہی وجہ ہے کہ اُنھوں نے جس چیز کی تصویر کھینچی ہے لاجواب ہے۔ انکا انداز بیاں دلکش ہے جس واقعہ کو نظم کیا ہے اس کو ترتیب کے سلسلہ میں ایسا منسلک کیا ہے کہ سبحان اللہ ؎

نظم ہے یہ بادرِ اشعار کی لڑیاں انہیں　　　جوہری بھی اس طرح موتی پرو سکتا نہیں۔

ایک نئی طرز کی ایجاد سے اُردو شاعری کو فی الواقع آپ نے چار چاند لگا دیے جیسا خود فرما گئے ہیں۔

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر　　　مگر ہم نے پلہ گراں کر دیا

میری قدر کرلے زمین سخن　　　تجھے بات میں آسماں کر دیا

میر صاحب کے ان اشعار کو شاعرانہ تعلی نہ سمجھنا چاہیئے اس میں بہت کچھ واقعیت موجود ہے اُن کے مراثی پر گہری نظر ڈالنے سے ان کے اس بیان کی کہ ؎

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا　　　یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا

فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا　　　مختصر پڑھ کے رولا دینے کا ساماں ہے جدا

دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو

دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

پورے طور پر تصدیق ہوتی ہے اور بڑے سے بڑے نکتہ چیں کو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ان کے کلام میں جامعیت کی شان پائی جاتی ہے۔ اور ڈراما نگاری کے اعلیٰ اصول کی پابندی کے ساتھ اُنھوں نے اُردو زبان کو ایک خاص قسم کی جلا دینے میں کامیابی حاصل کی ہے دیگر شعرا کی نسبت

اُنھوں نے اپنے کلام میں اُردو کے سب سے زیادہ الفاظ خوش سلیقگی اور شائستگی سے استعمال کیے ہیں اور اگر اسی ایک بات کو معیار کمال قرار دیا جائے تو بھی بقول مولانا حالی میر انیس کو اُردو شعرا میں سب سے برتر ماننا پڑے گا۔ مرزا دبیر جن کا ذکر اس مقدمہ میں ایک موقع پر آچکا ہے میر صاحب کے ہمعصر بلکہ مدمقابل مرثیہ گو شاعر گزرے ہیں اور آج بھی ایک گروہ مرزا صاحب کے کلام کو میر صاحب کے کلام پر ترجیح دینے والا ملک میں موجود ہے۔ مولانا شبلی نے اس مضمون پر ایک مستقل کتاب موازنۂ انیس و دبیر لکھ کر اُردو لٹریچر میں ایک مفید اضافہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوسری کتاب المیزان لکھی گئی جس میں **موازنۂ انیس و دبیر** کے مصنف کی بعض رایوں پر جو اس نے میر صاحب کے کلام کے متعلق دی ہیں نکتہ چینی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد نے تذکرہ آب حیات میں مرثیہ گوئی کے ان دونوں پہلوانوں کے متعلق جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے:-

”میر انیس صفائی کلام لطف زبان۔ چاشنی محاورہ۔ خوبی بندش حسن اسلوب مناسبت مقام طرز ادا اور سلسلہ کی ترتیب میں جواب نہیں رکھتے مگر مرزا دبیر بھی شوکت الفاظ مضامین کی آمد اس میں جا بجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنائے، دل گداز انداز کے جو مرثیے کی اصلی غرض ہے بادشاہ تھے“

لیکن ان سب رایوں کے دیکھنے کے بعد بھی ایک غیر جانبدار شخص جو نہ **انیسیوں** میں ہے نہ **دبیریوں** میں وہ صرف اُردو ادب کے گزشتہ موجودہ اور آئندہ حالت پر نگاہ رکھ کر مولانا حالی کی اس رائے سے اتفاق کرنے پر مجبور ہے:-

”میر انیس اُردو شعرا میں سب سے زیادہ برتر تھے“ فقط

خاکسار

نظامی عفی عنہ

بدایوں۔ ۲۳ مئی ۱۹۲۶ء

فہرست مراثی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مرثیہ (۱)

دشتِ وغا میں نورِ خدا کا ظہور ہے
اک آفتاب رخ کی ضیا دور دور ہے
ذرّوں میں روشنیٔ تجلّیٔ طور ہے
کوسوں زمین عکس سے دریائے نور ہے
اللہ رے حسن طبقۂ عنبر سرشت کا
میدانِ کربلا ہے نمونہ بہشت کا

حیراں زمیں کے نور سے ہے چرخِ لاجورد
ہے رو کش فضائے ارم وادیٔ نبرد
مانندِ کہربا ہے رخِ آفتاب زرد
اُٹھتا ہے خاک سے تتقِ نور جائے گرد
حیرت سے حاملانِ فلک اُن کو تکتے ہیں
ذرّے نہیں زمیں پہ ستارے چمکتے ہیں

ہے آبِ نہر صورتِ آئینہ جلوہ گر
لہریں بسانِ برق چمکتی ہیں سر بسر
تاباں ہے مثلِ چشمۂ خورشید ہر بھنور
پانی پہ مچھلیوں کی ٹھہرتی نہیں نظر
یہ آب و تاب ہے کہ گہر آب آب ہیں
دریا تو آسمان ہے سارے حباب ہیں

پرتو فگن ہوا جو رخِ قبلۂ انام
اور سنگریزے دُرِّ نجف بن گئے تمام
مشہور ہو گئی وہ زمیں عرش احتشام
صحرا کو مل گیا شرفِ وادیٔ السلام
کعبہ سے اور نجف سے بھی عزت سوا ہوئی
خاک اُس زمینِ پاک کی خاکِ شفا ہوئی

پھیلا جو نورِ مہرِ امامت دمِ زوال
سارے نہال فیضِ قدم سے ہوئے نہال
ذرّوں سے واں کے آنکھ ملانا ہوا محال
اختر بنے جو پھول تو شاخیں بنی ہلال
پتّے تمام آئینۂ نور ہو گئے
صحرا کے نخل سب شجرِ طور ہو گئے

غل تھا زہے حسین کی شوکت زہے وقار / گویا کھڑے ہیں جناب کو محبوب کردگار
رخ سے عیاں ہی دبدبۂ شاہ ذوالفقار / ہی نورِ حق جبینِ منور سے آشکار
کیونکر چھپے نہ ماہِ دو ہفتہ حجاب سے / چودہ طبق میں نور ہی اس آفتاب سے

یہ روے روشن اور یہ گیسوے مشکفام / یاں شام میں تو صبح ہی اور صبح میں ہی شام
ہالے میں یوں نظر نہیں آتا مہِ تمام / قدرت خدا کی نور کا ظلمت میں ہی مقام
زلفوں میں جلوہ گر نہیں چہرہ جناب کا / ہی نصف شب میں آج ظہور آفتاب کا

قرباں کمانِ ابروے مولا پہ جان و دل / گر ماہِ نو کہیں تو ہی تشبیہ مبتذل
چشمِ غزالِ دشتِ ختن چشم سے خجل / دیکھا جسے کرم سے خطائیں ہوئیں بحل
پتلی بسانِ قبلہ نمانے قرار ہی / گریاں ہیں وہ یہ گردشِ لیل و نہار ہی

رخسار ہیں ضیا میں قمر سے زیادہ تر / جن پر ٹھہر سکی نہ کبھی شمس کی نظر
ریشِ مخضب اور یہ رخِ شاہ بحروبر / پیدا ہیں صاف معنیِ واللیل و والقمر
قرآن سے عیاں ہی بزرگی امام کی / کھائی قسم خدا نے اسی صبح و شام کی

کس منہ سے کہیئے لب جاں بخش کا بیاں / چوسی جنھوں نے احمدِ مختار کی زباں
کیا درِّ آبدار ہیں اس درج میں نہاں / گویا کہ موتیوں کا خزانہ ہی یہ دہاں
ذرّے زمیں پہ عکس سے سارے چمک گئے / جس وقت یہ کھلے تو ستارے چمک گئے

شمعِ حریم لم یزلی تھا گلوے شاہ / تاریک شب میں جیسے ہویدا ہو نورِ ماہ
اے چرخِ بے مدار یہ کیسا ستم ہی آہ / شمشیرِ شمر اور محمدؐ کی بوسہ گاہ
جس پر رسولؐ ہونٹوں کو ملتے ہوں پیار سے / کٹ جائے کربلا میں وہ خنجر کی دھار سے

منظور یاں تھی مدح گلوے شہِ امم / یاد آ گئی مگر یہ حدیثِ غم و الم
مسجد میں جلوہ گر تھے رسولِ فلک حشم / ملتے تھے ذکرِ حق میں لبِ پاک دم بدم
روشن تھے بام و در رخِ روشن کے نور سے / آئینہ بن گئی تھی زمین تن کے نور سے

تھا جو ستوں کہ رکنِ رسالت کا تکیہ گاہ
کرسی بھی اس کی پشت کی تھی ڈھونڈھتی پناہ

تھا جس چھپیر پہ وہ دو عالم کا بادشاہ
حسرت سے عرش کرتا تھا اس فرش پر نگاہ

اوج زمین بہشتِ بریں سے دو چند تھا
منبر کا نہ فلک سے بھی پایا بلند تھا

اصحابِ خاص گرد تھے انجم کی طرح سب
تاباں تھا بیچ میں وہ مہ ہاشمی لقب

سر پر ملک صفات مگس راں تھے دو عرب
جبریلؑ تہ کیے ہوئے تھے زانوے ادب

خادم بلال و قنبرِ گردوں اساس تھا
نعلین اس کے پاس عصا اس کے پاس تھا

گیسو تھے وہ مفسر واللیل اذا سجا
رخ سے عیاں تھے معنی والشمس والضحیٰ

وہ ریشِ پاک اور رخِ سرور انبیا
گویا دھرا تھا رحل پہ قرآن کھلا ہوا

اوڑھے سیہ عبا جو وہ عالم پناہ تھا
کعبہ کا صاف حاجیوں کو اشتباہ تھا

پہلو میں بادشاہ کے تھا جلوہ گر وزیر
سردار دین علیؑ ولی خلق کا امیر

دونوں جہان میں کوئی نہ دونوں کا تھا نظیر
احمد تھے آفتاب تو حیدر مہِ منیر

ظاہر میں ایک نور کا دو جا ظہور تھا
گر غور کیجیے تو وہی ایک نور تھا

مصروف وعظ و پند تھے سلطانِ مشرقین
جو گھر سے نکلے کھیلتے زہراؑ کے نور عین

نانا بغیر دونوں نواسوں کو تھا نہ چین
بڑھ جاتے تھے حسنؑ کبھی آگے کبھی حسینؑ

کہتے تھے دیکھیں کون قدم جلد اٹھاتا ہے
نانا کے پاس پہلے بھلا کون جاتا ہے

وہ گورے گورے چہروں پہ زلفیں ادھر ادھر
کرتے گلوں میں نور بدن جن سے جلوہ گر

اختر سے وہ چمکتے ہوئے کان کے گہر
رشکِ ہلال طوق گلے غیرتِ قمر

ہیکل پہ نقش نام خدائے جلیل کے
تعویذ گردنوں میں پرِ جبرئیلؑ کے

مسجد میں آئے ہنستے ہوئے جب وہ گلبدن
خوشبو سے صحن مسجد جامع بنا چمن

تسلیم کو حسینؑ سے پہلے جھکے حسنؑ
خوش ہو کے مسکرانے لگے سرورِ زمن

بڑھ بڑھ کے خم سلام کو چھوٹے بڑے ہوئے
بیٹھے رہے رسولؐ ملک اٹھ کھڑے ہوئے

بیٹوں کو تھا علی کا اشارہ کہ بیٹھ جاؤ
پھیلا کے ہاتھ بولے محمد کہ آؤ آؤ
بھائی حسنؑ جو آپ کی گودی میں آئنگے
بولے حسنؑ کہ واہ ہمیں اور کریں پیار
بولے بچشم نم یہ حسینؑ فلک وقار
سب سے سوا جو ہیں سو ہمیں ان کے پیار ہیں
بھائی سے تب کہا یہ حسن نے بالتفات
نانا ہمارے کیا نہیں سلطان کائنات
غصہ نہ اتنا چاہیے خوش خو کے واسطے
یہ سن کے منہ علیؑ کا لگے دیکھنے رسولؐ
میں چاہتا ہوں آپ کی خاطر نہو ملول
ہوئے نہ رنج میرے کسی نورِ عین کو
شبیرؑ سے پھر اشارہ کیا ہو کے بے قرار
پھر بولے دیکھ کر سوئے شبیرؑ نامدار
چھاتی سے ہم لگائیں گے جان اپنی جانکر
دوڑے یہ بات سن کے برابر وہ خوش سیر
لپٹے حسینؑ ہنس کے ادھر اور حسنؑ ادھر
نانا کے ساتھ پیار میں دونوں کا ساتھ تھا
پھر پھر کے دیکھتے تھے شہنشاہِ مشرقین
بیٹھے جو زانوؤں پہ وہ زہرا کے نورِ عین
جھک جھک کے منہ رسولِ زمن چومنے لگے

لازم نہیں کہ وعظ میں نانا کو تم ستاؤ
شبیرؑ نے کہا ہمیں پہلے گلے لگاؤ
ہم تم سے نانا جان ابھی روٹھ جائنگے
اقرار کر چکے ہیں شہنشاہِ نامدار
دیکھیں تو کون ہوتا ہے کاندھے پہ اب سوار
آگے نہ بڑھیے آپ کہ نانا ہمارے ہیں
بے وجہ ہم سے روٹھے ہو تم اے نکو صفات
ہوتی ہے ناگوار تمھیں تو ذرا سی بات
مچلے تھے یونہی بچہ آہو کے واسطے
ہنسکر کہا یہ دونوں ہیں میرے چمن کے پھول
روئنگے یہ تو گھر سے نکل آئیں گی بتولؑ
تم لو حسنؑ کو گود میں میں لوں حسینؑ کو
غصہ نہ کھاؤ پہلے تمھیں کو کریں گے پیار
آ اے حسین آ تری باتوں کے میں نثار
دیکھیں تو پہلے کون لپٹتا ہے آن کر
پاس آئے آفتابِ رسالت کے دو قمر
تھے پانوں زانوؤں پہ تو بالائے دوش سر
گردن میں ایک ان کا اور اک ان کا ہاتھ تھا
گہ جانب حسنؑ تو کبھی جانب حسینؑ
تھا تن کو لطف قلب کو راحت جگر کو چین
ان کا گلا تو ان کا دہن چومنے لگے

شبیر چاہتے تھے کہ چومیں مرے بھی لب
نانا کے منہ کے پاس یہ لاتے تھے منہ کو جب
بھائی کو دیکھ کر جو حسنؑ مسکراتے تھے
اُٹھے حسین زانوے احمدؐ سے خشمگیں
رُخ پر پسینہ جسم میں رعشہ جبیں پہ چیں
گھر میں اکیلے تیوری چڑھائے چلے گئے

بیت الشرف میں آئے جو شبیرؑ نامدار
دوڑیں یہ کہہ کے فاطمہؑ زہرا جگر فگار
تجھکو رولا کے غم میں مجھے مبتلا کیا
میرا کلیجہ پھٹتا ہے اے دل ربا نہ رو
سر میں نہ درد ہو کہیں اے مہ لقا نہ رو
میری طرف تو دیکھو کہ بیتاب ہوتی ہوں

تو منہ تو کھول اے مرے شبیرؑ خوش خصال
مل مل کے پشت دست سے آنکھیں کرو نہ لال
گھر سے گئے تھے ساتھ جدا ہو کے آئے ہو
تم چپ ہو وہ گھر میں تو مسجد سے پھر کے آئیں
اُن سے نہ بولیو وہ تمھیں لاکھ گر منائیں
واری اگر حسنؑ نے رولایا برا کیا

بولے حسین ہم تو ہیں اس بات پر خفا
تم اماں جان منہ کو تو سونگھو مرے ذرا
بھائی کے لب سے اپنے لبوں کو ملاتے ہیں
پر کچھ گلے کے بوسوں کا کھلتا نہ تھا سبب
جھک جھک کے چومتے تھے گلا سید عرب
غیرت سے اُن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے

غصہ سے رنگ زرد اور آنکھوں پہ آستیں
پوچھا کدھر چلے تو یہ بولے کہیں نہیں
دیکھا نہ پھر کے سر کو جھکائے چلے گئے
کرتے کو منہ پہ رکھ کے لگے رونے زار زار
ہے ہے حسینؑ کیا ہوا تو کیوں ہے اشکبار
قربان ہو گئی تجھے کس نے خفا کیا

زہرا ہزار جان سے تجھ پر فدا نہ رو
بس بس نہ رو حسینؑ برائے خدا نہ رو
چادر سے منہ کو ڈھانپ کے لو میں بھی روتی ہوں
تر ہو گئے ہیں آنسوؤں سے گورے گورے گال
سلجھاؤں آؤ الجھے ہوئے گیسوؤں کے بال
سمجھی میں کچھ حسن سے خفا ہو کے آئے ہو

گزری ہیں کھیل سے مرے بچے کو کیوں رولائیں
لو آؤ جانے دو تمھیں چھاتی سے ہم لگائیں
پوچھوں گی کیا نہ میں مرے پیارے نے کیا کیا
نانا نے چومے بھائی کے ہونٹھ اور مرا گلا
کچھ بو ہے ناگوار ہے میرے دہن میں کیا
اب ہم نہ جائینگے ہمیں نانا رلاتے ہیں

منہ رکھ کے منہ پہ بولی یہ زہرا جگر فگار
بوئے گلاب آتی ہے اے میرے گلعذار
چوما اگر گلا تو خفا ہو نہ میں نثار
تم کو زبان چوساتے تھے محبوب کردگار
یہ مشک میں مہک نہ گل یاسمن میں ہے
خوشبو اسی دہن کی تمھارے دہن میں ہے

کہنے لگے حسینؑ یہ ماں سے بچشم نم
کیا جانو تم حسنؑ سے ہمیں چاہتے ہیں کم
یہ کیا انھیں پہ لطف و عنایت ہے دم بدم
معلوم ہوگیا انھیں پیارے نہیں ہیں ہم
رو رو کے جان آج ہم اپنی گوائیں گے
پانی نہ اب پئیں گے نہ کھانے کو کھائیں گے

یہ بات سن کے ہوگیا زہرا کا رنگ فق
بولی پسر سے رو کے وہ بنت رسول حق
صدقے گئی کرو نہ کلیجے کو میرے شق
ہے ہے یہ کیا کہا مجھے ہوتا ہے اب قلق
میرا لہو بہے گا جو آنسو بہاؤ گے
کاہے کو ماں جیے گی جو کھانا نہ کھاؤ گے

یہ کہہ کے اوڑھ لی سر پر نور پر ردا
موزے پہن کے گود میں شبیرؑ کو لیا
در تک گئی جو گھر سے وہ دلبند مصطفیٰ
فضہ نے بڑھ کے بوذر و سلماں کو دی صدا
پیش نبی حسینؑ کو گودی میں لاتی ہیں
ہٹ جاؤ سب کہ فاطمہؑ مسجد میں آتی ہیں

اللہ ری آمد آمد زہراؑ کا بندوبست
ساتوں فلک تھے اوج شرافت سے جس کی پست
احمدؐ کے گرد پیش سے اٹھے خدا پرست
انساں تو کیا ملک کو نہ تھی قدرت نشست
آئیں تو شاد شاد رسول زمن ہوے
گھر میں خدا کے ایک جگہ پنجتن ہوے

تعظیم فاطمہؑ کو اٹھے سید البشر
دیکھا کہ چشم فاطمہؑ ہے آنسوؤں سے تر
خم تھے حسینؑ دوش پہ ماں کے جھکائے سر
تھا اک ہلال مہر کے پہلو میں جلوہ گر
ماں کہتی تھی نہ رو دو مگر چپ نہ ہوتے تھے
آنکھیں تھیں بند ہچکیاں لیلے کے روتے تھے

گھبرا کے پوچھنے لگے محبوب ذوالجلال
روتا ہے کیوں حسینؑ یہ کیا ہے تمھارا حال
بولیں بتول آج قلق ہے مجھے کمال
رویا ہے یہ حسینؑ کہ آنکھیں ہیں دونوں لال
آتے ہیں ہنستے روتے ہوے گھر میں جاتے ہیں
شفقت بھی آپ ہی کرتے ہیں آپ ہی رلاتے ہیں

ہاتھوں کو جوڑتی ہوں میں یا شاہ بحر و بر
شفقت کی اس کے حال پہ ہر دم ہے منتظر
رونے سے اس کے ہوتا ہے ٹکڑے مرا جگر
مجھ فاقہ کش غریب کا پیارا ہے یہ پسر
حیدرؑ سے پوچھیے مری عسرت کے حال کو
کس کس دکھوں سے پالا ہے اس نونہال کو

اشک اس کے جتنے ٹپکے ہیں یا شاہِ نیک خو
اتنا ہی گھٹ گیا ہے مرے جسم کا لہو
روئے ہیں پھوٹ پھوٹ کے یہ میرے روبرو
تر ہو گیا ہے آنسوؤں سے چاند سا گلو
دیکھا نہ تھا میں نے جو حال اس کا آج ہے
حضرت تو جانتے ہیں کہ نازک مزاج ہے

شفقت سے آج آپ نے چومے حسنؑ کے لب
بوسہ لیا نہ ان کے لبوں کا یہ کیا سبب
رتبے میں دونوں ایک ہیں یا سرورِ عرب
میں سچ کہوں یہ سن کے مجھے بھی ہوا عجب
اس کو جو ہو خوشی تو دل اس کا بھی شاد ہو
چھوٹے سے چاہیے کہ محبت زیادہ ہو

آپ ان کے ناز اٹھاتے ہیں یا شاہِ بحر و بر
پھر کس سے روٹھیں آپ سے روٹھیں نہ یہ اگر
اکثر انھیں چڑھایا ہے حضرت نے دوش پر
گیسو دیئے ہیں ننھے سے ہاتھوں میں بیشتر
روٹھے تھے یہ سو قدموں پہ سر دھرنے آئے ہیں
منہ کے نہ چومنے کا گلا کرنے آئے ہیں

یہ کہہ کے پھر حسینؑ سے بولیں بچشمِ تر
لو جا کے اب نبی کے قدم پر جھکا دو سر
آئے حسینؑ ہاتھ جو ننھے سے جوڑ کر
بے اختیار رونے لگے سیدالبشر
رہ رہ کے دیکھتے تھے علیؑ و بتولؑ کو
نزدیک تھا قلق سے غش آئے رسولؐ کو

تھی آنسوؤں سے ریشِ مبارک تمام نم
فرطِ بکا سے خاک پہ جھکتے تھے دم بدم
گاہے ستون سے لگے ہوئے رہتے گاہ خم
ہر لحظہ اضطراب زیادہ تھا صبر کم
ہو سکتا تھا نہ ضبط شہِ مشرقین سے
روتے تھے بار بار لپٹ کر حسینؑ سے

شبیرؑ رو کے کہتے تھے نانا نہ روئیے
روئیں گے اب نہ ہم شہِ والا نہ روئیے
ہلنے لگے گا عرشِ معلّا نہ روئیے
پھٹتا ہے اب ہمارا کلیجا نہ روئیے
سو بار دن میں ہم تو منہ اشکوں سے دھوتے ہیں
حضرت ہمارے رونے پہ کاہے کو روتے ہیں

گھر آگئے علیؑ ولی شاہ بحر و بر
کی عرض فاطمہؑ نے جھکا کے قدم پہ سر

بیٹی نثار ہو گئی یا سید البشر
کیا وجہ ہے جو آپ ہیں اس طرح نوحہ گر

جلدی بتائیے کہ مجھے تاب اب نہیں
رونا خدا کے دوست کا بے سبب نہیں

حضرت کو علم غیب ہے یا شاہ انس و جاں
آئندہ و گزشتہ کا سب حال ہے عیاں

کیا آئی آج وحی خداوند دو جہاں
ہونا ہے جو حسینؑ پہ مجھ سے کرو بیاں

فاقوں میں کاٹتی ہوں مصیبت جہان کی
کیوں بابا جان خیر تو ہے اس کی جان کی

بولے جگر کو تھام کے محبوب ذوالجلال
تجھ سے سنا نہ جائے گا اے فاطمہؑ یہ حال

کس منہ سے میں کہوں کہ قلق ہے مجھے کمال
زہراؑ شہید ہوئیں گے تیرے یہ دونوں لال

ماتم کی یہ خبر ابھی جبریلؑ لائے تھے
سارے ملک حسینؑ کے پرسے کو آئے تھے

الماس پی کے ہوئے گا بیجان ترا حسنؑ
یہ وجہ ہے کہ چومتا ہوں اس کا میں دہن

بھر جائے گا کلیجوں کے ٹکڑوں سے سب لگن
ہوگا زمردی ترے اس لال کا بدن

سوئے بہشت جب جہاں سے سدھاریں گے
بے دیں تیر اس کے جنازے پہ ماریں گے

زہرا مجھے کلام کی طاقت نہیں ہے اب
حلق حسینؑ چومنے کا کیا کہوں سبب

اک بن میں تین روز رہیں گے یہ تشنہ لب
کٹ جائے گا گلا بھی خنجر سے ہے غضب

نیزے پہ سر چڑھے گا ترے نور عین کا
گھوڑوں سے روند ڈالیں گے لاشہ حسینؑ کا

روئے خبر یہ کہہ کے جو محبوب ذوالمنن
گھبرا کے منہ حسینؑ کا تکنے لگے حسنؑ

زہراؑ پکاری ہائے لٹے گا مرا چمن
میں مر گئی دہائی ہے یا سرور زمن

کیسی یہ آگ ہے کہ مری کوکھ جل گئی
ہے ہے چھری کلیجے پہ زہراؑ کے چل گئی

فریاد یا نبی شہ ابرار الغیاث
اے مرسلان حق کے مددگار الغیاث

اے بیکسوں کے وارث و سردار الغیاث
اے جزو کل کے مالک و مختار الغیاث

قدرت ہے سب طرح کی شہ مشرقین کو
حضرت سے لو لگی اپنے حسنؑ اور حسینؑ کو

کس جرم پر یہ لال مرے قتل ہوں گے آہ
کی عرض فاطمہؑ نے کہ ای عرش بارگاہ
تلواریں کھینچ کھینچ کے ظالم جو آئیں گے
آساں ہی کیا جو قتل کریں گے ستم شعار
اعدا پہ کیا چلے گا نہ دستِ خدا کا وار
ٹکڑے جگر جو ہوے گا مجھ دل دو نیم کا
زہرا سے روکے کہنے لگے شاہ نیک خو
اُس وقت قتل ہوئیں گے یہ دونوں ماہ رو
لاشہ پہ مجتبےٰ کے تو شبیرؑ روے گا
چلائی سر پٹک کے یہ زہرا کہ ہی ستم
ماتم کی صف بچھاے گا کون ای شہ امم
ہم میں سے ایسے وقت جو کوئی نہ ہوے گا
بچے کی میرے تعزیہ داری کرے گا کون
دریاے اشک چشم سے جاری کریگا کون
ہوگا کہاں نبی کے نواسہ کا فاتحہ
بولے نبی کہ آپ کو زہرا نہ کر ہلاک
پیدا کریں گے قوم اک ایسی بروے خاک
بزم عزا میں آئیں گے وہ دور دور سے
ہوگی انھیں سے مجلس ماتم کی زیب و زین
آنکھیں وہ دیں گے رونے کو سمجھیں جو فرض عین
سامان تعزیت کے کبھی کم نہ ہوئیں گے

روکر کہا رسولؐ خدا نے کہ بے گناہ
بچوں کو میرے کیا نہ ملے گی کہیں پناہ
حضرت نہ کیا نواسوں کو اپنے بچائیں گے
کیا شیرِ حق کمر سے نہ کھینچیں گے ذوالفقار
بالوں کو کیا نہ کھولے گی زہراؑ جگر فگار
پایہ نہ کیا ہلاؤں گی عرش عظیم کا
بیٹی مجھے ستائیں گے تربت میں کینہ جو
دنیا میں جب نہ ہوگا علیؑ اور نہ میں نہ تو
شبیرؑ جب مرے گا تو کوئی نہ ہوے گا
پیٹے گا کون تن سے جو نکلے گا اُس کا دم
پُرسے کو کون آئے گا اُس کے بچشمِ نم
ہای ہای مرے حسینؑ کو پھر کون روے گا
منہ ڈھانپ ڈھانٹ گریہ و زاری کریگا کون
امداد بعدِ مرگ ہماری کرے گا کون
شربت پہ کون دیوے گا پیاسے کا فاتحہ
فرما چکا ہی مجھ سے یہ وعدہ خداے پاک
جو رات دن رہیں گے اسی غم میں دردناک
تن خاک سے بنائیں گے دل اُن کے نور سے
دیں گے انھیں وہ لب کہ رہے جس پہ وا حسینؑ
ہاتھ ایسے غیر سینہ زنی ہو جنھیں نہ چین
وہ حشر تک حسینؑ کے ماتم میں روئیں گے

ہوگا عیاں فلک پہ محرم کا جب ہلال
کھولیں گی بی بیاں بھی سب اپنے سروں کے بال
لیں گے صلہ میں خلد ترے نور عین سے

پیاسا شہید ہوگا جو زہرا یہ دلربا
ہووے گی شاد روح شہیدان کربلا
محبوب کبریا کے نواسے کی نذر ہی

کہنے لگی نبی سے بتول فلک جناب
ای بادشاہ کون و مکاں مالک الرقاب
کیجے دعا کہ خالق اکبر مدد کرے

بیٹی سے روکے کہنے لگے شاہ کائنات
چاہو تو رد کرے یہ بلا رب پاک ذات
محبوب حق نثار ترے نور عین پر

اللہ رے صبر دختر محبوب کردگار
خوشنود ہوکے کہنے لگے شاہ ذوالفقار
اس راہ میں نہ مال نہ دولت عزیز ہی

کہنے لگے حسین سے پھر شاہ بحر و بر
نانا سے بولے چھوٹے سے ہاتوں کو جوڑ کر
وعدہ کو ہم نہ بھولیں گے گو خرد سال ہیں

روتے ہیں آپ کس لیے یا سید امم
تلواریں بھی چلیں تو نہیں مارنے کے دم
ہم راست گو ہیں بات پہ جس وقت آتے ہیں

رخت سیاہ پہنیں گے بر میں وہ خوش خصال
ہر گھر میں ہوگا شور کہ ہی ہی علی کا لال
آنسو عزیز وہ نہ کریں گے حسین سے

مومن سبیلیں رکھیں گے پانی کی جابجا
بھر بھر کے آب سرد پکاریں گے برملا
پیاسے نہ جائیو کہ یہ پیاسے کی نذر ہی

ہی ہی میں کیا کروں دل مضطر کو نہیں ہی تاب
درگاہ حق میں آپ کی ہی عرض مستجاب
اللہ یہ بلا مرے بچے کی رد کرے

روح الامین نے مجھ سے تو یہ بھی کہی ہی بات
لیکن نہ ہووے گی مری امت کی پھر نجات
موقوف ہی یہ امر تو قتل حسین پر

امت کا نام سن کے جھکا یا سر ایک بار
صدقے حسن حسین تصدق علی نثار
پیارے پسر نہیں ہیں امت عزیز ہی

بتلا مجھے کہ کیا تری مرضی ہی ای پسر
امت کے کام آے تو حاضر ابھی ہی سر
چھوٹے نہیں ہیں مخبر صادق کے لال ہیں

راضی ہیں ہم پہ راہ خدا میں ہوں جو ستم
امت پہ اپنے سر کو تصدق کریں گے ہم
کہتے ہیں جو زبان سے وہی کر دکھاتے ہیں

بچپن میں جو زباں سے کہا تھا کیا وہ کام
گردن جھکائے برچھیاں کھایا کیے امام
تیغیں علیؑ کے لال کے شانے پہ چل گئیں

مینہ کی طرح برسنے لگے شاہ دیں پہ تیر
دامن پہ تیر جیب پہ تیر آستیں پہ تیر
داغوں سے خون کے رخت بدن لالہ زار تھا

تر تھی لہو میں زلف شکن در شکن جدا
در پے تھے نیزہ دار جدا تیغ زن جدا
سیپارہ تھا نہ صدر فقط اُس جناب کا

کرتا تھا وار برچھیوں والوں کا جب پرا
نیزوں میں خوں نبیؐ کے نواسہ کا تھا بھرا
تھیں سختیاں ستم کی شہ خوش خصال پر

تھے دو ہزار جسم شہ بحر و بر پہ زخم
گردن پہ زخم سینہ پہ زخم اور کمر پہ زخم
گھوڑے پہ گہہ سنبھلتے تھے گہ ڈگمگاتے تھے

گھوڑے پہ جب سنبھلنے کی مطلق رہی نہ تاب
گرنے لگا جو خاک پہ وہ آسماں جناب
غل تھا کہ خاک پر شہ کون و مکاں گرا

جلتی ہوئی زمین پہ تڑپنے لگے امام
اُس وقت شمر سے یہ عمر نے کیا کلام
ڈریو نہ سن کے فاطمہ زہرا کی آہ کو

جس وقت رن میں ٹوٹ پڑی شہ پہ فوج شام
خون میں قبا رسولؐ کی تر ہو گئی تمام
چھاتی کے پار نیزوں کی نوکیں نکل گئیں

تھرا رہے تھے لگ کے تن نازنیں پہ تیر
پہلو پہ تیغ سینہ پہ نیزہ جبیں پہ تیر
شکل ضریح سینۂ اقدس فگار تھا

مجروح لعل لب تھے جدا اور دہن جدا
کٹ کٹ کے ہو گیا تھا ہر اک عضو تن جدا
پرزے ورق ورق تھا خدا کی کتاب کا

تیغوں سے دم بھی لینے کی مہلت نہ تھی ذرا
شمشیر و تیر و نیزہ و خنجر کے ماورا
چلتے تھے سنگ فاطمہ زہرا کے لال پر

ماتھے پہ زخم تیر کے تیغوں کے سر پہ زخم
اور اس کے ماورا تھے بہتر جگر پہ زخم
غش آتا تھا تو ہرنے پہ سر کو جھکاتے تھے

ہاتھوں سے باگ چھٹ گئی اور پاؤں سے رکاب
مرقد میں بے قرار ہوئی روح بوتراب
بس اب زمیں الٹ گئی اور آسماں گرا

بیکس پہ ظالموں نے کیا اور اژدہام
ہاں تن سے جلد کاٹ سر سرور انام
گل کردے شمع قبر رسالت پناہ کو

یہ سُنتے ہی چڑھائی ستمگر نے آستیں
خنجر کمر سے کھینچ کے آگے بڑھا لعین
بیٹھے قبلہ رو جھکائے ہوئے سجدے میں شاہِ دیں
لب ہلتے دیکھے شاہ کے آیا وہ جب قریں
سمجھا کہ تشنگی سے جو صدمے گذرتے ہیں
اس وقت بد دعا مجھے شبیرؑ کرتے ہیں

جھک کر قریب کان جو لایا تو یہ سُنا
حق میں گناہ گاروں کے کرتے ہیں شہ دعا
جاری زبانِ خشک پہ یہ ہی کہ ای خدا
کر حاجتوں کو میرے محبّوں کی تو روا
شیعوں کا حشر روزِ جزا میرے ساتھ ہو
میرا یہ خوں بہا ہی کہ ان کی نجات ہو

یہ سن کے مستعد ہوا وہ شہ کے قتل پر
زانو رکھا حسینؑ کے سینہ پہ بے خطر
گردن پہ پھیرنے لگا خنجر جو بد گہر
آئی صدا علیؑ کی کہ ہی ہی مرے پسر
زہرا پکاری کچھ بھی نبی سے حجاب ہی
ظالم یہ بوسہ گاہِ رسالت مآب ہی

کیوں ذبح میرے لال کو کرتا ہی بے گناہ
کیوں کاٹتا ہی میرے کلیجے کو روسیاہ
کشتی کو اہلبیتِ نبیؐ کی نہ کر تباہ
میں فاطمہ ہوں عرش ہلا دے گی میری آہ
ہووے گا حشر قتل جو یہ بے وطن ہوا
یہ مر گیا تو خاتمۂ پنجتن ہوا

آواز اپنی ماں کی یہ زینب نے جب سنی
دوڑی نکل کے خیمہ سے سر پیٹتی ہوئی
دیکھا کہ ذبح کرتا ہی حضرت کو وہ شقی
سر پیٹکر یہ کہنے لگی وہ جگر جلی
ہی ہی نہ تین روز کے پیاسے کو ذبح کر
ظالم نہ مصطفیٰ کے نواسے کو ذبح کر

بانو پکارتی تھی یہ کیا کرتا ہی لعین
پیاسا ہی تین روز سے حیدر کا جانشین
چلاتی تھی سکینہ کہ جینے کی میں نہیں
بابا کو ذبح کرتا ہی کیوں ای عدوے دین
خنجر نہ پھیر چاند سی گردن پہ رحم کر
بابا کو چھوڑ دے مرے بچپن پہ رحم کر

زخموں سے چور چور ہی زہرا کا یادگار
جس چھاتی پر میں سوتی تھی اس پر ہی تو سوار
بابا کے حلق پر نہ پھرا اب چھری کی دھار
بدلے پدر کے سر کو مرے تن سے تو اتار
سیّد پہ تشنہ لب پہ ستم اس قدر نہ کر
پوتی ہوں فاطمہ کی مجھے تو بے پدر نہ کر

رو کر بیان یہ کرتی تھی وہ سوختہ جگر
کرتا تھا ذبح شہ کو وہاں شمر بد گہر
پانی دیا نہ ہائے نبی کے نواسے کو
آخر سرِ امامِ امم تن سے کٹ گیا
میداں سے جلد لیکے سکینہ کو گھر میں جا
مارا الظلم شمر نے پیاسے کو جان سے
بس ای انیس بزم میں ہی نالہ و فغاں
حق ہی سُنا نہیں کبھی اس حسن کا بیاں
سچ ہی کہ اس زبان کو کوئی جانتا نہیں

دیکر دہائی اہل حرم پیٹتے تھے سر
فرماتے تھے یہ شاہ کہ پیاسا ہوں رحم کر
جلّاد ذبح کرنے لگا بھوکے پیاسے کو
چلّائے فاطمہؑ نے یہ زینب کو دی صدا
بے جرم کٹ گیا ترے ماں جائے کا گلا
میں لُٹ گئی حسینؑ سدھارے جہان سے
پوچھ اُن کے دل سے جو ہیں سخن فہم نکتہ داں
گویا کہ یہ خلیق کی ہی سر بسر زباں
جو جانتا ہی اور کو وہ مانتا نہیں

مرثیہ (۲)

فرزند پیمبرؐ کا مدینے سے سفر ہے — سادات کی بستی کے اجڑنے کی خبر ہے
درپیش ہے وہ غم کہ جہاں زیر و زبر ہے — گل چاک گریباں ہیں صبا خاک بسر ہے
گل صورتِ غنچہ کمر بستہ کھڑے ہیں — سب ایک جگہ صورتِ گلدستہ کھڑے ہیں

آراستہ ہیں بہرِ سفر سرو قبا پوش — عمامے سروں پر ہیں عبائیں سرِ دوش
یاران وطن ہوتے ہیں آپس میں ہم آغوش — حیران کوئی تصویر کی صورت کوئی خاموش
منہ ملتا ہے رو کر کوئی سرور کے قدم پر — گر پڑتا ہے کوئی علی اکبرؑ کے قدم پر

عباسؑ کا منہ دیکھ کے کہتا ہے کوئی آہ! — اب آنکھوں سے چھپ جائے گی تصویر ید اللہ
کہتے ہیں گلے مل کے یہ قاسمؑ کے ہوا خواہ — واللہ دلوں پر ہے عجب صدمۂ جانکاہ
ہم لوگوں سے شیریں سخنی کون کرے گا — یہ انس یہ خلقِ حسنی کون کرے گا

روتے ہیں وہ جو عون محمدؐ کے ہیں ہمسن — کہتے ہیں کہ مکتب میں نہ جی بہلیگا تم بن
اس داغ سے چین آئے ہمیں یہ نہیں ممکن — گرمی کا مہینہ ہے سفر کے یہ نہیں دن
تم حضرت شبیرؑ کے سایہ میں پلے ہو — کیوں دھوپ کی تکلیف اٹھانے کو چلے ہو

ہمجولیوں سے کہتے تھے وہ دونوں برادر — ہاں بھائیو تم بھی ہمیں یاد آؤ گے اکثر
پالا ہے ہمیں شاہ نے ہم جائیں نہ کیونکر — ماموں رہیں جنگل میں تو اپنا ہے وہی گھر
وہ دن ہو کہ ہم حقِ غلامی سے ادا ہوں — تم بھی یہ دعا مانگو کہ ہم شہ پہ فدا ہوں

رخصت کے لیے لوگ چلے آتے ہیں باہم — ہر قلب حزیں ہے تو ہر اک چشم ہے پرنم
ایسا نہیں گھر کوئی کہ جس میں نہیں ماتم — غل ہے کہ چلا دلبرِ مخدومۂ عالم
خدام کھڑے پیٹتے ہیں قبرِ نبیؐ کے — روضہ پہ اداسی ہے رسولِ عربیؐ کے

ہے جب سے کھلا حالِ سفر بند ہے بازار
ہے جنسِ غمِ ارزاں ہے کہ روتے ہیں دوکاندار
خاک اُڑتی ہے ویرانیٔ یثرب کے ہیں آثار
ہر کوچے میں ہے شور کہ ہے ہے شہِ ابرار
اب یاں کوئی والی نہ رہا آہ ہمارا
جاتا ہے مدینے سے شہنشاہ ہمارا

تدبیرِ سفر میں ہیں اِدھر سبطِ پیمبرؐ
گھر میں کبھی آتے ہیں کبھی جاتے ہیں باہر
اسباب نکلواتے ہیں عباسؑ دلاور
تقسیم سواری کے تردد میں ہیں اکبرؑ
شہ کو جنہیں لیجانا ہے وہ پلتے ہیں گھوڑے
خالی ہوا اصطبل چلے آتے ہیں گھوڑے

حاضر درِ دولت پہ ہیں سب یاور و انصار
کوئی تو کمر باندھتا ہے اور کوئی ہتھیار
ہودج بھی کسے جاتے ہیں محمل بھی ہیں تیار
چلاتے ہیں دربان کوئی آئے نہ خبردار
ہر محمل و ہودج پہ گھٹا ٹوپ پڑے ہیں
پردے کی قناتیں لیے فراش کھڑے ہیں

عوراتِ محلہ چلی آتی ہیں بصد غم
کہتی ہیں یہ دن رحلتِ زہراؑ سے نہیں کم
پُرسے کی طرح رونیکا غل ہوتا ہے ہر دم
فرش اُٹھتا ہے کیا بچھتی ہے گویا صفِ ماتم
غل ہوتا ہے ہر سمت جدا ہوتی ہے زینب
ہر اک کے گلے ملتی ہے اور روتی ہے زینب

لے لے کے بلائیں یہی سب کرتی ہیں تقریر
اس گرمی کے موسم میں کہاں جاتے ہیں شبیرؑ
سمجھاتی نہیں بھائی کو اے شاہ کی ہمشیر
مسلم کا خط آلے تو کریں کوچ کی تدبیر
للہ ابھی قبرِ پیمبرؐ کو نہ چھوڑیں
گھر فاطمہ زہرا کا ہے اس گھر کو نہ چھوڑیں

وہ گھر ہے ملک رہتے تھے جس گھر کے نگہبان
کیوں اپنے بزرگوں کا مکاں کرتے ہیں ویران
کوفے کی بھی خلقت تو نہیں صاحبِ ایمان
بی بی یہ مدینے کی تباہی کا ہے سامان
ایک ایک شقی دشمنِ اولادِ علیؑ ہے
شمشیرِ ستم واں سرِ حیدر پہ چلی ہے

اُجڑے گا مدینہ جو یہ گھر ہوئے گا خالی
بربادیِ یثرب کی بنا چرخ نے ڈالی
کیا جانیں پھر آئیں کہ نہ آئیں شہِ عالی
حضرت کے سوا کون ہے اس شہر کا والی
زہرا ہیں نہ حیدر نہ پیمبر نہ حسنؑ ہیں
اب اُن کی جگہ آپ ہی یا شاہِ زمن ہیں

گرمی کے یہ دن اور پہاڑوں کا سفر آہ
رستے کی مشقت سے کہاں ہیں ابھی آگاہ
قطرہ بھی دمِ تشنہ دہانی نہیں ملتا
مُنہ دیکھ کے اصغر کا چلا آتا ہے رونا
جھولا یہ کہاں اور کہاں نرم بچھونا
کیا ہوگا جو میدان میں ہوا گرم چلے گی

ان بیبیوں سے کہتی تھی یہ شاہ کی ہمشیر
اس شہر میں رہنا نہیں ملتا کسی تدبیر
مجھکو بھی ہے سنج ایسا کہ کچھ کہہ نہیں سکتی
اماں کی لحد چھوڑ کے میں یاں سے نجاتی
بھائی کی طرف دیکھ کے شق ہوتی ہے چھاتی
ظاہر میں تو مابین لحد سوتی ہیں اماں

ہے روح پہ اماں کے قلق کرتی ہیں زاری
روداد بیاں کرگئی ہیں مجھ سے وہ ساری
غمخوار ہے تو اور خدا حافظِ جاں ہے
یاد آتی ہے ہر دم مجھے اماں کی وصیت
آہستہ یہ فرماتی تھیں با صد غم و حسرت
اُس دن مری تربت سے بھی منہ موڑیو زینب

اماں کی وصیت کو بجا لاؤں نہ کیوں کر
دو بہنیں ہیں ماں جائیاں اور ایک برادر
جو ہوئے سو ہو بھائی کے ہمراہ ہے زینب

ان چھوٹے سے بچوں کا نگہبان ہے اللہ
ان کو تو نہ لیجائیں سفر میں شہ ذیجاہ
کوسوں تلک اس راہ میں پانی نہیں ملتا
آرام سے مادر کی کہاں گود میں سونا
لکھا تھا اسی سن میں مسافر انھیں ہونا
یہ پھول سے کمھلائیں گے ماں ہاتھ ملے گی

بہنوں ہیں زینب سے یہ بھائی ہے تقاریر
یہ خط پہ خط آئے ہیں کہ مجبور ہیں شبیرؑ
بھائی سے جدا ہو کے مگر رہ نہیں سکتی
فاقے بھی اگر ہوتے تو غم اُس کا نہ کھاتی
نے جائے مجھے بات کوئی بن نہیں آتی
ہیں خواب میں جب دیکھتی ہوں روتی ہیں اماں

مرتے ہیں میں نے انھیں دیکھا کئی باری
فرماتی تھیں بھائی سے خبردار ہیو واری
نہ باپ ہے سر پر مرے بچے کے نہ ماں ہے
کچھ جان کی تھی فکر نہ اُن کو دمِ رحلت
شبیرؑ سدھائے جو سوئے وادیٔ غربت
اس بھائی کو تنہا نہ کبھی چھوڑیو زینب

گھر بھائی سے تھا بھائی نہ ہوئے تو کہاں گھر
رسی سے بندھیں ہاتھ کہ بلوے میں کھلیں سر
اس کوچ کے انجام سے آگاہ ہے زینب

یہ کہتی تھی زینبؑ کہ پکارے شہِ عادل
تیار ہیں دروازے پہ سب ہودج و محمل
طے شام تلک ہو گی کہیں آج کی منزل
رخصت کرو لوگوں کو بس اب رونے سے حاصل
چلتی ہے ہوا سرد ابھی وقتِ سحر ہے
بچے کئی ہمراہ ہیں گرمی کا سفر ہے

رخصت کرو اُن کو کہ جو ہیں ملنے کو آئے
کہہ دو کوئی گہوارۂ اصغرؑ کو بھی لائے
نادان سکینہ ہے کہیں آنسو نہ بہائے
جانے کی خبر میری نہ صغرا کہیں پائے
ڈر ہے کہیں گھبرا کے دم اُس کا نہ نکل جائے
باتیں کرو ایسی کہ وہ بیمار بہل جائے

رخصت کو ابھی قبرِ پیغمبرؐ پہ ہے جانا
کیا جانیے پھر ہو کہ نہ ہووے مرا آنا
اماں کی لحد پر ہے ابھی اشک بہانا
اُس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لیے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

سُن کر یہ سخن بانوئے ناشاد پکاری
میں لُٹتی ہوں کیسا سفر اور کیسی سواری
غش ہو گئی ہے فاطمہ صغرا مری پیاری
کس کے لیے کرتے ہیں سب گریہ و زاری
اب کس پہ میں اس صاحبِ آزار کو چھوڑوں
اس حال میں کس طرح سے بیمار کو چھوڑوں

ماں ہوں میں کلیجہ نہیں سینہ میں سنبھلتا
صاحب مرے دل کو ہے کوئی ہاتھوں سے ملتا
میں تو اُسے لے چلتی پہ کچھ بس نہیں چلتا
رہ جاتی جو بہنیں بھی تو دم اُس کا بہلتا
دروازے پہ تیار سواری تو کھڑی ہے
پر اب تو مجھے جان کی صغرا کی پڑی ہے

چلاتی تھی کبرا کہ بہن آنکھیں تو کھولو
کہتی تھی سکینہ کہ ذرا مُنہ سے تو بولو
ہم جاتے ہیں تم اُٹھ کے بغلگیر تو ہو لو
چھاتی سے لگو باپ کی دل کھول کے رو لو
تم جن کی ہو شیدا وہ برادر نہ ملے گا
پھر گھر میں جو ڈھونڈو گی تو اکبر نہ ملے گا

ہشیار ہو کیا صبح سے بے ہوش ہو خواہر
اصغر کو کرو پیار کلیجے سے لگا کر
چھاتی سے لگو اُٹھ کے کھڑی روتی ہے مادر
ہم روتے ہیں دیکھو تو ذرا آنکھ اُٹھا کر
افسوس اِسی طور سے غفلت میں رہو گی
کیا آخری بابا کی زیارت نہ کرو گی

سن کر یہ سخن شاہ کے آنسو نکل آئے
بیمار کے نزدیک گئے سر کو جھکائے
منہ دیکھ کے بانو کا سخن لب پہ یہ لائے
کیا ضعف و نقاہت ہے خدا اس کو بچائے
جس صاحبِ آزار کا یہ حال ہو گھر میں
دانستہ میں کیونکر اُسے لیجاؤں سفر میں

کہکر یہ سخن بیٹھ گئے سیّد خوش خو
اور سورۂ الحمد پڑھا تھام کے بازو
بیمار نے پائی گلِ زہرا کی جو خوشبو
آنکھوں کو تو کھولا پہ ٹپکنے لگے آنسو
ماں سے کہا مجھ میں جو حواس آئے ہیں امّاں
کیا میرے مسیحا مرے پاس آئے ہیں امّاں

ماں نے کہا ہاں ہاں وہی آئے ہیں مری جاں
جو کہنا ہے کہلو کہ یہاں اور ہے ساماں
دیکھو تو ادھر روتی ہیں بی بی شہِ ذیشاں
صغرا نے کہا اُن کی محبت کے میں قرباں
وہ کونسا ساماں ہے جو یوں روتے ہیں بابا
کُھلکر کہو کیا مجھ سے جدا ہوتے ہیں بابا

یہ گھر کا سب اسباب گیا کس سبب باہر
نہ فرش نہ ہے مسندِ فرزندِ پیمبر
دالان سے کیا ہو گیا گہوارۂ اصغر
اُجڑا ہوا لوگو نظر آتا ہے مجھے گھر
کچھ منہ سے تو بولو مرا دم گھٹتا ہے اماں
کیا سبطِ پیمبر سے وطن چھٹتا ہے اماں

شبیر کا منہ تکنے لگی بانوے مغموم
صغرا کے لیے رونے لگیں زینب و کلثوم
بیٹی سے یہ فرمانے لگے سیّدِ مظلوم
پردہ رہا اب کیا تمھیں خود ہو گیا معلوم
تم چھٹتی ہو اس واسطے سب روتے ہیں صغرا
ہم آج سے آوارۂ وطن ہوتے ہیں صغرا

اب شہر میں اک دم ہے ٹھہرنا مجھے دشوار
میں پا بہ رکاب اور ہو تم صاحبِ آزار
پھر آتا ہے وہ گھر میں سفر میں جو ہو بیمار
تکلیف تمھیں دوں یہ مناسب نہیں زنہار
غربت میں بشر کے لیے سو طرح کا ڈر ہے
میرا تو سفر رنج و مصیبت کا سفر ہے

لو چلتی ہے خاک اُڑتی ہے گرمی کے ہیں ایام
جنگل میں نہ راحت نہ کہیں راہ میں آرام
بستی میں کہیں صبح تو جنگل میں کہیں شام
دریا کہیں حائل کہیں پانی کا نہیں نام
صحت میں گوارا ہے جو تکلیف گزر جائے
اس طرح کا بیمار نہ مرتا ہو تو مر جائے

صغرا نے کہا کھانے سے خود ہی مجھے انکار
کچھ بھوک کا شکوہ نہیں کرنے کی یہ بیمار
گرمی میں بھی راحت سے گزر جائے گی بابا
کیا تاب اگر منہ سے کہوں درد ہی سر میں
بھولے سے بھی شب کو نہ کراہونگی سفر میں
ہو جانا خفا راہ میں گر روے گی صغرا

وہ بات نہ ہوگی کہ جو بیچین ہوں مادر
دن بھر مری گودی میں رہینگے علی اصغر
میں یہ نہیں کہتی کہ عماری میں بٹھا دو
شہ بولے کہ واقف ہی مرے حال سے اللہ
کھل جائے گا یہ راز بھی گو تم نہیں آگاہ
ناچار یہ فرقت کا الم سہتا ہوں صغرا

ای نور بصر آنکھوں پہ لیکر تجھے چلتا
تپ ہی تجھے اور غم سے جگر ہی مرا جلتا
جز ہجر علاج اور کوئی ہو نہیں سکتا
منہ تکنے لگی ماں کا وہ بیمار بصد غم
ماں کہتی تھی مختار ہیں بی بی شہ عالم
وہ درد ہی جس درد سے چارا نہیں صغرا

صغرا نے کہا کوئی کسی کا نہیں نہار
اللہ نہ وہ آنکھ کسی کی ہی نہ وہ پیار
بیزار ہیں سب ایک بھی شفقت نہیں کرتا

پانی جو کہیں راہ میں مانگوں تو گنہگار
تبرید فقط آپ کا ہی شربت دیدار
آئے گا پسینہ تپ اُتر جائے گی بابا
اُف تک نہ کروں بھڑکے اگر آگ جگر میں
قربان گئی چھوڑ نہ جاؤ مجھے گھر میں
یاں نیند کب آتی ہی جو واں سوے گی صغرا

ہر صبح میں پیلوں گی دوا آپ بنا کر
لونڈی ہوں سکینہ کی نہ سمجھو مجھے دختر
بابا مجھے فضہ کی سواری میں بٹھا دو
میں کہہ نہیں سکتا مجھے درپیش ہی جو راہ
ایسا بھی کوئی ہی جسے بیٹی کی نہ ہو چاہ
ہی مصلحت حق یہی جو کہتا ہوں صغرا

تو مجھ سے بہلتی مرا دل تجھ سے بہلتا
پہ ضعف کہ دم تک نہیں سینے میں سنبھلتا
دانستہ تمھیں ہاتھ سے میں کھو نہیں سکتا
چتون سے عیاں تھا کہ چلیں آپ مرے ہم
میرے تو کلیجے پہ چھری چلتی ہی اس دم
تقدیر سے کچھ زور ہمارا نہیں صغرا

سب کی یہی مرضی ہی کہ مرجاے یہ بیمار
اک ہم ہیں کہ ہیں سب پہ فدا سب ہیں غمخوار
سچ ہی کوئی مردے سے محبت نہیں کرتا

ہمشیر کے عاشق ہیں سلامت رہیں اکبر
اتنا نہ کہا مر گئی یا جیتی ہے خواہر
میں گھر میں تڑپتی ہوں وہ ہیں صبح سے باہر
وہ کیا کریں برگشتہ ہے اپنا ہی مقدر
پوچھا نہ کسی نے کہ وہ بیمار کدھر ہے
نہ بھائیوں کو دھیان نہ بہنوں کو خبر ہے

کیا ان کو پڑی تھی جو وہ غم کھانے کو آتے
ہیں کون جو صورت مجھے دکھلانے کو آتے
ہوتی جو غرض چھاتی سے لپٹانے کو آتے
زلفیں جو الجھتیں تو سلجھوانے کو آتے
کل تک تو مرے حال پریشاں پہ نظر تھی
تقدیر کے اس پیچ کی مجھکو نہ خبر تھی

مانوس سکینہ سے ہیں عباس دلاور
میں کون ہوں جو میری خبر پوچھتے آکر
سرسبز رہے خلق میں نوبادۂ شبیر
شادی میں بلائیں مجھے یہ بھی نہیں باور
بے دولہ بنے منہ کو چھپاتے ہیں ابھی سے
میں جیتی ہوں اور آنکھ چراتے ہیں ابھی سے

کس سے کہوں اس دکھ کو میں بیکس و رنجور
بہنیں بھی الگ مجھ سے ہیں اور بھائی بھی ہیں دور
اماں کا سخن یہ ہے کہ بیٹی میں ہوں مجبور
ہمراہ ہے بیمار کسی کو نہیں منظور
دنیا سے سفر رنج و مصیبت میں لکھا تھا
تنہائی کا مرنا مری قسمت میں لکھا تھا

سب بی بیاں رونے لگیں سن سن کے یہ تقریر
چھاتی سے لگا کر اسے کہنے لگے شبیر
لو صبر کرو کوچ میں اب ہوتی ہے تاخیر
منہ دیکھ کے چپ رہ گئی وہ بیکس و دلگیر
نزدیک تھا دل چیر کے پہلو نکل آئے
اچھا تو کہا منہ سے پہ آنسو نکل آئے

بانو کو اشارہ کیا حضرت نے کہ جاؤ
اکبر کو بلاؤ علی اصغر کو بھی لاؤ
آئے علی اکبر تو کہا شاہ نے آؤ
روٹھی ہے بہن تم سے گلے اس کو لگاؤ
چلتے ہوئے جی بھر کے ذرا پیار تو کر لو
لینے انھیں کب آؤ گے اقرار تو کر لو

پاس آن کے اکبر نے کی یہ پیار کی تقریر
کیا مجھ سے خفا ہو گئیں صغرا مری تقصیر
چلانے لگی چھاتی پہ منہ رکھ کے وہ دلگیر
محبوب برادر ترے قربان یہ ہمشیر
صدقے ترے سر پہ سے اتارے مجھے کوئی
بل کھائی ہوئی زلفوں پہ وارے مجھے کوئی

رخساروں پہ سبزے کے نکلنے کے میں صدقے
افسوس سے ان ہاتھوں کے ملنے کے میں صدقے
جلد اُن کے بھینا کی خبر لیجیو بھائی

لکھنا مجھے نسبت کا اگر ہو کہیں سامان
اور مر گئی پیچھے تو رہے دل میں سب ارمان
خوشنود مری روح کو کر دیجیو بھائی

پیارے مرے بھیا مرے مہرو علی اکبرؑ
یاد آئے گی یہ جسم کی خوشبو علی اکبرؑ
دل سینے میں کیونکر تہ و بالا نہ رہے گا

کیا گزرے گی جب گھر سے چلے جاؤ گے بھائی
تشریف خدا جانے کب لاؤ گے بھائی
کیا دم کا بھروسا کہ چراغ سحری ہیں

ہاں سچ ہے کہ بیمار کا بہتر نہیں جانا
بھیا جواب آنا تو مری قبر پہ آنا
کیا لطف کسی کو نہیں گر چاہ ہماری

مرنا تو مقدم ہے غم اس کا نہیں زنہار
قبلہ کی طرف کون کرے گا رخ بیمار
سانس اُکھڑے گی جس وقت تمہیں یاد کروں گی

ماں بولی یہ کیا کہتی ہے صغرا ترے قربان
بیکس مری بچی ترا اللہ نگہبان
کیا بھائی جدا بہنوں سے ہوتے نہیں بیٹا

تلواریں لیے شان سے چلنے کے میں صدقے
کیوں روتے ہو تم آنکھوں کے ڈھلنے کے میں صدقے
بے میرے کہیں بیاہ نہ کر لیجیو بھائی

حق دار ہوں میں نیگ کا ہے مجھ کو بھی دھیان
لے آنا دلہن کو مری تربت پہ میں قربان
حق نیگ کا تم قبر پہ دھر دیجیو بھائی

چھپ جائیں گے آنکھوں سے یہ گیسو علی اکبر
ڈھونڈھیں گی یہ آنکھیں تمہیں ہر سو علی اکبر
جب چاند چھپے گا تو اُجالا نہ رہے گا

کیسے مجھے ہر بات میں یاد آؤ گے بھائی
کی دیر تو جیتا نہ ہمیں پاؤ گے بھائی
تم آج مسافر ہو تو ہم کل سفری ہیں

صحت سے جو ہیں ان میں کہاں میرا ٹھکانا
ہم گور کی منزل کی طرف ہوں گے روانا
وہ راہ تمہاری ہے تو یہ راہ ہماری

دھڑکا ہے کہ جب ہوں گے عیاں موت کے آثار
یٰسین بھی پڑھنے کو نہ ہوگا کوئی غمخوار
میں ہچکیاں لے لے کے تمہیں یاد کروں گی

گھبرا کے نہ اب تن سے نکل جائے مری جان
صحت ہو تجھے میری دعا ہے یہی ہر آن
کنبے کے لیے جان کو کھوتے نہیں بیٹا

میں صدقے گئی بس نکرو گریہ وزاری
صغرا مرا روتا ہے صدا سن کے تمہاری
وہ کانپتے ہاتھوں کو اٹھا کر یہ پکاری
آ اے مرے ننھے سے مسافر ترے واری
چھٹتی ہے یہ بیمار بہن جان گئے تم
صغرا مری آواز کو پہچان گئے تم

تم جاتے ہو اور ساتھ بہن جا نہیں سکتی
تب ہی تمہیں چھاتی سے میں لپٹا نہیں سکتی
جو دل میں ہے لب پر وہ سخن لا نہیں سکتی
رکھ لوں تمہیں اماں کو بھی سمجھا نہیں سکتی
بیکس ہوں مرا کوئی مددگار نہیں ہے
تم ہو سو تمہیں طاقت گفتار نہیں ہے

معصوم نے جس دم یہ سنی درد کی گفتار
صغرا کی طرف ہاتھوں کو لٹکا دیا اک بار
لے لے کے بلائیں یہ لگی کہنے وہ بیمار
جھک جھک کے دکھاتے ہو مجھے آخری دیدار
دنیا سے کوئی دن میں گزر جائے گی صغرا
تم بھی یہ سمجھتے ہو کہ مر جائے گی صغرا

عباس نے اتنے میں یہ ڈیوڑھی سے پکارا
چلنے کے لیے قافلہ تیار ہے آقا
لپٹا کے گلے فاطمہ صغرا کو دوبارا
اٹھے شہ دیں گھر تہ و بالا ہوا سارا
جس چشم کو دیکھا سو وہ پرنم نظر آئی
اک مجلس ماتم تھی کہ برہم نظر آئی

بیت الشرف خاص سے نکلے شہ ابرار
روتے ہوئے ڈیوڑھی پہ گئے عترت اطہار
فراشوں کو عباسؑ پکارے یہ بہ تکرار
پردے کی قناتوں سے خبردار خبردار
باہر حرم آتے ہیں رسولِ دوسرا کے
شقہ کوئی جھک جائے نہ جھونکے سے ہوا کے

لڑکا بھی جو کوٹھے پہ چڑھا ہو وہ اتر جائے
آتا ہو ادھر جو وہ اسی جا پہ ٹھہر جائے
ناقے پہ بھی کوئی نہ برابر سے گزر جائے
دیتے رہو آواز جہاں تک کہ نظر جائے
مریمؑ سے سوا حق نے شرف ان کو دیے ہیں
افلاک پہ آنکھوں کو ملک بند کیے ہیں

عباسِ علی سے علی اکبر نے کہا تب
ہیں قافلہ سالار حرم حضرتِ زینب
پہلے ہوں وہ اسوار تو محمل میں چڑھیں سب
حضرت نے کہا ہاں یہی میرا بھی ہے مطلب
گھر میں مرے زہرا کی جگہ بنتِ علی ہے
میں جانتا ہوں ماں مرے ہمراہ چلی ہے

پہونچی جو ہیں ناقے کے قریں دخترِ حیدرؑ
خود ہاتھ پکڑنے کو بڑھے سبطِ پیمبر
فضہ تو سنبھالے ہوئے تھی گوشۂ چادر
تھے پردۂ محمل کو اٹھائے علی اکبرؑ
فرزند کمربستہ چپ و راس کھڑے تھے
نعلین اٹھا لینے کو عباس کھڑے تھے

اک دن تو مہیا تھا یہ سامانِ سواری
اک روز تھا وہ گرد تھے نیزے لیے ناری
محمل تھا نہ ہودج نہ کجاوہ نہ عماری
بے پردہ تھی وہ حیدرِ کرار کی پیاری
ننھے کئی بچوں کے گلے ساتھ بندھے تھے
تھے بال کھلے چہروں پہ اور ہاتھ بندھے تھے

زینت دہِ محمل جو ہوئی دخترِ زہرا
ناقوں پہ چڑھے سب حرمِ سید والا
آنے لگے رہوار کھلا گرد کا پردا
عباسؑ سے بولے یہ شہِ یثرب و بطحا
صدمہ ہے بچھڑنے کا مرے روحِ نبیؐ پر
رخصت کو چلو قبرِ رسولِ عربیؐ پر

ہے قبر پہ نانا کے مقدم مجھے جانا
کیا جانیئے پھر ہو کہ نہ ہو شہر میں آنا
اماں کی ہے تربت پہ ابھی اشک بہانا
اس مرقدِ انور کو ہے آنکھوں سے لگانا
آخر تو لیے جاتی ہے تقدیر وطن سے
چلتے ہوئے ملنا ہے ابھی قبرِ حسنؑ سے

پیدل شہِ دیں روضۂ احمدؐ پہ سدھارے
تربت سے صدا آئی کہ آؤ مرے پیارے
تعویذ سے شبیرؑ لپٹ کر یہ پکارے
ملتا نہیں آرام نواسے کو تمھارے
خط کیا ہیں اجل کا یہ پیام آیا ہے نانا
آج آخری رخصت کو غلام آیا ہے نانا

خادم کو کہیں امن کی اب جا نہیں ملتی
راحت کوئی ساعت مرے مولا نہیں ملتی
دکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں ملتی
ہیں آپ جہاں راہ وہ اصلا نہیں ملتی
پابندِ مصیبت ہوں گرفتارِ بلا ہوں
خود پاؤں سے اپنے طرفِ قبر چلا ہوں

میں اک تنِ تنہا ہوں ستمگار ہزاروں
اک جان ہے اور درپئے آزار ہزاروں
اک پھول سے رکھتے ہیں خلش خار ہزاروں
اک سر ہے فقط اور خریدار ہزاروں
واں جمع کئی شہر کے خونریز ہوئے ہیں
خنجر مری گردن کے لیے تیز ہوئے ہیں

فرمائیے اب جائے کدھر آپ کا شبیرؑ
یاں قید کی ہے فکر اُدھر قتل کی تدبیر
تیغیں ہیں کہیں میرے لیے اور کہیں زنجیر
خونریزی کو کعبہ تلک آپہونچے ہیں بے پیر
بچ جاؤں جو پاس اپنے بلا لیجیے نانا
تربت میں نواسے کو چھپا لیجیے نانا

یہ کہہ کے ملا قبر سے شہ نے جو رخِ پاک
ہلنے لگا صدمے سے مزارِ شہِ لولاک
جنبش جو ہوئی قبر کو تھرا گئے افلاک
کانپی جو زمیں صحنِ مقدس میں اُڑی خاک
اُس شور میں آئی یہ صدا روضۂ جد سے
تم آگے چلو ہم بھی نکلتے ہیں لحد سے

باتوں نے تری دل کو مرے کر دیا مجروح
تو شہر سے جاتا ہے تڑپتی ہے مری روح
بے تیغ کیا خنجرِ غم نے ترے مذبوح
ہے کشتیٔ امت پہ تباہی کہ چلا نوحؑ
افلاکِ امامت کا کبھی بدر نہ سمجھے
بے قدر ہیں ظالم کہ تری قدر نہ سمجھے

مارا گیا جس روز سے شبرؑ مرا پیارا
اُس روز سے ٹکڑے ہے کلیجہ مرا سارا
اب قتل میں ہوتا ہوں ترے ساتھ دوبارا
امت نے کیا پاسِ ادب خوب ہمارا
زہرا کی جو بستی کو اجاڑیں تو عجب کیا
اعدا مجھے تربت سے اکھاڑیں تو عجب کیا

اِس ذکر پہ رویا کیے شہ سر کو جھکائے
واں سے جو اُٹھے فاطمہؑ کی قبر پہ آئے
پائینِ لحد گر کے بہت اشک بہائے
آواز یہ آئی کہ میں صدقے مرے جائے
ہے شور ترے کوچ کا جس دن سے وطن میں
پیارے میں اسی دن سے تڑپتی ہوں کفن میں

تربت میں جو کی میں نے بہت گریہ و زاری
گھبرا کے علیؑ آئے نجف سے کئی باری
کہتے تھے کہ ای احمدِ مختار کی پیاری
تم پاس ہو تربت ہے بہت دور ہماری
گھر لٹتا ہے کیونکر ہمیں چین آئے گا زہراؑ
کیا ہم سے نہ رخصت کو حسینؑ آئے گا زہراؑ

میں نے جو کہا قبر سے کیوں نکلے ہو باہر
نہ سر پہ عمامہ ہے نہ ہے دوش پہ چادر
فرمایا کہ ماتم میں ہوں اے بنتِ پیمبر
مرنے کو پسر جاتا ہے برباد ہوا گھر
ترسیں گے وہ پانی کو جو نازوں کے پلے ہیں
تلواریں ہیں اب اور مرے بچوں کے گلے ہیں

پھرتا ہے مری آنکھوں میں شبیرؑ کا مقتل
وہ نہرِ فرات اور کئی کوس کا جنگل
وہ بجلیاں تلواروں کی اور شام کا بادل
دریا سے وہ پیاسوں کے ہٹا دینے کی ہلچل
شبیرؑ کے سر پر سے یہ آفت نہ ٹلے گی
دسویں کو محرم کی چھری مجھ پہ چلے گی

سُن کر یہ بیان باپ کا مادر کی زبانی
رو رو کے پکارا اسد اللہ کا جانی
ہاں والدہ سچ ہے نہ ملے گا مجھے پانی
پیاسے ہیں مرے خون کے یہ ظلم کے بانی
بچپن میں کیا تھا مرا ماتم شہِ دیں نے
نانا کو خبر دی تھی مری روحِ امیں نے

پہلو میں جو تھی فاطمہ کے تربتِ شبرؑ
اُس قبر سے پلٹے یہ محبت شہِ صفدر
چلائے کہ شبیرؑ کی رخصت ہے برادر
حضرت کو تو پہلو ہوا اماں کا میسر
قبریں بھی جدا ہیں نہ افلاک ہماری
دیکھیں ہمیں لیجائے کہاں خاک ہماری

یہ کہہ کے چلے قبرِ حسن سے شہِ مظلوم
رہوار جو مانگا تو سواری کی ہوئی دھوم
یاران وطن گرد تھے افسردہ و مغموم
چلاتے تھے خادم کہ چلا خلق کا مخدوم
خالی ہوا گھر آج رسولِ عربی کا
تابوت اسی دھوم سے نکلا تھا نبیؐ کا

جب اُٹھ گئی تھیں خلق سے مخدومۂ عالم
سر پیٹتے تھے لوگ اسی طرح سے باہم
برپا تھا جنازہ پہ علیؑ کے یونہیں ماتم
تھا رحلتِ شبرؑ میں محبّوں کو یہی غم
بس آج سے نے وارث و والی ہے مدینہ
اب پنجتنِ پاک سے خالی ہے مدینہ

چلاتی تھیں رانڈیں کہ چلی شہ کی سواری
لے گا خبر اب کون مصیبت میں ہماری
آنکھوں سے یتیموں کے دُرِ اشک تھے جاری
مضطر تھے اپاہج ضعفا کرتے تھے زاری
کہتے تھے گدا ہم کو غنی کون کرے گا
محتاجوں کی فاقہ شکنی کون کرے گا

تھا ناکے تلک شہر کے اک شورِ قیامت
سمجھاتے ہوئے سب کو چلے جاتے تھے حضرت
رو رو کے وہ کہتا تھا جسے کرتے تھے رخصت
پائیں گے کہاں ہم یہ غنیمت ہے زیارت
آخر تو بچھڑ کر کفِ افسوس ملیں گے
دس بیس قدم اور بھی ہمراہ چلیں گے

قسمیں انھیں دے دے کے کہا شہ نے کہ جاؤ
اللہ کو سونپا تمھیں آنسو نہ بہاؤ
اُس بیکس و تنہا کی خبر پوچھتے رہنا
روتے ہوئے وہ لوگ پھرے شاہ سدھارے
کس شوق سے مردانِ حق آگاہ سدھارے
اُترے نہ مسافر کسی مخلوق کے گھر میں

روشن ہوئی کعبہ کی زمیں نورِ خدا سے
جھک جھک کے ملے سبطِ پیمبر غربا سے
خوش ہو کے ہوا خواہ یہ کہتے تھے علی کے
کعبہ میں بھی اک دن نہ ملا شاہ کو آرام
اعدا نے گزرنے نہ دیے حج کے بھی ایام
عازم طرفِ راہِ الٰہی ہوئے حضرت

جاتے تھے دل افسردہ و غمگین شہ ابرار
قبریں نظر آتیں کسی صحرا میں جو دو چار
جز خاک نہ ہوئے گا نشاں بھی بدنوں کا
احباب کہیں گھر ہیں کہیں آپ کہیں ہیں
خالی ہیں مکاں آپ تہِ خاک مکیں ہیں
حسرت یہ رہی ہوگی کہ پہونچے نہ وطن میں

باتیں تھیں یہی پاس کی اور دور کی تقریر
شب کو کہیں اُترے تو سحر کو ہوئے رہ گیر
مقتل کا یہ تھا شوق شہ جن و بشر کو
تکلیف تمھیں ہوتی ہے اب ساتھ نہ آؤ
پھرنے کے نہیں ہم سے بس اب ہاتھ اُٹھاؤ
یارو مری صغرا کی خبر پوچھتے رہنا

جو صاحبِ قسمت تھے وہ ہمراہ سدھارے
عابد طرفِ خانۂ اللہ سدھارے
عاشق کو کشش لے گئی معشوق کے گھر میں
مکہ نے شرف اور بھی پایا شرفا سے
آباد ہوا شہر نمازوں کی صدا سے
سب باپ کی خو بو ہے نواسے ہیں نبیؐ کے

کوفے سے چلے آتے تھے نامے سحر و شام
کھولا پسرِ فاطمہؑ نے باندھ کے احرام
تھی ہشتم ذی الحجہ کہ راہی ہوئے حضرت
ہر گام پہ ہوتے تھے عیاں موت کے آثار
فرماتے تھے شہ فاعتبروا یا اولی الابصار
انجام یہ ہے ہم سے غریب الوطنوں کا

آگے تو زمیں پر تھے پر اب زیرِ زمیں ہیں
جو دور نہ رہتے تھے وہ اب پاس نہیں ہیں
کیا منہ کو لپیٹے ہوئے سوتے ہیں کفن میں
منزل پہ بھی آرام سے سوتے تھے نہ شبیرؑ
جلدی تھی کہ ہو جائے شہادت میں نہ تاخیر
جس طرح سے ڈھونڈے کوئی معشوق کے گھر کو

ملتا تھا کوئی مرد مسافر جو سر راہ
یوں پوچھتے تھے اس سے بحسرت شہ ذیجاہ

ایسا کوئی صحرا بھی ہے ای بندۂ اللہ
اک نہر سوا جس میں ہو چشمہ نہ کوئی چاہ

کیا ملتا ہے اُس دشت میں اور کیا نہیں ملتا
ہم ڈھونڈتے پھرتے ہیں وہ صحرا نہیں ملتا

وہ عرض یہ کرتا تھا کہ سبط شہ لولاک
ہے سخت پر اندوہ وہ صحرا تہ افلاک

ہنستا ہوا واں جائے تو ہو جاتا ہے غمناک
سنتا ہوں وہاں دن کو اڑاتا ہے کوئی خاک

واں راتوں کو آتی ہے صدا سینہ زنی کی
درویش کی مسکن ہے سکونت نہ غنی کی

چلاتی ہے عورت کوئی ہے ہے مرے فرزند
اس دشت میں ہو جائے گا تو خاک کا پیوند

تلواروں سے ٹکڑے نہیں ہونگے ترے دلبند
پانی نہیں ہو جائے گا بچوں پہ ترے بند

پیارے تو اسی خاک پہ گھوڑے سے گریگا
ہے ہے یہ نہیں خنجر تری گردن پہ پھرے گا

اک شیر ترائی میں یہ چلاتا ہے دن رات
کٹ جائیں گے یاں ہاتھ مرے لال کے ہیہات

کیا حال کہوں نہر کا اے شاہ خوش اوقات
پانی تو نہیں شور پہ مشہور ہے یہ بات

طائر بھی دم تشنہ دہانی نہیں پیتے
وحشی کبھی واں آن کے پانی نہیں پیتے

اُس جا نہ اُترتا ہے نہ دم لیتا ہے رہ گیر
ہے شور کہ اس آب میں ہے آگ کی تاثیر

پیاسوں کے لیے اس کی ہر اک موج ہے شمشیر
اس طرح ہوا چلتی ہے جس طرح چلیں تیر

بجھتی نہیں واں پیاس کسی تشنہ گلو کی
بو آتی ہے اُس نہر کے پانی میں لہو کی

اُس شخص سے یہ کہہ کے چلے قبلۂ عالم
اللہ نے چاہا تو بسائیں گے اُسے ہم

عاشق پہ بلا بعد بلا آتی ہے ہر دم
غم اور بڑھا وصل کا عرصہ جو رہا کم

آفت یہ نئی فوج شہنشاہ میں آئی
مسلم کی شہادت کی خبر راہ میں آئی

غربت میں نہ ماتم کی سنائے خبر اللہ
طاری ہوا حضرت پہ عجب صدمہ جانکاہ

گوندھے ہوئے سر کھول کے پیٹے حرم شاہ
فرماتے تھے شہ سب کو ہے درپیش یہی راہ

ہوگا وہی اللہ کو جو مد نظر ہے
آج اُن کا ہوا کوچ کل اپنا بھی سفر ہے

وارث کے لیے زوجۂ مسلم کا تھا یہ حال
روتے تھے بہن کے لیے عباسِ خوش اقبال
پوچھو تو کدھر وہ مرے پیارے گئے دونو
محمل تھے سب اُس بی بی کے ہودج کے برابر
گھبرا گئی تھی مسلمؑ مظلوم کی دختر
کیوں بیٹھی ہو کون جدا ہو گیا اماں
اُس دن سے تو اک ابرِ ستم فوج پہ چھایا
رستے میں ابھی تھا اسد اللہ کا جایا
سب نے مہِ نو لشکرِ شبیرؑ میں دیکھا
خویش و رفقا چاند کی تسلیم کو آئے
یہ چاند مبارک ہو ید اللہ کے جائے
رتبہ مہ و خورشید سے بالا رہے تیرا
حضرتؑ نے دعا پڑھ کے یہ کی حق سے مناجات
سر دینے کا مشتاق ہوں عالم ہے زمافات
باقی ہیں جو راتیں وہ عبادت میں بسر ہوں
پہونچا دے مجھے جلد بس اے خالقِ افلاک
طالب ہے ترے قرب کا سبطِ شہِ لولاک
بیتاب ہے دل صبر کا یارا نہیں مجھ کو
اتنے میں یہ فضہ علی اکبرؑ کو پکاری
عادت ہے کہ وہ دیکھتی ہیں شکل تمہاری
آئے تو رخِ اکبرؑ ذیقدر کو دیکھوں

محمل سے گری پڑتی تھی بکھرائے ہوئے بال
وہ کہتی تھی ساتھ آئے تھے چھوٹے مرے دو لال
فرماتے تھے شبیرؑ کہ مارے گئے دونو
تھا شور کہ بیوہ ہوئی شبیرؑ کی خواہر
ہر بار یہی پوچھتی تھی ماں سے لپٹ کر
غربت میں مرے باپ پہ کیا ہو گیا اماں
کھانا کئی دن قافلہ والوں نے نہ کھایا
جو چاند محرم کا فلک پر نظر آیا
منہ شاہ نے آئینۂ شمشیر میں دیکھا
مجرے کو جھکے اور سخن لب پہ یہ لائے
کفار پہ تو فتح اسی چاند میں پائے
تا حشر زمانے میں اُجالا رہے تیرا
کر رحم گنہگاروں پہ اے قاضیِ حاجات
خنجر مری آنکھوں میں پھرا کرتا ہے دن رات
یہ زیست کے دس دن تری طاعت میں بسر ہوں
اُس خاک پہ جس خاک سے ملتی ہے مری خاک
نہ ملک کی خواہش ہے نہ درکار ہے املاک
اب فصل بجز وصل گوارا نہیں مجھ کو
لو دیکھ چکیں چاند ید اللہ کی پیاری
آنکھوں کو کیے بند یہ فرماتی ہیں واری
شکلِ مہِ نو دیکھ چکی بدر کو دیکھوں

شہ داخلِ خیمہ ہوے فرزند کے ہمراہ
منہ دیکھ کے یوں کہنے لگی بنتِ یداللہ

یہ چاند ہے کس طرح کا اے فاطمہ کے ماہ
فرمانے لگے رو کے بہن سے شہِ ذیجاہ

سر تن سے مرا اس مہِ پُرغم میں کٹے گا
زینبؑ یہ مہینہ تمھیں ماتم میں کٹے گا

یہ آلِ نبیؐ کی ہے مصیبت کا مہینا
یہ ظلم کا عشرہ ہے یہ آفت کا مہینا

پہونچا ہے غریبوں کی شہادت کا مہینا
آخر ہے بس اب عمر کی مدت کا مہینا

یہ بارِ امانت مری گردن سے اُتر جاے
ہو خاتمہ بالخیر جو سر تن سے اُتر جاے

گردون پہ مہِ نو جو نمایاں ہے یہ ہمشیر
چڑھتی ہے مرے سر کے لیے چرخ پہ شمشیر

اِس چاند میں کٹ جاے گا سب لشکرِ شبیرؑ
نیزہ کوئی کھاے گا کلیجہ پہ کوئی تیر

برچھی کسی جانباز کے پہلو میں لگے گی
شمشیر کسی شیر کے بازو میں لگے گی

خیمہ کو جلا دیں گے لٹے گا زر و زیور
اِس ماہ میں ہون گے نہ پدر اور نہ مادر

ماؤں سے پسر چھوٹیں گے بہنوں سے برادر
بیوہ کئی سیدانیاں ہوویں گی مقرر

گھڑکیں گے ستمگار جو رووے گی سکینہ
اس ماہ میں بن باپ کی ہووے گی سکینہ

دولہ کوئی ٹاپوں کے تلے ہوئیگا پامال
پیٹے گی کوئی تازہ دلھن کھولے ہوے بال

تیروں سے کسی ماں کا جگر ہووے گا غربال
نکلے گی کوئی کہتی ہوئی ہاے مرا لال

معصوموں کے سونے کی جگہ ہائیں گی خالی
بچوں سے بھری گودیاں ہوجائیں گی خالی

اس عشرۂ اول میں نہ ہوئیں گے بہن ہم
تاریخِ سفر ہے دہم ماہ محرم

عشرہ یہ وہ عشرہ ہے کہ اے زینبِ پُرغم
جس لال کی عاشق ہو وہ ہو جاے گا بیدم

دیکھو گی نہ پھر مُنہ علی اکبر سے پسر کا
اب شام میں ہووے گا تمھیں چاند صفر کا

رونے کے لیے حق نے بنائے ہیں یہ دن
ان روزوں خوشی ہو یہ کسی کو نہیں ممکن

لیویں گے مرا تعزیہ ہر شہر کے ساکن
اکبرؑ کو جوان روئیں گے معصوموں کو کمسن

بھولیں ہمیں ایسے نہیں غمخوار ہمارے
ہوئیں گے سیہ پوش عزادار ہمارے

غش ہوگئی سن کر یہ بیاں زینبِؑ پرغم
بیدار رہیں صبح تلک بی بیاں باہم
آخر وہی صحرا وہی جنگل نظر آیا

اترے اسی میدانِ بلاخیز میں سرور
صحرا کی طرف دیکھ کے خوش ہوگئے اکبرؑ
شہ بولے ہوا نہر کی بھائی تمھیں بھائی

خامہ کو بس اب روک انیسؔ جگرِ افگار
زندہ رہیں دنیا میں شہِ دیں کے عزادار
آنکھوں سے مزارِ شہِ دلگیر کو دیکھیں

خیمے میں اسی رات سے برپا ہوا ماتم
خیموں کو اکھڑوا کے چلے قبلۂ عالم
تھی دوسری تاریخ کہ مقتل نظر آیا

استادہ ہوئے خیمۂ ناموس پیمبرؐ
دریا پہ ٹہلنے لگے عباسِؑ دلاور
ہاں شبیر ہو دریا کی ترائی تمھیں بھائی

خالق سے دعا مانگ کہ اے ایزدِ غفار
غیر از غمِ شہ اُن کو نہ غم ہو کوئی زنہار
اس سال میں بس روضۂ شبیر کو دیکھیں

رباعی

جس دن کہ فراقِ روح و تن میں ہوگا
مشکل آنا اس انجمن میں ہوگا
نازاں نہ ہو رختِ نو پہن کر غافل
اک روز یہی جسم کفن میں ہوگا

رباعی

مرقد میں انیسؔ نہ کفن میں ہوگا
وہ روضۂ سلطانِ زمن میں ہوگا
چلکر گلزارِ کربلا میں ڈھونڈیں
بلبل کا مزار بھی چمن میں ہوگا

رباعی

اختر سے بھی آبرو میں بہتر ہیں یہ اشک
اللہ ہے مشتری وہ گوہر ہیں یہ اشک
آنکھوں سے لگا کے اُس کو کہتے ہیں ملک
گوہر نہیں نورِ چشمِ کوثر ہیں یہ اشک

رباعی

یکتا گہرِ قلزم سرمد ہی حسینؑ
سردارِ امم مثل محمدؐ ہی حسینؑ
جب سر کو قدم کیا تو سر کی رہِ عشق
حقا کہ شہیدوں میں سرآمد ہی حسینؑ

رباعی

واحد ہی جو عبدِ نیک نام اس کا ہوں
یکتا ہی جو مداح مدام اُس کا ہوں
پوچھیں گے نکیرین تو کہدوں گا انیسؔ
قنبر کا جو مولا ہی غلام اُس کا ہوں

مرثیہ (۳)

سبطِ نبی سے منزلِ مقصد قریب ہے
آرام گاہِ جانِ محمد قریب ہے
مولد تو دور رہ گیا مشہد قریب ہے
جس جا لحد بنے گی وہ سرحد قریب ہے
جاتے ہیں آپ خلق کی مشکل کشائی کو
آئی ہے کربلا سے اجل پیشوائی کو

ہے شور آمد آمدِ شاہِ فلک سریر
فوجوں کی ہر طرف سے چلی آتی ہے بھیر
دعوت کے واسطے ہیں سنانیں لیے شریر
حضرت کی پیشکش کو کمانیں ہیں اور تیر
پانی پہ چوکیاں ستم آرا بٹھاتے ہیں
دریا کے گھاٹ برچھیوں سے روکے جاتے ہیں

شقے گئے ہیں شام کے حاکم کے جابجا
ہر پرگنے سے ہے طلب لشکرِ جفا
آکر اترتی جاتی ہیں فوجیں جدا جدا
لیتا ہے جائزہ عمرِ سعدِ بے حیا
غل ہے کریں گے قتل جو زہرا کے ماہ کو
انعام میں ملے گا دو ماہہ سپاہ کو

تیغیں سلاح خانہ سے نکلی ہیں بے شمار
ہے جابجا درستیِ اسبابِ کارزار
ہوتے ہیں لیس تیروں کے دستے کئی ہزار
خنجر ہوئے ہیں ذبح کو پیاسوں کے آبدار
نوکیں نکالی جاتی ہیں تیروں کی سان پر
پھل برچھیوں پہ چڑھتے ہیں پرچمِ نشان پر

وہ سالکِ طریقِ ہدایت ہے شاد شاد
ہے آرزو کہ جلد ملے گوہرِ مراد
بہتے ہیں اشک جوش پہ ہے بحرِ اتحاد
لب پر اسی کا ذکر ہے دل میں اسی کی یاد
معشوق کے سوا کوئی پیشِ نظر نہیں
یہ شوقِ وصل ہے کہ کسی کی خبر نہیں

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت
پانی نہ منزلوں نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت
سنولا گئے ہیں رنگِ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہروں پہ ڈالے ہیں
توسن ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

جلتی ہے لوں حرارت خورشید ہے دوچند
مرجھا گئے ہیں نخل ہوا میں ہے یہ گزند
جھیلوں میں ہیں رند و درختوں پہ ہیں پرند
ہے دھوپ میں رسولؐ کا فرزند ارجمند
غربت میں بیکسی ہے شہ دیں پناہ پر
سایہ ہے آفتاب کا زہرا کے ماہ پر

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر
صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج مسافرت میں ہیں سلطان بحر و بر
لب برگ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اُڑ کے یمین و یسار سے
گیسوے مشکبار اٹے ہیں غبار سے

اہل حرم ہیں محمل و ہودج میں بیقرار
معصوم پانی مانگتے ہیں رو کے بار بار
بانو پکارتی ہے کہ یا شاہ نامدار
گرمی سے جاں بلب ہے مرا طفل شیرخوار
کیونکر یہ دکھ اُٹھے چھ مہینے کی جان سے
گرمی ہے یا برستی ہے آگ آسمان سے

چلاتی ہے سکینہ کہ اچھے مرے چچا
محمل میں گھٹ گئی مجھے گودی میں لو ذرا
بابا سے کہدو اب کریں خیمہ کہیں بپا
ٹھنڈی ہوا میں لیکے چلو تم پہ میں فدا
سایہ کسی جگہ ہے نہ چشمہ نہ چاہ ہے
تم تو ہوا میں ہو مری حالت تباہ ہے

جب طے ہوئی وہ منزل آفت قریب شام
اس روز ثعلبیہ میں شہ کا ہوا مقام
اکبر نے آن کر کیا پردے کا اہتمام
ناقوں سے اُترے آل نبیؐ باصد احترام
ڈوبے ہوئے عرق میں سبھوں کے لباس تھے
دل رُندھ گئے تھے چاند سے چہرے اداس تھے

اُترے رفیق خاص قریب خیام شاہ
کچھ فاصلے سے گرد فروکش ہوئی سپاہ
نکلا حرم سے حضرت خیر النسا کا ماہ
کرسی پہ جلوہ گر ہوا وہ عرش بارگاہ
ہر نخل غیرت شجر طور ہو گیا
صحرا خدا کے نور سے معمور ہو گیا

اُس دن بہت اداس تھا زہرا کا یادگار
زردی تھی رُخ پہ گیسوؤں پر راہ کا غبار
صحرا پہ گہہ نظر تھی گہے سوئے کوہسار
کہتے تھے دیکھ دیکھ کے گردوں کو بار بار
کس کو نہ بے وطن کیا کس پر جفا نہ کی
اے دہر تو نے آہ کسی سے وفا نہ کی

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہ دیں کہ ناگہاں
ناقے پہ ایک شخص ہوا دور سے عیاں
عباسؑ سے یہ کہنے لگے شاہ دو جہاں
تم جا کے اس عرب کو بلا لاؤ بھائی جاں
تشویش ہے رسولِ خدا کے حبیب کو
کچھ پوچھنا ہے اس سے حسینِ غریب کو

جلدی چلے یہ سنتے ہی حکم شہ انام
پاس اس کے جا کے آپ نے کی سبقتِ سلام
ناقہ بٹھا کے کود پڑا تب وہ نیک نام
عباسؑ نامور نے یہ اس سے کیا کلام
آیا ہے تو جدھر سے ادھر ہم بھی جاتے ہیں
ای شخص جلد چل تجھے آقا بلاتے ہیں

دیکھا جو رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
دستِ ادب کو جوڑ کے اس نے کیا سوال
ہے کون شخص آپ کا آقائے خوش خصال
عباسؑ نے کہا کہ رسولِ خدا کا لال
نور نگاہ فاتح بدر و حنین ہے
آقا کا میرے اسمِ مبارک حسین ہے

یہ سن کے اشک آنکھوں سے اس شخص نے بہائے
چھاتی پہ ہاتھ مار کے بولا کہ ہائے ہائے
کیوں اس طرف کو سید والا وطن سے آئے
آفت سے نورِ چشمِ علی کو خدا بچائے
سب اہل شہر ہیں کوفیوں کو ان سے بیر ہے
پھر جائیں آپ جانب یثرب تو خیر ہے

گھبرا گئے یہ سنتے ہی عباسِ باوفا
فرمایا ای عرب ترے رونے کی وجہ کیا
مسلم نے بھی یہ حال تو خط میں نہیں لکھا
اس نے کہا کہ اور ہے کچھ واں کا ماجرا
سب شہر پھر گیا ہے شہ خاص و عام سے
کہنا ہے جو کہوں گا مفصل امام سے

پہونچا وہ جب قریبِ شہنشاہ سرفراز
تسلیم کرکے پانوں پہ رکھا سرِ نیاز
ہاتھ اس کا لے کے ہاتھ میں اٹھے شہ حجاز
بولا کنارے جا کے وہ امت کا کارساز
گر نیک ہو سفر تو وسیلہ ظفر کا ہے
آنا ہوا کدھر سے ارادہ کدھر کا ہے

کی عرض اس نے ای پسرِ سید البشر
کوفے کے شہرِ شوم سے آتا ہوں میں ادھر
فرمایا شہ نے ہے تجھے مسلم کی کچھ خبر
رونے لگا وہ مردِ مسافر جھکا کے سر
شہ بولے وجہ کیا جو ترا حال غیر ہے
جلدی بتا کہ میرے مسافر کی خیر ہے

گھبرا کے حال پوچھتے تھے شاہ نامدار
گر گر کے وہ قدم پہ یہ کہتا تھا بار بار
پھر چلیے اب وطن کی طرف بہرِ کردگار
کوفے میں سب ہیں عہد شکن اور ستم شعار
آلِ رسولِ پاک پہ کیا کیا جفا نہ کی
یہ ہیں وہی جنھوں نے علی سے وفا نہ کی

ہاتوں کو جوڑتا ہوں میں شاہا نجائیے
بہرِ علیؑ و احمدؐ و زہراؑ نجائیے
اُس جا دغا ہی سید والا نجائیے
آقا نجائیے مرے مولا نجائیے
کیا دور ہی جو آکے عدو سدِّ راہ ہوں
ایسا نہ ہو کہ آلِ محمدؐ تباہ ہوں

بچوں پہ رحم کیجیے یا شاہ انس و جاں
پہونچے نہ ان گلوں کو کہیں صدمۂ خزاں
بچھڑے نہ اِس ضعیفی میں اکبر سا نوجواں
رکھے خدا جہان میں ید اللہ کا نشاں
پھولا پھلا رسولِ خدا کا چمن رہے
روشن سدا چراغِ مزارِ حسنؑ رہے

فکر ہی جو آپ کو لکھے ہیں سب نے خط
مطلب یہ ہی کہ یاں تلک آویں کسی نمط
مضمون بھی غلط ہیں عبارت بھی سب غلط
یہ خط نہیں ہیں قتل کی تدبیر ہی فقط
حاکم کا مدعا ہی کہ ظلم و ستم کروں
گر جھوٹ ہو تو ہاتھوں کو اپنے قلم کروں

کوفی تمام مایۂ جور و فساد ہیں
مفسد ہیں بد طریق ہیں بد اعتقاد ہیں
تربت میں فاطمہؑ کے رُلانے پہ شاد ہیں
تیغیں ادھر ہیں دل سوے ابنِ زیاد ہیں
نے ہمتوں نے کونسا وعدہ وفا کیا
کیونکر کہوں کہ مسلمِ بیکس سے کیا کیا

پھر بولا سر کو پیٹ کے باصد غم و محن
آقا ہوا شہید وہ مظلوم بے وطن
نیزے پہ سر ہی جسم ہی بے گور بے کفن
اور اب تلک بندھی ہوئی ہی پاؤں میں رسن
تربت نہیں نصیب تنِ پاش پاش کو
گلیوں میں لوگ کھینچتے پھرتے ہیں لاش کو

باقی جو تھا حضور کا غمخوار و خیر خواہ
مسلم نے لی تھی گھر میں اسی دوست کے پناہ
کوڑے لگے پہ منہ سے نہ کی اُس حزیں نے آہ
مسلم کے ساتھ وہ بھی ہوا قتل بے گناہ
صادق جو تھے وفا میں تو کامل تھے عشق میں
دونوں کے سر روانہ ہوئے ہیں دمشق میں

شہ نے سنا عرب سے جو سارا یہ ماجرا
فرمایا بازگشت ہے سب کی سوئے خدا
جو مسلمِ غریب پہ ہونا تھا ہو چکا
باقی ہے کچھ جو ظلم وہ اب ہم پہ ہوئیگا
خواہانِ مرگ سبطِ رسالت مآب ہے
اُن کا جہان سے کوچ مراپا تراب ہے

یہ بات کہہ کے رونے لگے شاہِ نامدار
واسلما کہا کئی باری بحالِ زار
فرماتے تھے کہ ہائے مرے یارِ غمگسار
بھائی حسینؑ تیری غریبی پہ ہو نثار
میں جانتا تھا اب مرے لینے کو آؤگے
اس کی خبر نہ تھی کہ ہمیں چھوڑ جاؤگے

دوڑے ہوئے جب آئے تم اس شہ کے قریب
مارے گئے وہاں کہ کوئی جس جا نہ تھا حبیب
پردیس میں لحد بھی نہ تم کو ہوئی نصیب
کیسا سفر تھا ہائے مرے قاصدِ غریب
تکتے تھے مجکو یاس سے منہ پھیر پھیر کے
کوفے میں لے گئی تھی اجل تم کو گھیر کے

کوئی بدی کریں گے یہ مجکو نہ تھی خبر
شرمندہ ہے حسینؑ تمھیں پہلے بھیجکر
درپیش ہے ہمیں بھی اسی طرح کا سفر
اب ہم بھی آن پہونچے ہیں واں تم گئے جدھر
رتبے بڑے ہیں کشتۂ اول کے واسطے
سبقت تو ہے ضرور ہراول کے واسطے

اتنے میں روتے روتے جو کچھ آگیا خیال
مسلم کے دونوں بیٹوں کا پوچھا عرب سے حال
اُس نے کہا کہ کیا کہوں ای شاہِ خوش خصال
حارث کے ہاتھ آگئے وہ دونوں نونہال
بے رحم نے یتیموں پہ کیا کیا ستم کیے
بازو بندھے تھے دونوں کے جب سر قلم کیے

آتا تھا شہر کوفہ سے جس دم میں نوحہ گر
حاکم کے آگے جاتے تھے وہ چھوٹے چھوٹے سر
آنکھیں کھلی تھیں چاند سے چہرے تھے خوں میں تر
رخ پہ پڑی لٹکتی تھیں زلفیں ادھر اُدھر
ہاتھوں سے آشکار نشانِ سجود تھے
بے رحم کے طمانچوں سے عارض کبود تھے

فریاد کرکے کہنے لگے سرورِ عرب
خاموش رہ کہ صبر کی طاقت نہیں ہے اب
بندوں کا اختیار ہی کیا جو رضائے رب
دونوں یتیم بھی نہ بچے اُس کے ہے غضب
معلوم تھا کسے کہ تباہی یہ آئے گی
ماں اُن کی جب سنے گی تو کیا خاک اُڑائے گی

رو رو کے پوچھا بچوں کی قبروں کا جب پتا
وہ شخص دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا
کی عرض کچھ نہ پوچھیے اے ابن مرتضیٰ
تجہیز کیسی قبر کجا اور کفن کجا
یوں دفن کم ہوا ہے کوئی کائنات میں
خندق میں لاش باپ کی بیٹے فرات میں

یہ سُن کے اُٹھ کھڑے ہوئے حضرت بچشم نم
کہنے لگا وہ مردِ عرب چوم کر قدم
اب کس طرف کا قصد ہے اے سرور امم
شہ نے کہا کہ جائیں گے مقتل پہ اپنے ہم
مُنہ کو سنان و تیغ سے موڑا نجائے گا
مجھسے خدا کی راہ کو چھوڑا نجائے گا

رخصت ہوا وہ مردِ مسافر بصد فغاں
نہوڑائے سر کو گھر میں گئے شاہ دوجہاں
آنکھوں سے اشک ریش مبارک پہ تھے رواں
حضرت کو روتے دیکھ کے گھبرائیں بی بیاں
صدمے سے رنگ بانوئے بیکس کا فق ہوا
زینب زمیں پہ اٹھ کے گری یہ قلق ہوا

کلثوم سر کو پیٹ کے آئی بہن کے پاس
قاسم کی والدہ میں نہ مطلق رہے حواس
تکتی تھی منہ کو شہ کے سکینہ بچشمِ یاس
سب سے زیادہ زوجۂ مسلم کو تھا ہراس
خیمے سے صحن تک جو گئی جا بجا گری
چہرے سے رنگ اُڑ گیا بستر پہ جا گری

رونے سے شہ کے ہوش کسی کے نہ تھے بجا
سینوں میں دل دھڑکتے تھے لرزاں تھے دست و پا
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ باوفا
باہر سے یاں اُنھیں تو بلائے کوئی ذرا
پوچھوں تو حال کیوں شہ والا کا غیر ہے
کیا ہو گیا وطن میں تو لوگوں کی خیر ہے

کبرا پکارتی تھی کہ صغرا کی خیر ہو
یارب مریض بیکس و تنہا کی خیر ہو
مسلم کی بیٹی کہتی تھی بابا کی خیر ہو
غربت میں قاصدِ شہ والا کی خیر ہو
ہے ہے وطن سے آن کے وہ لٹ گئے نہوں
بھائی مرے پدر سے کہیں چھٹ گئے نہوں

کہتی تھی سکینہ سے رو کر وہ بے قرار
ہے دل میں شہ کے سب سے زیادہ تمھارا پیار
وجہ بکا تو پوچھو بہن تم پہ میں نثار
حضرت تمھی کو دیکھ کے روتے ہیں بار بار
پڑتا ہے دل میں شک مری چھاتی دھڑکتی ہے
رہ رہ کے غم کی آگ جگر میں بھڑکتی ہے

اتنے میں بڑھ کے شاہ سے زینب نے یہ کہا
بھیا مجھے بتاؤ تو رونے کی وجہ کیا

فرمایا شاہ نے کہ بہن قہر ہو گیا
بیٹوں سمیت قتل ہوا ابن عم مرا

مسلم سے کوفیوں نے بڑی بے وفائی کی
گاڑی نہ لاش بھی مرے مظلوم بھائی کی

پیٹو کہ رانڈ ہو گئی عباسؑ کی بہن
رنڈسالہ اس کو دو کہ نہ اُس کو ملا کفن

مارا گیا مرے لیے ہے ہے وہ صف شکن
اب ہم نہ پھر کے جائیں گے ہم سے چھٹا وطن

آ پہونچی فصل فاطمہؑ کے خاک اُڑانے کی
زینب یہ ابتدا ہے مرے مارے جانے کی

سمجھو تم اس خبر کو مرے قتل کی خبر
بانو بھی ساتھ زوجۂ مسلم کے کھولے سر

پُرسے کو آئے زوجۂ عباسؑ نامور
بیکس تھا وہ شریک عزا ہو تمام گھر

رنڈسالہ بی بیاں اُسے جس دم پنھائیں گی
اماں نکل کے قبر سے پُرسے کو آئیں گی

کہدو سکینہ دخترِ مسلم کے پاس جائے
بھائی کو جب وہ پیٹے تو یہ سر پہ خاک اُڑائے

گبرا برابر اُس کے زمیں پر پچھاڑیں کھائے
باپ اس کا مر گیا ہے گلے سے اُسے لگائے

ہم بھی خدا کی راہ میں اب قتل ہوئیں گے
اک دن اسی طرح ہمیں سب بلکے روئیں گے

یہ سن کے چھاتیوں کو لگے پیٹنے حرم
چلائی رو کے زوجۂ مسلم کہ ہے ستم

مارا گیا سفر میں غلام شہ امم
فریاد ہے کہ رانڈ ہوئی میں اسیر غم

صدمے اجل کے تین دموں پر گزر گئے
وارث بھی مر گیا مرے بچے بھی مر گئے

غل سن کے آئے خیمے میں عباسؑ نامور
دیکھا بہن تڑپتی ہے سر ننگے خاک پر

دل غم سے ٹکڑے ہو گیا رو کے جھکا کے سر
بولے قریب آ کے خدا پر کرو نظر

سمجھیں گے اُن سے قاتل مسلم نظر میں ہیں
پیٹو نہ سر کہ سید والا سفر میں ہیں

وابستہ جس کے دم سے ہو اُس کا ہے خیال
لازم نہیں تمھیں کہ بھرے گھر میں ہو وبال

ہم سب غلام جس کے ہیں دیکھو تو انکا حال
مانگو دعا جہان میں رہے فاطمہؑ کا لال

لازم ہے تم کو صبر کہ دنیا میں نام ہو
اُس کا زہے شرف کہ نثار امام ہو

مسلم ہوئے ہراولِ فوجِ شہِ انام
دنیا میں تا قیام قیامت رہے گا نام
کیا نیک کوچ تھا کہ ہوا خلد میں مقام
مخدومۂ جہاں انھیں روویں گی صبح و شام
ماں سے سوا شفیق ہیں اور حق شناس ہیں
بچے تمھارے فاطمہ زہراؑ کے پاس ہیں

شوہر تمھارا صاحبِ عزت تھا اے بہن
حُلّے ملے بہشت میں پایا نہ گر کفن
زخموں کے بدلے ہاتھ لگا خلد کا چمن
ہمسایۂ رسولؐ ملا گو چھٹا وطن
راضی علیؑ ہوں شاد خدا کا حبیب ہو
مانگو دعا کہ ہم کو یہ دولت نصیب ہو

مسلم کا خوں جو راہِ خدا میں ہوا سبیل
پہونچا کنارِ کوثر و تسنیم و سلسبیل
تائیدِ ذوالجلال سے رتبہ ہوا جلیل
عاقل کمال تھا پسرِ حضرتِ عقیل
سمجھو نہ یہ سفر کی تباہی میں مر گیا
زندہ ہے وہ جو راہِ الٰہی میں مر گیا

سمجھاتے تھے بہن کو یہ عباس نامور
روتے تھے سر جھکائے ہوئے شاہ بحر و بر
مسلم کو یاد کر کے حرم پیٹتے تھے سر
بیٹی پکارتی تھی کہ ہے ہے مرے پدر
تم بن ہماری زیست کی صورت بگڑ گئی
بیٹوں کو ساتھ لے گئے بیٹی بچھڑ گئی

شورِ بکا ذرا نہ ہوا کم تمام رات
سویا نہ کوئی خیمے میں اک دم تمام رات
تڑپا کیے امامِ دو عالم تمام رات
گھر میں رہا حسینؑ کے ماتم تمام رات
بس اے انیس اب نہیں لکھنے کی تاب ہے
اس آتشِ الم سے کلیجہ کباب ہے

مرثیہ

جب کربلا میں داخلہ شاہ دیں ہوا — دشت بلا نمونۂ خلد بریں ہوا
سر جھک گیا فلک کا یہ اوج زمیں ہوا — خورشید محو حسن حسینؑ حسیں ہوا
پایا فروغ نیر دیں کے ظہور سے — جنگل کو چاند لگ گئے چہرے کے نور سے

زہرا کے اختروں سے زمیں آسماں ہوئی — غازی جہاں چلے وہ زمیں کہکشاں ہوئی
سب ارض پاک غیرت باغ جناں ہوئی — ایسا مکیں ملا کہ رفیع المکاں ہوئی
دامن جو پاک صاف تھا دشت مصاف کا — احرام باندھا کعبہ نے اُس کے طواف کا

ہاتف نے دی صدا کہ زہے شان کربلا — مختار کائنات ہے مہمان کربلا
پھولوں سے آج بھر گیا دامان کربلا — بس اب تو ہاں بہشت ہے بستان کربلا
خورشید دیں کے فیض سے کیا کیا شرف ملے — روشن ہے جس سے عرش وہ دُر نجف ملے

یہ دشت ہولناک کہاں یہ چمن کہاں — جنگل کہاں بتول کے گل پیرہن کہاں
کعبہ کہاں نبیؐ کا یہ دار محن کہاں — قبریں کہاں شکستہ دلوں کی وطن کہاں
آئے ہیں ڈھونڈتے ہوئے اس ارض پاک کو — سچ ہے کہ خاک کھینچتی ہے اپنی خاک کو

غل تھا چمن چمن کہ بہار آئی اب قریب — باغی جو چین دیں تو یہ ہے موسم عجیب
بولی یہ آشیاں سے جدا ہو کے عندلیب — آیا گل ریاض محمدؐ خوشا نصیب
فخر اُس زمیں کا جس پہ شہ انس و جن رکے — دیکھو خدا کی شان کہ جنگل کے دن پھرے

خوشبو سے ان گلوں کی ہوا دشت باغ باغ — غنچے کھلے ہرے ہوئے بلبل کے دل کے داغ
پہونچا سر فلک پہ ہر اک کوہ کا دماغ — دریا نے بھی حبابوں کے روشن کیے چراغ
خورشید بن گئے طبقے ارض پاک کے — تاروں کو گرد کر دیا ذروں نے خاک کے

جنگل میں بن گیا شجرِ طور ہر درخت
بالیدگی سے ہو گئے ٹکڑے گلوں کے رخت
آئی صدا فلک سے کہ جاگے زمیں کے بخت
اب اس زمیں پہ سوئے گا مختارِ تاج و تخت
رفعت کا اُس کی فرش سے غل عرش تک گیا
لو آج خاک کا بھی ستارا چمک گیا

کہتی تھی آسماں سے زمینِ فلک حشم
کیوں آج مرتبے میں زیادہ ہے تو کہ ہم
مجھ پر ہیں وہ جو مُہرِ نبوت پہ تھے قدم
ذرّے سے بھی یہاں نیّرِ شمس و قمر ہیں کم
اب تو یہ خاکسار بھی کیوان اساس ہے
زیور جو عرش کا تھا وہ سب میرے پاس ہے

پھیلی جو نکہتِ چمنِ شاہِ بحر و بر
صحرا میں لہلہا گیا سبزہ بھی سربسر
جلدی ہوا نے جا کے یہ دریا کو دی خبر
آیا تری کچھار میں مختارِ خشک و تر
جب تک وہ بحرِ فیض برائے وضو بڑھے
بڑھ کر قدم تو لے کہ تری آبرو بڑھے

ساحل پہ ہوں گے جلوہ نما ابنِ امامِ دہر
دریا دلی کا ہوگا تری شور شہر شہر
یہ سُن کے بے قرار ہوئی علقمہ کی نہر
سر کو قدم کیے ہوئے دوڑی ہر ایک لہر
آمد سُنی جو سبطِ رسالت مآب کی
ساحل سے آنکھ لڑ گئی اک اک حباب کی

بولے فرس کو روک کے شاہِ فلک وقار
منزل پہ ہم پہونچ گئے احسانِ کردگار
آگے نہ اب بڑھائے کوئی یاں سے راہوار
یہ وہ زمیں ہے جس کے لیے دل تھا بیقرار
قربان اس مکانِ سعادت نشان کے
پایا دُرِ مراد بڑی خاک چھان کے

اُترو مسافرو کہ سفر ہو چکا تمام
کوچ اب نہ ہوگا حشر تک ہے یہیں مقام
مقتل یہی زمین ہے یہی مشہدِ امام
اونٹوں سے بار اُتار کے برپا کرو خیام
بستر لگاؤ شوق سے اس ارضِ پاک پر
چھڑکا ہوا ہے آبِ بقا یاں کی خاک پر

مثلِ زمینِ خلد مُصفّا ہے یہ زمین
ساتوں فلک سے اوج میں بالا ہے یہ زمیں
روئے زمیں پہ عرشِ معلّٰی ہے یہ زمیں
فردوس کا کھنچا ہوا نقشا ہے یہ زمیں
اس کے مکیں نہوں گے پراگندہ حشر میں
بے سر اسی زمین سے ہم اُٹھیں گے حشر میں

مرغوب طبع ہے یہ زمین فلک جناب
سوے گا اس کی خاک پہ فرزند بوتراب
ہے اس طرح یہ ساری زمینوں میں انتخاب
جس طرح ذی شرف ہے ستاروں میں آفتاب
مرنا لکھا ہوا ہے یہیں سرنوشت میں
جائے گا ہاتھوں ہاتھ یہ طبقہ بہشت میں

سجدے کریں گے جس پہ ملک وہ زمیں یہ ہے
جس پر کھدا ہے نقش شفا وہ نگیں یہ ہے
بطحا یہ ہے مدینۂ ارباب دیں یہ ہے
کعبہ یہ ہے نجف یہ ہے خلد بریں یہ ہے
تھی اس زمین کی قدر رسولان پاک کو
آنکھوں سے سب لگا گئے ہیں یاں کی خاک کو

ذروں سے اس کے اشرفی مہر زرد ہے
مٹی طلا ہے نسخۂ اکسیر گرد ہے
کردے سقر کی آگ کو پانی یہ سرد ہے
کحل بصر ہے دار وے اندوہ و درد ہے
زندے الم سے بچتے ہیں مردے فشار سے
آنکھوں میں نور آتا ہے اس کے غبار سے

خاک اس کے دل میں ہے جسے اس خاک سے غبار
مجرم بھی اس کے فیض سے اٹھے گا رستگار
پڑ جائے جس کے جسم پہ خاک اس کی ایک بار
سایہ سے اس کے آتش دوزخ کرے فرار
یوں دور ہوں گناہ سب اس نیک بخت سے
پتے خزاں میں گرتے ہیں جیسے درخت سے

کام آئے گی لحد میں یہ ہنگام درد و یاس
اس خاک سے بنے گا کفن نور کا لباس
تسبیح اس کی قبر میں ہووے گی جس کے پاس
سو سو طرح کی پائے گا راحت وہ حق شناس
فرمائیں گے ملک ارم اس کا مقام ہے
سونے دو چین سے یہ مطیع امام ہے

دیں گے جو اس کی خاک سے لکھا ہو کفن
میت پہ پھر نہ ہوگا کوئی صدمہ و محن
ڈھانپے گا اس کو چادر رحمت سے ذوالمنن
خوشبو سے ہوگا کنج لحد خلد کا چمن
پھولوں میں خاک پاک کفن کو بسائے گی
ذروں سے نکہت گل فردوس آئے گی

توشہ مسافروں کا یہی اور یہی ہے زاد
یہ خاک آب خضر سے رتبے میں ہے زیاد
طوفان میں اس کو ڈالے گا جو مرد خوش نہاد
لے آئے گی ہوائے موافق دُرِ مراد
دیکھے گا پاس ہیں کرم کارساز کو
تھامے گا دست موج سے دریا جہاز کو

اُترا یہ کہہ کے کشتیِ امت کا ناخدا — جتنے سوار تھے وہ ہوئے سب پیادہ پا
حضرت نے مسکرا کے یہ ہر ایک سے کہا — دیکھو تو کیا ترائی ہے کیا نہر کیا فضا
اکبرؑ شگفتہ ہوگئے صحرا کو دیکھ کر — عباسؑ جھومنے لگے دریا کو دیکھ کر

بولے یہ اشک بھر کے شہنشاہِ سربلند — کیوں یہ مقام ہے تمہیں شاہا بہت پسند
کی مسکرا کے عرض کہ باشاہِ ارجمند — بس یاں تو خود بخود ہوئی جاتی ہے آنکھ بند
شبیرؑ اب یہیں رہیں گے عنایت عجب کی ہے — میں کیا کہوں حضور ترائی غضب کی ہے

گرمی میں ایسی سرد ہوا یا شہِ انام — ہے لیٹنے کی جا یہ زمین فلک مقام
مشہور غاضریہ ہے شاید اسی کا نام — جی چاہتا ہے یاں سے سرکیے نہ ایک گام
ایسی جگہ بس اب نہ ملے گی کسی جگہ — کیا لطف ہے جو قبر بھی ہووے اسی جگہ

روتے ہوئے وہاں سے بڑھے آپ چند گام — گویا زمیں کی سیر کو اُترا مہِ تمام
انجم کی طرح گرد تھے حیدرؑ کے لالہ فام — شکلیں وہ نور کی وہ تجمل وہ احتشام
زلفیں ہوا سے اُڑتی تھیں ہاتھوں میں ہاتھ تھے — لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

تکنے لگے پہاڑوں کو مسلم کے دونوں لال — پھولوں سے کھیلنے لگے زینب کے نونہال
سبزے سے واں کے ابن حسنؑ خوش ہوئے کمال — کی عرض اس زمیں کا ہر ایک گل ہے بے مثال
ای خسروِ زمین یہ جگہ ہے جلوس کی — خوشبو ہے یاں کی خاک میں عطرِ عروس کی

صحرا سے آئے پھر سوئے دریا شہِ امم — الیاس شاد ہو کے پکارے زہے حشم
اُبھریں درود پڑھتی ہوئی مچھلیاں بہم — بولے حباب آنکھوں پہ شاہا ترے قدم
پانی میں روشنی ہوئی حسنِ حضور سے — لے لیں بلائیں پنجۂ مرجاں نے دور سے

ٹھہرے کنارِ نہر جوانانِ ماہرو — دھویا کسی نے رخ کسی نے کیا وضو
گھوڑے جو آئے پیاس بجھانے کنارِ جو — بھر لائے اشک آنکھوں میں شبیرؑ نیک خو
کھینچی اک آہ سرد ترائی کو دیکھ کر — ہاتھوں سے دل پکڑ لیا بھائی کو دیکھ کر

بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباسؑ نامور
خیمہ کہاں بپا کریں یا شاہ بحر و بر
ایذا ہے محملوں میں بہت اہل بیت پر
بچے ہیں نازکی میں گلوں سے زیادہ تر
کب سے عماریوں کے ہیں پردے چڑھے ہوئے
گرمی کے مارے دم ہیں سبھوں کے رکے ہوئے

کچھ سوچ کر امامِ دو عالم نے یہ کہا
زینب جہاں کہیں وہیں خیمہ کرو بپا
پیچھے ہٹے یہ سنتے ہی عباسؑ باوفا
جا کر قریبِ محملِ زینبؑ یہ دی صدا
حاضر ہے جاں نثار امامِ غیور کا
برپا کہاں ہو خیمۂ اقدس حضور کا

بولی یہ سن کے دخترِ خاتونِ روزگار
اس امر میں بھلا مجھے کیا دخل میں نثار
خشکی ہو یا ترائی چمن ہو کہ سبزہ زار
ہر جا مسافروں کا نگہبان ہے کردگار
مختارِ کائنات کے تم نورِ عین ہو
اترو وہاں جہاں مرے بھائی کو چین ہو

عاقل ہو تم تو نام خدا اے علی کے لال
مجھ سے زیادہ بھائی کی راحت کا ہے خیال
دریافت کر لو پہلے کسی سے یہاں کا حال
داری کسی طرح کا نہ آقا کو ہو ملال
گوشہ ملے ہمیں نہ فضا ہو نہ سیر ہو
اتنی ہی پڑی ہے کہ جانوں کی خیر ہو

آرام کو ترس گئے جب سے چھٹا ہے گھر
کن آفتوں میں پانچ مہینے ہوئے بسر
یہ آندھیاں یہ گرمی کے ایام یہ سفر
دن بھر چلے ہیں دھوپ میں جاگے ہیں رات بھر
گرمی سے کھیت خشک تھے جنگل اجاڑ تھا
ایک ایک کوس راہ جبل میں پہاڑ تھا

آج اس زمیں پہ ہمیں لایا ہے آسماں
اب دیکھیے دکھاتی ہے تقدیر کیا یہاں
آقا کی خیریت کی دعا مانگو بھائی جان
یارب مسافروں کو مبارک ہو یہ مکاں
دشمن بہت ہیں بادشہ خوش خصال کے
بھائی بہن نثار ذرا دیکھ بھال کے

بھائی سے اس زمین کی سنی ہے بہت صفت
ہے وہ امام واقفِ اسرارِ شش جہت
جو جو سخن ہیں ان سے بھی لازم ہے مصلحت
صدقے گئی حبیبؑ سے بھی کر لو مشورت
ساحل پہ دشمنوں میں کسی کا عمل نہ ہو
بھیا مجھے یہ ڈر ہے کہ رد و بدل نہ ہو

دست ادب کو جوڑ کے اُس شیر نے کہا
تشویش کچھ نہ کیجیے ای بنت مرتضا
ہر چند مصلحت مری کیا اور عقل کیا
لیکن کوئی ترائی سے بہتر نہیں ہی جا
جو مہر فاطمہ میں ہی یہ وہ فرات ہی
گرمی میں قرب نہر کا آب حیات ہی

جس سرزمیں پہ دلبر زہرا عمل کرے
زہرہ کسی کا کیا ہی جو ردو بدل کرے
مانع وہ ہو جو دین نبیؐ میں خلل کرے
کافر ہی جو حسینؑ سے جنگ و جدل کرے
دخل اس میں روم کا ہی نہ سلطان شام کا
دنیا کی سب زمیں پہ ہی قبضہ امام کا

حضرت کے حکم کا متردد ہی جان نثار
ارشاد یہ ہوا کہ دیا تم کو اختیار
آیا حضور سبط پیمبرؐ وہ ذی وقار
کی عرض خیمہ نہر پہ کرتا ہی خاکسار
اتریں یہیں یہ مرضی آل رسولؐ ہی
بولا وہ بحر فیض کہ اچھا قبول ہی

یہ سن کے خادموں کو پکارا وہ مہ جبیں
فراش آ کے جلد مصفا کریں زمین
حاضر ہوں آب پاش محل دیر کا نہیں
یاں ہوگا خیمۂ حرم بادشاہ دیں
جلد اُن کو بھیجو لوگ ہیں جو کاروبار کے
لے آؤ اشتروں سے قناتیں اُتار کے

بولے زہیر قین کہ حاضر ہیں سب غلام
بڑھ کر حبیب بھی ہوئے مصروف اہتمام
کرسی منگا کے بیٹھ گئے اک طرف امام
رُتبے میں ہوگئی وہ زمیں عرش احتشام
پرتو فگن تھا نور رسالت مآب کا
سر پر لگا تھا چتر زری آفتاب کا

تھا فکر میں خموش دو عالم کا تاجدار
کھلوا رہے تھے خیموں کو عباسؑ ذی وقار
ناگہ اُٹھا شمال کی جانب سے اک غبار
رایت سیاہ و سرخ نظر آئے تین چار
مڑ کر کہا حبیب نے کچھ رنگ اور ہی
بولا کوئی یہ شام کے لشکر کا طور ہی

یک جا ہوئے یہ سن کے جوانان صف شکن
نکلا ہر اک ولی کی زباں سے یہی سخن
آئے ہیں ملک غیر میں ہم چھوڑ کر وطن
تو سب کی خیر کیجیو ای رب ذوالمنن
اعدائے دین کے شر سے حفاظت میں ہم رہیں
ناحق کوئی لڑے بھی تو ثابت قدم رہیں

کہنے لگے پکار کے عباسؑ حق شناس
دل میں نہ خوف ہو نہ زباں پر کلام یاس
گر مر گئے تو روضۂ رضواں کی سیر ہے
کیا ڈر فشونِ روم ہے یہ یا جنودِ شام
جو مرد ہیں ہراس کے کرتے نہیں کلام
سر سبز ہیں وہی جو علی کے نشان ہیں
یہ ذکر تھا کہ بن میں سیاہی سی چھا گئی
گھوڑوں کے دوڑنے سے زمیں تھرتھرا گئی
ایک ایک پیل زور تہمتن شکوہ تھا
بولے ملازموں سے یہ عباسؑ باوفا
آتے ہی سرکشی یہ طریقہ ہے کونسا
لازم رسول زادیوں کا احترام ہے
کرسی نشین ہے تختِ دلِ سیّد البشر
آتی ہے اڑ کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گرد ادھر
بھولے ہوئے ہیں اس پہ کہ ہم خاکسار ہیں
اُس فوج کے رئیس نے بڑھ کر کیا کلام
چھوڑیں گے ہم اُسے کہ جو راحت کا ہے مقام
لشکر کشی ہے بادشہِ کائنات پر
کوفے سے کل جواں ادھر آئے ہیں دس ہزار
خالی ہیں منزلیں نہ بیاباں نہ کوہسار
لاکھوں ہیں کوئی قبل کوئی بعد آئے گا

ہاں ناصرانِ قبلۂ کونین با حواس!
جیتے ہو تو حسینؑ سے ہو قدرداں کے پاس
دونوں طرف مآل تمھارا بخیر ہے
ہم اپنے کام میں ہیں ہمیں کیا کسی سے کام
ہونے دو گر ہیں سرخ علم یا سیاہ فام
خود جھک کے وہ ملیں گے کہ ہم میہماں ہیں
ڈنکے کی دشتِ ظلم سے کوسوں صدا گئی
جنگی سپاہ گھاٹ کے نزدیک آ گئی
ابن رکابِ سبز قدم سرگروہ تھا
دریافت تو کرو کہ ارادہ ہے ان کا کیا
کہدو کہ اہل بیت کے خیمہ کی ہے یہ جا
اُتریں الگ کہیں یہ ادب کا مقام ہے
آئینِ خسروی سے یہ واقف نہیں مگر
کیا ہے جو روکتے نہیں باگیں جیرہ سر
شاید ہوا کے گھوڑوں پہ ظالم سوار ہیں
حکم امیر ہے یہیں اُترے سپاہِ شام
دریا سے ہٹ کے آپ بپا کیجیے خیام
کل مورچے سپاہ کے ہوں گے فرات پر
رستے میں شام کی ابھی فوجیں ہیں بے شمار
شہروں سے پرگنوں سے چلے آتے ہیں سوار
گیتی ہلے گی جب پسرِ سعد آئے گا

فوجوں کا جائزہ تھا وہاں ہم چلے تھے جب
دستوں کی روم و شام کے آمد ہر روز و شب
یکجے مقام گر کوئی گوشہ جدا ملے
ہم گھاٹ روکنے کے لیے آئے ہیں ادھر
سنتے ہی یہ ترائی میں گونجا وہ شیر نر
کم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے
غصے میں رکھ کے دوش پہ شمشیر برق دم
گر فوج قاہرہ کی ہے آمد تو کیا ہے غم
بھڑیں جو شبر سامنے آتا نہیں کوئی
دنیا ہو اک طرف تو نہ آئے خیال میں
گیتی ہو نے نشاں اگر آئیں جلال میں
دریا ہے کیا یہ شبر ہٹیں جس کو چھوڑ کے
تم کون ہو حسینؑ ہے مختار خشک و تر
دیکھو فساد ہوگا بڑھو گے اگر ادھر
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں
دریا تو ابتدا سے ہمارا ہے تم ہو کون؟
اللہ نے زمین کو سنوارا ہے تم ہو کون
ہیہات غضب حق سے پھرے آج تک نہیں
کیا ابن سعد شوم کی فوج اور کیا حشم
اترے ہیں آکے نہر سلیماں کے ساتھ ہم
کچھ ڈر نہیں چھ لاکھ اگر بدخصال ہیں

گردے میں بیس کوس کے لشکر پڑا تھا سب
اس ارض پر نہ ہو جو سمائی تو کیا عجب
ممکن نہیں کہ نہر پہ خیمے کی جا ملے
ہے آج شب کو داخلۂ شمر کی خبر
تیوری چڑھا کے تیغ کے قبضہ پہ کی نظر
نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے
نعرہ کیا اسد نے کہ تم سے ہٹیں گے ہم
گرتا ہے کٹ کے سر وہیں جس جا جمے قدم
یہ آنکھ وہ ہے جس میں سماتا نہیں کوئی
لاکھوں پہ اپنی تیغ چلی ہے جدال میں
ہے سب طرح کا زور محمد کی آل میں
جب پل بنا دیا در خیبر کو توڑ کے
اُن کے سوا ہے کون شہنشاہ بحر و بر
شیروں کا یاں عمل ہے تمھیں کیا نہیں خبر
بس کہہ دیا کہ پاؤں نہ رکھنا ترائی میں
اس کا حق رسول کا پیارا ہے تم ہو کون؟
ساحل پہ کچھ کسی کا اجارا ہے تم ہو کون؟
منزل مسافروں کی یہ ہے کچھ فدک نہیں
سر لوٹتے پھریں گے بڑھایا اگر قدم
کیا اُن کے مورچے کہ جو ہوں تم تو ہوں سے کم
ہم بھی کنندۂ در خیبر کے لال ہیں

کیا سر پہ موت آئی ہی بس سامنے سے جاؤ
فوجوں کا ذکر کرکے کسی اور کو ڈراؤ
دعوی ہی کچھ سپاہ گری کا اگر تو آؤ
بیٹا رحیم کا ہوں مجھے غیظ میں نہ لاؤ
تلوار ادھر کھچی کہ ادھر کھیت پڑ گیا
پھر کچھ نہ بن پڑے گا اگر میں بگڑ گیا

ہم شیر ہیں قسم اسد کردگار کی
رکھتے ہیں ناخنوں میں برش ذوالفقار کی
سنو کی نہ اصل یاں نہ حقیقت ہزار کی
ٹوکے یہ کیا مجال کسی نابکار کی
گرجیں ابھی تو رعد ہیں برسیں تو ابر ہیں
اک میں نہیں بہت ابھی ایسے ہزبر ہیں

چھوڑیں نہ یہ زمین جو گرے سر پہ آسمان
بڑھ کر ہٹا نہیں کبھی اس فوج کا نشان
جب تک کہ دم میں دم ہی بچا لیگی آن بان
رہتی پہ ہم بپا کریں خیمہ خدا کی شان
مرجائیں وہ جو ساتھ کئی شیر خوار ہیں
فی الواقعی ہم ایسے ہی تقصیر وار ہیں

ہم پہلے آے ہیں کہ تم آے ہو تا بہ نہر
کیوں غاصبو یہ نہر نہیں فاطمہ کا مہر
چھوڑ آے ہیں تمھارے بلانے پہ اپنا شہر
کوئی مسافروں پہ یہ کرتا ہی جبر و قہر
اُترے ابھی نہیں کہ لڑائی ٹھہر گئی
وعدے وہ کیا ہوے وہ محبت کدھر گئی

شر اس قدر زمیں پہ تمھارے سروں پہ خاک
مٹی ہے لکھے تھے عریضوں میں جو تپاک
ہی بو ترابیوں کی جگہ یہ زمین پاک
ہوئیں گی تربتیں بھی یہیں گر ہوے ہلاک
تم لوگ کس طرح یہ جگہ ہم کو بھائی ہی
مشہور ہی کہ شیروں کا مسکن ترائی ہی

سوچو تمھیں لوں ہیں کہ حق دار کون ہی
عالم میں بر و بحر کا مختار کون ہی
ہادی ہی کون سید ابرار کون ہی
ہی بے قصور کون گنہگار کون ہی
لازم ہی تم کو پاس کلام مجید کا
کلمہ نبی کا پڑھتے ہو تم بایزید کا

یہ کس کے گھر سے دین کی دولت ملی تمھیں
صدقہ ہی کس ولی کا جو عزت ملی تمھیں
خوان کرم سے کس کے یہ نعمت ملی تمھیں
ہادی ہوے جو ہم تو ہدایت ملی تمھیں
پھلتا نہیں نہال حسد پھولتا نہیں
محسن کو اس طرح سے کوئی بھولتا نہیں

ہم تو تمہیں سمجھتے ہیں سیّد کا خیر خواہ
کیا خوب مہمانوں کی دعوت ہے واہ واہ
الفت نہ دلدہی نہ تعارف نہ رسم و راہ
معصوم سے وہ کونسا ایسا ہوا گناہ؟
چشمے پہ جنگ فاطمہ کے نورِ عین سے
نا منصفو پھراتے ہو آنکھیں حسینؑ سے

ہر چند خاکسار ہیں فرزندِ بوتراب
پر سرکشی کی ہم سے کسی کو نہیں ہے تاب
کُہنی تک آستیں کو جو اُلٹیں دمِ عتاب
گردوں میں تھرتھرا کے چھپے قرصِ آفتاب
آجائے انقلاب کی آفت جہان پر
ہو آسمان زمیں پہ زمیں آسمان پر

ارض و سما کو ہم تہ و بالا کریں ابھی
جو سرکشی کرے اُسے پسپا کریں ابھی
اِس سرزمین کو خون کا دریا کریں ابھی
ساحل تک آئے جو اُسے ٹھنڈا کریں ابھی
بولے کوئی تو تن سے سر اُس کا جدا کریں
خیمہ بپا نہ ہو تو قیامت بپا کریں

ظالم بگڑ بگڑ کے بڑھے ایک بار سب
بلوہ جو ہو گیا سمٹ آئے سوار سب
نیزے علم کیے ہوئے تھے نیزہ دار سب
باندھے تھے ایک غول ضلالت شعار سب
لیکن ملا نہ سکتے تھے آنکھ اُس دلیر سے
اک شور تھا کہ چھین لو دریا کو شیر سے

بگڑے ابو ثمامہ و سعدِ فلک سریر
تولی زہیرِ قین نے شمشیرِ بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے ایک تیر
بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں شریر
عابس کو غیظ لشکرِ بدخو پہ آگیا
غصّے سے بل ہلال کی ابرو پہ آگیا

بولے اُٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر
بس اب سزا میں ان کی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شبیب ادھر سے جو نکلے گا ایک شیر
بھاگیں گے سب یہ گھوڑوں کی باگوں کو پھیر پھیر
آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں
کثرت پہ اپنی بھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

اُلٹی جنابِ قاسمِ ذیشان نے آستیں
قبضے پہ ہاتھ رکھ کے بڑھے اکبرِ حسین
بولے بگڑ کے بچّے زینب کے مہ جبیں
شیروں سے کیا ترائی کو لیں گے یہ اہلِ کیں
کہیے تو نیزہ بازوں کو ہم دیکھ بھال لیں
تیوری کوئی چڑھائے تو آنکھیں نکال لیں

آگے تھے سب کے حضرت عباسؑ ذی حشم
تیغیں جو تولتے تھے اُدھر بانیٔ ستم
لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو

بڑھتا تھا جھومتا ہوا جس دم وہ شیر نر
تیغیں جو کھنچ گئیں تو ہوا اور شور و شر
آغوش میں پھوپھی کی سکینہ دہل گئی

چلائی روکے زینبؑ ناشاد و نامراد
غربت زدوں سے کیا سبب کینہ و عناد
ہمشیر کو نثار امام اُمم کرو

محمل سے مُنہ نکال کے فضہ نے یہ کہا
نیزے بڑھا بڑھا کے ہٹاتے ہیں اشقیا
کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو

زینبؑ پکاریں پیٹ کے زانو بصد ملال
کہدے کوئی کہ اے اسد کبریا کے لال
قربان ہو گئی نہ لڑائی کا نام لو

لڑنے کو تیغ میان سے کھینچو گے تم اگر
عباسؑ تم تو ساقیٔ کوثر کے ہو پسر
مر جاؤں گی سفر میں جو بچھڑوں گی بھائی سے

دریا کو روکتے ہیں اگر بانیٔ ستم
غربت زدوں پہ چاہیئے اللہ کا کرم
ثابت ہوا کسی کو ہماری ولا نہیں

بڑھ بڑھ کے روکتے تھے دلیروں کو دم بدم
کہتے تھے سر نہ ہوگا بڑھایا اگر قدم
روکے تھا ایک شیر جری دس ہزار کو

گرتا تھا کوئی ڈر کے اِدھر اور کوئی اُدھر
گھبرائے اہل بیت شہنشاہِ بحر و بر
غل پڑ گیا کہ گھاٹ پہ تلوار چل گئی

ہے ہے خبر تو لو کہ یہ کس سے ہوا فساد
دیکھے کوئی کدھر ہیں شہنشاہ خوش نہاد
لوگو دعائیں اکبرؑ مہرو پہ دم کرو

بلوہ کنارِ نہر ہے اے بنت مرتضےٰؑ
قبضے پہ ہاتھ رکھے ہیں عباسؑ باوفا
سب دشت گونجتا ہے یہ غصہ ہے شیر کو

ہے ہے غضب ہوا اگر آیا انھیں جلال
غربت پہ ابن فاطمہؑ کی تم کرو خیال
میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ غصے کو تھام لو

محمل سے گر پڑوں گی میں پردیس ننگے سر
یہ نہر کیا ہے جس کے لیے رنج اس قدر
جنگل مجھے پسند ہے گزری ترائی سے

جلتی زمین پہ بچوں کو لیکر رہیں گے ہم
پھر آؤ بس سکینہ کے سر کی تمھیں قسم
پانی بھی اب نہ دیں تو نہیں کچھ گلا نہیں

یہ بات کہہ کے رونے لگی خواہرِ امام
کرسی سے جلد اُٹھ کے پکارے شہِ انام
یکساں ہے بر و بحر ہماری نگاہ میں
ہر چند اس میں کوئی تمھارا نہیں قصور
خیر امتحاں کا دن بھی کچھ ایسا نہیں ہے دور
ادنیٰ سے بحث ننگ ہے عالی مقام کا
لے سکتے ہیں ترائی کو تم سے یہ نابکار
جرأت میں تم نہ ایک نہ یہ اہلِ کیں ہزار
نے آبِ تیغ دم میں یہ ناری ہلاک ہوں
ہے گرچہ ان کی بے ادبی قابلِ سزا
جنگل ہو یا ترائی ہو ہے ہر جگہ خدا
کرتا ہے عاجزی وہی جو حق شناس ہے
صدقے ترے جلال کے اے میرے آفتاب
تم سے مقابلے کی جہاں میں کسے ہے تاب
یہ کیا ہیں تم تو سدِّ سکندر کو توڑ دو
لازم ہے ان پہ رحم یہ امت ہے میں نثار
ان کے لیے حسنؑ نے کیا جبر اختیار
ہو نوجوان مزاج میں غصہ ہے آپ کے
آؤ تمھیں قسم ہے جناب امیرؑ کی
ہمراہ بیٹیاں ہیں شہِ قلعہ گیر کی
کیا دشت کم ہے صابر و شاکر کے واسطے

عباسؑ اُدھر غضب میں بڑھے سوئے فوجِ شام
بھیا ہمارے سر کی قسم روک لو حسام
غیظ و غضب کو دخل نہ دو حق کی راہ میں
ناحق فساد کرتے ہیں تم سے یہ بے شعور
جانے دو جاہلوں سے یہ تکرار کیا ضرور
بس خامشی جواب ہے ان کے کلام کا
کس پر یہ خشم اے شہِ مرداں کے یادگار
بخشا ہے ہر طرح کا تمھیں حق نے اختیار
گر منہ سے اُف کرو تو ابھی جل کے خاک ہوں
پر تم پسر رحیم کے ہو بخشدو خطا
مظلوم کو غریب کو غصے سے کام کیا
ہم کو نبیؐ کی روحِ مطہر کا پاس ہے
یاد آگیا مجھے اسد اللہ کا عتاب
جعفرؑ ہو دوبانے میں شجاعت میں بوتراب
لو ہم کو چاہتے ہو تو دریا کو چھوڑ دو
کرتے تھے مصطفیٰؐ انھیں بیٹوں کی طرح پیار
دشمن پہ بھی رہا کرمِ شیرِ کردگار
بیٹا وہ ہے قدم بہ قدم ہو جو باپ کے
بگڑو نہ سرکشی پہ سپاہِ شریر کی
سب سے جدا ہی چاہیے منزل فقیر کی
یہ اہتمام ایک مسافر کے واسطے

تھوڑے سے بستروں کی ہی درکار ہم کو جا
ہی عمر بے ثبات زمانہ ہی بے وفا
اب وہ کہاں ہیں شہر جنھوں نے بسائے ہیں
آقا نے دی جو اپنے سرِ پاک کی قسم
پر تھی شکن جبیں پہ نہ ہوتا تھا غیظ کم
گردن جھکا دی تا نہ ادب میں خلل پڑے
تیغ و سپر کو پھینک کے بولا وہ نامور
حکمِ خدا ہی حکمِ شہنشاہِ بحر و بر
میں ہوں غلام آپ کے ادنیٰ غلام کا
اُترے گی آکے نہر پہ اب شام کی سپاہ
اس دشت میں نہ اور ہی چشمہ کوئی نہ چاہ
اس فکر میں غلام کا دل آب آب ہی
گردن میں ہاتھ ڈال کے حضرت نے یہ کہا
لو اب اُٹھا لو تیغ و سپر تم پہ میں فدا
وہ شیر ہو کہ دھاک ہی ساری خدائی میں
اس قوم سے نہ رد و بدل چاہیے تمھیں
قربِ خدائے عز و جل چاہیے تمھیں
بھائی جگہ مزاروں کی پہچانتا ہوں میں
ہی منکشف امام پہ احوالِ بحر و بر
صدمہ ہی دل پہ کیا میں کہوں کس سے یہ خبر
دولت مٹے گی یاں اسدِ کردگار کی

جنگل ہوا تو کیا جو ترائی ہوئی تو کیا
آرام کا محل نہیں یہ عاریت سرا
سب اس زمین پہ خاک میں ملنے کو آئے ہیں
بس تھرتھرا کے رہ گیا وہ صاحبِ کرم
چپ ہو گئے قریب جب آئے شہِ امم
قطرے لہو کے آنکھوں سے لیکن نکل پڑے
کہہ دیجیے ان سے کاٹ کے لیجائیں میرا سر
اب کچھ کہوں زبان سے کیا تاب کیا جگر
آقا مجھے خیال تھا بابا کے نام کا
پانی بھی ہم پہ بند کریں گے یہ روسیاہ
سب قافلہ حضور کا ہو جائے گا تباہ
پر عینِ مصلحت ہی جو حکمِ جناب ہی
کیوں کانپتے ہو غیظ سے بھائی یہ کیا کیا
دریا کو تم تو لے چکے ای میرے مہ لقا
دیکھو کوئی تمھارے سوا ہی ترائی میں
غصہ نہ یہ ہمیں نہ جدل چاہیے تمھیں
جو ہم کہیں اسی پہ عمل چاہیے تمھیں
جو ہوگا اس زمیں پہ وہ سب جانتا ہوں میں
حق نے کیا ہی واقفِ اسرارِ خشک و تر
قبضہ تمھارا تا بہ قیامت ہی نہر پر
بھیا یہی جگہ ہی تمھارے مزار کی

ہوتا ہی کیا ہزار کہیں ساکنانِ شام
بخشا ہی تم کو خالقِ اکبر نے یہ مقام

کہتے ہیں اس زمین پہ ملک آکے صبح و شام
یاں ہوگی قبرِ حضرتِ عباسؑ نیک نام

دیندار گرد قبر کے بستی بسائیں گے
شہروں سے لوگ یاں کی زیارت کو آئیں گے

سچ ہی کہ ہاتھ آپ کے آئی ہی کیا جگہ
پیارے ہمارے بھائی کو بھائی ہی کیا جگہ

ٹھنڈی ہوائیں سونے کو پائی ہی کیا جگہ
کیا سبزہ کیا نفیس ترائی ہی کیا جگہ

لنگر ہو تم نجات کی کشتی کے واسطے
لازم ہی قرب نہرِ بہشتی کے واسطے

آؤ اب اپنی قبر کی جا ہم تمھیں دکھائیں
مقتل میں نخل بھی نہیں سایہ کہاں سے لائیں

قسمت میں یہ لکھا ہی کہ جنگل کی دھوپ کھائیں
چالیس روز تک نہ کفن اور نہ غسل پائیں

میدان ہو اور لاش حسین غریب ہو
بھائی قریب ہو نہ ترائی قریب ہو

عباسؑ آب دیدہ ہوے سن کے یہ کلام
بھائی کا ہاتھ ہاتھ میں لیکر چلے امام

فرمایا واں پہونچ کے جو تھا قتل کا مقام
دیکھو حسینؑ ہوگا یہیں قتل تشنہ کام

بھائی مقامِ خیمۂ آلِ عبا ہی وہ
باہر ہی جو نشیب سے تربت کی جا ہی وہ

رونے لگے پکار کے عباسِ نامدار
شہ نے کہا کہ ضبط کرو تم پہ میں نثار

سن پائے گی جو زینبِ بیکسؑ یہ حالِ زار
مر جائے گی تڑپ کے ابھی وہ جگر فگار

مجھ کو بہت خیال ہی زہرا کی جائی کا
مرنا کوئی بہن نہ سنے اپنے بھائی کا

قدموں پہ سر جھکا کے یہ بولا وہ نیک نام
ارشاد یہ تو کیجیے ای قبلۂ انام

پہلے مرے گا آپ سے یہ باوفا غلام
رو کر کہا کہ ہاں یہی ہووے گا لاکلام

مجبوری ہی کہ بھائی کو ہاتھوں سے کھوئیں گے
روؤ گے تم نہ ہم کو ہمیں تم کو روئیں گے

مژدہ یہ سن کے شاد ہوا وہ اسیرِ غم
سجدہ کیا کہ بھائی سے پہلے مریں گے ہم

ریتی پہ آکے گاڑ دیا شبیر نے علم
برپا ہوے خیام شہِ آسمان حشم

ذرّے نجوم بن گئے سارے زمین پر
اترے خدا کے عرش کے تارے زمین پر

کھینچا فلک پہ خیمۂ زنگار گوں نے سر
تار شعاع تھے کہ طنابیں تھیں جلوہ گر
روشن ہوئے کلس کی تجلی سے دشت و در
پردا حرم کا تھا کہ قناتیں اِدھر اُدھر
جنگل کا اوج ہو گیا خیمہ کی شان سے
پلہ زمین کا اُٹھ کے ملا آسمان سے

تھا اُس کے ارتفاع میں کرسی کا سب طور
شمسے کا اوج اوج تھا خیمے کا دور دور
سکان عرش دیکھتے تھے فرش کو بغور
گویا کہ آسمان کے تلے آسمان تھا اور
سر جا ملا جو شمسۂ کیواں جناب کا
سونا اُتر گیا ورقِ آفتاب کا

خیمے میں جا چکے جو حرم باصد احترام
کمریں اِدھر کھلیں اُدھر اُتری سپاہِ شام
ڈیوڑھی پہ آ کھڑے ہوئے عباس نیک نام
بھائی کو لیکے خیمہ میں داخل ہوئے امام
اڈا تھا دل جو سبطِ نبیؐ کی جدائی سے
زینب لپٹ کے رونے لگی چھوٹے بھائی سے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے کو شہِ زمن
تھے دس ہزار مستعدِ جنگ تیغ زن
صدقہ اُتار و کچھ مرے بھائی پہ بہن
جیتا ہیں زخمی ہوتے جو عباسؑ صف شکن
آزردہ ہیں کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا
دیکھو ابھی تلک نہیں ابرو سے بل گیا

لیکر بلائیں کہنے لگی وہ جگر فگار
محمل میں میں تو سر کو ٹپکتی تھی بار بار
کیا جی میں آگئی تھی یہ بھیا بہن نثار
صدقے کروں وہ نہر لڑیں جس پہ یلکار
پیاسا رہے انھیں جنھیں پانی عزیز ہے
بھیا ہمیں تمھاری جوانی عزیز ہے

منہ رکھ کے منہ پہ بالی سکینہ نے یہ کہا
روتی تھی میں سنی بھی نہ تم نے مری صدا
عاشق کو میرے پھیر کے لایا مرا خدا
بس اب کہیں نہ جاؤ اچھے مرے چچا
اس بیکسی میں دلبرِ زہرا کا کون تھا
آتے نہ تم تو پھر مرے بابا کا کون تھا

کہنے لگی یہ زوجۂ عباس خوش بیان
ہر بات میں ہے شیرِ الٰہی کی آن بان
غصے میں ان کو کچھ نہیں رہتا کسی کا دھیان
یہ جان کو بھلا کبھی سمجھے ہیں اپنی جان
آتا ہے غیظ جب تو نہ کھاتے نہ پیتے ہیں
یہ تو فقط حسین کے صدقے میں جیتے ہیں

فرمایا شہ نے بھائی سے اب کھولیے کمر
بیٹھے نہ تھے ابھی کہ یہ اکبر نے دی خبر
مجمع غضب سپاہ کا دریا کے پاس ہے
آخر ہوا وہ دن تو ہوئی رات کو یہ دھوم
اک لاکھ سے سوا ہیں جوانانِ شام و روم
کیسا شمار حصر نہ تھا انتہا نہ تھی
آمد اسی طرح رہی لشکر کی روز و شب
گرمی میں ساتویں سے ہوئی شدتِ تعب
مرجھا گیا چمن شہِ گردوں جناب کا
غش تھے بہم کو پیاس سے اطفالِ شاہِ دیں
تھا دودھ خشک پیٹتی تھی بانوے حزیں
خندق میں گرد خیمے کے آتش بھڑکتی تھی
رونے میں وہ پہاڑ سا دن جب ہوا تمام
شب تھی مسافروں کے لیے موت کا پیام
ل لو جنابِ فاطمہ کے نورِ عین سے
لکھوں سیاہی شبِ عاشور کا جو حال
چھایا ہوا تھا ابرِ غم و حسرت و ملال
پیاسوں سے پوچھو رات وہ کیونکر بسر ہوئی
گردوں پہ جب بیاضِ سحر کا ورق کھلا
بزمِ جہاں میں دفترِ نظم و نسق کھلا
پہونچا فلک پہ ماہ کو حکم انقلاب کا

زینب نے لے لی ہاتھ سے شمشیر اور سپر
فوج اور آئی شام سے یا شاہِ بحر و بر
شہ نے کہا کہ ہوئے تمھیں کیا ہراس ہے
آپہونچا لے کے فوج گراں ابنِ سعدِ شوم
آفت کی ہے بھیڑ قیامت کا ہے ہجوم
دیکھا جو صبح کو کہیں بستر کی جا نہ تھی
نرغے میں آ گیا پسرِ سیدِ العرب
پانی مسافروں پہ ہوا بند ہے غضب
شور آٹھویں سے ہونے لگا آب آب کا
جز آبِ اشک پانی کا قطرہ کہیں نہیں
دم توڑتا تھا جھولے میں اصغرِ سا نازنیں
باقر تڑپ رہا تھا سکینہ بلکتی تھی
آئی سیہ بلا کی طرح شامِ تیرہ فام
غل تھا کہ ایک رات کے مہمان ہیں امام
خالی سحر کو ہوگا زمانہ حسینؑ سے
دفتر سیاہ ہوں شبِ دیجور کی مثال
کھولے تھے اہلِ بیتِ محمد سروں کے بال
بس مختصر یہ ہے کہ غضب کی سحر ہوئی
یعنی کتابِ ذکرِ خدا کا سبق کھلا
ظلمت نہاں ہوئی در باغِ شفق کھلا
موجِ ہوا سے پھول کھلا آفتاب کا

ہونے لگے چراغ نجوم آسماں پہ گل
قرنا پھکی سپاہ عدو میں بجا دُہل
برپا حسینیوں میں ہوا یاں اذاں کا غل
پڑھنے لگے نماز شہنشاہ جزو و کل
قدسی ہوئے نثار جماعت کی شان پہ
نعرے نمازیوں کے گئے آسمان پر

سجدوں میں یاں جھکے تھے ابھی عابدوں کے سر
فوج ستم میں ہوگئیں صف بندیاں اُدھر
دو چار تیر آ کے گرے جب قریب تر
حضرت پہ آکے روک لی عباس نے سپر
کی عرض سرکشی پہ یہ سب فوج شام ہے
فرمایا آپ نے یہ اجل کا پیام ہے

پھر بیٹھے جا نماز پہ شاہ فلک وقار
شانہ کیا محاسن اقدس میں چند بار
سر پر رکھا عمامۂ محبوب کردگار
پہنی قبائے خسرو عالم بہ افتخار
پیدا ہوئے تھے خلق میں رحمت کے واسطے
باندھی کمر شفاعت امت کے واسطے

رخصت کو اہل بیت نبیؐ میں گیے امام
قدموں پہ لوٹنے لگیں سیدانیاں تمام
وہ شور الفراق کا وہ یاس کے کلام
بچے بھی سر پٹکتے تھے لے لے کے شہ کا نام
روتے تھے یوں تو لپٹے ہوئے سب حسین سے
لیکن کلیجے پھٹتے تھے زینبؑ کے بین سے

روتے تھے ماں کے پہلو میں بیٹے کے نونہال
پر غم میں بھائی کے اُسے مطلق نہ تھا خیال
گرنے میں تھامتے تھے جو ماں کو وہ خوش خصال
کہتی تھی مرنے جاتا ہے خیر النسا کا لال
قربان جاؤں منہ نہ پھرانا لڑائی سے
ہشیار رہیو بہر خدا میرے بھائی سے

قاسم سے کوئی کہتی تھی اے میرے نوجوان
چھپ جائے گی اب آنکھوں سے ہے ہے حسن کی شان
اک سو تھا مادر علی اکبرؑ کا یہ بیان
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو میری جان
رخصت کو ماں سے آئے ہو زلفیں سنوار کے
چڑھنا جہاد پہ مجھے صدقے اتار کے

دیکھا گیا نہ شاہ سے سیدانیوں کا حال
بس الوداع کہہ کے چلا فاطمہ کا لال
باہر جو آئے روتے ہوئے شاہ خوش خصال
دیکھا کہ فوج سب ہے مسلح پئے جدال
جھک کر سلام غازیوں نے باادب کیا
گھوڑا سوار دوش نبیؐ نے طلب کیا

آیا عجب شکوہ سے شبدیز تیز گام
طاؤس و کبک دیکھتے تھے جلوۂ خرام
دامن قبا کا رکھ کے کمر میں بڑھے امام
عباسؑ نے رکاب کو تھاما بہ احترام
چھوٹی قدم سے ہیں یہ ہوا غم زمین کو
جبریلؑ جھاڑنے لگے شہپر سے زین کو

حاصل ہوا جو فیضِ قدمبوسی جناب
اللہ ری ضیا مہ نو بن گئی رکاب
روشن تھے بدر سے سمِ اسپ صبا شتاب
ثابت تھا صدرِ زیں سے کہ ہے برجِ آفتاب
انسان تو کیا ہیں دیدۂ انجم بھی بند ہیں
تارِ شعاع موے ابالِ سمند ہیں

کس اوج سے خدیوِ زمین و زماں چلا
رہوار کیا زمین پہ چلا آسماں چلا
لیکر نشان علیؑ ولی کا نشاں چلا
دامن بھرے ہوے علمِ زر نشاں چلا
اختر نثارِ بخشش سبط رسولؐ تھے
ذرّے نہ تھے زمین پہ سونے کے پھول تھے

سادات کے وہ چہروں کی ضو وہ علم کی شان
تکتا تھا اُس زمین کے تاروں کو آسمان
وہ برچھیاں سنبھالے ہوے ہاشمی جوان
رن میں نہ مرتے مرتے گئی جن کی آن بان
وار اُن کے معرکہ میں ہزاروں پہ چل گئے
قبضے چھٹے نہ ہاتھوں سے اور دم نکل گئے

پہونچے جو اس شکوہ سے وہ غازیانِ دین
گاڑا سپاہ کفر کے آگے نشانِ دین
اللہ رے جلوۂ قمرِ آسمانِ دین
روشن تھا جس کے نور سے سب خاندانِ دین
افروختہ تھا چہرۂ اقدس جناب کا
شوکت تھی عرش کی تو جلال آفتاب کا

چلوں میں جوڑنے لگے واں تیر اہل شر
سینے حسینیوں نے ادھر کر دیے سپر
لشکر سے چند گام بڑھے شاہ بحر و بر
حجت تمام کی پہ نہ سمجھے وہ بدگہر
مطلق نہ کی تمیز خطا و صواب میں
تیر آئے سرکشوں کی طرف سے جواب میں

عباسؑ نے کہا کہ ہوا پر ہیں یہ شریر
مولا کہاں کلام نصیحت کہاں یہ تیر
خاموش ہیں ادب سے جوانان بے نظیر
موقع بس اب یہی جنگ کا ہے آسماں سریر
کیا قدرتِ خدا ہے کہ روباہ شیر ہوں
جب اُن سے چھین لے کوئی دریا تو زیر ہوں

بولے حبیب رحم کی بھی انتہا ہے اب
دیجے رضا جہاد کی یا شاہ تشنہ لب
گزرے ہیں سات روز کہ ہے روح پر تعب
بچوں کو بھوک پیاس میں یہ تیسری ہے شب
کٹ جائیں پیاسے حلق ادا سر سے دَین ہو
اب سلسبیل پر کہیں پہونچیں تو چین ہو

فرمایا واں کثیر ہے لشکر یہاں قلیل
اچھا لڑو کہ خالق کونین ہے کفیل
نزدیک اب ہے کوثر و تسنیم و سلسبیل
دے گا مجاہدوں کو خدا رتبۂ جلیل
ہاں اشتیاقِ خنجرِ قاتل ہمیں بھی ہے
در پیش عصر تک یہی منزل ہمیں بھی ہے

یہ سن کے شاد شاد ہوئے وہ خوش اعتقاد
رخصت اُنھیں ملی کہ ملا گوہر مراد
تیغیں پکڑ پکڑ کے جو نکلے پئے جہاد
میدان سے اُٹھ گئے قدم لشکر عناد
کس آبرو سے فدیۂ راہ خدا ہوئے
سر دے کے سب امام کے حق سے ادا ہوئے

نصف النہار تک تھا یہی شور کارزار
مرنے کو یہ چلا وہ تڑپ کر ہوا نثار
رخصت لئے کیا تو اُسے روئے زار زار
جاتے تھے آپ لاش اُٹھانے کو بار بار
ایک ایک نے سعادت عقبیٰ حصول کی
دم نکلے سب کے گود میں سبط رسولؐ کی

لُٹنے لگی علی کی بضاعت دم زوال
کام آئے رن میں جعفر و مسلم کے نونہال
زینب کے نور عین بھی جب کر چکے جدال
حضرت کو داغ دے کے سدھارا حسن کا لال
سترہ دلیر قتل ہوئے حق کی راہ میں
وہ تشنہ کام رہ گئے ساری سپاہ میں

اس وقت تھا عجب شہ دیں پر ہجوم یاس
ڈھلنا وہ دوپہر کا وہ آندھی وہ لو وہ پیاس
لاشے پڑے ہوئے تھے عزیزوں کے آس پاس
رو کر فلک کو دیکھتے تھے شاہ حق شناس
اٹھتا تھا درد دل تو قدم لڑکھڑاتے تھے
فرما کے یا علی ولی بیٹھ جاتے تھے

ہل من مبارز کی جو اعدا میں تھی پکار
بھائی کو دیکھتے تھے کنکھیوں سے بار بار
ڈیوڑھی پہ تھا یہ شور کہ بادشاہ نامدار
دوڑو چلی جہان سے سکینہ جگر فگار
ہے ہے یہ کیسی آگ لگی ہے زمانے کو
قطرہ نہیں ہے پانی کا منہ میں چوانے کو

گردن جھکائے چپ تھے شہنشاہِ بحر و بر
صدمے سے ہاتھ ملتے تھے عباس نامور
تلخ اُن کو زیست تھی اُنھیں سر بارِ دوش تھا
بڑھکر چچا سے کہتے تھے اکبر یہ دم بدم
فرماتے تھے اشارے میں عباس فی حشم
پہلے فدا وہ ہوگا جو خدمت گزار ہی
یہ کہہ کے رکھ دیا قدم شاہِ دین پہ سر
صدمے سے قلب ہل گیا تھرّا گیا جگر
کیا سنبھلے جس پہ ظلم کا یوں آسماں گرے
بھائی کے سر کو چھاتی سے لپٹا کے یہ کہا
دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ باوفا
گزرے ہیں تین دن یونہیں اس عرش صفات پر
بولے بہا کے اشک امام فلک جناب
صابر ہر اک بلا میں ہی فرزند بوتراب
مشتاق آپ دیر سے جنگ وجدل کے ہیں
کیا اختیار خیر و عطا دیجیے ہمیں
ملیگا اب کہاں یہ بتا دیجیے ہمیں
بھائی کی زیست قوتِ بازو کے ہاتھ ہی
یہ کہہ کے اس طرح ہوے شبیر نوحہ گر
رخصت کی اہلبیت کو بھی ہو گئی خبر
چلائی عمو جان ادھر آ کے جائیے

لب برگِ گل سے خشک تھے رخ آنسوؤں سے تر
پانی تھا غم سے اکبرِ ذیجاہ کا جگر
دونوں دلاوروں کو شجاعت کا جوش تھا
رخصت کو عرض کرتے ہیں شاہِ دیں سے ہم
کہیو نہ کچھ تمھیں سر شبیر کی قسم
مر لے یہ جاں نثار تو پھر اختیار ہی
حضرت سمجھ گئے کہ اب انکا بھی ہی سفر
طاقت نے تن سے کوچ کیا جھک گئی کمر
دل تھام کر زمین پہ امامِ زماں گرے
بتلاؤ کیا ارادہ ہی میرے مہ لقا
پیاسی سکینہ مرتی ہی یا شاہ کربلا
گر اذن ہو تو پانی کو جاؤں فرات پر
یہ موت کا پیام ہی بچوں کا اضطراب
اچھا یہ ہی صلاح تو کیجے تلاشِ آب
پانی کہاں کا سب یہ بہانے اجل کے ہیں
جینے کی کوئی شکل بتا دیجیے ہمیں
رولیں لپٹ کے اتنی رضا دیجیے ہمیں
پوچھو ہمارے دل سے کہ برسوں کا ساتھ ہی
روے جوان پسر کے لیے جس طرح پدر
گھبرا کے آئی بالی سکینہ قریب در
دیدار آخری مجھے دکھلا کے جائیے

یاں چڑھ چکے تھے گھوڑے پہ عباسؑ حق شناس
بولی یہ مشک دے کے سکینہؑ بدرد و یاس
آئے صدا بھتیجی کی سنتے ہی در کے پاس
قربان عمو جان بجھا دو ہماری پیاس
چھلکتا ہے دل عطش سے کلیجہ کباب ہے
سقائی کیجیے کہ یہ کار ثواب ہے

عباسؑ نے کہا کہ مرا فخر ہے یہ کام
دی تم نے آبرو مجھے اے دختر امام
بی بی تمھارے باپ کا ادنیٰ ہوں میں غلام
اب ہو گیا جہان میں بہشتی ہمارا نام
کوثر میں سمجھوں دوش پہ گر مشک آب ہو
تم بھی دعا کرو کہ چچا کامیاب ہو

کہہ کر یہ بات باگ اٹھائی سمند کی
صورت بدل گئی فرس سربلند کی
چھل بل ہرن کی تیز پری تھی پرند کی
سرعت بلائیں لیتی تھی ہر جوڑ بند کی
بجلی چمک کے چھپ گئی پارا تڑپ گیا
جنگل میں یوں اڑا کہ چکارا تڑپ گیا

مرکب قدم زمین پہ نہ رکھتا تھا ناز سے
بجلی کو خوف کیا ہے نشیب و فراز سے
چالاکیاں دکھاتا تھا کس امتیاز سے
اڑتا تھا پر صدا نہ نکلتی تھی ساز سے
راکب وہ ہیں جو فرق دو عالم کے تاج ہیں
گھوڑا بھی جانتا ہے کہ نازک مزاج ہیں

وہ تھوتنی وہ ابلی ہوئی انکھڑیاں وہ یال
گویا کھلے تھے حور کے گیسو پری کے بال
وہ جلد وہ دماغ وہ سینہ وہ سُم وہ چال
دم میں کبھی ہما کبھی ضیغم کبھی غزال
وہ قصر آسماں پہ بھی جانے میں طاق تھا
دو پر اگر خدا اسے دیتا براق تھا

گھوڑے کی یہ شکوہ وہ شوکت سوار کی
تصویر تھی ہوا پہ شہ ذوالفقار کی
وہ نور وہ چمک علم زرنگار کی
خوشبو مہک رہی تھی نسیم بہار کی
پنجہ نہ تھا نشان ثریا مآب کا
تھا فرق جبرئیل پہ تاج آفتاب کا

بڑھ کر صدا یہ دیتا تھا اقبال دم بدم
افزوں ترا جلال ہو و بالاتر احتشام
نصرت پکارتی تھی جلو میں قدم قدم
جب تک ہے آفتاب درخشاں رہے علم
مطلب منافقوں کے جو ہیں ملتوی رہیں
یا رب ترے حسینؑ کے بازو قوی رہیں

اللہ رے جلالت و شوکت حضور کی
دہشت سے اُٹھ نہ سکتی تھی گردن غرور کی
ہر جا فرس سے شکوہ دکھاتا تھا طور کی
بجلی قدم قدم پہ چمکتی تھی نور کی
ذرّوں کی ضو سے مہرِ جہانتاب زرد تھا
مٹی میں یہ دمک تھی کہ کندن بھی گرد تھا

پہونچا جو اس جلال سے وہ آفتاب دیں
دیکھا سپاہ کو صفتِ شیر خشمگیں
گاڑا جو بڑھ کے بدنے سے علم ہل گئی زمیں
ہٹ ہٹ کے مورچوں سے پکارے یہ اہلِ کیں
غازی ہو صف شکن ہو جری ہو دلیر ہو
ہٹتا نہ تھا ترائی سے جو وہ یہ شیر ہو

گردے کے اپنے سر کی قسم لے نہ جا کے شاہ
دریا سے اس جری کو ہٹا سکتی تھی سپاہ
گویا کھڑے تھے تیغ بکف ضیغم الٰہ
کیا قہر کی نگاہ تھی اللہ کی پناہ
پلکوں کی تیزیوں سے کلیجے فگار تھے
جنبش بھوؤں کی تھی کہ سروہی کے وار تھے

خود اب تو دی ہو شہ نے اسے رخصتِ جدال
دریا کو ایک حملے میں لے گا یہ خوش خصال
اس کا جلال حیدرِ صفدر کا ہے جلال
سرکش جو لاکھ ہوں تو کرے دم میں پائمال
اُس معرکہ میں بس نہ چلا اس کا بھائی سے
دیکھو یہ شیر اب نہ ہٹے گا ترائی سے

یہ سُن کے تہلکہ صفِ اعدا میں پڑ گیا
ٹوٹا یہ مورچہ وہ رسالہ بگڑ گیا
ہر غول میں علم سے علم جھک کے لڑ گیا
جو رہ گیا نشاں وہ خجالت سے گڑ گیا
ہل چل میں ٹھکیوں سے جو چلّے نکل گئے
اِس صف کے تیر سہم کے اُس صف پہ چل گئے

تیغیں کھنچی لیے ہوئے بھاگے جو اہلِ شر
کٹ کر کسی کا ہاتھ گرا اور کسی کا سر
تلوار یاں پڑی تھی کسی کی تو واں سپر
برچھی تھی اس شقی کی تو اُس نحس کا جگر
یہ جنگ تھی کہ حشر کوئی جانتا نہ تھا
بیٹے کو باپ خوف سے پہچانتا نہ تھا

گھبرا کے ابن سعد نے لشکر کو دی صدا
چھوڑ آئے مورچوں کو شجاعو یہ کیا کیا
اتنا ہراس نامور و ننگ کی ہے جا
وہ کون تھے علی سے لڑے جو دمِ وغا
سب مل کے روکتے نہیں اس تشنہ کام کو
کھوتے ہو معرکے میں بزرگوں کے نام کو

قاتل تمہارے جد و پدر کا تھا جو دلیر
ہاں غازیو اسی کا جگر بند ہے یہ شیر
کرتے ہیں رستموں کو زبردستیوں سے زیر
دشمن کو پا کے واہ یہ کم جرأتی یہ دیر
بڑھ بڑھ کے یوں لڑو کہ تہمتن بھی گرد ہو
لو کشتگانِ بدر کا بدلہ جو مرد ہو

یہ سن کے سب کو جوش حمیت کا آ گیا
ابلیس آ کے راہ ضلالت بتا گیا
پھر ابر فوجِ شام لبِ نہر چھا گیا
شورِ دہل سے رعد کا دل تھرتھرا گیا
جو جو تھے منتشر وہ پرے پھر بہم ہوئے
پھر سب نشان کھل گئے نیزے علم ہوئے

پڑھ کر رجز علیؑ و ولی کا پسر بڑھا
گویا شکار کھیلنے کو شیرِ نر بڑھا
دریائے قہرِ خالقِ جن و بشر بڑھا
بہرِ نبرد مالکِ فتح و ظفر بڑھا
تڑپا جو رخش برق نگاہوں سے گر گئی
آمد خدا کے شیر کی آنکھوں میں پھر گئی

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخِ لاجورد
مانندِ کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمین سے بیٹھ گئی زلزلے میں گرد
تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی ہوش اڑے جوش و طیش کے
شبیرؔ اس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

نکلی ادھر غلاف سے وہ برقِ شعلہ ریز
چلنے میں ذوالفقار تھی جس کی زبان تیز
چمکے شرر بھڑکنے لگی آتشِ ستیز
گھبرا اجل نے بند ہوئے کوچۂ گریز
آیا خدا کا قہر ہر اک روسیاہ پر
بجلی محیط ہو گئی ساری سپاہ پر

چمکی گری تڑپ کے کلیجے ہلا گئی
جو تھے ہوا پہ خاک میں ان کو ملا گئی
بھڑکی دلوں میں آگ وہ پانی پلا گئی
جوہر دکھا کے فوج کو ہیرا کھلا گئی
دعوی تھا خونِ قاسمِ یوسف جمال کا
یوں تیغ نے عوض لیا شبیرؔ کے لال کا

کھا کھا گئی صفوں کو برابر لڑائی میں
ٹھہری نہ نے لہو پیے دم بھر لڑائی میں
ثابت رہے تھے جن کے قدم ہر لڑائی میں
پہلے انھیں کے کاٹ گئی سر لڑائی میں
دو ٹکڑے ہو کے گرتا تھا جو راہوار سے
یہ اٹھ کے داد مانگتی تھی ذوالفقار سے

جس غول پر گری نہ رکی نہ تھمی کہیں
اک دم بھی کی نہ اُس کی برش نے کمی کہیں
چمکی کہیں کسی پہ کسی جا جمی کہیں
فوجوں میں ابتری تھی کہیں برہمی کہیں
کاٹے ہوئے نشان تھے زمیں پر پڑے ہوئے
ہر جا تھے ضرب تیغ کے جھنڈے گڑے ہوئے

جل جل کے آبِ تیغ سے کفار مر گئے
بس بس کے بھاگتے ہیں جفاکار مر گئے
نامی تھے جتنے سب وہ نمودار مر گئے
دو ہاتھ جب ادھر سے چلے چار مر گئے
غل تھا کہ زلزلے میں زمیں آج رن کی ہے
کہتا تھا شیر ہاں یہ مدد پنجتن کی ہے

جب وار چل گیا سپرِ آہنیں کٹی
دستانہ کٹ کے ہاتھ کٹا آستیں کٹی
مغفر کٹا دو نیم ہوا سر جبیں کٹی
سینے کو لے کے زیں سے جو اُتری زمیں کٹی
جو رنگ تھا فرس تو وہ بارا سوار تھا
اللہ رے منہ کہ تیغ نے جانا خیار تھا

آئی جدھر لہو میں سراسر بھری ہوئی
خالی صفوں میں اور سوا ابتری ہوئی
نلے جاں تھا جس پہ سایہ فگن وہ پری ہوئی
پھرتی تھی ساتھ ساتھ اجل بڑوری ہوئی
آنچ اُس کی قہر تھی کوئی کیونکر الگ جائے
چھپتی تھی برق بھی کہ ہوا اس کی لگ جائے

نلے سر تھا جس کے فرق پہ وہ جاں گزا لگی
اک آگ تھی کہ خنجر گردن میں جا لگی
چار آئینہ پہ ضربتِ قہرِ خدا لگی
کڑیاں کھلیں زرہ کی جب اُس کی ہوا لگی
برپا تھا شور چار طرف بھاگ بھاگ کا
پانی اثر دکھاتا تھا لوہے کو آگ کا

پلٹی اُدھر سے جب تو ادھر کا پرا نہ تھا
کاٹے تھے سر پہ فرق برش میں فرا نہ تھا
جھٹکا ہوا تھا سم بدن اُس کا ہرا نہ تھا
خوں سب کا پی گئی تھی مگر دم بھرا نہ تھا
سیلِ فنا تھا جنگ میں کاٹ اُس کی دھار کا
دم خم تھا گھاٹ باڑھ میں سب ذوالفقار کا

گورا وہ ہاتھ اور وہ تلوار کی چمک
تھی صاف تیغ حیدرِ کرار کی چمک
موجوں پہ عکس ڈالتی تھی دھار کی چمک
اُس پار تک پہونچتی تھی اس پار کی چمک
اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں
خشکی میں زلزلہ تھا تلاطم فرات میں

بڑھ بڑھ کے چل رہی تھی جو تلوار چار سو
کشتوں کے بڑھتے جاتے تھے انبار چار سو
تھا رن میں گرم موت کا بازار چار سو
پھرتا تھا جھوم جھوم کے رہوار چار سو
تیغ آئی جس پہ اس کا بھی وار اُس پہ چل گیا
وہ سر گرا گئی تو یہ لاشہ کچل گیا

ثابت ہو جس پہ زد کوئی ایسی کماں نہ تھی
تیر افگنوں کی خوف سے خاطر نشاں نہ تھی
گر میان تھا تو تیغ دم امتحاں نہ تھی
یہ طرفہ بات تھی کہ دہن تھا زباں نہ تھی
جرّار سر جھکائے تھے تلوار کی طرح
سرکش خموش تھے لبِ سوفار کی طرح

جب ضرب کی زمین کے طبق ہل کے رہ گئے
سر اُڑ گئے گلوں سے گلے مل کے رہ گئے
زخموں کے پھول چار طرف کھل کے رہ گئے
بسمل تڑپ کے سامنے بسمل کے رہ گئے
برہم مزاجِ لختِ دلِ بوتراب تھا
لاشے اُلٹ گئے یہ نیا انقلاب تھا

ممکن نہ تھا کہ ایک کو سو میں اماں ملے
مارا انھیں چھپے ہوئے ظالم جہاں ملے
جو نامور بڑے تھے نہ اُن کے نشاں ملے
ریتی پہ گر ملے بھی تو لاشے طپاں ملے
کیوں معرکے میں تیغ دو دم سرخرو نہ ہو
ایسی جگہ نہ تھی کوئی جس جا لہو نہ ہو

زہرہ کسی کا آب تھا ڈر سے کسی کا دل
بھائی ٹھہر نہ سکتا تھا بھائی کے متصل
آفت تھی قہر تھی یورشِ تیغ جاں گسل
کرتی تھی شکل کو وہ ہیولیٰ سے منفعل
ٹکڑے تھے منہ سزا تھی یہ اعمالِ زشت کی
ہیئت بدل گئی تھی ہر اک بدسرشت کی

ڈوبے لہو میں گھاٹ ستمگار روک کے
دم بھر نہ رک سکا کوئی اک وار روک کے
جب بھاگتا سپہر کو سپہ کار روک کے
عباس مسکراتے تھے تلوار روک کے
ٹھہرا جہاں لیا وہیں گھوڑے کو پھیر کے
کوئی شکار بچتا ہی پنجے سے شیر کے

وہ تیغِ شعلہ زا کی چمک وہ فرس کی جست
رستے کھلے ہوئے نہ صفیں وہ نہ بندوبست
بجلی گری پھرا جو ذرا دستِ حق پرست
غارت وہ مورچہ ادھر آفت ادھر شکست
افسردہ فوج فوج سے افسر چھٹے ہوئے
سب چھاؤنی اُجاڑ محلّے لٹے ہوئے

ہر اک علم کی چوبِ ضلالت نشاں کٹی
منہ تیغ کا کٹا تو سناں کی زباں کٹی
ترکش کٹے قلم ہوئے تیر سناں کٹی
ٹکڑے ہوئی زرہ کمر پہلواں کٹی
روحوں کے ساتھ تن بھی نہ رہے تیغوں کے ساتھ
تارِ نفس بھی کٹ گئے تھے گردنوں کے ساتھ

ناری صفوں میں جل گئے جب شعلہ ور ہوئی
چمکی اِدھر یہ تیغ تجلی اُدھر ہوئی
شب کو چمن کھلا جو سپر خون سے تر ہوئی
سر دھڑ سے گر پڑا تو جسد کو خبر ہوئی
چلائی موت صدقے تری کج ادائی کی
بولی نکل کے روح نثار اس صفائی کے

جب سن سے فوج کفر پہ وہ جنگجو چلی
گویا سمومِ قہر خدا چار سو چلی
بسمل پھڑک کے رہ گئے یوں تند خو چلی
ٹکڑے اُڑائے ذبح کیا سرخرو چلی
غل تھا برش ہے قہر کی جوہر بلا کے ہیں
دم بھر میں فیصلہ یہ کرشمے قضا کے ہیں

جس کے گلے سے مل کے چلی مر کے رہ گیا
بسمل بھی تیغِ تیز کا دم بھر کے رہ گیا
آگے بڑھا کوئی تو کوئی ڈر کے رہ گیا
سکتے میں کوئی منہ پہ نظر کر کے رہ گیا
دو پتلیاں بھی بہر تماشا تلی رہیں
سر کٹ کے گر پڑا مگر آنکھیں کھلی رہیں

کُہنی سے دونوں ہاتھ جدا تن سے سر جدا
ہر نخلِ قد کی شاخ جدا اور ثمر جدا
اِس ہاتھ سے جو تیغ تو اُس سے سپر جدا
بھائی سے بھائی اور پسر سے پدر جدا
وہ تہلکے بھی ہول قیامت سے کم نہ تھے
کیا تفرقہ پڑا تھا کہ اعضا بہم نہ تھے

اسوار کو گرا کے سنبھلنے نہ دیتی تھی
لاکھوں میں ہاتھ ایک کا چلنے نہ دیتی تھی
برچھیت کو پرے سے نکلنے نہ دیتی تھی
رستم بھی ہو تو ٹھاٹھ بدلنے نہ دیتی تھی
جو اُس کا کام تھا سو وہ پھرتی کے ساتھ تھا
جس کا قدم بڑھا نہ سپر تھی نہ ہاتھ تھا

اُٹھی چلی سپاہ میں آئی جدا ہوئی
پنجہ جو بچ گیا تو کلائی جدا ہوئی
صف کی جدا پرے کی صفائی جدا ہوئی
پیری جگر میں خون میں نہائی جدا ہوئی
دم توڑے یا مرے کوئی پروا ذرا نہ تھی
نکلی جو خون میں پیر کے پھر آشنا نہ تھی

چھپتی تھی برق اُس کی چمک دیکھ دیکھ کے
رہ جاتی تھی سما کو سمک دیکھ دیکھ کے
تھرّاتا تھا زمیں کو فلک دیکھ دیکھ کے
خورشید کانپتا تھا جھلک دیکھ دیکھ کے
جوہر میں پیچ و تاب تھا زلفوں کے جال کا
بجلی کی زرق برق تھی چم خم ہلال کا

تُلتی تھی سر تنوں سے جدا دیکھ دیکھ کے
کرتی تھی ناز حشر بپا دیکھ دیکھ کے
بیخود تھی آپ اپنی ادا دیکھ دیکھ کے
چشمک قضا کی تھی کہ ذرا دیکھ دیکھ کے
کہتی تھی تیغ گو کہ سروہی کا ہاتھ ہوں
تو میرے دم کے ساتھ ہے میں تیرے ساتھ ہوں

سب سے جُدا تھی تیغ کے چلنے کی قطع راہ
اِس صف کے ہاتھ پاؤں قلم وہ پرا تباہ
خط جا بجا تھے خاک پہ مابینِ رزم گاہ
کٹ کٹ کے تیغیں کہتی تھیں اللہ کی پناہ
کتراکے لو پھر آئی لہو چاٹتی ہوئی
چلتی ہے یہ تو راہ کو بھی کاٹتی ہوئی

گھبرا جو یک بیک غضبِ کردگار نے
گھوڑے بھگائے فوج ضلالت شعار نے
کھینچا سرِ آسماں پہ زمیں کے غبار نے
سر پر اُڑائی خاک سیہ روزگار نے
دِن چھپ گیا یہ گرد پڑی روئے مہر پر
مٹی کا پُل بندھا تھا محیطِ سپہر پر

اللہ رے زلزلہ کہ لرزتے تھے بحر و بر
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے ڈر ڈر کے جانور
جنات کانپ کانپ کے کہتے تھے الحذر
دنیا میں خاک اُڑتی ہے اب جائیں ہم کدھر
اندھیر ہے اٹھی برکت اب جہان سے
ٹل گیا زمین کا طبق آسمان سے

دریا کی فوج گھاٹ سے جب ہٹ گئی تمام
ساحل تک آئے حضرتِ عباسِ نیک نام
نعرہ کیا ترائی تو شیروں کا ہے مقام
وہ زور شور کیا ہوا اے ساکنانِ شام
تم سب کی کیا بساط ہے دامن کی گرد ہو
ہاں اب ہمیں ہٹاؤ تو جانیں کہ مرد ہو

وہ حکم اور تھا کہ نہ تھی بولنے کی تاب
ریتی پہ کیا سپاہ کی مٹی ہوئی خراب
لاکھوں میں اب تو دے کوئی اس تیغ کا جواب
یوں خاک میں ملاتے ہیں فرزندِ بوتراب
افسوس ابنِ سعدِ ستمگار ٹل گیا
پر خیر کچھ بخار تو دل کا نکل گیا

یہ بات کہہ کے ڈال دیا نہر میں سمند
طاؤس دُم اُٹھا کے بنا اسپِ سربلند
چمکا جو عکسِ روے علمدارِ ارجمند
پانی کی آب و تاب ہوئی چاند سے دوچند
دریا کے دل میں تھی جو کدورت وہ ہوگئی
آنکھوں میں مچھلیوں کے چکا چوند ہوگئی

جلوے جو نہر میں علمِ سبز نے دکھاے
اِک شور تھا کہ خضر علیہ السلام آے
پانی میں جب کہ شرم سے خورشید ڈوب جاے
پھر آنکھ میں حباب کی کیا آسماں سماے
ہر سنگ ریزہ نور سے دُرِّ خوش آب تھا
لہریں جو تھیں کرن تو بھنور آفتاب تھا

چھاتی تک اُس نے پانی کو دیکھا جو ایک بار
گھوڑے کا دل ہوا صفتِ موج بے قرار
حسرت سے منہ پھرا کے نظر کی سوے سوار
بولے یہ باگ چھوڑ کے عباسؑ نامدار
تو پی لے اے فرس کہ بہت تشنہ کام ہے
ہم پر تو بے حسینؑ یہ پانی حرام ہے

گردن ہلا کے کہنے لگا اسپِ تیز گام
سنے ذوالجناح مجھ پہ بھی پانی ہے یہ حرام
اُس قوم میں نہیں کہ ڈبو دوں وفا کا نام
آقا بھی حسینؑ کے بچے ہیں تشنہ کام
مطلب یہ ہے کہ ذکرِ وفا چار سو رہے
تر خشک لب نہ ہوں تو نہ ہوں آبرو رہے

ہر چند تین روز سے ہے پیاس کا وفور
پیتا یہ خانہ زاد بھی پیتے اگر حضور
پر ہے یہ امر آپ کی دریادلی سے دور
جانیں بچیں صغیروں کی فکر اس کی ہے ضرور
ناموسِ مصطفےٰ میں تلاطم ہے رات سے
اب جلد مشک بھر کے نکلیے فرات سے

بچوں کا حال سن کے لگا دل پہ تیرِ غم
روے لہو کے اشکوں سے عباسؑ باکرم
مشکیزہ بھر کے دوش پہ رکھا بچشمِ نم
نکلا پلٹ کے نہر سے شبدیزِ خوش قدم
بڑھتے ہی بحرِ ظلم کی موجوں میں گھر گیا
سقا نبی کی آل کا فوجوں میں گھر گیا

ہاں راہ روک لو یہ ہوئی چار سو پکار
برچھے اُٹھا اُٹھا کے بڑھے سیکڑوں سوار
ڈھالیں بڑھیں بہم کہ اٹھا ابرِ کوہسار
تیغیں علم ہوئیں کہ بندھا آہنی حصار
ہلتا تھا چرخ غلغلۂ دار و گیر سے
حلقہ کسی کمان کا نہ خالی تھا تیر سے

کہتا تھا گر زنوں کے ایک ایک پہلوان
رکھ دو یہ مشک ای اسد اللہ کے نشاں

بڑھ کر جواب دیتے تھے عباس نوجوان
پھیرہ بگاڑ دوں گا سنبھالے رہو زبان

کیا منہ جو مشک لے کوئی جب تک یہ ہاتھ ہی
ای بے حمیّتو مری جان اس کے ساتھ ہی

طفلی سے تھی ہمیں اُنھیں عُہدوں کی آرزو
دونوں امانتیں ہیں یہ ای فوج کینہ جو

اک مشک اک نشان شہنشاہِ نیک خو
اس سے جہان میں نام ہی اور اُسی سے آبرو

گر مرگئے تو رنج والم لیکے جائیں گے
مختار اُن کا جو ہی اُسے دیکے جائیں گے

جھپٹے یہ کہہ کے تیغِ دو دستی علم کیے
دونوں طرف کے نیزۂ خطی قلم کیے

حملے صفوں پہ صورتِ شیرِ دُژم کیے
تیغِ دو دم سے بند لعینوں کے دم کیے

سن سن پلٹ کے چلنے میں کمریں جھکٹ گئیں
آدھی صفیں تو بچھ گئیں آدھی الٹ گئیں

بوچھار یک بیک ہوئی تیروں کی ہی غضب
تیغیں چلیں عقب سے شریروں کی ہی غضب

یہ شکل دو جہان کے امیروں کی ہی غضب
بجھنے نہ پائی پیاس صغیروں کی ہی غضب

نیزے تھے اور چاند سے پہلو دلیر کے
تیروں نے چھان ڈالا تھا سینے کو شیر کے

زخمی تھے پر فرس کو ڈپٹتے تھے بار بار
چہرے پہ زخم کھا کے جھپٹتے تھے بار بار

بڑھ بڑھ کے غول فوج کے ہٹتے تھے بار بار
تن سر سے پانچ سات کے کٹتے تھے بار بار

دکھلا رہے تھے رنگ علی کی لڑائی کا
اعدا کے خوں سے لال تھا سبزہ ترائی کا

جھکتے علم کو روک کے کہتے تھے بار بار
قوت عطا کرو مجھے یا شیرِ کردگار

دیتے تھے دم بدم یہ صدا شاہِ ذوالفقار
بیٹا ترے تھکے ہوے بازو کے میں نثار

پانی کے واسطے یہ کبھی رن پڑا نہیں
کاندھے پہ مشک لے کے کوئی یوں لڑا نہیں

واحسرتا وہ فوج کا بلوہ وہ ایک جان
فاقہ وہ تین دن کا وہ سوکھی ہوئی زبان

لڑنے کی فکر مشک کا دھڑکا علم کا دھیان
جی سن سے ہو گیا کہیں کڑکی اگر کمان

چمکی سناں تو روح بدن سے رواں ہوئی
روکا سپر پہ تیر تو خاطر نشاں ہوئی

کھاتے تھے تن پہ زخم کچھ اپنا نہ تھا الم
مضطر تھا مشک کے لیے وہ صاحب کرم
بہتا تھا خون رکابوں میں تھمتے نہ تھے قدم
قوت کو ضعف ضعف کو قوت تھی دم بدم
اعدا ہدف بنائے تھے کینے سے مشک کو
پر یہ جدا نہ کرتے تھے سینے سے مشک کو

تلوار ہاتھ میں علم شاہ دوش پر
ہرنے پہ گاہ مشک رکھی گاہ دوش پر
اک تیغ تیز چل گئی ناگاہ دوش پر
تلوار کیا پہاڑ گرا آہ دوش پر
صدمہ ادھر تو مشک کا جان حزیں پہ تھا
دیکھا جو پھر کے دست مبارک زمیں پہ تھا

شانے سے یوں ابل کے بہا خون کہ الاماں
تیورا کے جھومنے لگے عباس نوجواں
مچھلی کی طرح ہاتھ تو ریتی پہ تھا طپاں
لیکن جدا نہ ہوتی تھیں قبضے سے انگلیاں
بے دست ہو گئی تھی جو اس صفدری کے ساتھ
تلوار بھی تڑپتی تھی دست جری کے ساتھ

دہنا تھا ہاتھ تیغ اسی میں تھی ہے ستم
اب تھاما بائیں ہاتھ میں مشکیزہ و علم
تلواریں دو چلیں جو کمیں گاہ سے بہم
الجھا ہوا وہ ہاتھ بھی بس ہو گیا قلم
کس سے ہٹائیں فوج کو کس سے وغا کریں
بتلاؤ اب کہ حضرت عباس کیا کریں

ڈر سے قریں تو آنہ سکا کوئی نابکار
پر تیر سب لگانے لگے باندھ کر قطار
اک تیر لگ کے مشک پہ گزرا جگر کے پار
پانی کے ساتھ سینے سے چھوٹی لہو کی دھار
ہے ہے سکینہ کہہ کے فلک پہ نگاہ کی
ہرنے پہ سر پٹک کے بہشتی نے آہ کی

گرز ستم سے شق ہوا تا کہ سر جناب
تھرّائے ہونٹ چھٹ گئی دانتوں سے مشک آب
فرمایا ہائے دیں گے سکینہ کو کیا جواب
گھوڑے سے تھرتھرا کے گرے مثل آفتاب
تڑپے اٹھے کراہ کے خاموش ہو گئے
منہ رکھ کے خالی مشک پہ بے ہوش ہو گئے

ان کا تو یاں ہے کوچ سنو واں کی اب خبر
ڈیوڑھی کے پاس بیٹھے ہیں حضرت برہنہ سر
لپٹا ہوا ہے چھاتی سے عباس کا پسر
روتی ہے سر جھکائے سکینہ قریب در
زینب کھڑی ہیں ڈیوڑھی پہ اور دل پہ ہاتھ ہے
بکھرائے بال زوجۂ عباس ساتھ ہے

زینب سے عرض کرتی ہے رو کر وہ دل فگار
ہے ہے یہ شور نہر پہ کیسا ہے میں نثار
کچھ دم الجھ رہا ہے نہیں قلب کو قرار
گرتی ہے کانپنے میں ردا سر سے بار بار
خیر اب نہیں ہے خیر کے انداز اور ہیں
بی بی یہ سب ہمارے رنڈاپے کے طور ہیں

کس سے کہوں جو دوڑ کے لائے کوئی خبر
پروا اٹھا کے اب میں نکلتی ہوں ننگے سر
یہ ذکر تھا کہ فتح کے باجے بجے ادھر
دوڑے زمیں سے اٹھ کے شہنشاہ بحر و بر
ماتم میں نوجواں کے دل اندوہ ناک تھا
تلوار ہاتھ میں تھی گریبان چاک تھا

رستے میں لڑکھڑاتے تھے جب ضعف سے قدم
اکبر سنبھال لیتے تھے بابا کو دم بدم
فرماتے تھے تڑپ کے پسر سے شہ امم
جو حال ہو بجا ہے کہ بھائی کا ہے الم
بازو پکڑ کے دلبر زہرا کو لے چلو
بیٹا چچا کی لاش پہ بابا کو لے چلو

اک اک قدم پہ ضعف و نقاہت ہے سد راہ
عباس کیا بچھڑ گئے گھر ہو گیا تباہ
جیتے رہے تھے ٹھوکریں کھانے کو آہ آہ
وہ کہتے ہوں گے لاش پہ اب تک نہ آئے شاہ
شق ہو جگر جو صبر ادھر سے عطا نہ ہو
یا رب کسی سے خلق میں بھائی جدا نہ ہو

ٹھہرو کہ پاؤں اب نہیں قابو میں اے پسر
تم ہاتھ تھامتے ہو جھکی جاتی ہے کمر
سینہ لہو ہے دل ہے طپاں چاک ہے جگر
اکبر بتاؤ ہاتھ میں رکھوں کدھر کدھر
لو سنتے بولنے میں بدن سرد ہو گیا
کیا دکھ ہے یہ کہ میں ہمہ تن درد ہو گیا

اس شکل سے ترائی میں پہونچے جو شاہ دیں
روکر یہ شہ سے کہنے لگے اکبر حزیں
بابا یہی ہے لاش علمدار مہ جبیں
گھوڑا کہیں ہے تیغ کہیں ہے علم کہیں
رکھے ہوئے ہیں مشک پہ منہ پیار دیکھیے
شانے کٹے ہیں شان علمدار دیکھیے

حضرت پکارے جان بھی ہے جسم زار میں
یا مر گئے تڑپ کے مرے انتظار میں
کی عرض دم تو ہے جسد زخمدار میں
پر منہ سے بولتے نہیں کچھ احتضار میں
کیجے ذرا ملاحظہ چہرے کے نور کو
آنکھیں کھلیں ہیں دیکھ رہے ہیں حضور کو

چلائے گر کے لاش پہ شبیرِ نامدار
بھیا تمہاری نرگسی آنکھوں کے میں نثار
اس نزع میں بھی تھا تمہیں بھائی کا انتظار
آنکھیں پھرا کے ڈھونڈھتے ہو ہم کو بار بار
شاید زبان ہی بند جو اب کھولتے نہیں
روتے ہوئے ہم آئے تو اب بولتے نہیں

مر جائے گا حسینؑ برادر جواب دو
ای میرے نوجواں مرے صفدر جواب دو
اب جاں بلب ہے سبطِ پیمبر جواب دو
ای نورِ چشمِ ساقیِ کوثر جواب دو
لکنت زبانِ خشک کو ہے تشنہ کام ہیں
بھیا تمہارے سر کی قسم ہم تمام ہیں

سن لو تمہیں دیا ہے سکینہ نے کچھ پیام
ایسا نہ ہو کہ یاں چلی آوے وہ تشنہ کام
جنبش ہوئی لبوں کو بھتیجی کا سن کے نام
کی عرض اب غلام کی رخصت ہے یا امام
قدموں پہ آنکھیں ملنے کو دل بے قرار تھا
مولا کے دیکھنے کا فقط انتظار تھا

منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ خوش خصال
کیوں چپ ہوئے کچھ اور کہو اپنے دل کا حال
ان سوکھے سوکھے ہونٹوں کے صدقے علی کا لال
بھیا مدد کو آئے ہیں اب شیرِ ذوالجلال
رخ کیوں ہے زرد کون سی ایذا گزرتی ہے
کیوں دم بدم کراہتے ہو کیا گزرتی ہے

گودی میں ہے مری دمِ آخر تمہارا سر
اور پائنتی جوان بھتیجا ہے نوحہ گر
گزرے گی ہم پہ جو تمہیں اس کی بھی ہے خبر
سینہ پہ ہوگا تیغ لیے شمرِ بد گہر
شمشیر حلقِ خشک پہ چلتی ہے کس طرح
دیکھیں ہماری جان نکلتی ہے کس طرح

یہ بات سن کے نزع میں عباس تھرتھرائے
قطرے لہو کے آنکھوں سے عارض پہ بہہ کے آئے
دو بار سر پٹک کے پکارے کہ ہائے ہائے
پرخوں دہن حسینؑ کے قدموں کے پاس لائے
ہچکی کے ساتھ موت کا خنجر بھی چل گیا
سر پاؤں پر دھرا رہا اور دم نکل گیا

اکبرؑ نے عرض کی کہ چچا جان مر گئے
جھک کر پکارے شاہ کہ بھیا کدھر گئے
منہ تو اٹھاؤ خاک سے رخسار بھر گئے
واحسرتا حسینؑ کو بے آس کر گئے
اب کون دے گا دکھ میں نبیؐ کے پسر کا ساتھ
دم بھر میں تم نے چھوڑ دیا عمر بھر کا ساتھ

ای میرے شیرِ صف شکن ای ببرِ نوجواں
شبیرِ خدا کا آج جہاں سے مٹا نشاں
تینوں میں اب سپر نہیں بھائی کی ہوتے ہو
آتے ہی بھا گئی تھی ترائی کی جا تمھیں
بخشی خدا نے قبر بھی سب سے جدا تمھیں
اتنی جگہ کے واسطے بچھڑے حسینؑ سے
قسمت میں ہی کہ دھوپ ہو جنگل کی اور ہم
کیا خوب ہو اگر یہیں نکلے ہمارا دم
روئیں سرہانے بیٹھ کے جو سوگوار ہوں
آئی صدائے حضرتِ خاتونِ روزگار
ای میرے لال تیرے تڑپنے کے میں نثار
بیٹیا بلائیں لاش کی لینے کو آئی ہوں
واری تم اب یہ مشک و علم لیکے جاؤ گھر
چلّائے تب یہ رو کے شہنشاہ بحر و بر
ہم مر گئے کہ خلق سے بھائی گزر گیا
اکبر سے پھر کہا کہ علم خاک سے اُٹھاؤ
بیوہ ہوئی چچی اُسے پرسا دو خاک اُڑاو
پوچھیں جو سب کہ سبط پیمبر کدھر گئے
اکبر یہ شہ سے سن کے جو رد ئے بصد بکا
ناگاہ آئی در سے سکینہ کی یہ صدا
روتے ہیں آپ کیوں مرے عمو کدھر گئے

پاؤں گا تم سا چاہنے والا میں اب کہاں
تم کو حسینؑ جانتا تھا اپنے تن کی جاں
بازو کٹائے شبیر سے دریا پہ سوتے ہو
اللہ کیا پسند تھی یاں کی ہوا تمھیں
آخر وہی ہوا کہ جو منظور تھا تمھیں
بھیّا ہوائے سرد میں اب سو و چین سے
کیا تفرقہ دکھایا ہی گردوں نے ہی ستم
الفت یہ چاہتی تھی کہ قبریں بھی تن ہم
ہم دونوں بھائیوں کے برابر مزار ہوں
ہی ہی جہان سے اُٹھ گیا ایسا وفا شعار
میر السیر ہی آج سے عباسِ نامدار
پرسا تمھارے بھائی کا دینے کو آئی ہوں
ایسا نہ ہو نکل پڑے زینبؑ برہنہ سر
اماں کمر تو ٹوٹ گئی جائیں اب کدھر
بازو ہمارا تھامنے والا تو مر گیا
پرخون یہ مشک خیمۂ عصمت میں لیکے جاؤ
بیٹا چچا کے بچوں کو جا کر گلے لگاؤ
کہدیجیو کہ بھائی کے لاشے پہ مر گئے
تڑپے اک آہ کر کے شہنشاہِ کربلا
بابا میں اب نکلتی ہوں گھر سے برہنہ پا
حضرت نے دی صدا کہ جہاں سے گزر گئے

فرما کے یہ زمین سے اٹھے شاہ انس و جاں
رو کر علم سے باندھ دی وہ مشک خونچکاں
پہونچے حرم سرا کے جو نزدیک ناگہاں
سر پیٹ کے سکینہ نے تب یہ کیا بیان
اندھیر ہے جہان مجھے کچھ سوجھتا نہیں
ہے ہے علم تو آیا ہے میرا چچا نہیں

ڈھونڈوں کہاں میں اے مرے عمو کدھر گئے
مجکو پتا دیا نہ وہاں کا جدھر گئے
دریا سے مشک بھیجدی اور خود گزر گئے
پانی پیا نہ تشنہ دہن کوچ کر گئے
شانے کٹے تھے مشک بھی تیروں سے کٹ گئی
وہ کیا کریں ہماری ہی قسمت الٹ گئی

غل پڑ گیا کہ شہ کے علمدار ہائے ہائے
اے نور چشم حیدر کرار ہائے ہائے
اے ابن فاطمہ کے مددگار ہائے ہائے
اے فوج شہ کے جعفر طیار ہائے ہائے
چھوٹے سے ہاتھ رکھ کے دل دردناک پر
دے مارا سر کو بالی سکینہ نے خاک پر

حضرت نے لا کے گاڑ دیا صحن میں علم
اور گر پڑے زمین پہ شہنشاہ باکرم
سب سے کہا کہ جینے نہ دے گا ہمیں یہ غم
جن سے جدا نہ ہوتے تھے کھوئے انکو ہم
پوچھو ہمارے دل سے مصیبت جدائی کی
بھائی ہی جانتا ہے محبت کو بھائی کی

بھائی سے ساتھ بھائی کا چھوٹا ہزار حیف
چھوڑا نہ پھل نہ پھول نہ بوٹا ہزار حیف
بازو مرا قوی تھا سو ٹوٹا ہزار حیف
امت نے میرے باغ کو لوٹا ہزار حیف
فریاد ہے لعینوں نے ہم پر ستم کیا
تیغوں سے سرو باغ علی کو قلم کیا

زیر علم تھا زوجۂ عباس کا یہ حال
ماتھا بھرا تھا خاک سے بکھرے ہوئے تھے بال
چلاتی تھی یتیم ہوئے میرے دونوں لال
دنیا سے کھو گئے مجھے عباس خوش خصال
ہے ہے علی کا نور نظر مجھ سے چھٹ گیا
میں رانڈ ہو گئی مرا اقبال لٹ گیا

ناگہ صدا علی کی یہ آئی کہ اے بہو
زانو پہ تھا مرے سر عباس نیک خو
آئی ہے تیرے پرسے کو زہرا کشادہ مو
بی بی بس اب حسین کو رو رو کے رلا نہ تو
بھائی کے غم میں لال مرا دردمند ہے
اب صبر کر کہ صبر خدا کو پسند ہے

ہاں رو دو مومنو یہ بُکا کا مقام ہے
تم میں شریکِ روحِ رسولِ انام ہے
اب رخصتِ حسینِ علیہ السلام ہے
چہلم کی مجلسوں کا بھی آج اختتام ہے
موت آئی تو شریکِ عزا کون ہووے گا
جو سال بھر جیے گا وہ پھر شہ کو روے گا

آگے تمہارے مرتے جو عباسِ باوفا
پُرسانہ دیتے سبطِ رسولِ خدا کو کیا
تم سب کو دیکھتے ہیں شہنشاہِ کربلا
زہرا ابھی ننگے سر ہے قیامت کرو بپا
سمجھو شریکِ بزم شہِ مشرقین کو
دے نوجوان بھائی کا پرسا حسین کو

یہ کہہ کے ہائے حضرتِ عباس خاک اڑاؤ
پیٹو سروں کو ہاتھوں سے اور اشکِ خوں بہاؤ
ہے ہے حسین کہہ کے زمیں پر پچھاڑیں کھاؤ
پُرسا پسر کا فاطمہ زہرا کو دیکے جاؤ
کل خاک میں ملائیں گے اُس تشنہ کام کو
رخصت کرو حسینِ علیہ السلام کو

ای بے دیار و بے سر و سامان الوداع
ای بنتِ مصطفےٰ کے دل و جان الوداع
ای دو جہاں کے سید و سلطان الوداع
ای شیعیانِ ہند کے مہمان الوداع
آہ و بکا سے ہم کبھی غافل نہ ہوئیں گے
جب تک جئیں گے آپ کی غربت پہ روئیں گے

مولا ضریحِ پاک پہ بلوائیے شتاب
اب ہجر کی انیس کے دل کو نہیں ہے تاب
رہ جائے گی ہوس جو دیا زیست نے جواب
خاکِ شفا ملے مجھے یا ابنِ بوتراب
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

رباعی

گھر میں ڈھونڈو نہ انجمن میں ڈھونڈو
مرقد میں نہ ڈھونڈو نہ کفن میں ڈھونڈو
گلزارِ نجف میں مدح خواں ہوگا انیس
بلبل کو جو ڈھونڈو تو چمن میں ڈھونڈو

مرثیہ ٥

بخدا فارسِ میدان تہور تھا حُر
نار دوزخ سے ابوذر کی طرح حُر تھا حُر
ڈھونڈھ لی راہ خدا کام بھی کیا نیک ہوا
واہ رے طالعِ بیدار زہے عزت جاہ
پیشوائی کو گئے آپ شہ عرش پناہ
مدتوں دور رہے جو وہ قریب ایسا ہو
نار سے نور کی جانب اُسے لائی تقدیر
شافعِ حشر نے خوش ہو کے بحل کی تقصیر
اوج و اقبال و حشم فوجِ خدا میں پایا
اللہ اللہ حُرِ صفدر و غازی کا نصیب
ہجر میں لطف ملاقات کا دوری میں قریب
صدقے ہو جائے اسے عشق ولی کہتے ہیں
آیا کس شان سے کعبہ کی طرف چھوڑ کے دیر
حق نے لکھ دی تھی جو تقدیر میں فردوس کی سیر
ذکر خیر اُس کے موئے پر بھی ہوئے جاتے ہیں
کفر کی راہ سے کارہ تھا جو وہ نیک طریق
تھے تو لاکھوں پہ کسی کو بھی ہوئی یہ توفیق
اوج و بندار کو بیدیں کو سدا پستی ہے

ایک دو لاکھ سواروں میں بہادر تھا حُر
گوہرِ تاجِ سرِ عرش ہو وہ دُر تھا حُر
پاک طینت تھی تو انجام بھی کیا نیک ہوا
حُر پہ کیا فضل خدا ہو گیا اللہ اللہ
خضرِ قسمت نے بتا دی اُسے فردوس کی راہ
بخت ایسے ہوں اگر ہو تو نصیب ایسا ہو
ابھی ذرہ تھا ابھی ہو گیا خورشیدِ منیر
تکیۂ زانوے شبیر ملا وقت اخیر
جب ہوا خاک تو گھر خاکِ شفا میں پایا
جانِ محبوبِ الٰہی جسے فرمائے حبیب
وہی کام آتے ہیں محسن کے جو ہوتے ہیں نجیب
اُس کو دنیا میں سعیدِ ازلی کہتے ہیں
کوئی حضرت کا یگانہ بھی نہ سمجھا اُسے غیر
فتنہ و شر سے بچا ہو گیا انجام بخیر
عملِ نیک ہر اک وقت میں کام آتے ہیں
کس بشاشت سے ہوا راہبر ایماں کا رفیق
خُلق طینت میں ہے جن کے وہی ہوتے ہیں خلیق
اصل جن تیغ کی اچھی ہے وہی کستی ہے

کیوں نہ بالیدہ ہو اس کا چمن جاہ وجلال
جس کو سرسبز کرے خود اسداللہ کا لال
ہو گیا فاطمہ کے باغ میں آتے ہی نہال
وہ ثمر پائے کہ پہونچے نہ جہاں دست خجل
کھل گیا غنچۂ دل عذر جو منظور ہوئے
صورت برگ خزاں دیدہ گنہ دور ہوئے

حر کہاں اور کہاں احمد مرسل کا خلف
بخت نے دیر سے پہونچا دیا کعبہ کی طرف
دل صفا ہو گیا سینے میں تو پائے یہ شرف
جب کہ آنکھیں ہوئیں حق بین تو ملا در نجف
نیک جو امر ہیں دل پر وہی کھل جاتے ہیں
جب خدا چاہے تو بگڑے ہوئے بن جاتے ہیں

وصف حر میں ہو زباں معترف عجز و قصور
آمد آمد کی بہادر کا ستو اب مذکور
جب ہوئی مستعد جنگ سپاہ مقہور
مہر افلاک امامت نے کیا رن میں ظہور
غل ہوا جنگ کو اللہ کے پیارے نکلے
اے فلک دیکھ زمیں پر بھی ستارے نکلے

کیا کہوں شان جوانان جنود اللہ
کوئی ہم صورت خورشید کوئی غیرت ماہ
باندھی شیروں نے صف جنگ میان جنگاہ
چمن خلد سے کرنے لگیں حوریں بھی نگاہ
واں لعینوں نے در ظلم و ستم کھول دیا
بڑھ کے عباس نے یاں سبز علم کھول دیا

ہو گئے سرخ شجاعت سے رخ آل نبی
آئی ٹھنڈی جو ہوا بھول گئے تشنہ لبی
رن میں کڑکا ہوا بجنے لگے باجے عربی
یکہ تازوں نے کیا شور ھل من مبارز طلبی
اک گھٹا چھا گئی ڈھالوں سے سیہ کاروں کی
برق ہر صف میں چمکنے لگی تلواروں کی

برچھیاں تول کے ہر غول سے خونخوار بڑھے
نیزے ہاتھوں میں سنبھالے ہوئے اسوار بڑھے
تیر جوڑے ہوئے چلوں میں کماندار بڑھے
بولے شہ یاں سے ابھی کوئی نہ زنہار بڑھے
اسد حق کے گھرانے کا یہ دستور نہیں
میں نبی زادہ ہوں سبقت مجھے منظور نہیں

یہ سخن کہہ کے مخاطب ہوئے اعدا سے امام
اے سپاہ عرب و روم و ری و کوفہ و شام
تم پہ کرتا ہے حسین آخری حجت کو تمام
پسر مصحف ناطق ہوں سنو میرا کلام
سخن حق کی طرف کانوں کو مصروف کرو
شور باجوں کا مناسب ہو تو موقوف کرو

یہ صدا سنتے ہی خود رک گیا قرنا کا خروش
تھم گیا طبل وغا کی بھی وہ آواز کا جوش

ہوگیا جوڑ کے ہاتھوں کو جلاجل خاموش
کیا بجاتے کہ بجا تھے نہ کسی شخص کے ہوش

چھیڑنا ان کو سرودوں کا بھی ناساز ہوا
رعب فرزند نبی صلعم سرمۂ آواز ہوا

کم ہوا غلغلہ فوج ستم جب یک بار
یوں گہربار ہوئے شہ کے لب گوہر بار

صف کشی کس پہ ہے یہ ای سپہ ناہنجار
قتل سادات کی لشکر میں یہ کیسی ہے پکار

وطن آوارہ وں پہ یہ ترق ہے کیوں پانی کا
کیا زمانے میں یہی طور ہے مہمانی کا

مجھ کو لڑنا نہیں منظور یہ کیا کرتے ہو
تیر جوڑے ہیں جو تم نے تو خطا کرتے ہو

کیوں نبی زادہ پہ غربت میں جفا کرتے ہو
دیکھو اچھا نہیں یہ ظلم برا کرتے ہو

شمع ایماں ہوں اگر سر مرا کٹ جائے گا
یہ مرقع ابھی اک دم میں الٹ جائے گا

میں ہوں سردار شباب چمن خلد بریں
میں ہوں خالق کی قسم دوش محمد کا مکیں

میں ہوں انگشتر پیغمبر خاتم کا نگیں
مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں

ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

قلزم عز و شرف کا در شہوار ہوں میں
سب جہاں زیر نگیں ہے وہ جہاندار ہوں میں

آج گو مصلحتاً بیکس و ناچار ہوں میں
ورثۂ احمد مختار کا مختار ہوں میں

بخدا دولت ایمان اسی دربار میں ہے
سب بزرگوں کا تبرک مری سرکار میں ہے

یہ قبا کس کی ہے بتلاؤ یہ کس کی دستار
یہ زرہ کس کی ہے پہنے ہوں جو میں سینہ فگار

بر میں کس کا ہے یہ چار آئینۂ جوہر دار
کس کا رہوار ہے یہ آج میں جس پہ ہوں سوار

کس کا یہ خود ہے یہ تیغ دو سر کس کی ہے
کس جری کی یہ کمان ہے یہ سپر کس کی ہے

تنگ آئے گا تو رکنے کا نہیں
ایک حملہ میں فنا ہوں گے یہ دو لاکھ شریر

چل سکیں گے نہ تبر مجھ پہ نہ تلوار نہ تیر
کاٹ جائے گی گلے سب کے یہ برّان شمشیر

شبیر ہوں لخت دل غالب ہر غالب ہوں
میں جگر بند علی ابن ابی طالب ہوں

مجکو ہوتا نہ اگر بخشش امت کا خیال — روک لیتا ہے مجھے رستے میں یہ کس کی مجال
تھام سکتا تھا لجام فرس برق مثال — پوچھ لو دیکھا ہے اُس نے مرے شیروں کا جلال
گفتگو میں سپر اُس کی جو نہ ہم ہو جاتے — ہاتھ اک وار میں پہونچوں سے قلم ہو جاتے

غیظ سے ہاتھ چباتے تھے علی کے دلدار — پیچھے تو لیتے ننھے عون و محمد ہر بار
اُنگلی پڑتی تھی جگر بند حسنؑ کی تلوار — میں نے جب سر کی قسم دی تو رکے وہ جرار
چلتی تلوار تو جنگل تہ و بالا ہوتا — پھر نہ حر خلق میں ہوتا نہ رسالا ہوتا

تھا یہ بپھرا ہوا عباسؑ مرا شیر جواں — سینۂ حُر پہ رکھے دیتا تھا نیزے کی سناں
میں یہ کرتا تھا اشارہ کہ نہ ای بھائی کہاں — رحم لازم ہے نہیں ہم ہیں امام دوجہاں
کچھ تردد نہیں سر تن سے اتارا جائے — کوئی بندہ نہ مرے ہاتھ سے مارا جائے

گرچہ یہ امر نہیں اہل سخا کے شایاں — کہ کسی شخص کو کچھ دے کے کرے پھر عیاں
پوچھ لو حُر تو ہے موجود عیاں را چہ بیاں — اُسی جنگل میں مع فوج تھا یہ تشنہ وہاں
شور تھا آج چلیں جسم سے جانیں سب کی — منہ کے باہر نکل آئی تھیں زبانیں سب کی

زیست ہر شی کی ہے پانی سے شجر ہو کہ بشر — مجھ سے دیکھا نہ گیا میں تو سخی کا ہوں پسر
میں نے عباسؑ دلاور سے کہا گھبرا کر — مشکوں والے ہیں کہاں اونٹ ہیں پانی کے کدھر
کرم ساقی کوثر کو دکھا دو بھائی — جتنا پانی ہے وہ پیاسوں کو پلا دو بھائی

رہ نہ جائے کوئی گھوڑا کوئی ناقہ بے آب — چھاگلیں جلد منگاؤ مرا دل ہے بیتاب
سقے مشکیزوں کے منہ کھول کے آپہونچے شتاب — متوجہ ہوا میں خود کہ وہ تھا کار ثواب
چین آیا نہ جب تک نہ انھیں آرام دیے — تھا جو اک جام کا پیاسا اُسے دو جام دیے

تھی بھی فصل بھی دھوپ بھی گرم ہوا — ٹھنڈے پانی پہ گرے پڑتے تھے حر کے رفقا
تشنہ کاموں کا یہ مجمع تھا کہ ملتی نہ تھی جا — سقے بھر بھر کے کٹوروں کو یہ دیتے تھے صدا
بھائیو آؤ جو پانی کی طلبگاری ہے — چشمۂ فیض حسینؑ ابن علی جاری ہے

آبِ شیریں کا جو دریا ہوا جنگل میں رواں
شکر کرنے لگے تر ہوگئی ہر خشک زباں
شور تھا ابن ید اللہ نے جاں بخشی کی

ایک دن وہ تھا اور اک دن یہ ہے اللہ اللہ
چشمِ اُمید ہو کیا سب نے پھرائی ہے نگاہ
ہر مسلماں پہ نبی زادے کا حق ہوتا ہے

کئی طفل اُن میں ہیں کم سن کہ جو سوئے جاتے ہیں
پانی پانی جو وہ کرتے ہیں تو شرماتے ہیں
سچ ہے غربت کی عجب شام و سحر ہوتی ہے

شہ کی مظلومی پہ گریاں ہوئی ظالم کی سپاہ
بولا وہ اشہد باللہ بجا کہتے ہیں شاہ
اُن کے احسان کا کیونکر کوئی منکر ہو جائے

ایک میں کیا ہوں زمانے پہ ہے احساں ان کا
خشک و تر پر ہے کرم خلق میں یکساں ان کا
جنتی ہے جسے حاصل یہ شرف ہووے گا

یہ ابھی ہاتھ اٹھا کر جو دعا فرمائیں
حق سے جس شی کے طلبگار ہوں فوراً پائیں
مثلِ خورشید ہے روشن وہ شرف ان کا ہے

ان سے قطرہ کوئی مانگے تو گہر دیتے ہیں
پیٹ سائل کا بھی فاقوں میں یہ بھر دیتے ہیں
اپنے مجرم کی گنہگار کی امید ہیں یہ

فرس و اشتر و قاطر نہ رہے تشنہ دہاں
پانی پی پی کے دعائیں مجھے دیتے تھے جواں
دین و دنیا کے شہنشاہ نے جاں بخشی کی

کہ اُسی طرح ہمیں پیاس ہے پانی کی ہے چاہ
کوئی اک جام بھی بھر کر ہمیں دیتا نہیں آہ
بچے روتے ہیں تو سینہ مرا شق ہوتا ہے

دم اُکھڑتا ہے مرا جب انھیں غش آتے ہیں
پاس دریا ہے پہ اک بوند نہیں پاتے ہیں
تیسرا دن ہے کہ فاقوں میں بسر ہوتی ہے

عمرِ سعد نے کی پھر کے رخِ حُر پہ نگاہ
محسن و منعم و آقا ہے مرا یہ ذی جاہ
سخنِ حق ہیں جو شک لائے وہ کافر ہو جائے

ابرِ رحمت ہیں خطا پوش ہے داماں ان کا
اے خوشا حال جو غربت میں ہے مہماں ان کا
جو اُدھر ہوگا خدا اُس کی طرف ہووے گا

جتنے عالم کے گنہگار ہیں بخشے جائیں
جام کوثر ہمیں فردوس سے حوریں لائیں
یہ وہ بندے ہیں کہ اللہ یہ حق جن کا ہے

ہیں سخی ابن سخی بات پہ سر دیتے ہیں
یاں تو زر دیتے ہیں فردوس میں گھر دیتے ہیں
ذرہ پرور ہیں جنھیں کہتے ہیں خورشید ہیں یہ

حُر سے گھبرا کے یہ بولا عمرِ سعدِ شریر
اپنے حاکم کا نہ کچھ ذکر نہ تعریف امیر
سُن چکا ہوں میں کہ مضطر ہی کئی راتوں سے
نہ وہ آنکھیں وہ چتون نہ وہ تیور نہ مزاج
تخت بخشا ہی محمدؐ کے نواسے نے کہ تاج
کون سا باغ تجھے شاہ نے دکھلایا ہی
کیا کسی حور کا دکھلا دیا حضرت نے جمال
قصرِ یاقوت میں پہنچا جو ترا رنگ ہی لال
دفعتاً حقِ نمک کو بھی فراموش کیا
میں جہاں دیدہ ہوں سب مجھ کو خبر ہی تیری
ہونٹ بھی خشک ہیں اور چشم بھی تر ہی تیری
راہ میں کچھ جو سلوک اور نوازش کی ہی
خیر مخفی نہ رہے گا یہ قصور اور فتور
حاکمِ شاہ ہی جابر وہ سزا دے گا ضرور
سب تری قوم کے سر تن سے جدا ہوویں گے
نفع اُس امر میں کیا جس میں ہی مردم کا ضرر
شجرِ قامتِ سرور پہ جو ڈالے گا نظر
الفتِ زلف سے بھی پیچ میں تو آئے گا
بدرِ پیشانیِ سرور کا جو ہی سر میں خیال
سب میں ہو جائے گا انگشت نما مثلِ ہلال
عشقِ رخسار میں رتبہ ترا گھٹ جائے گا

یہ تو ہی صاف طرفداریِ شہ کی تقریر
اللہ اللہ یہ اوصاف یہ مدحِ شبیرؑ
الفتِ شاہ ٹپکتی ہی تری باتوں سے
سیدھی باتوں میں بگڑنا یہ نیا طور ہی آج
جن کو سمجھا ہی غنی دل میں وہ خود ہیں محتاج
کہیں کوثر کے تو چھینٹوں میں نہیں آیا ہی
مل گیا سایۂ طوبےٰ کہ جو ایسا ہی نہال
کون سے میوۂ شیریں پہ ٹپکتی ہی رال
کب تجھے بادۂ تسنیم نے بے ہوش کیا
قرۃ العینِ محمد پہ نظر ہی تیری
جسم خالی ہی اِدھر جان اُدھر ہی تیری
تو نے فرزندِ یداللہ سے سازش کی ہی
لکھیں گے عہدۂ اخبار پہ جو ہیں مامور
گر تجھے دار پہ کھینچیں تو کچھ اُس سے نہیں دور
زن و فرزند گرفتارِ بلا ہوویں گے
آنکھیں نکلیں گی محبت سے جو دیکھے گا اُدھر
سر چڑھے گا ترا برچھی پہ یہ ہی اس کا ثمر
خالِ رخ دیکھا تو گھر خال سے لگ جائے گا
تو اسی ماہ میں نقصان ترا ہووے گا کمال
تیر و شمشیر ہی ابرو کی محبت کا وبال
منہ پہ کہتا ہوں کہ چہرہ ترا کٹ جائے گا

خوف کس بات کا پیاسوں سے یہ تھرّانا کیا
ننگ کی بات ہی دشمن کی طرف جانا کیا
ابھی لیجائیں جو شبیر کا سر ہاتھ لگے
حُر پکارا کہ زبان بند کر او ناہموار
ابن زہرا ہی جگر بند رسولِ مختار
اک زمانہ صفتِ آلِ عبا کرتا ہی
وصف ایسوں کا زباں پر کوئی کیونکر لاوے
کسی انساں نے یہ دنیا میں ہیں رُتبے پاے
الفتِ آل میں مریے تو خوش اقبالی ہی
اسفلوں سے ہی محبت تجھے ای سفلہ مزاج
جس کو کاندھے پہ محمد کے ملی ہی معراج
کیوں ترے سامنے مُکروں کہ یہیں بخشتا ہی
باغ جو مجھ کو دکھایا اُسے کیا جانے گا تو
مجکو اللہ نے بخشی ہیں وہ حوریں خوش رو
نام کوثر کا نہ لے تو نہ مجھے جوش آتا ہی
عزتِ دینِ شرف کون ومکاں ہی شبیر
سنگ پانی ہو وہ اعجاز بیاں ہی شبیر
مہرباں ہوں تو ابھی عقدہ کشائی ہووے
کیا میں اور دوست ستمگر کیا ہیں مری کچھ ہی عیال
واں کی املاک نہ راحت کا ہو کیا مجھ کو خیال
گھر کا اب دھیان نہ بچوں کا الم ہی مجکو

لب پر ہر مرتبہ بیکس کی ثنا لانا کیا
ہو نبی یا کہ وصی جنگ میں شرمانا کیا
غلط ہم اس کو سمجھتے ہیں کہ زر ہاتھ لگے
قابلِ لعن ہی تو اور وہ تیرا سردار
میرا کیا مُنہ جو کروں مدحِ امامِ ابرار
آپ قرآن میں خدا اُن کی ثنا کرتا ہی
تین سو آیہ ہوں تعریف میں جن کی آے
اپنا محبوب وولی جس کو خدا فرماے
سنگ ہی اُن کی محبت سے جو دل خالی ہی
خاکِ پا اُس کا ہوں میں ہی جو سرِ عرش کا تاج
میرے آقا سا بھی کون ہی کونین میں تاج
ہاں مجھے شاہ نے فردوسِ بریں بخشا ہی
راحتِ روح ہی جس باغ کے پھولوں کی بو
کہ جنھیں تیرے فرشتوں نے نہ دیکھا ہو کبھو
اُنھیں چھینٹوں سے تو نے ہوش کہیں آتا ہی
جانِ زہرا کی محمد کی زباں ہی شبیر
جان کیوں ہو نہ اُدھر جانِ جہاں ہی شبیر
وہ نہ بخشیں تو خدا تک نہ رسائی ہووے
جب کہ آفت میں پھنسی احمدِ مختار کی آل
یاں ہوئی جاتی ہی سادات کی کھنچی لی مال
خانہ بربادیِ شبیر کا غم ہی مجکو

دولتِ حاکمِ دون پہ ہی ترا وار و مدار — دارِ دنیا سے تعلق نہیں رکھتے دیندار
کیا مجھے دار پہ کھینچے گا وہ ظالم غدار — خوابِ غفلت ہی اُسے میرا ہی طالع بیدار
کسی سردار نے یہ اوج نہ پایا ہوگا — دارِ طوبے کا مرے فرق پہ سایا ہوگا
ہی سرفراز سدا عاشقِ پیشانیِ شاہ — سجدے کیجے کہ ہی بیت ابروؤں کی بیت اللہ
عشق آنکھوں کا ہی ہر دم کے لیے نورِ نگاہ — ہی وہ یوسف جسے ہو مصحفِ رخسار کی چاہ
عاشقِ لب کو خدا لعل و گہر دیتا ہی — وہ دہن چشمۂ کوثر کی خبر دیتا ہی
خالِ رخسار نہیں گوے سعادت ہی یہ — مجھ سے مجرم کے لیے مہرِ شفاعت ہی یہ
ہوں جو آشفتۂ گیسو تو عبادت ہی یہ — بخدا سلسلۂ بخششِ امت ہی یہ
شبِ معراجِ رسولِ دو جہاں سمجھا ہوں — اُس کے ہر تار کو میں رشتۂ جاں سمجھا ہوں
وصفِ دنداں میں رہے جس کی زباں گوہر بار — موتیوں سے دہن اُس شخص کا بھر دے غفار
شوق میں سیبِ ذقن کے جسے آئے نہ قرار — حور غرفوں سے دکھائیں اُسے رنگِ رخسار
دم بدم چاہنے والوں کے لہو گھٹتے ہیں — یہ گلا وہ ہی گلے جس کے لیے کٹتے ہیں
صدقے اُس سینہ پہ ہیں عاشقِ صافی سینہ — خاک اُس دل پہ جو اُس سینے سے رکھے کینہ
حق نما ہی تو جہاں میں ہی یہی آئینہ — اس کا عاشق ہو تو ہوں کور کی آنکھیں بینا
فیض پاتا ہی وہ جس دل میں ولا ہوتی ہی — چشم کو اُن کی زیارت سے جلا ہوتی ہی
پاؤں یہ وہ ہیں کہ اِن پاؤوں کو جو ہاتھ لگائے — تو سرِ دست سرافرازیِ کونین وہ پائے
گردِ نعلینِ مبارک جو اثر اپنا دکھائے — توتیا ہوے خجل کحلِ جواہر شرمائے
صدقے کر دیں گے سر ان پاؤں پہ ہم ایسے ہیں — دوشِ احمد پہ رہے جو یہ قدم ایسے ہیں
عملِ خیر سے بہکا نہ سکے مجھے ادا ابلیس — یہی کونین کا مالک ہی یہی راس رئیس
کیا مجھے دے گا ترا حاکمِ ملعون و خسیس — کچھ تردد نہیں کہہ دے کہ لکھے پرچہ نویس
ہاں سوے ابنِ شہنشاہِ عرب جاتا ہوں — اے ستمگر جو نجاتا تھا تو اب جاتا ہوں

کہہ کے یہ ڈاب سے غازی نے نکالی تلوار
سرخ آنکھیں ہوئیں ابرو پہ بل آئے اک بار
تن کے دیکھا طرفِ فوجِ امامِ ابرار
پاؤں رکھنے لگا بن بن کے زمیں پر رہوار
غل ہوا سیدِ والا کا ولی جاتا ہی
لو طرفدارِ حسین ابن علی جاتا ہی

حُر نے نعرہ کیا یا حیدرِ صفدر مدد ے
وقتِ امداد ہی یا فاتحِ خیبر مدد ے
روحِ زہرا مدد ے نفسِ پیمبر مدد ے
بندۂ آل ہوں یا خواجۂ قنبر مدد ے
تنِ تنہا ہی غلام اور بہت اظلم ہیں
آئی آواز کہ اے حُر ترے حامی ہم ہیں

مل گئی راہِ خدا واہ رے اقبال ترا
پاک عصیاں سے ہوا نامۂ اعمال ترا
جرم راضی ہوے سب عفو خوشا حال ترا
جلد جا جلد کہ شائق ہی مرا لال ترا
مرد ہی جس کی یہ ہمت یہ ارادہ ہوے
ہاں برادر تری توفیق زیادہ ہوے

منتظر ہیں ترے سب فوجِ حسینی کے جوان
در فردوس پہ مشتاق کھڑا ہی رضواں
راہ تکتی ہیں تری دیر سے حورانِ جناں
شور کوثر پہ ہی شبیرؑ کا مہماں ہی کہاں
فوجِ قدسی تری ہمت کی ثنا کرتی ہی
فاطمہ آج ترے حق میں دعا کرتی ہی

تو بہشتی ہی یہ کافر ہیں کنشتی اے حُر
مٹ گئی سب ترے اعمال کی زشتی اے حُر
دیکھ اب صورتِ حورانِ بہشتی اے حُر
کس تلاطم میں بچی ہی تری کشتی اے حُر
غضب اللہ کا شبیرؑ کی ناراضی ہی
پنجتن تجھ سے ہیں راضی تو خدا راضی ہی

اور بالیدہ ہوا سن کے یہ مژدہ وہ ہژبر
دلِ بیتاب پکارا کہ نہیں طاقتِ صبر
اب تو اس فوج میں اک دم کی بھی تعویق ہی جبر
قعرِ دوزخ ہی مسلمان کے لیے صحبتِ گبر
ہاں اٹھا باگ جو شیدائے شہِ عالی ہی
فوجِ اللہ و نبیؐ میں تری جا خالی ہی

سن کے یہ باگ جو لی اسپِ سبکتاز اڑا
ڈر سے رنگِ عمرِ شعبدہ پرواز اڑا
کیا اڑا رخش کہ طاؤس بصد ناز اڑا
دی پرندوں نے یہ آواز کہ شہباز اڑا
باغِ زہرا میں نسیمِ سحری جاتی ہی
غل تھا دربارِ سلیمانؑ میں پری جاتی ہی

کیا دو تین رسالوں نے تعاقب ہر چند
حر کا ہاتھ آتا تو کیسا نہ ملی گرد سمند
کٹتے تھے شرم سے دہ کے جو دوڑے تھے کمند
یہ چھلاوا تھا کہ آندھی یہ فرس تھا کہ پرند
کیا سبک سوے چمن بادِ بہاری پہونچی
ہم یہیں رہ گئے واں حر کی سواری پہنچی

ہاں ہوئے علمِ امامت سے شہِ دیں آگاہ
ہنس کے عباس سے فرمایا کہ اے غیرتِ ماہ
مرے لشکر کی طرف ہے رخِ حرِ ذی جاہ
سب سے کہہ دو کہ نہ روکے کوئی اس شخص کی راہ
جاؤ لینے کو عجب رتبہ شناس آتا ہے
مرا مہمان مرا عاشق مرے پاس آتا ہے

ذکر یہ تھا کہ صدا دور سے آئی اک بار
الغیاث اے جگر و جان رسولِ مختار
مجرم ایسا ہوں کہ عصیاں کا نہیں جس کے شمار
عفو کر عفو کر اے چشمۂ فیضِ غفار
پار دریائے خطا سے مری کشتی ہو جائے
دوزخی بھی ترے صدقے سے بہشتی ہو جائے

کئی روزوں سے تلاطم میں ہے اے شہنشاہ
مددا اے نوحِ غریباں مرا بیڑا ہے تباہ
دست و پا گم ہیں کچھ ایسے کہ نہیں سوجھتی راہ
شور کرتا ہوں کہ بتلائے کوئی جائے پناہ
ابرِ رحمت کی طرف جا بہ صدا دیتے ہیں
سب ترے دامنِ دولت کا پتا دیتے ہیں

ترے دامن کے نثار اے مرے آقائے جلیل
رحم کر رحم کہ شرمندہ ہے یہ عبدِ ذلیل
دل خنک ہوئے جو نکلے کوئی کوثر کی سبیل
جان آ جائے جو مولائے دو عالم ہوں کفیل
نہ وزیروں میں یہ ہمت نہ شہنشاہ میں ہے
سب مرے درد کا درماں تری درگاہ میں ہے

خلق میں آپ کے والد کے کرم ہیں مشہور
بات میں بخش دیے سیکڑوں بندوں کے قصور
مجھ سے ہیں باگ پکڑ لینے پہ آزردہ حضور
بخش دیجے تو کرم سے نہیں کچھ آپ کے دور
یہ تو کیونکر کہوں میں لائقِ تعزیر نہیں
مگر اس سے زیادہ مری تقصیر نہیں

اے مددگار و معین الضعفا ادرکنی
اے خبر گیرِ گروہِ غربا ادرکنی
پاؤں لغزش میں ہیں اے دستِ خدا ادرکنی
ہاتھ باندھے ہوں میں اے عقدہ کشا ادرکنی
دیجیے حر کو سند نار سے آزادی کی
آئیے جلد خبر لیجیے فریادی کی

مرے اعمال میں ہر چند سراسر ہی بدی
ہوں گنہگار خدا لے ازلی و ابدی

آپ ہیں مالک سرکار جناب احدی
ای خداوند جہاں خذ بیدی خذ بیدی

جو تہی دست ہیں تکتے ہیں شہنشاہ کا ہاتھ
آپ کا ہاتھ زمانے میں ہے اللہ کا ہاتھ

ایک یہ خستہ تن اور درپے جاں لاکھ حریف
ای سلیمان کہیں پامال نہ ہو مور ضعیف

چھوڑ کر آپ کی سرکار کہاں جائے نحیف
کیجیئے اب نظر لطف کہ ہونا ہی خفیف

ہوں سرافراز جو اتنا ہی کرم ہو جائے
نام قنبر کے غلاموں میں رقم ہو جائے

استغاثہ یہ کیا حُر نے جو با دیدۂ نم
جوش میں آگیا اللہ کا دریائے کرم

خود بڑھے ہاتھوں کو پھیلا کے شہنشاہ امم
حُر کو یہ ہاتف غیبی نے صدا دی اس دم

شکر کر سبط رسول الثقلین آتے ہیں
اے بہادر ترے لینے کو حسینؑ آتے ہیں

حُر نے دیکھا کہ چلے آتے ہیں پیدل شبیرؑ
دوڑ کر چوم لیے پائے شہ عرش سریر

شہ نے چھاتی سے لگا کر کہا ای با توقیر
میں نے بخشی مرے اللہ نے بخشی تقصیر

میں رضا مند ہوں کس واسطے مضطر ہے تو
مجکو عباسؑ و لاور کے برابر ہے تو

کس کے کیوں باندھے ہیں ہاتھوں کو میں کہتا ہوں خجل
سہل کر دیں اسے گر اور کوئی ہو مشکل

بھائی آ مجھ سے بغلگیر تو ہو کھول کے دل
غافر و راحم و توّاب ہے رب عادل

جرم سب محو کیے حق نے ترے دفتر سے
آج پیدا ہوا گویا شکم مادر سے

حُر پکارا بابی انت و امی یا شاہ
قابل عفو نہ تھے بندۂ آثم کے گناہ

مجھ سے گمراہ کو اک آن میں لی جا بہ راہ؟
سب ہے صدقہ انھیں قدموں کا خدا ہے آگاہ

مہر ذرہ پہ جو ہو نیر تاباں ہو جائے
آپ جس مور کو چاہیں وہ سلیماں ہو جائے

کون مقداد تھے سلمانؓ و اباذرؓ تھے کون
آپ فرمائیں کہ عمار دلاور تھے کون

شور عالم میں جو ہے مالک اشتر تھے کون
ای خداوند جہاں حضرت قنبر تھے کون

انھیں قدموں کا تصدق تھا کہ ممتاز ہوئے
اسی سرکار کے خلعت سے سرافراز ہوئے

شہ نے فرمایا کہ خالق کی عنایت ہی یہ سب
اس مسبب کی عنایت کے یہ سارے ہیں سبب
اپنے کیسے سے نہ دام اور درم دیتے ہیں
لاکھ ہاتھ اُس کے ہیں دینے کے وہ ایسا ہی جواد
رزق وہ حوصلۂ حرص سے دیتا ہی زیاد
وہ غنی ہی کہ ہی محتاج زمانہ اُس کا
جس قدر اُس سے طلب کیجیے خوشنود ہی وہ
ہاتھ پھیلائیے جو سو بار تو موجود ہی وہ
پرورش جرم پہ بھی صبح و مسا ہوتی ہی
کہہ کے یہ ساتھ لیے حر کو چلے شاہ امم
راس و چپ قاسم و اکبر تھے زہے شان حشم
دور سے اہل خطا تیر جو برساتے تھے
لائے اس عزت و حرمت سے جو مہماں کو امام
شہ نے فرمایا مناسب ہی کوئی دم آرام
فاتحہ پڑھ کے یہ شمشیر و سپر باندھی ہی
ہی بہت شمر و عمر سے مجھے لڑنے کی اُمنگ
لشکر شام سے پیہم چلے آتے ہیں خدنگ
لیکن ایسا نہ ہو بچہ کوئی بے جان ہو جائے
شہ نے فرمایا کہ دشوار ہی فرقت تیری
وا دریغا ہوئی کچھ ہم سے نہ خدمت تیری
آج رتبہ ترا افضل شہدا میں ہوگا

دے کسی شخص کو بندے میں یہ مقدور ہی کب
وہی منعم وہی محسن وہی رازق وہی رب
جب وہ خالق ہمیں دیتا ہی تو ہم دیتے ہیں
ہم اُسے بھولیں تو بھولیں اُسے ہر وقت ہی یاد
شکر معبود کا اس پر بھی نہیں کرتے عباد
کبھی خالی نہیں ہوتا ہی خزانہ اُس کا
صاحب جود ہی وہاب ہی محمود ہی وہ
بخش دیتا ہی کہ ہم عبد ہیں معبود ہی وہ
یاں سے ہوتی ہی خطا واں سے عطا ہوتی ہی
ہاتھ میں ہاتھ تھا مہمان کا اللہ رے کرم
سر پہ کھولے ہوئے تھے حضرت عباسؑ علم
رفقا سایہ میں ڈھالوں کے لیے آتے تھے
بولے عباس کمر کھول اب ہی نیک انجام
عرض کی حُر نے کمر خلد میں کھولے گا غلام
آج اس عزم پہ خادم نے کمر باندھی ہی
ایک ہی وار میں دونوں کو کروں گا چورنگ
شاہزادوں کی سپر ہوں کہ عبادت ہی یہ جنگ
پہلے یہ تازہ غلام آپ پہ قربان ہو جائے
مجھکو مر کر بھی نہ بھولے گی محبت تیری
خیر فردوس میں ہو جائے گی دعوت تیری
شب کو تو صحبت محبوبؐ خدا میں ہوگا

تجھ پہ مخفی نہیں تم سے جو کچھ ہے مرا حال | راہیں ہر سمت کی روکے ہوئے ہیں اہل ضلال
قحط پانی کا ہے اس دشت میں گندم کا ہے کال | نان جو کا بھی ہے ملنا کسی قریہ میں محال
سب کو ایذا عوض آب و غذا ملتی ہے | دودھ اصغر کو نہ عابد کو دوا ملتی ہے

حر نے رو کر سر تسلیم جھکایا بہ ادب | شہ نے رومال رکھا آنکھوں پہ رونے لگے سب
جب چڑھا گھوڑے پہ وہ عاشق سلطان عرب | شاہ بولے کہ عجب دست چھپا ہے غضب
دم بدم یاں سے جو آواز بکا جاتی تھی | گریۂ آل محمد کی صدا آتی تھی

حر چلا فوج مخالف پہ اڑا کر توسن | چوکڑی بھول گئے جس کے تگاپو سے ہرن
وہ جلال اور وہ شوکت وہ غضب کی چتون | ہاتھ میں تیغ سپر دوش پہ بر میں جوشن
دوسرے دوش پہ شملے کے جو بل کھاتے تھے | کاکل حور کے سب پیچ کھلے جاتے تھے

زور بازو کا نمایاں تھا بھرے شانوں سے | دست فولاد دبا جاتا تھا دستانوں سے
بھبھیوں اٹھتا تھا دبکے فرس رانوں سے | آنکھ لڑ جاتی تھی دریا کے نگہبانوں سے
خود رومی کی جو ضو تا بہ فلک جاتی تھی | چشم خورشید میں بجلی سی چمک جاتی تھی

نیزۂ حر کی سناں پر نہ ٹھہرتی تھی نگاہ | تھا یہ ظاہر کہ نکالے ہے زبان مار سیاہ
قبضۂ تیغ پہ رکھے تھا سر عجز پناہ | آفتابی وہ سپر جس سے خجل گردۂ ماہ
قدر اندازوں کو جانوں کے ادھر لالے تھے | تیر ترکش کے نہ تھے آگ کے پرکالے تھے

رن میں جب شہ کی طرف سے حر دیندار آیا | کس بشاشت سے اڑاتا ہوا رہوار آیا
غل ہوا سید مظلوم کا غمخوار آیا | جاں نثار خلف حیدر کرار آیا
تتق نور سر راہ نظر آتا ہے | جلوۂ قدرت اللہ نظر آتا ہے

آنے جانے کا بہادر کے کروں کیا مذکور | پہلے کچھ اور ہی جلوہ تھا پر اب اور ظہور
اے خوشا رتبۂ فیض قدم پاک حضور | غل تھا آتا ہے ملک پہنے ہوئے خلعت نور
صحبت اہل دلاں دل کو جلا کرتی ہے | مس کو اک آن میں اکسیر طلا کرتی ہے

واہ کیا فیض ہی سرکارِ شہ عالم میں
نور یہ حور میں دیکھا نہ بنی آدم میں
تن ہی خوشبو رخ گلرنگ تر و تازہ ہی
مہر ذرہ ہی جہاں چہرۂ روشن ایسا
حرز ہو بازوے داؤد کا جوشن ایسا
گلشنِ دہر میں لو بادِ بہاری آئی
حُر پکارا کہ بجا کہتے ہو لاشک لاریب
دولتِ دیں سے نہ دامن مرا خالی ہو نہ جیب
فیض پا کر پئے شمشیر زنی آیا ہوں
جلوہ خورشید کیا نورِ خدا کی ضو نے
بخت پائے ہیں سکندر کے غلامِ نو نے
دور دور آج سے میرا ہی زمانہ میرا
رخِ روشن کو مرے تکتے ہو کیا حسرت سے
نور وہ ہی جسے دیکھیں نظرِ رغبت سے
مجھ کو بھی دیکھ کے بیمار نہیں تجتے ہو
جانِ سلطانِ رسالت کو غنیمت جانو
نورِ خالق کی زیارت کو غنیمت جانو
ساتھ اس کے برکت خلق سے اٹھ جائے گی
ایک سید کے مٹا دینے میں ہی کونسا نام
گر ہو دانا تو کہو بد ہی کہ ہی نیک کلام
شکرِ احسانِ جنابِ احدی کرتے ہیں

ذرۂ خاک کو خورشید کیا اک دم میں
یہ وہی حُرِ جری ہی جو ابھی تھا ہم میں
خاک نعلینِ مبارک کی عجب غازہ ہی
چاندنی جس سے کرے کسبِ ضیا تن ایسا
ہوش پریوں کے اُڑے جاتے ہیں توسن ایسا
قاف میں غل ہی سلیماں کی سواری آئی
دامنِ حضرتِ شبیر نے ڈھانپے مرے عیب
بارک اللہ کی دیتا ہی صدا ہاتفِ غیب
یاں سے محتاج گیا واں سے غنی آیا ہوں
نور بخشا پسرِ فاطمہؓ کے پرتو نے
گنج وہ لایا ہوں دیکھا جو نہ تھا خسرو نے
کبھی خالی نہیں ہووے گا خزانہ میرا
مَل کے آیا ہوں منہ اپنا قدمِ حضرت سے
وائے وہ لوگ جو محروم ہیں اس دولت سے
ہی غضب آنکھیں تو کھولے ہو مگر سوتے ہو
پسرِ شاہِ ولایت کو غنیمت جانو
قمرِ برجِ امامت کو غنیمت جانو
پھر جو ڈھونڈھو گے یہ دولت نہ ہاتھ لگے گی
اس ہوا پر ہو کہ بجھ جائے چراغِ اسلام
خوش نما کب ہی وہ تسبیح نہ ہو جس میں امام
پیشوا سے کہیں پیرو بھی بدی کرتے ہیں

یہ سخن سن کے پکارا پسر سعد شریر
ہاں طرفدار شہ دیں پہ چلیں نیزہ و تیر
لیے حربوں کو بڑھا فوج کا انبوہ کثیر
فاتحہ پڑھ کے جواں مرد نے کھینچی شمشیر
حر کا منہ سرخ ہوا فوج ستم زرد ہوئی
شعلۂ تیغ سے بجلی کی چمک گرد ہوئی

رعد تھرا گیا نعرے جو سنے ضیغم کے
استخواں کانپ گئے زیر زمیں رستم کے
تہ و بالا ہوئیں لشکر کی صفیں جم جم کے
برق شمشیر سے ڈر ڈر کے فرس بھی چمکے
نوبت جنگ نہ آئی تھی کہ دل ٹوٹ گئے
برچھیاں گر گئیں ہاتھوں سے نشان چھوٹ گئے

چھیڑ کر باگ فرس کو جو ذرا گرمایا
غیظ میں آن کے گھوڑا بھی غضب کف لایا
شیر سا فوج مخالف پہ جھپٹ کر آیا
روند ڈالا اسے دم میں جسے سرکش پایا
اس کا قاتل تھا جو دشمن شہ عالی کا تھا
کاٹ ہر نعل میں شمشیر ہلالی کا تھا

حشر برپا تھا کہ تیغ حر ذیجاہ چلی
آگ برسانے کو بجلی سوئے جنگاہ چلی
کس کرشمہ سے وہ لیلی ظفر راہ چلی
گہ بڑھی گاہ پھری گاہ تھمی گاہ چلی
زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے
چال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

کیں صفیں صاف مگر منہ کی صفائی نہ گئی
کج ادائی کو نہ چھوڑا وہ لڑائی نہ گئی
کاٹ چھانٹ اور وہ لگاوٹ لکھائی نہ گئی
سیکڑوں خون کیے اور کہیں آئی نہ گئی
شور تھا برق پری جلوہ گری نکلی ہے
جان لینے کو اجل بن کے پری نکلی ہے

جس طرف دیدۂ جوہر سے نظر کرتی ہے
پل نہ گزرے کہ صفیں زیر و زبر کرتی ہے
چشم ہر چند کہ پتلی کو سپر کرتی ہے
ہے وہ طرار کہ آنکھوں میں یہ گھر کرتی ہے
اس کے افسوں سے جو ساحر ہو وہ جل جاتا ہے
سحر پریوں کا اسی طرح سے چل جاتا ہے

پھونکے بجلی کو یہ اس آگ کی ہے پرکالا
کاٹ جائے تو کبھی لہر نہ لے پھر کالا
برچھیاں چل گئیں اس پہ جسے دیکھا بھالا
آ گیا دام میں جس شخص پہ ڈورا ڈالا
اس کے پانی میں کف مار سیہ گھولا ہے
بارہ ہو ملک الموت نے منہ کھولا ہے

آئی جس غول پہ لاشوں سے زمیں پاٹ گئی
چاٹ ایسی تھی لہو کی کہ صفیں چاٹ گئی
جس پہ جاتی تھی نہ نے جان کبھی پھرتی تھی
گل نئے پھولے جو برچھی پہ لگا پھل اُس کا
ڈھیر تھا خاک پہ کاٹا ہوا جنگل اُس کا
شور تھا دیکھیے کیونکر یہ بلا ٹلتی ہے
جنگ میں تیغ کو دعوا تھا کہ یکتا ہوں میں
چرخ کہتا تھا کہ یارب تہ و بالا ہوں میں
کس میں ہے یہ جو تڑپ برق فلک میری ہے
نہ تھمی سنگ سے وہ اور نہ رُکی آہن سے
نہ اُٹھی اُس کی کڑی ضرب کسی جوشن سے
جوش طوفاں کا دکھا کر وہ خوش اسلوب گئی

کثرت جوہر زانی سے وہ گو جال میں تھی
تھی چمک جانے میں تجلی تو یہی چال میں تھی
کہیں دم لینے کی مہلت تھی نہ سنبھل کے لیے
صید کرنے کو جدھر صورت شہباز آئی
غل ہوا شہپر شاہین کے تلے قاز آئی
گرچہ قبضے میں لیے تھی اُسے پر چھوڑ دیا
آب نے آتش سوزاں کا اثر دکھلایا
باڑھ نے جادۂ صحرائے سقر دکھلایا
تیغ کہتی تھی در فتح کی مفتاح ہوں میں

دست و پا صدر و کمر گردن و سر کاٹ گئی
دیکھی تیغوں کی جدھر باڑھ اُسی گھاٹ گئی
ایک بجلی تھی مگر لاکھ جگہ گرتی تھی
زور دکھلاتا تھا ہر ضرب میں کس بل اُس کا
جو بڑھا جنگ میں قصہ ہوا فیصل اُس کا
اس قدر جلد تو سیفی بھی نہیں چلتی ہے
سر اُٹھایا تھا یہ گھوڑے نے کہ عنقا ہوں میں
برق کہتی تھی کہ تلوار ہے یہ یا ہوں میں
تیغ کرتی تھی اشارا یہ چمک میری ہے
ہاتھ اُڑا دیتی تھی پہونچوں سے تو سر گردن سے
چل گئی باد مخالف جدھر آئی سن سے
خوں کے دریا میں ہر اک کشتی تن ڈوب گئی ——

پر تڑپ صورت ماہی ہی ہر حال میں تھی
کبھی مغفر میں کبھی سر میں کبھی ڈھال میں تھی
تھی جگر کے لیے برچھی تو چھری دل کے لیے
لاکھ تڑپا وہ نہ بے جان لیے باز آئی
اُڑ گیا طائر دل اور نہ آواز آئی
تھا زبس صید زبوں کاٹ کے سر چھوڑ دیا
تاب نے مرگ مفاجات کا گھر دکھلایا
گھاٹ نے آئنۂ فتح و ظفر دکھلایا
قول قبضہ کا یہ تھا قابض ارواح ہوں میں

خم وہ پایا تھا کہ شرمائے ہلالِ مہِ عید
حُر کے ہاتھ آ گئی تھی گلشنِ جنت کی کلید

برش ایسی تھی کہ کٹ کٹ گئی سب فوجِ یزید
جامۂ کفر کے پرزے بھی ہوئے قطع و برید

نہ بچا تارِ نفس خلق میں جینے کے لیے
چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لیے

کئی حملے کیے پیہم جو کمانداروں پر
چل گئے تیر ملامت کے جفاکاروں پر

چٹکیاں سب کی دھری رہ گئیں سوفاروں پر
رخ پھرا تھا کہ گری برق ستمگاروں پہ

جل کے خرمن ہوا یوں خاک کہ خوشہ نہ ملا
کشمکش میں کہیں چھپنے کو بھی گوشہ نہ ملا

نیزۂ فوجِ ستمگار تھے دیکھے بھالے
دم میں اس شیرِ نیستاں نے قلم کر ڈالے

گرچہ تھے جان لڑائے ہوئے لڑنے والے
آفتِ مرگ کو سر سے کوئی کیونکر ٹالے

جب سواروں کے پرے جنگ پہ تن جاتے تھے
بند سب ناخنِ شمشیر سے کھل جاتے تھے

الفِ گرز کو کر دیتی تھی ہر ضرب ہی دال
تھی نئی آمد و رفت اور نئی طرح کی چال

کبھی برچھی کی انی تھی تو کبھی تیر کی بھال
کبھی تلوار کبھی خنجرِ برّاں کبھی ڈھال

غرب کو روک کے دشمن کو فنا کرتی تھی
دم بدم فوجِ ستمگر بھی ثنا کرتی تھی

شور تھا آگ ہے تلوار میں یا پانی ہے
جل بجھے کشتیِ تن خون میں طوفانی ہے

ضرب میں فرد ہے یہ زور میں لاثانی ہے
کہتا تھا حُر یہ فقط قوتِ ایمانی ہے

زور تھا مجھ میں نہ ایسا نہ وغا کی طاقت
سب ہے یہ سبطِ پیمبر کی دعا کی طاقت

کہہ کے یہ فوج میں پھر تشنہ جگر ڈوب گیا
ورطۂ قلزمِ آفت میں گہر ڈوب گیا

لشکرِ شام کے بادل میں قمر ڈوب گیا
کشمکش تھی کہ عرق میں گلِ تر ڈوب گیا

تھا کبھی شیر سا بپھرا ہوا شمشیروں میں
کبھی نیزوں کے نیستاں میں کبھی تیروں میں

گہ چھپا اور گہے نکلا وہ مہِ برجِ شرف
گہے اس صف میں در آیا گہے روندی صف

گہے دریا کے کنارے گہے صحرا کی طرف
گہے نعرہ تھا کہ صدقے ترے یا شاہِ نجف

جتنے مجروح تھے دم ان کے نکل جاتے تھے
شیر بھی نام علیؑ سن کے دہل جاتے تھے

نخل تھراتے تھے سب گونج رہا تھا جنگل
سرکی جاتی تھی زمیں رن کی غضب تھی ہلچل
کوند جاتی تھی سروں پر جو وہ شمشیر اجل
منہ کے بھل گرتا تھا کوئی تو کوئی سر کے بھل
حشر برپا تھا سواروں پہ فرس لوٹتے تھے
دو پہ چار ایک پہ دو پانچ پہ دس لوٹتے تھے

بڑھ کے فرماتے تھے عباسؑ زہے عزّ و جاہ
بارک اللہ کی دیتا تھا صدا دلبر شاہ
کہتے تھے ابن حسنؑ واہ حُر غازی واہ
شاہ ہر ضرب پہ فرماتے تھے ماشاء اللہ
اپنی جاں بازی کا غازی جو صلہ پاتا تھا
مسکراتا ہوا تسلیم کو جھک جاتا تھا

حیف جھکنے میں لعینوں نے جو فرصت پائی
سامنے چھوڑ کے سب فوج عقب سے آئی
لاکھ خونریز اُدھر اور اِدھر تنہائی
باگ گھوڑے کی پھراتا تھا کہ برچھی کھائی
آگیا موت کے پنجہ میں نہ کچھ دیر لگی
فرق پر گرز لگا دوش پہ شمشیر لگی

سینہ غربال ہوا تیر چلے اعدا کے
رکھ دیا شیر نے قربوس پہ سر تیوڑا کے
علی اکبرؑ نے یہ حضرت سے کہا چلّا کے
گر ہو ارشاد تو مہمان کو بچاؤں جا کے
خادم حضرت زہرا و علیؑ گرتا ہے
خاک پہ اب وہ سعید ازلی گرتا ہے

شاہ رونے لگے یہ سنتے ہی مہماں کی خبر
ہوگئی آنسوؤں سے ریش مبارک سب تر
علی اکبرؑ سے کہا تم ابھی ٹھہرو دلبر
حُر کی امداد کو ہم جائیں گے ای نور نظر
کس سے اس وقت کہوں حق جو تعلق مجھ پر ہے
لاش اُٹھاؤں گا کہ مہمان کا حق مجھ پر ہے

عرض کی حضرت عباسؑ نے جاتا ہے غلام
جوش رقت میں کہا شہ نے نہیں ای گلفام
میری الفت میں ہوا قتل حُر نیک انجام
دوست ایسے جو برے وقت میں آئے نہ کام
اُس پہ جب سخت گھڑی ہوگی تو کام آویں گے
لاش کیا قبر میں مہماں کی ہم جاویں گے

اُس کے لاشے پہ نہ جائیں یہ مروت سے ہے دور
اُس سے ہم شاد ہوے وہ بھی تو ہو کچھ مسرور
قصر خلد اُس کو دکھائیں کہ ہوے عفو قصور
سرخرو جاتا ہے دنیا سے وہ خالق کے حضور
ایسا ذی رتبہ کوئی خلق میں کم نکلے گا
میرے مہماں کا مری گود میں دم نکلے گا

یہ سخن کہہ کے چلے رن کو جنابِ شبیرؑ
واں گرا خاک پہ گھوڑے سے حرِ باتوقیر
دیکھ کر شاہ کو آتے ہوئے بھاگے بے پیر
پہونچے لاشے پہ امام دوجہاں وقتِ اخیر
چمنِ ہستیِ مہماں کو اجڑتے دیکھا
ایڑیاں خاک پہ زخمی کو رگڑتے دیکھا

گر کے لاشے کے برابر یہ پکارے سرور
مرے مہماں مرے مددگار و معین و یاور
گرز کیا تجکو لگا ٹوٹ گئی میری کمر
گر پڑا گھوڑے سے اور آہ نہ کی مجھ کو خبر
دوست کے ہجر میں کب دوست کو چین آیا ہے
کھول دے چشم کو بھائی کہ حسینؑ آیا ہے

واہ رے حرِ جری میں تری ہمت کے فدا
اس کو کہتے ہیں محبت اسے کہتے ہیں وفا
ہے یہ بیکس ترا شرمندۂ احساں بخدا
بس یہی بھائی بھی کرتے ہیں جو کچھ تونے کیا
حق تعالیٰ چمنِ خلد میں گھر دے بھائی
اس ریاضت کا خدا تجکو ثمر دے بھائی

حر کو چونکا کے حبیب ابن مظاہر نے کہا
آپ نے تاب ہیں ای حرِ جری ہوش میں آ
دیکھ دیدارِ جگر بندِ جنابِ زہراؑ
کوچ در پیش ہے یہ وقت نہیں غفلت کا
دم رکا ہے تو اشارے سے وصیت کرلے
نزع میں نورِ الٰہی کی زیارت کرلے

کسی آقا نے کبھی کی ہے یہ توقیرِ غلام
دیکھ تو رحم ترے واسطے روتے ہیں امام
بھائی فرماتے ہیں شفقت سے شہِ عرش مقام
ای خوشا حال خدا سب کا کرے نیک انجام
حشر تک خلق میں یہ ذکرِ غم انگیز رہا
تو تو بچپن کے غلاموں سے بھی تیز رہا

نیم وا چشم سے حر نے رخِ مولا دیکھا
زیرِ سر زانوے شبیرؑ کا تکیا دیکھا
مسکرا کر طرفِ عالمِ بالا دیکھا
شہ نے فرمایا کہ ای حرِ جری کیا دیکھا
عرض کی حسنِ رخِ حور نظر آتا ہے
فرش سے عرش تلک نور نظر آتا ہے

باغِ فردوس دکھاتا ہے مجھے اپنی بہار
صاف نہریں ہیں رواں جھوم رہے ہیں اشجار
شاخ سے میری طرف بڑھتے ہیں میوہ بار
حوریں لاتی ہیں جواہر کے طبق بہرِ نثار
ہے یہ رضواں کی صدا دھیان کدھر تیرا ہے
دیکھ اے شاہ کے مہماں یہ گھر تیرا ہے

مجکو لینے چلے آتے ہیں فرشتے یا شاہ
خلد سے شیرِ خدا نکلے ہیں اللہ اللہ
ننگے سر احمدِ مختار کی پیاری آئی

قبلہ رو کیجیے لاشہ مرا ای قبلۂ دیں
کوچ نزدیک ہی ای بادشہِ عرش نشیں
بات بھی انسے زباں سے نہیں کی جاتی ہی

کہہ کے یہ گود میں شبیر کے لی انگڑائی
شہ نے فرمایا ہمیں چھوڑ چلے کیوں بھائی
طائرِ روح نے پرواز کی طوبا کی طرف

لاش اُٹھا کر شہِ دیں خیمہ کے در پر آئے
غل ہوا خیمۂ عصمت میں کہ سرور آئے
دخترِ فاطمہؑ سامان عزا کرنے لگی

شاہ چلّائے کہ ای زینب و امِ کلثوم
ماں ہی یاں اس کی نہ خواہر یہ تمھیں ہی معلوم
اجر ہو گا تمھیں اشکوں سے جو منہ دھوؤگی

کہدو کبرا سے کہ ماتم کے لیے کھولے سر
جاں گزا بین کرے بانوے تفتیدہ جگر
غل ہی فریاد کا آوازِ بکا آتی ہی

میری جانب سے کہو لاش پہ آئیں سجادؑ
یہ وصیت مری شیعوں کو ہی رکھیں اسے یاد
جس عزا خانہ میں دہ تعزیہ میرا رکھیں

ملک الموت بھی کرتا ہی محبت کی نگاہ
لو بر آمد ہوے شبرؑ بھی پدر کے ہمراہ
دیکھیے آپ کے نانا کی سواری آئی

پڑھیے یٰسں کہ اب ہی یہ دمِ بازپسیں
لیجیے تن سے نکلتی ہی مری جانِ حزیں
کچھ اُڑھا دیجیے مولا مجھے نیند آتی ہی

آیا ماتھے پہ عرق چہرے پہ زردی چھائی
چل بسے حرؑ جری پھر نہ کچھ آواز آئی
پتلیاں رہ گئیں پھر کر شہِ والا کی طرف

پانوں مہماں کے سنبھالے علی اکبر آئے
پیچھے پردے کے حرم کھولے ہوے سر آئے
فضّہ پردے کے اُدھر آ کے پکارنے لگی

ہم بھی مظلوم ہیں مہمان بھی ہوا ہی مظلوم
کون لاشے پہ کرے نالہ و فریاد کی دھوم
اُس کو یوں روؤ کہ جس طرح مجھے روؤگی

روے ناداں سکینہؑ اسے عمو کہہ کر
ہم ادھر لاش پہ ماتم کریں تم روؤ ادھر
سن لو اماں کے بھی رونے کی صدا آتی ہی

بعد مرنے کے ہو تا روح مرے دوست کی شاد
نامِ حرؑ حسن کے کریں آہ و فغاں نہ فریاد
اُس کا ماتم بھی اسی بزم میں برپا رکھیں

دوست کے دوست کا غم دوست سدا کرتے ہیں
فاتحہ دیتے ہیں سامان عزا کرتے ہیں
تھا یہ وہ دوست کہ جاں اس پہ فدا ہوتی ہے
سن کے یہ شور ہوا حُرِ دلاور ہے ہے
خوں میں سب تر ہے ترا روئے منور ہے ہے
اِدھر آنا تھا کہ تیری اجل آئی بھائی
بس انیسؔ اب یہ دعا مانگ کہ اے ربِّ عباد
رونے والے شہ والا کے رہیں خلق میں شاد
عشرۂ ماہ عزا نالہ کشی میں گزرے

حق محبت کا وفادار ادا کرتے ہیں
غیر مرجاتا ہے گھر میں تو بکا کرتے ہیں
فاطمہؓ اپنا پسر کہہ کے اُسے روتی ہے
اے مددگارِ جگر بندِ پیمبر ہے ہے
تشنہ و بیکس و مظلوم کے یاور ہے ہے
گھر میں سادات کے دعوت کبھی نہ کھائی بھائی
لکھنؤ کے طبقے کو تو سدا رکھ آباد
اُن کے سایہ میں برومند ہو ان کی اولاد
سال بھر شہ کے غلاموں کو خوشی میں گزرے

رباعی

افسوس زمانے کا عجب طور ہوا
کیوں چرخ کہن آہ نیا دور ہوا
بس یاں سے کہیں اور چلو جلد انیسؔ
اب یاں کی زمین اور فلک اور ہوا

رباعی

مال و زر و افسر و حشم ملتا ہے
ممکن ہے نگین طبل و علم ملتا ہے
عنقا گوگرد سرخ پارس اکسیر
یہ سب ملتے ہیں دوست کم ملتا ہے

مرثیہ ۶

جب حر کو ملا خلعتِ پرخونِ شہادت
جنت میں گیا رالیفِ گلگونِ شہادت
مستوجبِ رحمت تھا وہ مفتونِ شہادت
جاں بیچ کے پایا دُرِ مکنونِ شہادت
بے سر دیے ہرگز یہ مہم سر نہیں ہوتی
ہاتھ آئی وہ دولت جو میسر نہیں ہوتی

یہ مرتبہ بے شکر گزاری نہیں ہوتا
یہ اوج بجز رحمتِ باری نہیں ہوتا
بے فیض یہ چشمہ کبھی جاری نہیں ہوتا
کم قدر کا پلہ کبھی بھاری نہیں ہوتا
راحت بھی اُٹھائی ہے جب آزار ملے ہیں
غواص کو اکثر دُرِ شہوار ملے ہیں

غل تھا کہ یہ اچھوں کی رفاقت کا ثمر ہے
جنت گلِ زہراؑ کی محبّت کا ثمر ہے
ایمان فقط نخلِ ولایت کا ثمر ہے
سرسبزیِ حُر باغِ ریاضت کا ثمر ہے
مولا جسے چاہیں وہ گناہوں سے بری ہو
کھیتی یہ ہرا ول کی ہے کیونکر نہ ہری ہو

اک جا تھے حُر و شمر یہ عالم میں ہے مشہور
کیا شانِ خدا ہے کہ یہ مغفور وہ مقہور
وہ ہوتا ہے جو ہوتا ہے اللہ کو منظور
انسان رہے حق کی طرف اپنے بمقدور
دولت کو نہ حشمت کو نہ آرام کو دیکھے
آنکھیں وہی رکھتا ہے جو انجام کو دیکھے

اللہ کے محبوب کے دربار میں پہونچا
سر دے کے ید اللہ کی سرکار میں پہونچا
بے رنج و خلش گلشنِ بے خار میں پہونچا
وہ نار میں یہ خلد کے گلزار میں پہونچا
مالک نے لیا اس کو اسے شاہِ عربؐ نے
رحمت نے اسے گھیر لیا اس کو غضب نے

رویا اسے زہرا کا پسر واہ ری قسمت
زانوے حسینؑ اور وہ سر واہ ری قسمت
طوبیٰ کے تلے خلد میں گھر واہ ری قسمت
دنیا سے یہ رحمت کا سفر واہ ری قسمت
کیا جلد گیا سوئے ارم دارِ فنا سے
سوکھا جو پسینہ بھی تو جنّت کی ہوا سے

خواہش یہ ہر اک حور کی تھی حُر ادھر آئے
لہراتا تھا کوثر بھی کہ یہ وُر ادھر آئے
مشتاق ملاقات کے سب چھوٹے بڑے تھے
فرماتی تھی زہرا مرے غمخوار کو لاؤ
تعظیم سے تکریم سے جرّار کو لاؤ
پایا نہ کفن واں تو یہاں شاد کروں گی
حوروں کا وہ میووں کے طبق سامنے لانا
کوثر ہی وہ منظور ہی گر پیاس بجھانا
جو کہ وہ کریں فخر ہی خدمت شہدا کی
حقا کہ یہ رتبہ شہ ذی جاہ نے بخشا
طالب تھا وہ جس کا وہی اللہ نے بخشا
جنت ادھر آئی جدھر آیا قدم اُن کا
اے حُرِّ دلاور تری تقدیر کے صدقے
مہماں کے تصدّق شہ دلگیر کے صدقے
ناکام کا یوں کام ملاقات میں بن جائے
اب یاں سے رقم کرتا ہی یوں راوی صادق
پھر فوج پہ برسانے لگے تیر منافق
ایک ایک سے پہلے تھا خریدار اجل کا
یوں جاتے تھے میدانِ شہادت میں جرّار
خود روکتے تھے فرق پہ جب آتی تھی تلوار
برچھی جو لگی نخلِ شہادت میں پھل آیا

یہ صاحبِ اقبال و تہوّر ادھر آئے
فرماتے تھے حیدر یہ بہادر ادھر آئے
محبوب خدا ہاتھوں کو پھیلائے کھڑے تھے
جلدی مرے پیارے کے مددگار کو لاؤ
لاؤ مرے آگے حُرِ دیندار کو لاؤ
میں حلّۂ جنت اُسے امداد کروں گی
در پردہ اشارے کہ ہماری طرف آنا
اس قصرِ جواہر سے کہیں اور نہ جانا
ہم سب ہیں کنیزیں پسرِ شبّر خدا کی
ایمان کا شرف فاطمہؑ کے ماہ نے بخشا
بخشا اُسے خالق نے جسے شاہ نے بخشا
کر دیتا ہی انساں کو فرشتہ کرم اُن کا
رتبے کے فدا عزّت و توقیر کے صدقے
اُس صحبتِ ذی قدر کی تاثیر کے صدقے
برسوں کا جو بگڑا ہو وہ اِک بات میں بن جائے
جب قتل ہوا حر سا مددگار موافق
مر جانے پہ اک دل ہوئے سب شاہ کے عاشق
سر کٹ رہے تھے گرم تھا بازار اجل کا
جس طرح کہ بچھڑی ہوئی بلبل سوئے گلزار
باران کرم جانتے تھے تیروں کی بوچھار
جان آ گئی جس وقت پیام اجل آیا

زخموں کو عطائے صمدی جانتے تھے وہ
آزار کو لطف احدی جانتے تھے وہ
جینے کو مقدر کی بدی جانتے تھے وہ
مرنے کو حیات ابدی جانتے تھے وہ
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ محمدؐ کی ثنا تھی
دو روز کی پیاس اُن کے لیے آبِ بقا تھی

قربانِ تولائے حبیب ابن مظاہر
یکساں صفتِ مہر ہیں باطن و ظاہر
عصیاں سے بری طیب و پاکیزہ و طاہر
جاں باز جہاں دیدہ فنِ جنگ سے ماہر
سر ہلتا تھا پیری سے قدِ راست میں خم تھا
اِس پر بھی کچھ آگے ہی جوانوں سے قدم تھا

رعشا تھا کہ قابو میں نہ تھے دستِ نکوکار
پر ایک میں محکم تھی سپر ایک میں تلوار
جب شہ کی طرف تیر لگاتے تھے ستمگار
یہ بڑھ کے اُسے روکتے تھے سینے پہ ہر بار
بھائی مرے پاس آؤ یہ فرماتے تھے حضرت
جب تیر انھیں لگتا تھا تڑپ جاتے تھے حضرت

جب ایسے رفیقوں کا پرا ہو گیا خالی
بھرتا تھا دمِ سرد وہ کونین کا والی
پھر تھا کوئی مولا کا نہ ہمدم نہ موالی
لاشوں کو لگاتے تھے گلے سرورِ عالی
بے تاب تھے اس طرح ہر اک دوست کے غم میں
جیسے کوئی رہتا ہو برادر کے الم میں

لاشوں کے اُٹھانے سے نہ پائی تھی فراغت
جو تول کے نیزوں کو بڑھے اہلِ شقاوت
مولا کے یگانوں نے کیا عزمِ شہادت
لٹنے لگی زہرا و محمدؐ کی بضاعت
سیدانیوں کا دودھ جو پی پی کے پلے تھے
جلادوں کی تلواریں تھیں اور اُن کے گلے تھے

لاکھوں سے لڑے حضرتِ عباسؑ کے بھائی
حملوں میں دکھائی شہِ مرداں کی لڑائی
سب شانِ پدر بیٹوں نے جعفرؑ کے دکھائی
مسلم کی جو میراث تھی فرزندوں نے پائی
لاکھوں میں بھی پھر اس شان سے شاہِ دو جہاں تھے
دو طفل جلو میں فقط اور تین جواں تھے

دو طفل وہ جو تین شب و روز کے پیاسے
زینب کے پسر شیرِ الٰہی کے نواسے
خود اپنی شہادت کے طلب گار خدا سے
بے تاب کہ کیوں رہ گئے پیچھے شہدا سے
جیتے کی ہماری جو خبر پائیں گی اماں
لاشے بھی یقیں ہے کہ نہ منگوائیں گی اماں

قاسم حسنِ سبز قبا کا مہ تاباں
ہم شکل نبیؐ نورِ نگاہ شہِ ذی شاں
تاباں نظر آتا تھا قمر پاس قمر کے

ایک ایک جری ملک شجاعت کا شہنشاہ
ذی قدر سرافراز و فائیش دل آگاہ
پیدا یہ تہور سے کہ لاکھوں ہیں تو کیا ہیں
کھوئے ہوئے رایت کوئی توڑے ہوئے شمشیر
فاقوں میں زبردست کہ لاکھوں سے نہ ہوں کم
جز سجدۂ حق سر کبھی اُن کے نہ جھکے تھے

اس وقت عجب غم تھا شہ جن و بشر کو
کھو سکتے تھے بھائی کو نہ اکبر سے پسر کو
میوے تھے سب اک باغ کے پھول ایک چمن کے
فرماتے تھے موت آئے تو چھٹ جاؤں الم سے
بچھڑیں ہمیں ان سے یہ جدا ہوں نہ ہم سے
ہاتھوں سے یہ محبوب گنوائے نہیں جاتے

آگاہ ہوا شور مبارز طلبی کا
مُنہ سُرخ ہوا غیظ سے ہم شکل نبی کا
حیدر کے نواسوں کی بھی ابرو پہ بل آیا
گھبرا کے پکارے جو اُسے سبطِ ابرار
کی عرض بصد عجز کہ اے کُل کے مددگار
نے تاب ہیں دل جان لڑائی میں لٹی ہے

عباسِ علیؑ چشم و چراغ شہ مرداں
زینبؑ کے پسر جعفر و زہراؑ کے دل و جاں
پانچوں یہ جری چاند تھے شبیرؑ کے گھر کے
بچپن میں اولوالعزم کہ العظمۃ للہ
شیر اُن کی نظر دیکھ کے بن جاتے تھے روباہ
دعویٰ تھا ہر اک کو کہ ہمیں شیر خدا ہیں

بے تاب کہ تلوار کے چلنے میں ہے کیوں دیر
بیشے میں پلے جو اسد اللہ کے وہ شیر
پر قبلۂ عالم کا ادب تھا جو رکے تھے
نہ روح کو راحت تھی نہ آرام جگر کو
نہ عون و محمد کو نہ شبرؑ کے قمر کو
وہ بھائی کا بیٹا تھا یہ بیٹے تھے بہن کے

یارب مرا گھر ہے انھیں جراروں کے دم سے
کٹ جائے گلا جلد کہیں تیغِ دو دم سے
داغ اب ترے بندے سے اُٹھائے نہیں جاتے
پھر قصد لعینوں نے کیا بے ادبی کا
رایت بھی بڑھا فوجِ رسول عربی کا
چھوٹا تو یہ بگڑا کہ پرے سے نکل آیا

بس پھر کے گرے پاؤں پہ آقا کے وہ جرار
ہم دونوں غلام اب ہیں اجازت کے طلبگار
اے نورِ خدا ذرہ نوازی کی گھڑی ہے

مرنے کو اگر چلے گئے قاسمؑ و اکبرؑ
شبر کی وہ تصویر یہ ہم شکل پیمبرؐ
مالک ہیں خداوند ہیں سردار ہیں دونوں

بسمل جو ہوئے مسلمِ مظلوم کے پیارے
اماں نے کہا ہوگا کہ اب تک نہ سدھارے
قاصر ہیں جو توقیرِ شہادت نہیں ملتی

حضرت پہ ہے روشن جو ہمارا ہے ارادہ
نانا تو علیؑ جعفرِ طیار سے دادا
شیروں کی طرح بیشۂ حیدر میں پلے ہیں

وہ تیغ کے مالک ہیں تو مختار ہیں ہم بھی
نانا تھے جو کرار تو جرار ہیں ہم بھی
ہے جوشِ دغا عمر کے پیمانے بھرے ہیں

ہم آپ سے مرنے کے لیے جا نہیں سکتے
بے حکم جو مطلب ہو اُسے پا نہیں سکتے
پیچھے رہے اوروں سے یہ تقدیر ہماری

ہم دونوں غلام اکبر و اصغر کے ہیں یا شاہ
اماں کا تو نازک ہے مزاج آپ ہیں آگاہ
پوچھیں گی خفا ہو کے تو کیا اُن سے کہیں گے

عورت ہیں پہ خو بو شہِ مرداں کی ہے ساری
تم یہ نہ سمجھو کہ میں عاشق ہوں تمہاری
کس کام کے پھر سر جو تصدق نہ کرو گے

باشاہ ہمیں دودھ نہ بخشیں گی مادر
توقیر اسی میں ہے کہ ہم صدقے ہوں اُن پر
ہم ان کے بزرگوں کے نمک خوار ہیں دونوں

ہم خیمے میں جا سکتے نہیں شرم کے مارے
جانوں کو بچاتے ہیں جگر بند ہمارے
کیا جانیں اسے وہ کہ اجازت نہیں ملتی

سن کم ہیں پہ ہمت ہے جوانوں سے زیادہ
ہم ڈھونڈھتے ہیں صبح سے فردوس کا جادہ
تلواروں سے ہم کھیل کے اس گھر میں بڑھے ہیں

دادا کی طرح مرنے پہ تیار ہیں ہم بھی
سر دے کے شہادت کے طلبگار ہیں ہم بھی
ہم صبح سے سر نذر کو ہاتھوں پہ دھرے ہیں

زخمِ تبر و تیر و سناں کھا نہیں سکتے
آداب سے کچھ لب پہ سخن لا نہیں سکتے
ہاتھ آپ کے ہے عزت و توقیر ہماری

الفت کو بس اب دل سے اٹھا دیجیے للہ
بنتِ اسدِ حضرتِ باری ہیں وہ ذی جاہ
آزردہ ہوئیں وہ تو کہیں کے نہ رہیں گے

شب کو بھی یہ فرمایا تھا ہم سے کئی باری
بھائی سے مجھے جان نہ اولاد ہے پیاری
تب دودھ میں بخشوں گی جو عزت سے مرو گے

یہ کہہ کے جو رونے لگیں زینب جگر بند
کھوئے ہیں کسی بھائی نے ہمشیر کے فرزند
تنہائی کا دکھ فاطمہ کا لال سہے گا
اکبر کو تو ہمشیر نے میں نے تمھیں پالا
اب کون ہے غربت میں مرا تھامنے والا
دس سال بھی پورے نہیں دونوں کے سنوں میں
دونوں سے یہ فرما کے ادھر روتے تھے شبیرؑ
سر زانو پہ تھا فکر میں اور لب پہ یہ تقریر
میں جانتی تھی پہلے اجازت وہی لیں گے
آتا ہے دم صبح سے یاں لاشے پہ لاشا
پائی نہ اجازت یہ سخن خوب تراشا
رکتے ہیں دلاور کہیں روکے سے کسی کے
بانو نے کہا دونوں کی عمریں ہیں ابھی کیا
میدان کی رضا دیتے نہ ہوں گے شہ والا
سن لیجیے گا رن میں جو کچھ کام کریں گے
فرمایا کہ ہاں جو مجھے تقدیر دکھائے
کیوں شاہ سے رخصت کا سخن لب پہ نہ لائے
جو چاہیں کریں بیٹوں کے قابل میں کہاں ہوں
یہ ذکر تھا فضہ جو خبر لے کے یہ آئی
لو میرے خوزادوں نے رضا جنگ کی پائی
نیچے بھی شریکِ شہدا ہوتے ہیں لوگو

حضرت نے کہا میں ہوں بہر حال رضا مند
کس منہ سے کہوں آہ کہ ہو خاک کے پیوند
لاشے کے اٹھانے کو بھی کوئی نہ رہے گا
ماموں سے جدا ہوتے ہو جب ہوش سنبھالا
دل کا کوئی ارمان بھی تم سے نہ نکالا
دنیا سے اجل لے چلی شادی کے دنوں میں
چپ بیٹھی تھی اندر اٹھیں وہیں ادھر شاہ کی ہمشیر
محجوب کیا بیٹوں نے ہے ہے مری تقدیر
اس کی نہ خبر تھی کہ دغا وقت پہ دیں گے
اُن کے لیے اوروں کی لڑائی ہے تماشا
باتیں ہیں یہ ساری مجھے باور نہیں حاشا
وہ سب بھی تو پیارے تھے حسین ابن علی کے
نہ گھر سے وہ نکلے نہ کوئی معرکہ دیکھا
آزردہ نہ ہوں آپ یہ غصے کی نہیں جا
حیدر کے نواسے ہیں بڑا نام کریں گے
جی جاؤں گی مر کر جو وہ میدان سے آئے
کیا جانیے کس فکر میں ہیں وہ مرے جائے
اب وہ مرے فرزند نہیں دونوں کی ماں ہوں
فریاد کہ اب لٹتی ہے زینب کی کمائی
اے بنتِ علیؑ رو رہے ہیں آپ کے بھائی
دو بھانجے ماموں سے جدا ہوتے ہیں لوگو

فضہ سے یہ سنتا تھا کہ بس رونے لگے سب
فرمایا کہ صد شکر بر آیا مرا مطلب
بہتر ہے جو لڑنے کو وہ پیارے گئے دونوں
بچے ہیں لڑائی کے نہیں ڈھنگ سے واقف
فوجوں سے نہ آگہ نہ فنِ جنگ سے واقف
بوٹا سے ہیں قد بھی نہیں کچھ ایسے بڑھے ہیں
دہ سالہ و نہ سالہ تھے نکلے جو وطن سے
بچے مرے کم زور ہیں فاقوں کے محن سے
محسوب ہوں فدیوں میں علی ابن ولی کے
بانو نے کہا دیکھ لو پھر اُن کو بلا کر
اصرار کیا سب نے تو گردن کو جھکا کر
صدقے گئی کچھ کام ہے یاں آ کے سدھارو
فضہ گئی اور خیمے میں لائی اُنھیں ہمراہ
قدموں پہ گرے ہاتھوں کو جوڑے جو وہ ذیجاہ
ماموں پہ فدا ہوتے ہو میں تم پہ فدا ہوں
چھوٹے نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ مادر
جاتا تھا وہاں ایک کے بعد ایک دلاور
کس سے کہیں آقا پہ جو کچھ رنج و تعب تھا
لاشوں کا وہ آنا وہ ہجومِ الم و یاس
آزردہ نہ ہوں آپ ہمیں تھا یہی وسواس
جوڑے ہیں کبھی ہاتھ کبھی گرد پھرے ہیں

اور خاک پہ سجدے کو جھکیں حضرت زینب
عزت مرے بچوں کی ترے ہاتھ ہے یارب
یہ خوشخبری آئے کہ مارے گئے دونوں
نیزے کے نہ تلوار کے ہیں ڈھنگ سے واقف
دونوں میں نہیں ایک بھی جو رنگ سے واقف
گھوڑوں پہ تو وہ پہلے پہل آج چڑھے ہیں
بو دودھ کی آتی ہے ابھی ان کے دہن سے
دھڑکا ہے کہ گھبرا کے چلے آئیں نہ رن سے
تو ان کی مدد کر کہ نواسے ہیں علیؑ کے
فرمایا نہیں آئیں گے خود برچھیاں کھا کر
فرمایا کہ اچھا کوئی کہہ آئے یہ جا کر
جاتے ہو تو شکلیں مجھے دکھلا کے سدھارو
آئے صفت مہر لرزتے ہوئے دو ماہ
لپٹا کے گلے کہنے لگی بنتِ ید اللہ
لو آؤ کہ میں اب تو نہ غصے نہ خفا ہوں
ہر دم تھے اسی فکر میں ہم دونوں برادر
ہر دوست سے مل مل کے گلے روتے تھے سرور
اس وقت میں رخصت طلبی ترکِ ادب تھا
جرأت نہ پڑی عرض کی تھے گرچہ بہت پاس
جب بڑھتے تھے ہم روکتے تھے حضرت عباس
راضی ہوئے جب پاؤں پہ اس وقت گرے ہیں

خوش ہو کے کہا ماں نے کہ شاباش دلیرو | اب دیر نہیں خوب سدھارو مرے شیرو
ہاں چاہیئے منہ نیزہ و خنجر سے نہ پھیرو | دو شیر ہو ملکر عمر و شمر کو گھیرو
توقیر تمھاری ہو مری ناموری ہو | سر دونوں کے لاؤ تو میں جانوں کہ جری ہو

دادا کو جو پوچھو تو علمدار پیمبرؐ | ہاتھوں کے عوض جن کو خدا نے دیئے دو پر
نانا سا تو عالم میں نہ تھا کوئی دلاور | کرار کی جرأت تو سنی ہوگی مکرر
یوں سب ہیں پہ سرتاج دلیروں کے تمھی ہو | ہاں صدقے گئی شیر تو شیروں کے تمھی ہو

اس گھر کے بزرگوں کا چلن تیغ زنی ہے | جو فقر میں کرتا ہے سخاوت وہ غنی ہے
کیا شہرۂ خیبر شکنی بت شکنی ہے | جو بات پہ سر دے وہ سخاوت کا دھنی ہے
بودے کی کہاں آنکھ کہاں مرد کے تیور | چھپتے نہیں لاکھوں میں جوانمرد کے تیور

ہمراہ کوئی واں سے نہیں لاتا ہے رتبہ | جو نام پہ مرتا ہے وہی پاتا ہے رتبہ
سر بیچ کے ذیقدر کو ہاتھ آتا ہے رتبہ | ہٹتا ہے قدم بڑھ کے تو گھٹ جاتا ہے رتبہ
مر کر نہ ہٹے قابل احسنت وہی ہے | جو کھیت میں سرسبز ہو ساونت وہی ہے

دریا کی طرف پیاس میں تکتے نہیں غازی | گر شیر بھی جھپٹے تو سرکتے نہیں غازی
تلواروں میں آنکھوں کو جھپکتے نہیں غازی | بجلی بھی گرے گر تو جھجکتے نہیں غازی
آفت میں جو ہیں ان کے بجا ہوتے ہیں پیارو | جراروں کے تیور ہی جدا ہوتے ہیں پیارو

تیروں کی ہم بات میں سر کرتے ہیں صفدر | آقا کے دل پاک میں گھر کرتے ہیں صفدر
تلواروں میں سینوں کو سپر کرتے ہیں صفدر | عزت پہ بزرگوں کی نظر کرتے ہیں صفدر
دم ہونٹوں پہ آئے تو شجاعت نہیں جاتی | مرنے پہ بھی چہرے کی بشاشت نہیں جاتی

نانا نے تمھارے در خیبر کو جو توڑا | مانند سپر ہاتھ سے اس در کو نہ چھوڑا
ہر وار میں بچتا تھا نہ اسوار نہ گھوڑا | خالی ہوا جب قلعہ تو منہ جنگ سے موڑا
تھراتے تھے کفار تزلزل میں زمیں تھی | تھا زور تو یہ اور غذا نان جویں تھی

جب دستِ ید اللہ میں تیغ دوسر آئی
بس قبضۂ قدرت میں یکایک ظفر آئی
چھپٹے یہ اِدھر فوج پہ نصرت اُدھر آئی
بعد آپ پھرے فتح کی پہلے خبر آئی
پڑھتے ہیں وہ کلمہ جو مسلمان ہے دیکھے
اب تک تو سر اُٹھتے نہیں کفارِ عرب کے

خندق کی وَغا عمرو سیہ کار کی وہ دھوم
تھراتا تھا تلوار سے جس کی عرب و روم
رد کر کے جو حربوں کو بڑھا خاصۂ قیوم
جھپٹا اسد آہو پہ یہ سب کو ہوا معلوم
اِک ضرب میں نہ گرز نہ مغفر تھا نہ سر تھا
خندق کے اِدھر لاش سرِ نحس اُدھر تھا

جس وقت ظفر یاب ہوئے حیدرِ کرار
اِک ہاتھ میں سر عمرو کا اور ایک میں تلوار
فرمایا نبی نے یہ باعلان و بہ تکرار
افضل ہے دو عالم کی عبادت سے یہ اک وار
سر فتح کا تھا پاؤں پہ خالق کے ولی کے
جبریلِ امیں چومتے تھے ہاتھ علی کے

واری یوہیں تم بھی مرے کام آؤ تو جانوں
آقا کی اطاعت کو بجا لاؤ تو جانوں
ان چھاتیوں پر زخمِ سناں کھاؤ تو جانوں
لڑ بھڑ کے جب اس فوج سے مر جاؤ تو جانوں
جرار ہو سب حال سے محرم ہیں تمھارے
مجکو بھی یہ دھڑکا ہے کہ سن کم ہیں تمھارے

ماں صدقے گئی گھاٹ پہ دریا کے نجانا
پانی کی طرف پیاس میں گھبرا کے نجانا
ساحل پہ کبھی سرد ہوا پا کے نجانا
صابر ہو تو رہواروں کو گرما کے نجانا
ایسے تو نہیں جو مجھے محجوب کروگے
میں دودھ نہ بخشوں گی جو پیاسے نہ مروگے

جس پانی کو ترسے اسد اللہ کا پیارا
کیوں جاؤ اُدھر نہر پہ کیا کام تمھارا
عاقل کے لیے کافی و وافی ہے اشارا
گر آبِ بقا ہو تو مناسب ہے کنارا
وہ کام ہو جس کام میں کوثر پہ گزر ہو
دم بھر کے لیے کیوں عرقِ شرم میں تر ہو

بھائی کسی ہنگام میں بھائی کو نچھوڑے
دونوں میں کوئی عقدہ کشائی کو نچھوڑے
جرات کو جلالت کو لڑائی کو نچھوڑے
ہمت کو مروت کو بھلائی کو نچھوڑے
جو امر کہ مشکل ہے وہ دشوار نہ ہوگا
اک دل ہوے جب دو تو کوئی چارا نہ ہوگا

اک بھائی لڑے بڑھ کے جو ہاتھ ایک کا تھک جائے
ہاتھوں میں صفائی ہو کہ بسمل بھی پھڑک جائے
بلوا جو پھر اُس پر ہو تو یہ بھر کمک جائے
گر صف ہو تو پسپا ہو پرا ہو تو سرک جائے
حملوں میں سب انداز ہوں خالق کے ولی کے
پہچان لیں وہ سب کہ نواسے ہیں علی کے

نیزوں کی طرف چھاتیاں تانے ہوئے جانا
ہنس ہنس کے ہیں قربان گئی برچھیاں کھانا
ہاں تیروں کی بارش میں سپر منہ پہ نہ لانا
لازم ہے وہ ہمت کہ معرّف ہو زمانا
اس جنگ کا چرچا سحر و شام رہے گا
دنیا میں اگر تم نہ رہے نام رہے گا

دونوں نے کہا ہو گا یہی فضل خدا سے
ہم اور نہیں کوئی۔علی کے ہیں نواسے
کیا بات ہے جیتے ہیں تو مر جائیں گے پیاسے
غافل نہ رہیں آپ غلاموں کی دعا سے
کچھ ہم سے نہ تلوار سے نہ ڈھال سے ہوگا
جو ہوگا وہ سب آپ کے اقبال سے ہوگا

ارشاد نہ حضرت کا بجا لائیں تو مجرم
ڈر جائیں تو نے وفر جو ہٹ جائیں تو مجرم
بھولے سے بھی دریا کی طرف جائیں تو مجرم
بڑھ بڑھ کے نہ شمشیر و سناں کھائیں تو مجرم
مر جائیں گے دنیا میں سدا کون جیا ہے
دودھ آپ کا ہم دونوں غلاموں نے پیا ہے

جیتے ہیں تو نے صف شکنی ہم نہ رہیں گے
سر کاٹیے گا پاؤں جو محکم نہ رہیں گے
مجبور ہیں سینوں میں اگر دم نہ رہیں گے
لڑتے ہیں جوانوں سے مگر کم نہ رہیں گے
جینا کسی صورت ہمیں مطلوب نہیں ہے
اب کیا کہیں خود اپنی ثنا خوب نہیں ہے

چھوٹے تو ہیں کیا منہ سے بڑی بات نکالیں
سپنیاں ایسی جنہیں آغوش میں پالیں
ان سینوں پہ رکھدے کوئی سو نیزوں کی بھالیں
تلواروں میں روکیں گے وہی سینوں پہ ڈھالیں
ہم جینے پہ مرتے نہیں مرنے کو جیے ہیں
سینے ہمیں کس واسطے خالق نے دیئے ہیں

مختار ہیں یوں آپ سزا دیں کہ خفا ہوں
وہ نام پہ کیوں کر نہ مریں جو شرفا ہوں
ہوتے ہیں مکدّر کہیں دل جن کے صفا ہوں
تب وقت ہے غصہ کا جو وعدے نہ وفا ہوں
کیا زیست پھر اُن کی جنہیں ماں باپ بخشیں
تیور بھی جو میلے ہوں تو دودھ آپ بخشیں

ایسے تو نہیں ہم جو شجاعت نہ دکھائیں
سب نام کریں اور ہمیں جرأت نہ دکھائیں
نانا کی اگر شان و جلالت نہ دکھائیں
مصحف کی قسم آپ کو صورت نہ دکھائیں
خندق ہو تو لاشوں سے زمیں پاٹ کے مرجائیں
تیغیں نہ چلیں گر تو گلا کاٹ کے مرجائیں

جب کہہ چکے یہ جوشِ شجاعت میں وہ گلرو
آنکھوں سے ٹپکنے لگے رخساروں پہ آنسو
لپٹا کے گلے کہنے لگی زینب خوشخو
اللہ! یہ غصہ ہے کہ بل کھاتے ہیں گیسو
لڑنا ہے تمھیں فوج سے مطلوب لڑو گے
لو روؤ نہ معلوم ہوا خوب لڑو گے

صدقے میں ارادوں کے مرے شیر جوانو
اے بے وطن و فاقہ کش و تشنہ دہانو
اب غیظ سے تھراؤ نہ کہنا مرا مانو
ماں کہتے تھے پیارے مجھے تم خادمہ جانو
یہ فصل لڑائی کی نہیں کھیل کے دن ہیں
میں اس لیے کہتی ہوں کہ چھوٹے ابھی سن ہیں

شیر اس کے ہو تم شیر ہے جو بنت اسد کا
سر جس نے کیا معرکہ صفین و احد کا
دنیا میں بڑا نام ہے تم دونوں کے جد کا
ماں صدقے گئی وقت ہے ماموں کی مدد کا
ایک ایک جری تختِ ستم لاشوں سے بھر دے
اللہ تمھیں لشکرِ اعدا پہ ظفر دے

لو بخش دیا دودھ سدھارو مرے پیارو
الجھے ہوئے گیسو تو سنوارو مرے پیارو
میلی ہے یہ پوشاک اتارو مرے پیارو
دولھا تو بنا لوں مرے پیارو مرے پیارو
خوش ہونگی میں تب گھوڑوں پہ جب آج چڑھو گے
شادی ہے بڑی آج کہ پروان چڑھو گے

فرما کے یہ لیں دونوں کے چہروں کی بلائیں
اور تھام کے بازو کو پڑھیں آپ دعائیں
فرمایا کہ رخصت جنھیں ہونا ہو وہ آئیں
لو بی بیو سب آؤ تو بچے مرے جائیں
رن میں یہ برات اپنی دکھانے کو چلے ہیں
دونوں دلھنیں بیاہ کے لانے کو چلے ہیں

سب بیبیاں آئیں جو کلیجوں کو سنبھالے
تسلیم کو جھک جھک گئے وہ نازوں کے پالے
جس وقت چلے خیمے سے وہ گیسوؤں والے
در تک گئی ماں خاکِ عزا فرق پہ ڈالے
ڈیوڑھی سے جو دونوں دریکتا نکل آئے
نزدیک تھا یہ ماں کا کلیجہ نکل آئے

خیمے سے برآمد ہوئے زینب کے جو دلبر
بس جھک گئے تسلیم کو حضرت کی وہ صفدر
یہ وہ ہیں جو آغوش میں زینب کی پلے ہیں
کہکر یہ سخن دونوں کو گھوڑوں پہ چڑھایا
بجلی کا سب انداز سمندوں نے دکھایا
ثابت نہ ہوا ایک پہ کیا ہو گئے دونوں
ایک ایک سے جاندار گراں قدر سبک رو
کیلوں کی وہ تابش وہ ہر اک نعل کا پرتو
اک چاند تھا وہ جو سم توسن کا نشاں تھا
شکلیں بھی پری جرات و سرعت کے علاوہ
قد ایک سے ہی شکل ایک سی اور ایک سا کاوا
شوخی میں یہ آہو تھا اگر طیر تھا وہ بھی
ہاں کبک تو یہ رنگ یہ انداز دکھائے
جانیں جو پری چال میں یہ ناز دکھائے
ہوگا وہی لاریب تصور ہمیں جو ہی
تھم تھم کے بھی چلنے میں سب انداز ہوا کا
پائے انھیں مقدور یہ کب پیک صبا کا
یہ عجز ہے تعریف جو کرتا نہیں کوئی
یوں ذہن میں آتے ہی نکل جاتے ہیں سن سے
جرات میں فزوں شیر سے سرعت میں ہرن سے
نعل ان کے سرو ہی سے چلے فوج ستم پر

دیکھا کہ حسین ابن علی رونے ہیں در پہ
منہ کر کے سوئے چرخ پکارے شہ بے پر
بچے بھی تری راہ میں مرنے کو چلے ہیں
دونوں نے شرف پایہ معراج کا پایا
دوڑے کہ دکھائی نہ دیا دھوپ میں سایا
جنگل کو جو دیکھا تو ہوا ہو گئے دونوں
وہ جست وہ کاوے وہ طرارے وہ دواد
تاروں میں دکھاتے تھے چمک چار مہ نو
بالائے زمیں عالم بالا کا سماں تھا
دو گام تھا جن کے لیے سو کوس کا دھاوا
یہ گشت میں بجلی وہ رواروی میں چھلاوا
یہ بادیہ پیما تو فلک سیر تھا وہ بھی
قائل ہوں جو طاؤس یہ پرواز دکھائے
آہو یہ طرارے یہ تگ و تاز دکھائے
دعویٰ ہے تو آئیں یہی میدان بھی گو ہے
لڑنے میں سماں برق کا اڑنے میں ہما کا
نہ وہم کا واں دخل نہ فہم شعرا کا
باندھیں کسے مضموں تو ٹھہرتا نہیں کوئی
جس طرح نسیم آ کے نکل جائے چمن سے
آگاہ ہیں وہ جرات و سرعت کے چلن سے
پڑتے تھے قدم دونوں کے دلدل کے قدم پر

گھوڑوں کو اڑاتے ہوئے پہونچے جو بہادر
اک شور ہوا کونسے دریا کے ہیں یہ دُر
کیا جانیے کیا نام ہیں اِن کے اب و جد کے
پیشانیاں خورشیدِ جہانتاب سے بہتر
دانتوں کی صفا گوہرِ نایاب سے بہتر
ابرو نہیں پیشانیِ ذی قدر کے نیچے
حیران ہیں عدو حسن پہ اور دونوں کے سن پر
آنکھیں وہ کہ پریوں کی نظر پڑتی ہے جن پر
یہ گیسوؤ رُخ خوں میں بھرے رنج کی جا ہی
آنکھوں کی سیاہی پہ فدا نرگسِ شہلا
ہیں نیچنتی دل کبھی ان کا نہیں دہلا
تلوار چلی پھر گئی چتون جدھر ان کی
دِل بر ہیں دلیروں کے حسینوں کے حسیں ہیں
شیریں سخن اس طرح کے عالم میں نہیں ہیں
جملے ہیں وہی صاف ہی شرط و جزا ہی
شرمندہ ہی شمشاد بھی قد معتدل ایسے
مختوم ہیں خط خال کے نقطے سجل ایسے
سطریں ہیں یہ سب گیسوؤں کے بال نہیں ہیں
وہ چاند سے سینے کہ وفا کا ہی گھر ان میں
شیروں کا ہی بیشہ کہ دل اُن میں جگر ان میں
خود جن میں ہو دریا یہ سفینے نہیں دیکھے

فوجِ ستم آرا ہوئی سب غرق تحیّر
لڑکے ہیں یہ اللہ رے اقبال و تہوّر
تیور سے یہ پیدا ہی کہ بچے ہیں اسد کے
رخسارۂ رنگین گلِ شاداب سے بہتر
چہروں کا عرق موتیوں کی آب سے بہتر
ہیں دو مہِ نو بال سے اک بدر کے نیچے
ابرو وہ کمانیں ہیں کہ قرباں ہیں سب ان پہ
گیسو ہیں کہ سایہ کیا ہی رات نے دن پہ
دو بدر ہیں چار شش و پنج کی جا ہی
یہ عینِ شجاعت ہی کہ ہر معرکہ پہلا
نیزے تیغوں کے کھیلے کوئی بچہ نہیں بہلا
غصے میں سروہی سے سوا ہی نظر ان کی
گویا یہ دہن خاتمِ قدرت کے نگیں ہیں
یہ طرفہ حلاوت ہی کہ باتیں نمکیں ہیں
تقریر میں سب مصحفِ ناطق کا مزا ہی
رکھ دیتے ہیں سینوں کو سنانوں پہ دل ایسے
دیکھے ہیں کسی چشم کی پتلی نے تل ایسے
مہریں یہ خطِ حسن پہ ہیں خال نہیں ہیں
عدل و کرم و صنعت و علم و ہنر اُن میں
اسرارِ جنابِ احدی کے گہر ان میں
اس طرح کے سینے تو کسی نے نہیں دیکھے

مضمون ہیں سر دست یہ ہاتھوں کی ثنا کے
قبضے پہ اگر ہاتھ رکھیں غصے میں آ کے
ہی کونسا سرکش جو یہاں پست نہیں ہی

بت کعبہ سے جن سب نکالے یہ وہی ہیں
ہی فتح و ظفر جن کے حوالے یہ وہی ہیں
پروانے ہیں شمعِ حرمِ لم یزلی ہر

فوجیں نہیں ٹھہریں یہ جہاں جم کے لڑے ہیں
چھوٹے ہیں جو اس گھر کے وہ جرار بڑے ہیں
یہ پانوں ہٹاتے نہیں ہیں جنگ پہ چڑھ کر

ناگاہ یہ بڑھ کر پسرِ سعد پکارا
تلواریں پکڑ کر یہ پکارے وہ دل آرا
خورشیدِ زمیں تاجِ سرِ عرش بریں ہیں

دادا ہی شہنشاہِ دو عالم کا مددگار
وہ شُقّہ طرازِ علمِ احمدِ مختار
ہاتھوں کے عوض حق سے سر دست لیے ہیں

نانا اسد اللہ مددگارِ دو عالم
سلطانِ قضا منتظمِ کارِ دو عالم
سب امرِ اہم عقل کی میزان میں تلے تھے

بازوئے نبی دستِ خدا نفسِ پیمبر
لشکر شکن و بت شکن و فاتحِ خیبر
اصنام سے کیا خانۂ حق پاک کیا ہی

ناخن ہیں ہیں دونوں کے ہنر عقدہ کُشا کے
دم بھر میں ہلا دیں طبقے ارض و سما کے
ان سے کوئی دنیا میں زبردست نہیں ہی

رُکتے نہیں جن لوگوں کے بھالے یہ وہی ہیں
خیبر کے جو ہیں توڑنے والے یہ وہی ہیں
قبضہ انھیں لوگوں کا ہی شمشیرِ علی پر

ہاتھ ان کے تو فولاد کے پنجے سے کڑے ہیں
دیکھو یہ کہ بپھرے ہوئے دو شیر کھڑے ہیں
سر کٹنے پہ بھی گرتے ہیں تو کھیت سے بڑھ کر

ای شیر دلو نام و نسب کیا ہی تمھارا
خالق نے ہمارے لیے دنیا کو سنوارا
پہلا یہ شرف ہی کہ غلامِ شہِ دیں ہیں

سردارِ جہاں فخرِ عرب جعفرِ طیار
آلودہ رہی خون میں جس شیر کی تلوار
اللہ نے پر اُن کو زمرد کے دیے ہیں

دیندار نمودار جہاندارِ دو عالم
سرتاج فلک جبۂ دستارِ دو عالم
عقدے وہ ہوئے حل جو کسی سے نہ کھلے تھے

طیّب و زکی و طاہر و پاکیزہ و اطہر
سرتاجِ عجم میرِ عرب حیدرِ صفدر
گہوارے میں اژدر کا دہن چاک کیا ہی

وہ رعب کہ شیروں کو بھی عبرت ہوئی جس سے
وہ زور کہ ایماں کو قوت ہوئی جس سے
دیکھے اسے آگاہ جو حیدر سے نہیں ہے
کانپا کیا روم و عرب اک تیغ دو سر سے
دینداروں کو امن اس نے دیا فتنہ و شر سے
کیا کیا نہ بدل جائے گا کیا کیا نہ مٹے گا

اللہ رے اوج و شرف و عزت و مقدار
خالق کا ولی احمد مرسل کا مددگار
پاتے ہیں اشارے میں شفا کور و کر اس سے
ہم دونوں نواسے ہیں اسی فیض رساں کے
دکھلائیں گے جوہر تمھیں تیغ دو زباں کے
تم یہ نہ سمجھنا کہ ید اللہ نہیں ہیں

سن کر یہ رجز فوج کے سردار پکارے
تابندہ ہیں افلاک شرافت کے ستارے
حیدر کی طرح صاحب شمشیر ہیں دونوں
یہ سن کے کیا اس نے لڑائی کا سر انجام
برچھی کہیں چمکی کہیں جمدھر کہیں صمصام
یوں آتے تھے سب لوٹ کو فوج آتی ہے جیسے

اس شور میں بشاش کھڑے تھے وہ دلاور
کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا کہ برادر
وہ کہتا تھا تکیہ ہے عنایات احد پر

وہ حلم کہ خورشید کو حیرت ہوئی جس سے
وہ ضرب بنا کفر کی غارت ہوئی جس سے
بہتر کوئی شاہد در خیبر سے نہیں ہے
گزری سر مرحب سے تو عنتر کی کمر سے
ضرب اس کی نہ روکی گئی جبریل کے پر سے
پر حشر تلک اس ضرب کا سکہ نہ مٹے گا

دشمن کو بھی تھا فضل میں جس کے نہیں انکار
خاک کف پا سرمۂ چشم اولو الابصار
بینا ہے وہی جس کو ہے چشم نظر اس سے
فرزند ہیں ہم شبر شہ کون و مکاں کے
بڑھ بڑھ کے الٹ دیں گے پرے فوج گراں کے
ہم شبیر تو ہیں گر اسد اللہ نہیں ہیں

ای قوم یہ شبیر کے ہیں بھانجے پیارے
ہاں بھر لے طلا سے وہ سپر جو انھیں مارے
لڑکا انھیں سمجھے نہ کوئی شیر ہیں دونوں
کھلنے لگے ہر صف میں علمہائے سیہ فام
بدلی کی طرح جھوم کے آئی سپہ شام
بچوں پہ صفیں آتی تھیں موج آتی ہے جیسے

پروا تھی نہ مطلق کہ یہ فوج آتی ہے کس پر
دیکھیں تو ذرا آپ قریب آ گیا لشکر
آنے دو اجل ان کو لیے آتی ہے زد پر

آتا ہی شکار آپ سے جس دم طرف شیر
دانستہ وہ کرتا ہی جھپٹنے میں ذرا دیر
جاتے ہیں کہاں اب تو یہ آئے نہ شمشیر
جس جا ہیں صفیں ہوتے ہیں لاشوں کے وہیں ڈھیر
کھل جائے گا جب تیغ کھینچیں گے کمر سے
عرصہ فقط اتنا ہی کہ سبقت ہو ادھر سے

تھوڑے میں ابل پڑتے وہ جو ہیں تنگ ظرف
جب گرم ہوا مہر درخشاں تو کہاں برف
سر جائے پہ آئے نہ شجاعت پہ کوئی حرف
اس نحو سے عمر اپنے بزرگوں کی ہوئی صرف
ہاتھ اپنا چلے گا تو جگہ پا کے سب چلے گا
ٹھوکر وہی کھائے گا جو گھبرا کے چلے گا

تقریر ادھر یہ تھی کہ تیر آئے ادھر سے
پیغام وغا لیکے سفیر آئے ادھر سے
سب موت کے حلقے میں اسیر آئے ادھر سے
دو بچوں پہ دو لاکھ شریر آئے ادھر سے
اس بھیڑ پہ بھی بند تھے دہشت سے دم ان کے
بڑھ بڑھ کے ہٹے جاتے تھے پیچھے قدم ان کے

برچھی لیے انبوہ سواروں کا جب آیا
شہزادوں نے رانوں میں سمندوں کو دبایا
اک شور ہوا غیظ رحیموں کو اب آیا
وہ تیغے بجلی سے جو چمکے غضب آیا
آخر وہ جری لخت دل ضیغم دیں تھے
سر تھے صف اول کے کہیں جسم کہیں تھے

بس پھر تو دھنسے فوج میں وہ شیر درندہ
تلواروں سے ڈر ڈر کے چھپے مردوں میں زندہ
آہو سے بھی چالاک تھے اسپان دوندہ
مڑتے ہیں جو بجلی تھے تو اڑنے میں پرندہ
مانند براق نبوی عرش سما تھے
گھوڑے نہ کہو اوج سعادت کے ہما تھے

مارا انہیں جن جن کے جو تھے فوج میں چیدہ
رہواروں سے پامال تھے سر جلے بریدہ
باہم تھے کمانداروں سے دونوں جو کشیدہ
بدکیش و خطاکار تھے سب زخم رسیدہ
سہمے ہوئے تھے تیر کہ آفت تھی جہاں پر
پیکاں نہ سرے پر تھا نہ چلہ تھا کماں پر

خالی تھی جو یہ صف تو پریشان وہ پرا تھا
جنگل ستم ایجادوں کی لاشوں سے بھرا تھا
رنگ اڑ گئے تھے چہروں سے لشکر یہ ڈرا تھا
تھرّاتا تھا وہ ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
ڈر سے نہ بڑھاتے تھے جو سرکش قدم اپنے
تیغیں بھی نیاموں میں چرائے تھیں دم اپنے

وہ مر گیا تلوار اُٹھا کر جسے ڈانٹا
کلہائے جراحت کو عجب حسن سے بانٹا
ابتک یہ ہوا باغِ جہاں میں نہیں دیکھی
تلوار نے چھوٹے کی نیا رنگ دکھایا
حیرت ہوئی وہ زورِ دمِ جنگ دکھایا
ایسا کوئی طفلی میں نمودار نہ ہوگا

وہ نیمچا اور پھول سی وہ نرم کلائی
وہ اُنگلیاں جن میں ہنرِ عقدہ کشائی
زور ایسا جہاں کو وہ سبک ہاتھ کے تل سے
وہ شیروں سے بچکر ستم ایجاد کدھر جائے
خالی بھی جو دے وار تو پھر خون بکھر جائے
بزدل جو ہے کیونکر وہ دلیروں سے بچے گا

کس میں تھی ضیا نیمچوں کی ضو کے برابر
بجلی نہ چمک سکتی تھی پر تو کے برابر
بچتا تھا نہ وہ نوک بھی جا لگتی تھی جس کو
کاٹی جو سپر فرقِ جفا جو پہ نہ ٹھہری
چار آئینۂ ظالمِ بد خو پہ نہ ٹھہری
کیا زور تھا کیا ضربتِ شمشیرِ نکو تھی

بھالوں میں جو تیغوں کو سنبھالے نظر آئے
ریتی پہ طپاں برچھیوں والے نظر آئے
غل تھا کہ رن ایسا کبھی پڑتے نہیں دیکھا

اِس نخل کو تلوار سے کاٹا اُسے چھانٹا
نکلی نہ کوئی شاخ نہ اُبھا کوئی کانٹا
غل تھا کہ بہار ایسی خزاں میں نہیں دیکھی
ضرب اسد اللہ کا سب ڈھنگ دکھایا
راکب کو بھی مرکب کو بھی چورنگ دکھایا
ہاتھ ایسا تو جعفر کا بھی طیار نہ ہوگا

سب جس سے ہو پیدا یدِ بیضا کی صفائی
ضیغم کے بھی پنجے نے یہ قوت نہیں پائی
ضرب ایسی کہ پوچھے کوئی جبریل کے دل سے
گر منہ پہ چڑھے یہ تو سر نحس اتر جائے
بس زیست اسی میں ہے کہ تلوار سے مر جائے
بھاگے گا تو کیا صید یہ شیروں سے بچیگا

گویا کہ مہِ نو تھا مہِ نو کے برابر
سر خاک پہ گر پڑتے تھے سو سو کے برابر
رہ جاتا تھا وہ چل کے ہوا لگتی تھی جس کو
منہ پر نہ رکی ساعد و بازو پہ نہ ٹھہری
دشمن کی زرہ کاٹ کے پہلو پہ نہ ٹھہری
گھوڑے کی بھی گردن سی اک ارپن و کٹی

افسر نظر آئے نہ رسالے نظر آئے
ہر صف کی جگہ خون کے تھالے نظر آئے
بچوں کو اس انداز سے لڑتے نہیں دیکھا

چار آئے جو لڑنے کو تو اک دل ہوئے دونوں
گرما کے فرس جنگ پہ مائل ہوئے دونوں
ششدر نہیں ہوتے جو شجاعت کے دھنی ہیں
یہ سنتے ہی بچوں پہ جھپٹ کر وہ پل آئے
لشکر نے یہ جانا کہ وہ بچ کر نکل آئے
احسنت کا برپا ہوا غل چرخ بریں پر
کیا ذکر بھلا آٹھ کا یا چار سروں کا
گنتا ہوا اب تو ہیں دشوار سروں کا
تھم سکتے نہ تھے پاؤں کسی عربدہ جو کے
اعدا تھے دم جائزہ ہر بار ندارد
پیدل نظری فوج کے اسوار ندارد
یوں فوج کے دفتر کو الٹتے نہیں دیکھا
یہ تھک کے جو ٹھہرا تو وہ لشکر میں در آیا
یہ ڈوب گیا جب وہ اُدھر سے ادھر آئے
ہٹ جائے گا لشکر تو یہ خود چڑھ کے لڑیں گے
جانبازیاں دکھلاتے تھے میداں میں وہ جانباز
قاسم کا سخن تھا کہ علی کا ہے سب انداز
بڑھتے تھے کبھی گاہ سرک جاتے تھے عباس
ہر بار صدا دیتے تھے اے گیسوؤں والو
رہوار بڑھے جاتے ہیں باگوں کو سنبھالو
اب ہٹنے کی مہلت مری جاں ان کو نہ دینا

ٹھہرے نہ ہٹے نہ متامّل ہوئے دونوں
چاروں سے یہ فرما کے مقابل ہوئے دونوں
تم چار ہو ہم دو ہیں مگر پنجتنی ہیں
غصے سے دلیروں کے بھی ابرو پہ بل آئے
آنا تھا کہ چاروں پہ تیغ اجل آئے
ٹکڑے ہو گئے چار کے تھے آٹھ زمیں پر
کشتوں کے جو پشتے تھے تو انبار سروں کا
اک مینہ سا برس جاتا تھا ہر بار سروں کا
کٹتی تھی زمیں رن کی ڈبڑوں سے لہو کے
منشی کے قلم ہاتھ علمدار ندارد
دو آئے تو وہ چار تھے پھر چار ندارد
یوں چہرے پہ چہرہ کبھی کٹتے نہیں دیکھا
رستے کو تڑپتے ہوئے لاشوں سے بھر آیا
اک چاند تہ خاک چھپا اک نظر آیا
چھوٹے ہیں مگر بھائی سے کچھ بڑھ کے لڑیں گے
دل تھامے ہوئے دیکھتے تھے شاہ سرافراز
فرماتے تھے اکبر یہ لڑائی ہے کہ اعجاز
جب وار وہ کرتے تھے پھڑک جاتے تھے عباس
کیا کہنا ہے پھر بڑھ کے یہی ہاتھ لگا لو
حلقہ ہے کڑی آنکھ زرہ پوشوں پہ ڈالو
منت بھی کریں گر تو اماں ان کو نہ دینا

ہاں شیروں کے شیروں کا یہی کام ہے شبیرو
بس آج لڑائی میں بڑا نام ہے شبیرو
بچے میں تمہارے سیہ شام ہے شبیرو
تم دونوں کا جد صاحب صمصام ہے شبیرو
اک شمس تو اک برج شرافت کا قمر ہے
ہاں کس کی ہے بیٹی تو پدر کس کا پسر ہے

شہ کہتے تھے بچے ہیں لڑیں ہائے کہاں تک
لاکھوں سے لڑے دونوں میں طاقت تھی جہاں تک
دو روز سے پانی نہیں پہونچا ہے دہاں تک
اب پھیر کے کوئی نہیں لے آئے یہاں تک
سیراب بھی یہ تشنہ دہاں ہونے نہ پائے
ہے ہے مرے گھر میں یہ جواں ہونے نہ پائے

سیدانیاں دروازوں پہ تھیں کھولے ہوئے سر
اصغر کو لیے کانپتی تھی بانوئے مضطر
فضہ بھی پریشاں کیے مو خیمے کے باہر
پردے سے لگی کہتی تھی یہ شاہ کی خواہر
بتلاؤ مجھے بچے مرے کیا کرتے ہیں دونوں
وہ کہتی تھی لاکھوں سے وغا کرتے ہیں دونوں

وہ رخ پہ نظر آتے ہیں اُٹھتے ہوئے گیسو
وہ نیمچے بجلی کی طرح گرتے ہیں ہر سو
ڈھالیں لیے وہ بھاگتے پھرتے ہیں جفا جو
وہ ابر میں چھپ چھپ کے نکل آتے ہیں مہ رو
بہتا ہے لہو چھاتیوں سے چور ہیں دونوں
کس طرح پکاروں کہ بہت دور ہیں دونوں

زینب نے کہا دونوں میں کیا کہ جدا ہیں
کی عرض یہ رو کر کہ نہیں ایک ہی جا ہیں
لاکھوں میں عدو اور وہ دو ماہ لقا ہیں
منہ نہر سے پھیرے ہوئے سرگرم وغا ہیں
دم خوف سے سینے میں سنبھلتا نہیں اب تو
ہے ہے مجھے چھوٹا نظر آتا نہیں اب تو

یہ سنتے ہی ڈیوڑھی سے ہٹیں حضرت زینب
فرمایا کہ بچوں کا مرے خاتمہ ہے اب
اب کچھ نہیں وسواس برآیا مرا مطلب
لو بی بیو مل کر صف ماتم پہ چلو اب
بچے مرے داخل ہوئے خیل شہدا میں
سجدہ تو کروں شکر کا درگاہ خدا میں

یہ ذکر تھا جو طبل بجا فتح کا ناگاہ
چلائے حرم لٹ گئی بنت اسد اللہ
سجدے کو سوئے قبلہ جھکیں زینب ذی جاہ
دوڑے طرف دشت وغا روتے ہوئے شاہ
تلواریں علم قاسم و عباس لیے تھے
ہمشکل نبی چاک گریباں کیے تھے

عباس نے غصے میں لعینوں کو ہٹایا
بجلی سے بھی کچھ بڑھ کے گرا تیغ کا سایا
پسپا ہوئے کفار کوئی تاب نہ لایا
شبیر نے لاشوں کو تڑپتا ہوا پایا
آلودۂ خوں دو مہ کامل نظر آئے
گودی کے سپالے خاک پہ بسمل نظر آئے

سر تا بہ قدم جو رستے زخموں سے تن زار
انگڑائیاں لینے سے رگیں کھنچتی تھیں ہر بار
پیکان اِس سہلو تھے کئی چھاتیوں کے پار
تلواریں تھیں قبضوں میں مگر ہاتھ تھے بیکار
لب پر یہ سخن تھا شہ والا نہیں آئے
دم ہونٹوں پہ آئے مگر آقا نہیں آئے

لاشوں کے قریب آ کے پکارے شہ صفدر
ای بھانجو موجود ہی یہ بیکس دبے پر
یہ گرم زمیں اور یہ گل سے تن انور
ریتی سے اُٹھا کر مرے زانو پہ رکھو سر
ماموں سے عجب وقت میں منہ موڑ رہے ہو
کن آنکھوں سے دیکھوں میں کہ دم توڑ رہے ہو

ای عونؑ و محمدؑ یہ جفا تم نے اُٹھائی
ایذائے عطش سب سے سوا تم نے اُٹھائی
راحت مرے گھر میں نہ ذرا تم نے اُٹھائی
کیا کیا نہ صعوبت بخدا تم نے اُٹھائی
مانع جو ہوئی ماں سو یتیم پھر نہیں دیکھا
اِس عمر میں تم سا کوئی صابر نہیں دیکھا

ای شیر جوانو مجھے طاقت تھی تمہیں سے
ای تیز زبانو مجھے طاقت تھی تمہیں سے
ای مرتبہ دانو مجھے طاقت تھی تمہیں سے
ای تشنہ دہانو مجھے طاقت تھی تمہیں سے
ساتھ اپنے جہاں سے نہ مجھے لیتے گئے تم
کاندھا مرے تابوت کو دینے نہ گئے تم

اکبر نے کہا عونؑ کے بازو کو ہلا کر
بھیّا تمہیں چلاتے ہیں شہ اشک بہا کر
ماموں کو پکارے بھی نہ تم پچھیاں کھا کر
باتیں شہ والا سے کرو ہوش میں آ کر
لو گھر میں چلو بی بیاں سب غش میں پڑی ہیں
سر ننگے پھوپھی خیمے کی ڈیوڑھی پہ کھڑی ہیں

خم ہو کے یہ چھوٹے کو علمدار پکارے
ای تشنہ دہن ای مرے جانی مرے پیارے
کیا منہ میں زباں اینٹھ گئی پیاس کے مارے
چونکو کہ عجب حال ہے ماموں کا تمہارے
ہاتھوں کو ذرا جوڑ کے کچھ بات تو کر لو
بیٹا شہ والا سے ملاقات تو کر لو

سُن کر یہ صدا ہو گئیں آئے وہ دلاور
اٹکے تھے جو اُکھڑے ہوئے دم سینوں کے اندر
فردوسِ معلّیٰ کے مسافر ہوئے دونوں
گودی میں موئے وہ جنھیں آغوش میں پالا
بسمل کی طرح گر کے جو تڑپے شہِ والا
رقّت کا تھا یہ جوش کہ تھرّاتے تھے شبیر
عباس نے کی عرض یہ با دیدۂ خونبار
لے چلیے انھیں خیمے میں اب باشہِ ابرار
لاشے جو نہ جائیں گے تو غم کھائیں گی زینب
یہ سنتے ہی لاشے شہِ والا نے اُٹھائے
غل تھا کوئی جلدی صفِ ماتم کو بچھائے
چھوٹے کو علی اکبرِ دلگیر لیے ہیں
زینب نے کہا کیوں مجھے وسواس آئے
لوگو مرے پیارے نے بڑے رنج اُٹھائے
دو روز سے وہ سرورِ واں تشنہ دہاں ہے
اِن دونوں نے گر جان گنوائی تو گنوائی
میں ماں ہوں نہ جب تک مجھے تاب نہ بھائی
دِل سے نہ یہ داغِ الم و یاس مٹے گا
بانو نے کہا کونسی وسواس کی ہے جا
شق ہوتا ہے مظلوموں کی غربت پہ کلیجا
گھر تک کوئی واماندوں کو پہونچا نہیں دیتا

سر رکھ دیئے گھبرا کے شہِ دیں کے قدم پر
دو ہچکیاں لیں دونوں صغیروں نے برابر
کروٹ بھی نہ بدلی تھی کہ آخر ہوئے دونوں
آنکھیں تھیں لہو اور جگر تھا تہ و بالا
عباس نے تھاما علی اکبر نے سنبھالا
ہر مرتبہ لاشوں سے لپٹ جاتے تھے شبیر
خیمے سے نکل آئیں نہ سیدانیاں یکبار
بہتر ہے کہ ماں دیکھ لے فرزندوں کا دیدار
یہ قبر میں سوئے تو کہاں پائیں گی زینب
خیمے کے قریں دونوں کو روتے ہوئے لائے
لو آئے شہنشاہ کی ہمشیر کے جائے
اک لاش کو خود گود میں شبیر لیے ہیں
ہے ہے علی اکبر اُسے کیوں گود میں لائے
صدقے یہ پھوپھی لاش کے لے آنے کے جائے
اس بوجھ کی طاقت مرے بچے میں کہاں ہے
بن بیاہے مرے لال نے کیوں لاش اُٹھائی
اکبر مری اٹھارہ برس کی ہے کمائی
صدقہ اب اُتاروں گی تو وسواس مٹے گا
ہمشکلِ نبی لاشوں کو لائے تو ہوا کیا
ہے ہے وہ کوئی غیر تھے اے دخترِ زہرا
بھائی کوئی کیا بھائی کو کاندھا نہیں دیتا

ان دونوں کے عاشق تھے علی اکبرِ گلرو
چھوڑا نہ انھوں نے کبھی بھائی کا پہلو
ایسا یہ نہیں غم کہ تھمیں آنکھ سے آنسو
بس تلخ ہوئی زندگیِ اکبرِ خوشخو
کل تک تھے بہم آج اکیلے ہوے دونوں
بھائی بھی وہ جو ساتھ کے کھیلے ہوں دونوں

دونوں تھے اسی بھائی کے آرام کے طالب
جانے وہی جس شخص پہ گذریں یہ مصائب
وسواس کا یہ کونسا ہنگام ہے صاحب
بیجاں ہوے ہیں علی اکبر کے مصاحب
ساتھ اب کوئی جوڑے ہوے ہاتھ رہے گا
شہزادۂ کونین اُسے کون کہے گا

ناگاہ شہِ عرش نشیں لاشوں کو لائے
غل پڑ گیا لو سرورِ دیں لاشوں کو لائے
تھم کر صفِ ماتم کے قریں لاشوں کو لائے
ہمشیر تھیں جس صف میں وہیں لاشوں کو لائے
دونوں کا لٹانا تھا کہ غش کر گئی زینب
ہر بی بی پہ ثابت یہ ہوا مر گئی زینب

ہوش آیا تو اکبر سے کہا رانڈوں کو سمجھاؤ
ہے ہے نہ کرو صاحبو اک لحظہ ٹھہر جاؤ
عباس کی زوجہ سے یہ بولیں کہ ادھر آؤ
کیا روتی ہو کپڑے علی اکبر کے بدلواؤ
بانو ہیں کدھر آہ یہ کیا بے خبری ہے
سب خوں سے مرے لال کی پوشاک بھری ہے

حضرت سے کہا آپ کو اپنا ہوئی یا شاہ
کس طرح لڑے دونوں غلامانِ ہوا خواہ
حضرت نے کہا ہیچ میں قاصر ہے زباں آہ
زینب مجھے یاد آ گئی جنگِ اسد اللہ
نانا کی طرح دونوں نواسوں نے وَغا کی
بچوں کی نہ تھی جنگ یہ قدرت تھی خدا کی

تیغوں میں یہ تیزی یہ صفائی نہیں دیکھی
یہ ضرب یہ پھرتی یہ لڑائی نہیں دیکھی
شیروں کی یہ پر زور کلائی نہیں دیکھی
اعدا میں یہ ہلچل یہ دہائی نہیں دیکھی
صفین و جمل میں بھی یہ رن ایسے نہ پڑے تھے
تم پوچھ لو عباس تو نزدیک کھڑے تھے

عباس نے کی عرض کہ یاں لاؤں کہاں سے
جو کر گئے یہ لال وہ باہر ہے بیاں سے
لڑتے تھے اسی طرح علی فوجِ گراں سے
افسوس کہ یوں اُٹھ گئے یہ شیر جہاں سے
تلواریں جب اُن کی مجھے یاد آتی ہیں بھینا
دو بجلیاں آنکھوں میں چمک جاتی ہیں بھینا

کیا عرض کروں ہائے محمد کی لڑائی — گویا کہ یہ دیکھے ہوئے تھا جد کی لڑائی

بس صاف تھی صفین کی سرحد کی لڑائی — غل تھا کہ یہ ہیں بازوے احمد کی لڑائی

رن پر جو چڑھا ہو وہی جانے کہ یہ کیا تھا — دنیا میں علی آج جو ہوتے تو مزا تھا

یہ سنتے ہی سرخی سی رخ زرد پہ آئی — حضرت سے کہا آپ کا صدقہ ہی یہ بھائی

کونین میں عزت مرے دلبندوں نے پائی — اب شاد ہوئی ان سے ید اللہ کی جائی

آقا مجھے پیار آتا ہی اقبال پہ ان کے — بیکس ہیں خدا رحم کرے حال پہ ان کے

فرما کے یہ لیں اُن کی بلائیں کئی باری — شانوں کو ہلا کر کے یہ آہستہ پکاری

کرتے ہیں امام دو جہاں مدح تمھاری — یہ کیا ہی جو تسلیم کو اُٹھتے نہیں واری

صدقے گئی یہ نیند ہی یا غش میں پڑے ہو — بیٹھے ہیں حسین ابن علی اُٹھ تو کھڑے ہو

کچھ آج ہی غفلت عجب اے نیند کے ماتو — باعث ہی یہ بچپن کا سب اے نیند کے ماتو

چونکو مری خاطر سے اب اے نیند کے ماتو — پھر سوئیو آتی ہی شب اے نیند کے ماتو

پھر کیا ہی جو بچپن کے یہ انداز نہیں ہیں — گردن ہی کہیں ہاتھ کہیں پاؤں کہیں ہیں

اب ضبط کی طاقت نہیں اماں کو سنبھالو — انگڑائیاں لو بات کرو نیند کو ٹالو

سینے میں اُلجھتا ہی دم اے گیسوؤں والو — واری مجھے خدمت کے لیے پاس بلالو

میں ہوں گی تو راحت سے تمھیں یاس نہ ہوگی — کیا گزرے گی منزل پہ جو ماں پاس نہ ہوگی

پہلا تو سفر اور نئے لوگ نئی راہ — کس طور سے گزریں گی یہ تاریک شبیں آہ

صدقے گئی رستے سے بھی تم تو نہیں آگاہ — پہونچائے تمھیں خیر سے فردوس میں اللہ

پُرہول ہی رستہ مجھے تشویش بڑی ہی — قربان ہو ماں قبر کی منزل بھی کڑی ہی

ٹوکے کوئی رستے میں تم ڈریو نہ مری جان — ہاں کلمۂ توحید پڑھے جائیو ہر آن

اقرار نبوت میں فصاحت کا رہے دھیان — دلبند ہو تم تین اماموں کے میں قربان

کہنا کہ ملازم ہیں ولی ابن ولی کے — ہم آتے ہیں لشکر سے حسین ابن علی کے

ای عون خبردار مرے چھوٹے پسر سے
شب کو یہ اکیلا کبھی نکلا نہیں گھر سے
رستے سے نہ واقف ہی نہ غربت کے سفر سے
محروم رہونگی میں سدا خیر و خبر سے
واماندوں پہ ظاہر ہو یہ وہ بھید نہیں ہی
ای وائے خط آنے کی بھی امید نہیں ہی

بچوں کے بین ہائے غضب اور یہ سفر ایسا
لائے گا خبر کون کہاں نامہ بر ایسا
برباد نہ ہو یوں کوئی آباد گھر ایسا
نظروں سے نہ پوشیدہ ہو شمس و قمر ایسا
کس ناز و نعم سے یہ خوش اقبال پلے تھے
قبروں کے لیے ہائے مرے لال پلے تھے

اب کون مرے پہلوؤں میں سوئے گا بچو
تڑپے گا کلیجا مرا دل روے گا بچو
یہ داغ تو دنیا سے مجھے کھوئے گا بچو
دن جائے شب آئے گی تو کیا ہوے گا بچو
راحت کسی کروٹ کسی پہلو نہ ملے گی
مرجاؤں گی زلفوں کی جو خوشبو نہ ملے گی

دنیا کو نہ دیکھا تھا کہ موت آگئی تم کو
خیمے سے نکلتے ہی اجل پا گئی تم کو
ماں صدقے ہو جنگل کی ہوا بھا گئی تم کو
ای گل بدنو کس کی نظر کھا گئی تم کو
ہی ہی مجھے پوشاک شہانی نہ دکھائی
صدقے گئی اماں کو جوانی نہ دکھائی

مرتے ہوئے پانی بھی نہ مانگا مرے ڈر سے
پیاسے سوئے فردوس سدھارے مرے گھر سے
نے آب نہ اس عمر میں چوبیں پہر سے
دیکھا بھی نہ دریا کو توجہ کی نظر سے
سوا جو پڑی آنکھ تو منہ موڑ لیا ہی
ڈرتے تھے کہ اماں نے نہیں منع کیا ہی

غصے ہوئی تھی تم پہ میں واری مجھے بخشو
ماں اب نہیں لونڈی ہوں تمھاری مجھے بخشو
لب پر سخن عذر ہیں جاری مجھے بخشو
صدمے سے غشی ہوتی ہی طاری مجھے بخشو
میں بھی تو یہ جانوں کہ دل افسردہ نہیں ہیں
لو کہہ دو بس اتنا کہ ہم آزردہ نہیں ہیں

یہ کہہ کے جو چھاتی پہ دوہتڑ کئی مارے
سینہ ہوا شق ہاتھ بھی نیلے ہوے سارے
ہمشکل نبی پاؤں پہ گر کر یہ پکارے
بس والدہ اب روئیو لاشے پہ ہمارے
اب پیاس میں آب دم شمشیر پئیں گے
بھائی نہ رہے خلق میں ہم بھی نہ جئیں گے

گھبرا کے وہ مخدومۂ عالم یہ پکاری
مرجائے یہ ناشاد بلا لیکے تمہاری
بن بیاہے ہو تم لاشوں کے پاس آ کنواری
تم روؤگے اس ڈر سے میں کرتی نہیں زاری
باتوں میں بھی کچھ بین کے پہلو نہیں نکلے
آنکھوں سے مری دیکھ لو آنسو نہیں نکلے

فرما کے یہ غش ہو گئیں اور پھر ہوئیں ہشیار
پوچھا کہ کدھر ہے علی اکبر مرا دلدار
بانو نے کہا شاہ سے با دیدۂ خونبار
اب فرق بصارت میں بھی ہے یا شہِ ابرار
ابکی جو غش آیا تو گزر جائیں گی زینب
لیجایئے لاشے نہیں مرجائیں گی زینب

یہ ماتمِ اولاد ہے کیونکر اسے ٹالیں
مرجائیں جنہیں دل کی طرح گود میں پالیں
اکبر کی سنیں یا جگر و دل کو سنبھالیں
در آتی ہیں اک قلب میں دو تیروں کی بھالیں
بالائے جگر خنجرِ بیداد پھرے ہیں
دو غم کے پہاڑ ایک ضعیفہ پہ گرے ہیں

یہ سنتے ہی لاشوں کو اٹھانے لگے سرور
رانڈیں صفِ ماتم سے اٹھیں کھولے ہوئے سر
بانو نے کھڑے ہو کے ادھر روک لی چادر
چلائی سمجھکر شہ مظلوم کی خواہر
ٹھہرو ابھی کیوں داغ دیے جاتے ہو لوگو
ہے ہے مرے بچوں کو لیے جاتے ہو لوگو

دیکھا نہیں جی بھر کے ابھی بیٹوں کا دیدار
دونوں کی بلائیں مجھے لے لینے دو اکبار
چھوٹے کو بھی چھاتی سے لگا لے یہ دل افگار
مادر سے مکدر نہ ہوں یہ آئینہ رخسار
گھر میں مرے کا ہے کو پھر آئیں گے جا کے
دینے دو کفن دونوں کو زہرا کی ردا کے

در تک گئیں لاشوں سے لپٹنے کو کھلے سر
پھر رانڈوں نے جانے نہ دیا خیمے کے باہر
چلائیں درِ خیمہ کے پردے کو اٹھا کر
گاڑوگے کہاں بھائیوں کو اے علی اکبر
ڈر ہے کہ خفا مجھ سے مرے لال نہ ہو جائیں
صدقے گئی لاشے کہیں پامال نہ ہو جائیں

یہ وقت نہیں طول کا خاموش انیس اب
جتنے ہیں سخن فہم وہ عاشق ہیں ترے سب
ہر دم ہے عنایاتِ محمد کرمِ رب
اب جلد وہ حاصل ہو جو کچھ ہے ترا مطلب
یہ حسن فصاحت ہے یہ شیریں سخنی ہے
پیری میں جواں ہے تو فقیری میں غنی ہے

مرثیہ (۷)

۴

دوزخ سے جو آزاد کیا حر کو خدا نے
کھلوا دئے فردوس کے در عقدہ کشا نے
زانو پہ رکھا سر کو امام دوسرا نے
اعلیٰ کیا ادنیٰ کو بزرگوں کی دعا نے
سب جس کے طلبگار تھے جنت میں وہ در تھا
حوران جناں گرد تھیں اور بیچ میں حر تھا

چرچا تھا کہ مہمان حسین آتا ہے دیکھو
دنیا سے بصد زینت زیں آتا ہے دیکھو
مولائے شہ بدر و حنین آتا ہے دیکھو
شیدائے رسول الثقلین آتا ہے دیکھو
دم نکلا ہے گودی میں شہنشاہ زمن کے
سونگھو اسے خوشبو ہے یہ زہرا کے چمن کی

اللہ کے لشکر کا ہراول ہے یہ غازی
بعد اس کے ہیں سب کشتۂ اول ہے یہ غازی
خاک قدم احمد مرسل ہے یہ غازی
رتبے میں ملائک سے بھی افضل ہے یہ غازی
اس پر نظر لطف شہنشاہ نجف ہے
آنکھیں ہم اگر فرش کریں عین شرف ہے

اللہ کی درگاہ کا مقبول ہے یہ بھی
مقبول نہ کیونکر ہو کہ مقتول ہے یہ بھی
مجرم پہ کرم شاہ کا معمول ہے یہ بھی
گلدستۂ اسلام کا اک پھول ہے یہ بھی
نیکوں سے بدی وہ نہیں کرتا جو بھلا ہے
مرجھا کے یہ پھولا ہے خزاں ہو کے پھلا ہے

کیا اصل تھی اس نخل کی اور کیا ثمر آیا
اللہ کی قدرت یہ کہاں تھا کدھر آیا
لو شام کا بھولا ہوا وقت سحر آیا
تلواروں کی دریا سے سلامت اتر آیا
نیزوں کو عصا تیغوں کو پل کر دیا اس نے
آتش کو چمن خار کو گل کر دیا اس نے

کس لشکر بدخو سے بگڑ کر نکل آیا
دو لاکھ ستمگاروں سے لڑ کر نکل آیا
تنتنا ہوا تلوار پکڑ کر نکل آیا
نیزہ تھا کہ ہر قلب میں گڑ کر نکل آیا
کعبہ کی طرف دیر میں گر دیر سے پہونچا
شر نے اسے روکا تھا مگر خیر سے پہونچا

حوروں کے وہ چہرے وہ ضیائے دُرِ دنداں | کوئی ہے تبسم کوئی حیران کوئی خنداں
باتوں کی ملاحت لبِ شیریں سے دوچنداں | سن پائیں تو چرچا کریں ہونٹوں کو سخنداں
سو داہو پری دیکھ لے گر حور کی آنکھیں | سورج کی چمک چاند کا منہ نور کی آنکھیں
ہاتوں پہ وہ کوثر کے چھلکتے ہوئے ساغر | پانی وہ سبک اور وہ لچکتے ہوئے ساغر
شیشے وہ بلوریں وہ چمکتے ہوئے ساغر | وہ مشک کی خوشبو وہ مہکتے ہوئے ساغر
پژمردہ اگر غنچۂ خاطر ہو تو کھل جائے | برسوں نہ لگے پیاس گر اک جام بھی مل جائے

وہ نرگسی آنکھیں وہ اُن آنکھوں کے اشارے | اُٹھ سایۂ طوبیٰ سے چل اب گھر ہیں ہمارے
دیکھ اس طرف اے حضرت شبیر کے پیارے | ساماں ہیں مہیا ترے آرام کے سارے
سیراب ہو گر مے سے اگر تشنہ دہن ہے | وہ کوثر و تسنیم ہے یہ نہر لبن ہے
حوریں کریں شوقیہ سخن واہ ری قسمت | مشتاق ہو جنت کا چمن واہ ری قسمت
سر گود میں لیں شاہِ زمن واہ ری قسمت | بھائی کہیں حضرت کی بہن واہ ری قسمت
مرنا وہ کہ عالم کے خبر گیر سرہانے | پہلو میں علی حضرت شبیر سرہانے

اللہ ری وفائے رفقائے شہِ ذی جاہ | دل سینوں میں لبریز ولائے شہِ ذی جاہ
سر دیتے تھے ہنس ہنس کے برائے شہِ ذیجاہ | کرتے تھے سفر حرم کے پلے شہِ ذی جاہ
دنیا کی نہ جانب ہے نہ دریا کی طرف ہیں | مرتے ہوئے آنکھیں شہِ والا کی طرف ہیں
مرنے پہ کسے تھا کہ ایک ایک سے پہلے | کر دیتا تھا سینہ سپر ایک ایک سے پہلے
دیتا تھا بصد شوق سر ایک ایک سے پہلے | کرتا تھا دلِ شہ میں گھر ایک ایک سے پہلے
دشوار انھیں زیست کی ایک ایک گھڑی تھی | کوثر سے نظر خلد سے جاں اُن کی لڑی تھی

ایماں شہِ والا کی ولا جانتے تھے وہ | مر جانے کو توعینِ وفا جانتے تھے وہ
جینے کو ہوس دم کو ہوا جانتے تھے وہ | فاقوں کے بیاں کو بھی گلا جانتے تھے وہ
کچھ فرق اطاعت میں وہ ناکام نہ لائے | پانی کا زبانوں پہ کبھی نام نہ لائے

وہ ابن مظاہر کہ حبیبوں میں جو تھے فرد
اعدا کے لیے تیغ ہلالی دم ناورد
سب چھوٹے مگر دامن حضرت نہیں چھوڑا
جب وے چکے سب غیر عزیزوں کی طرح سر
مرنے پہ کمر باندھتے تھے قاسم نوشہ پر
ہے سخت عجب دونوں کی دانائی سے مجکو
سب جاتے ہیں اور رن کی وہ رخصت نہیں لیتے
سیدسے سرافرازی کا خلعت نہیں لیتے
پانی نہ ملے گر دمِ آخر نہ ملے گا
کم عمر ہیں عزت کی وہ کیا بات کو جانیں
ہے ہے انھیں شبیر سے پیاری ہوئیں جانیں
اب تیر جگر گوشۂ زہرا پہ چلیں گے
وہ نام پہ مرتے ہیں جو ہیں عاقلِ ذی ہوش
موقع ہو تو گویا کمیں سنتے بھی ہیں خاموش
فرق اُن کے تہوّر میں کسی طور نہیں ہے
یہ ذکر تھا نوشاہ جو روتے ہوئے آئے
اب جاتے ہیں لڑنیکو پھوپی جان کہے جائے
اب بھی ہمیں پیغام اجل آ نہیں جاتا
زینب نے کہا میری مراد آئی سدھاریں
دشمن جو ہوں فرزند علی کے انھیں ماریں
یہ کس کا لہو دیکھ کے وہ جوش میں آئے

دنیا میں کسے ملتے ہیں اس طرح کے ہمدرد
پیری میں اولوالعزم بڑھاپے میں جوانمرد
مرنے پہ بھی ابتک در دولت نہیں چھوڑا
نے جاں ہوئے دو ایلچی شاہ کے دلبر
کہتی تھی جھکائے ہوئے سر شاہ کی خواہر
ان بیٹوں نے محجوب کیا بھائی سے مجکو
مرجانے کی ماموں سے اجازت نہیں لیتے
سر دے کے جو ملتی ہے وہ دولت نہیں لیتے
کہدے کوئی ایسا تمھیں دن پھر نہ ملے گا
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ پھراتے ہیں زبانیں
پچھتائینگے روئیں گے نہ کہنا مرا مانیں
جب وقت نکل جائے گا پھر ہاتھ ملیں گے
سب دل میں کہیں گے کہ ہے جنگ سے رہوش
کیا جان کا پھر دھیان شجاعت کا ہے جب جوش
باعث یہ لڑکپن کا ہے کچھ اور نہیں ہے
مادر نے جو پوچھا تو سخن لب پہ یہ لائے
اُن بھائیوں سے پہلے نہ ہم خوں میں نہائے
یوں روتے ہیں شبیر کہ دیکھا نہیں جاتا
تیغوں میں گوارا ہوں اگر دودھ کی دھاریں
لڑنے پہ چڑھیں شمر کا سر تن سے اتاریں
جب مرچکے دو بھائی تو وہ ہوش میں آئے

خیمہ میں یہ باتیں تھیں کہ آئے وہ دلاور
ساتھ اپنے انھیں لے کے گئی بانوے مضطر
یہ نورِ نظر لائقِ الطاف و عطا ہیں
منہ پھیر کے کہنے لگیں یہ شاہ کی ہمشیر
شکوہ ہے مقدر کا کچھ ان کی نہیں تقصیر
انصاف تو کیجے مجھے کیونکر نہ گلا ہو
حُر کون تھا اور کون تھا ابن قین بجلی
کیونکر ہو بھلا مادر مضطر کو تسلی
آفت ہے یگانے ہی جو ہمت نہ کریں گے
فرزندِ حسن مرنے کو جالیں تو یہ جائیں
ہمشکلِ نبی برچھیاں کھالیں تو یہ جائیں
کھلتا نہیں کچھ جوشِ شجاعت انھیں کیوں ہے
کیوں روتے ہیں کیا چھن گئی سر سے مرے چادر
وقت آئے تو دکھلائیں گے تلواروں کے جوہر
جب کوئی نہ ہوئے گا تو یہ جنگ کریں گے
تلواروں میں دم عشق کا بھرتے ہیں وفادار
موقع ہو تو دنیا سے گزرتے ہیں وفادار
خنجر دلِ زہرا پہ جو چل لیں تو سدھاریں
میں سمجھی تھی پہلے ہی یہ ڈھونڈیں گے بہانا
لازم تھا اسی وقت انھیں خیمے میں آنا
جس تیغ میں تاثیر زباں میں نہیں ہے

دیکھا کہ الگ بیٹھی ہوئی روتی ہے مادر
کی عرض کہ چھاتی سے لگا لو انھیں خواہر
تقصیر ہوئی کیا جو حضور ان سے خفا ہیں
غیرت کی ہے جا غیر تو ہوں فدیۂ شبیر
منہ پھیریں وہ مقتل سے جو ہوں صاحبِ شمشیر
وہ پہلے نہ بیدم ہوں لہو جن میں ملا ہو
ہے عرش تلک جن کے ستاروں کی تجلی
مقتل میں یہ کوتاہیاں گھر میں یہ تعلی
یہ کس نے کہا تھا کہ ہمیں پہلے مریں گے
عباسِ علی خون میں نہا لیں تو یہ جائیں
لاشے ابھی شہزادوں کے آلیں تو یہ جائیں
حضرت تو سلامت ہیں عجلت انھیں کیوں ہے
خالی ابھی ہو لینے دیں محمد کا بھرا گھر
جرأت میں وہ جعفر ہیں شجاعت میں یہ حیدر
کیا عیب ہے پہلے نہ مرے بعد مریں گے
سر دینے میں سبقت کہیں کرتے ہیں وفادار
سردار سے پہلے کہیں مرتے ہیں وفادار
ماں خیمے سے سر ننگے نکل لے تو سدھاریں
کچھ منہ کا نوالہ نہیں تلواروں کا کھانا
سچ ہے کہ وفاداروں سے خالی ہے زمانا
غیروں میں اب الفت ہے یگانوں میں نہیں ہے

کم عمر ہیں بچے ہیں یہ کیا وقت کو جانیں
رخ زرد ہیں لب تشنگی میں سوکھی ہیں زبانیں
واں تیغوں میں تابش ہے کڑکتی ہیں کمانیں
جو نام پہ مرتے ہیں وہ دے دیتے ہیں جانیں
مذکور بزرگانِ خوش اوقات تو رہجائے
جانیں نہ رہیں گر نہ رہیں بات تو رہجائے

ماں کو تو سبک کر چکے کنبے کی نظر میں
ہیں لٹ گئی اس رنج و مصیبت کے سفر میں
پوچھے کوئی ان سے کہ یہ کیوں آئے ہیں گھر میں
کھولیں اسے باندھیں ہیں جو ہتھیار کمر میں
فوجوں میں یہی طور تھے خالق کے ولی کے
لڑنا ہے اس پر کہ نواسے ہیں علیؑ کے

توڑ آئے ہوں خیبر سے کسی در کو تو کہہ دیں
مارا ہو جو مرحب سے دلاور کو تو کہہ دیں
تا کوہ بھگا آئے ہوں لشکر کو تو کہہ دیں
خوشنود کیا ہو جو برادر کو تو کہہ دیں
چپ کیوں ہیں جو نصرت کی خبر لیکے پھرے ہیں
کیا شام کے سردار کا سر لیکے پھرے ہیں

یہ ذکر تھا جو خیمہ میں داخل ہوئے شبیر
دیکھا کہ ہیں بیٹوں سے خفا زینبِ دلگیر
فرمایا شکایت کے سخن کچھ نہ ہمشیر
ملتے ہیں کسے ایسے پسر صاحبِ توقیر
تلواروں میں ہر دم مرے قدموں پہ جھکے تھے
یہ شیرِ دلاور مرے روکے سے رکے تھے

افلاکِ شجاعت کے یہی دو ہیں شہنشاہ
رکھتے انھیں پردے میں جو ہوتے اسد اللہ
پوچھے کوئی مجھ سے تمھیں قدر ان کی نہیں آہ
تم تو شہِ مرداں کی جلالت سے ہو آگاہ
ہلتی تھی زمیں غیظ سے خالق کے ولی کے
یہ اور کی چتون نہیں تیور ہیں علی کے

مالک ہو تم ان دونوں سے بگڑو کہ خفا ہو
بہتر ہے وہ غصہ جو مناسب ہو بجا ہو
ایسے ہیں کہ حق دودھ کا ان سے نہ ادا ہو
میں کیا کروں دونوں کا مرنا تمھیں چاہو
سمجھا کہ میں ہاتوں سے انھیں کھوؤگی زینب
جب یہ نہ ملیں گے تو بہت روؤگی زینب

کس طرح میں اس دولتِ بیدار کو کھوتا
جیتا میں جو ان میں سے کوئی پاس نہ ہوتا
موت آتی تو سر دے کے میں اس دشت میں سوتا
روتے یہ مری لاش پہ میں ان کو نہ روتا
کچھ بس نہیں چلتا جو اجل آتی ہے زینب
موت ان کو مرے گھر سے لیے جاتی ہے زینب

دو داغ جگر سوز ہیں ہمشیر کروں کیا — بچوں کے بچا لینے کی تدبیر کروں کیا
کرتی ہی اکیلا مجھے تقدیر کروں کیا — رُکتے نہیں یہ صاحبِ شمشیر کروں کیا
صدمہ اُسے ہوتا ہی زیادہ جسے روکوں — مشکل ہی مجھے کس کو رضا دوں کسے روکوں

زینب نے کہا آپ الم ان کا نہ کیجیے — طالب ہیں تو بہتر ہی اجازت انھیں دیجیے
قربان ہیں سب بھانجے ہوں یا کہ بھتیجے — گر دھیان ہی میرا تو قسم رونے کی لیجیے
بیٹے بھی فدا آپ پہ ہیں میں بھی فدا ہوں — دیر اتنی ہوئی کیوں میں اسی پر تو خفا ہوں

تھرّا کے وہ بولی کہ ہماری نہیں تقصیر — قسمت میں خجالت تھی نہ یاور ہوئی تقدیر
فرمایا شجاعت کے منافی ہی یہ تقریر — مسلم کے پسر کاہے کو تھے صاحبِ شمشیر
جاتے ہوئے کس دوست کو آقا نے نہ روکا — روکا نھیں اُن کو شہِ والا نے نہ روکا

جو مرد ہیں پہلے وہی مرجاتے ہیں پیارو — آزردہ تھی پر جی سے خوشی اب ہوں سدھارو
صدقے گئی اُلجھی ہوئی زلفیں تو سنوارو — واری یہ تمنّا ہی کہ سر ماموں پہ وارو
سر دیکے جسے پاتے ہیں وہ راہ یہی ہی — صدقے گئی شادی ہی یہی بیاہ یہی ہی

پوشاک بدل کر جو سجے جنگ کے ہتھیار — غل تھا کہ چلے شاہ کی ہمشیر کے دلدار
مجرے کو جھکے ماں کے جو وہ آئنہ رخسار — سینے میں تڑپنے لگا زینب کا دلِ زار
فرمایا ادا سر سے کرو حق شہِ دیں کا — لو جاؤ مبارک ہو سفر خلدِ بریں کا

فوجوں کو مرے دودھ کی تاثیر دکھانا — دادا کی طرح جوہرِ شمشیر دکھانا
مظلومیتِ حضرتِ شبیر دکھانا — تن تن کے یداللہ کی تصویر دکھانا
تلوار اگر لاکھ چلیں سر نہ فرو ہو — جو سامنے آجائے وہ اک ضرب میں دو ہو

حیدر کی شجاعت کا معرّف ہی زمانا — فوجوں پہ اُسی دبدبہ و شاں سے جانا
ہنس ہنس کے تم اُن چھاتیوں پہ برچھیاں کھانا — جرات کے منافی ہی سپر چہرے پہ لانا
ظلمت ہو قمر پہ یہ سزاوار نہیں ہی — جو منہ کو چھپاتا ہی وہ رو دار نہیں ہی

بلوہ ہو تو پروا نہ رہے بھائی پہ بھائی
مثلِ جسد و روح نہ دم بھر ہو جدائی
دکھلائیو ان چھوٹے سے ہاتوں کی صفائی
جائیں جو لڑاؤ گے تو سر ہو گی لڑائی
گر مر گئے تو قبر بھی عزت بھی ملے گی
میں دودھ بھی بخشوں گی شہادت بھی ملے گی

دم ہونٹوں پہ آجائے اگر پیاس کے مارے
غش کھا کے جو گر پڑو بھی تو دریا کے کنارے
پانی کو ترستے رفقا مر گئے سارے
یہ آبِ رواں بند ہے ماموں پہ تمھارے
تلواریں ہیں موجوں کی روانی نہ سمجھنا
دریا ہے لہو کا اسے پانی نہ سمجھنا

کی عرض یہی ہوے گا ای مادرِ غمخوار
کیا بات ہے جیتے ہیں تو مرنا نہیں دشوار
اس پیاس میں صابر ہیں غلامانِ وفادار
دریا کو نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار
دیجے گا سزا فرقِ اطاعت میں گر آئے
پھر دیکھیں نہ منہ آپ جو رخ تک سپر آئے

یہ کہتے ہوئے خیمے سے صفدر نکل آئے
اک برج سے دو چاند برابر نکل آئے
رومال رکھے آنکھوں پہ اکبر نکل آئے
شبیر بھی روتے ہوئے باہر نکل آئے
قدموں پہ جھکے وہ جو شہنشاہ زمن کے
کس جبر سے رخصت کیا بیٹوں کو بہن کے

شرما کے کہا جاؤ خدا حافظ و ناصر
شمشیر و سناں کھاؤ خدا حافظ و ناصر
اب دل کو نہ تڑپاؤ خدا حافظ و ناصر
چھاتی سے لگو آؤ خدا حافظ و ناصر
ناشاد پُر ارمان مرے گھر سے چلے ہو
گھوڑوں پہ چڑھا لوں میں کہ گودی میں پلے ہو

تھامے جو رہے بازوؤں کو قاسم و اکبر
گھوڑوں پہ چڑھے زینب ناشاد کے دلبر
الفت سے چلے ساتھ علمدارِ دلاور
تب کہنے لگے جوڑ کے ہاتھوں کو وہ صفدر
کچھ فوجِ شقاوت نہیں ور آپ ٹھہر جائیں
آقا پہ مصیبت ہے حضور آپ ٹھہر جائیں

فرمایا کہ دل سینے میں ٹھہرے تو میں ٹھہروں
دو زخم نہ ہوں دل پہ جو گھبرائے تو میں ٹھہروں
دریا سے ہٹا لوں جو یہ بپھرے تو میں ٹھہروں
پانی ہوں ستمگاروں کے زہرے تو میں ٹھہروں
لازم ہے کہ جاؤں تو صفیں توڑ کے جاؤں
زینب سے کہوں کیا جو تمھیں چھوڑ کے جاؤں

جھکنے لگے گھوڑوں سے جو وہ آئینہ رخسار
تینوں میں چلے جنس شہادت کے طلبگار
ساتھ اُن کے ہرن جست میں گشت میں پہنچے
یوں آئے کہ جس طرح نسیمِ چمن آئے
سونلائے ہوئے دھوپ میں گل پیرہن آئے
شبیر آتے ہیں لشکر سے ولی ابن ولی کے
دو صاعقہ لشکر پہ چمکتے ہوئے آئے
دو شیر صف جنگ کو تکتے ہوئے آئے
تھا شور کہ ہوش اُڑتے ہیں یاں کبک دری کے
وہ گردنیں گھوڑوں کی وہ سم اور وہ سینے
چاروں وہ قدم اور وہ رکابوں کے قرینے
سرعت میں ہے راہِ جبل و بحر و صراط ایک
آہو ہیں کہ سرگرم تگ و دو ہیں زمیں پر
نعل ان کے نہیں آٹھ مہ نو ہیں زمیں پر
طاؤس میں جلوہ ہے یہ یہ چال نہیں ہے
کیا دونوں کو اسپانِ سبکتاز ملے تھے
فتراک نہیں تھے پر پرواز ملے تھے
شیروں کا بھی یہ رعب دمِ جنگ نہیں ہے
غصہ میں جو ہر بار ٹھہر جاتے ہیں چل کے
اِس طرح قدم خاک پہ رکھتے ہیں سنبھل کے
ہر گام پہ اُڑ جانے کو تیار ہیں دونوں

مغموم پھرے حضرتِ عباسِ علمدار
باگیں جو اُٹھائیں تو ہوا ہو گئے رہوار
اُڑتے ہوئے طاؤسِ چمن دشت میں پہنچے
گھوڑے تھے کہ دو آہوئے چین و ختن آئے
فوجوں میں ہوا شور کہ وہ صف شکن آئے
حضرت نے صدا دی کہ نواسے ہیں علی کے
شعلے تھی کہ آندھی میں لپکتی ہوئے آئے
دو گل تھے ہوا پر کہ مہکتے ہوئے آئے
گھوڑے نہیں جھونکے ہیں نسیمِ سحری کے
غل تھا کہ یہ سینے کبھی دیکھے ہیں کسی نے
کرسی کے یہ پائے ہیں تو ہیں عرش کے زینے
بلقیس کا تخت ایک سلیماں کی بساط ایک
دو شبیر مہیائے روا رو ہیں زمیں پر
کیلیں نہ کہو اختر پرضو ہیں زمیں پر
پریوں کے کھلے بال ہیں یہ یال نہیں ہے
جانبازوں کو رہوار بھی جانباز ملے تھے
زینب کے لیے ساز خدا ساز ملے تھے
رستم کا کمر بند ہے یہ تنگ نہیں ہے
آنکھوں نے نیا حسن دکھایا ہے ابل کے
گر ہاتھ میں ہو جام لبالب تو نہ چھلکے
بچوں کی سواری سے خبردار ہیں دونوں

زینوں پہ جو ہیں عرشِ الٰہی کے ستارے — جب پٹریاں جمتی ہیں تو بھرتے ہیں طرارے
خوش فہم ہیں ایسے کہ سمجھتے ہیں اشارے — ہیں شاہسوار آپ ید اللہ کے پیارے
کم سن ہیں یہ مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں — کس حسن سے رہواروں کے کمر باندھے ہوئے ہیں

ہر چند ہیں دونوں کے رکابوں سے جدا پاؤں — منہ ملتی ہیں قدموں پہ کبھی جو ہوا پاؤں
ہیں راہ روِ جادۂ تسلیم و رضا پاؤں — کیا ران ہے کیا باگ ہے کیا ہاتھ ہے کیا پاؤں
شوکت جو دکھاتے ہیں سمندوں کو بڑھاکر — حضرت نے سکھایا ہے یہ کاندھوں پہ چڑھاکر

وہ برق بہ سرعت وہ چھلاوہ بہ پری ہے — وہ آہوئے صحرا ہے تو یہ کبکِ دری ہے
سرعت جسے کہتے ہیں وہ رگ رگ میں بھری ہے — ہر گام نئی چال نئی جلوہ گری ہے
نعل اُن کے کہیں برق ہیں شمشیر کہیں ہیں — آہو کہیں چلتے ہیں کہیں شیر کہیں ہیں

گھوڑے ہیں کہ طاؤس شہادت کے چمن کے — باریک وہ جلدیں کہ خجل پھول سمن کے
گردن کے منوسے وہ ٹوٹے ہوئے منکے — گھونگٹ میں بھی پیدا ہیں سب انداز دلھن کے
دونوں کے پسینے میں بھی سب عطر کی بو ہے — رفتار میں گرمی یہ پریزادوں کی خو ہے

وہ شان وہ اجلال وہ شیروں کی نگاہیں — نعرے جو کیے بند ہوئیں امن کی راہیں
دعوے کہ فنا کر دیں ابھی ہم جسے چاہیں — ہمت وہ کہ جو منہ سے کہیں اُس کو نباہیں
فوجوں کو بھگایا ہے تو ہم بڑھ کے تھمے ہیں — سرکے نہیں جب کھیت میں یہ پاؤں جمے ہیں

فوجوں کی صفائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو — لشکر میں دُہائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
ہاں قلعہ کشائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو — بچوں کی لڑائی جو نہ دیکھی ہو تو دیکھو
یہ مُنہ کبھی تیغوں سے پھرے ہیں نہ پھریں گے — مرتے ہوئے دن ہیں قدم بڑھ کے گرینگے

تم سب میں شجاعت کا دھنی جو ہو وہ نکلے — بدخواہ امامِ مدنی جو ہو وہ نکلے
آمادۂ شمشیر زنی جو ہو وہ نکلے — سر دفترِ لشکر شکنی جو ہو وہ نکلے
تنہا نہیں اسکتی تو فوجیں بہم آئیں — کیوں دیر ہے گر تم نہیں بڑھتے تو ہم آئیں

تم لاکھ ہو ہم دو ہیں یہ راضی ہیں رضا پر — لاکھوں ہوں تو کیا ہیں نظر اپنی ہے خدا پر
کھل جائیں نشان چوب لگے طبل وغا پر — جلدی ہے کہ صدقے ہوں امام دوسرا پر
دیر اب نہ کرو جان لڑائی میں لڑی ہے — ہم پیاسے ہیں اور روزے کے اور دھوپ کڑی ہے

یہ ذکر ابھی تھا کہ خدنگ آئے اُدھر سے — شمعوں کی طرح اُڑ کے پتنگ آئے اُدھر سے
سرہنگ و جفا جو پئے جنگ آئے اُدھر سے — یا فسے جو بڑھے لعل تو سنگ آئے اُدھر سے
ڈھالیں تھیں بہم گرز بھی ہاتوں میں تُلے تھے — نیزے بھی لچکتے تھے پھریرے بھی کھلے تھے

کڑکیں وہ کمانیں کہ ہوا فوج کا کڑکا — تیغوں کی سفیدی تھی کہ تھا نور کا تڑکا
گہہ جھمکیا خورشید کا شعلہ کبھی بھڑکا — ہر دل کو ہلا دیتا تھا سر کٹنے کا دھڑکا
نعرے تھے کہ حیدر کے دلیروں سے وغا ہے — گھوڑے بھی بھڑکتے ہیں کہ شبیروں سے وغا ہے

دانتوں میں شجاعان عرب ڈاڑھیاں ڈالے — وہ صورتیں خونخوار وہ گھوڑے وہ رکابے
وہ گردنیں وہ سر تھے کہ معکوس قرابے — وہ آگ کے پتلے تھے تو شبدیز شتابے
خوں آل محمد کا بہایا تھا اُنھیں نے — سادات کے خیموں کو جلایا تھا اُنھیں نے

قبضوں پہ ادھر ہاتھ سلح شوروں نے ڈالے — تیر آئے کمانوں سے بڑھے ظلم کے بھالے
یاں تیغے شیروں نے نیاموں سے نکالے — فوجوں پہ چلے شاہ کی آغوش کے پالے
اِک برق گری لشکر بدخو کی صفوں پر — دو شیروں نے حملہ کیا آہو کی صفوں پر

ریزہ ہوا لشکر وہ صف اُس جا تھی اِس جا — آفت تھی نہ کس صف میں قیامت تھی نہ کس جا
ہل چل ہوئی دو شیر گئے فوج میں جس جا — لشکر میں یہ تھا شور کہ دنیا ہے نجس جا
سمجھے تھے کہ شبیر کا سر ہاتھ لگے گا — جائیں تو چلیں اب کسے زر ہاتھ لگے گا

اے سیف زباں تازہ لڑائی تو مجھے دکھلا — اے تیغ علی قلعہ کشائی تو مجھے دکھلا
شمشیر طلاقت کی صفائی تو مجھے دکھلا — اے ذہن رسا اپنی صفائی تو مجھے دکھلا
پشتی کو ہے موجود وہ صفدر جو علی ہے — پھر کھینچ وہ تلوار جو سو بار چلی ہے

یا شیرِ خدا سیفِ دو دم دیجیے مجکو
یا شاہِ نجف طبل و علم دیجیے مجکو

سر بر نہ ہو لشکر وہ حشم دیجیے مجکو
میدان جو چھوڑے وہ قلم دیجیے مجکو

نیزے سپہِ شام کے ہٹتے نظر آئیں
سب فوج کے چہرے ابھی کٹتے نظر آئیں

کوثر کا بھرا جام پلا دیجیے مولا
بالائے ولا اور ولا دیجیے مولا

ہر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجیے مولا
شمشیرِ فصاحت کو جلا دیجیے مولا

میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہے
مدّت سے جو ہوں چپ تو زباں صاف نہیں ہے

گو پیر ہوں پر زورِ جوانی ہے ابھی تک
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک

دندان نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک
قبضے میں وہ تیغِ صفہانی ہے ابھی تک

جوہر ہے وہی باڑھ وہی گھاٹ وہی ہے
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وہی ہے

تصویرِ پریشانیِ کفار دکھا دوں
غیظ و غضبِ حیدرِ کرار دکھا دوں

جعفر کو ابھی جنگ پہ تیار دکھا دوں
ہر بند پہ چلتی ہوئی تلوار دکھا دوں

رخ سب قدر اندازوں کے پھرتے نظر آئیں
سرداروں کے سر خاک پہ گرتے نظر آئیں

لو نیچے شہزادوں کے چلتے ہیں خبردار
لو بانبیوں سے ناگ نکلتے ہیں خبردار

رنگ افعیِ خونخوار بدلتے ہیں خبردار
لو مارِ سیہ زہر اُگلتے ہیں خبردار

جل جاتا ہے وہ آنچ ذرا لگتی ہے جس کو
پڑ جاتے ہیں نیل اُن کی ہوا لگتی ہے جن کو

دو ناگ ہیں پُر زہر کہ لہراتے ہیں سر پر
گہہ پاؤں پہ آتے ہیں کبھی جاتے ہیں سر پر

نکلے جو زمیں سے تو جگہ پاتے ہیں سر پر
چاٹا ہے لہو گرم ہوا کھاتے ہیں سر پر

کچھ پڑھ کے بھی پھونکے گا جو ناری تو جلے گا
اعجاز ہے ان پر کوئی افسوں نہ چلے گا

نے مثل و عدیل ایک تو یکتا نے ماں ایک
اُن باغیوں پہ بادِ سموم ایک خزاں ایک

اک آتشِ جاں سوز ہے اور آبِ رواں ایک
گھاٹ ایک برش ایک چمک ایک زباں ایک

میان اس کا الگ ہے تو غلاف اس کا جدا ہے
اک جان دو قالب اُسے کہیے تو بجا ہے

نصرت کا وہ یہ فتح کے گنجینہ کا مشتاق
ایمان کا وہ دین کے آئینہ کا مشتاق
وہ سر کا یہ چار آئینہ میں سینہ کا مشتاق
جو بندہ وہ دم کا یہ لہو پینے کا مشتاق
وہ تیر کے دل سے نکل آیا یہ جگر سے
جوشن سے اُسے لاگ اسے بیر سپر سے

وہ بیچ خالی نہ کبھی جا کے پھر آئے
اعدا کا لہو خاک پہ برسا کے پھر آئے
گھس سن سے گئے اور کبھی لہرا کے پھر آئے
دم لیکے لہو پیکے صفیں کھا کے پھر آئے
مخدوش جو راہیں تھیں وہ شفاف ہوئی ہیں
کیا ہاتھ منجھے ہیں کہ صفیں صاف ہوئی ہیں

وہ ہاتھ وہ اُن چھوٹی سی تلواروں کا پرتو
چلنے میں جو بجلی تو ٹھہرنے میں مہ نو
سرپٹ میں وہ یک رنگی اسپانِ سبکرو
دو ہاتھ جدھر چل گئے سر اُڑ گئے سو سو
چلتی تھی غضب تیز ہوا دشتِ بلا میں
کیا چیز تھی پتے ثمر اُڑتے تھے ہوا میں

تیروں کو جو چلتوں میں کمانداروں نے جوڑا
تیر آئے تو بدکیشوں نے منہ سہم کے موڑا
دونوں نے بزرگوں کے طریقے کو نہ چھوڑا
صف ایک نے اُلٹی تو پرا ایک نے توڑا
تلواروں کی گھاٹوں میں شناور ہے دونو
موجیں بھی جو آئیں تو برابر رہے دونو

گر برق کہوں برق میں یہ تاب کہاں ہے
پانی میں روانی ہے پہ یہ آب کہاں ہے
آئینہ میں جوہر ہے پہ یہ داب کہاں ہے
آتش ہے تو آتش میں بھلا آب کہاں ہے
خم ہے پہ دم ایسا تو مہ نو میں نہیں ہے
ایسی تو چمک مہر کی پرتو میں نہیں ہے

ٹوٹی ہوئی صف عہد شکن دیکھ کے بھاگے
حیدر کی لڑائی کا چلن دیکھ کے بھاگے
نامرد فراقِ سر و تن دیکھ کے بھاگے
بپھرے ہوئے شیروں کو ہرن دیکھ کے بھاگے
دریا پہ بھی ڈر سے کوئی ٹھہرا نہیں جاتا
بھاگڑ میں یہ ہے شور کہ ٹھہرا نہیں جاتا

بڑھ کر سپر اس بھائی نے کاٹی تو سر اس نے
زخمی کیا دشمن کا دل اس نے جگر اس نے
صدر اس نے کیا چاک تو کاٹی کمر اس نے
دکھلائے علی کے چلن اس نے ہنر اس نے
مطلب تھا کہ نہ عمر کو نہ زید کو چھوڑیں
دو شیر جب ایسے ہوں تو کب صید کو چھوڑیں

کیا دخل جو قابو میں سوار آکے نکل جائے
کیا جان جو بھاڑ میں جگہ پا کے نکل جائے
کیا تاب جو گھوڑا کوئی چمکا کے نکل جائے
کیا منہ ہے جو تلوار کوئی کھا کے نکل جائے
جز کنجِ لحد اور کہیں امن نہیں تھا
پچکاب جسے ریتی پہ وہ پیوند زمیں تھا

یہ شوکتِ اسپانِ سکندر نہیں دیکھی
یہ جست یہ سرعت یہ تگ و دو نہیں دیکھی
گردوں پہ یہ تنویرِ مہ نو نہیں دیکھی
چلتی ہوئی تلواروں میں یہ ضو نہیں دیکھی
کالا تھا جو دن دھوپ بھی سیماب ہوئی تھی
لشکر کی سیاہی شبِ مہتاب ہوئی تھی

تھا شور کہ دریا یہ روانی نہیں رکھتا
یہ کاٹ کسی تیغ کا پانی نہیں رکھتا
خنجر کوئی یہ تیز زبانی نہیں رکھتا
ایک ایک وہ یکتا ہے کہ ثانی نہیں رکھتا
جد اِن کا اُٹھاتا تھا پیمبر کے علم کو
یہ چھین کے لے جائینگے لشکر کے علم کو

بہتے ہوئے دریا کی روانی ہے انھیں میں
یاں کند ہیں سب تیز زبانی ہے انھیں میں
بجلی کی طرح شعلہ فشانی ہے انھیں میں
جو آگ کو بھڑکائے وہ پانی ہے انھیں میں
موجوں کا طلاطم ہے کہ نو جیبِ لبِ جو کی
ٹاپو ہے وہ لاشوں کا یہ ندی ہے لہو کی

بہتے ہوئے دریا کا بھی کیا زور گھٹا ہے
ڈھالوں کی سیاہی ہے کہ گھنگور گھٹا ہے
مقتل میں برستا ہے لہو زور گھٹا ہے
تلواریں برستی ہیں سلح شور گھٹا ہے
ڈوبی ہوئی ہے خوں میں پڑی فوج عدو کے
بوچھار سروں کی ہے ڈریری میں لہو کے

سینوں کو سنانوں سے ملا دیتے ہیں دونوں
ہر ضرب میں گیتی کو ہلا دیتے ہیں دونوں
آئنۂ نصرت کو جلا دیتے ہیں دونوں
پانی انھیں تیغوں کا پلا دیتے ہیں دونوں
یوں مرتے ہیں کرتے ہیں برائی جو بھلوں سے
تھا زہر ہلاہل کہ اُترتا تھا گلوں سے

نے وست تھا نیزوں کو ادھر جس نے اُٹھایا
جان اُس کی گئی زخمِ جگر جس نے اُٹھایا
ضرب اُس پہ چلی فوج میں سر جس نے اُٹھایا
پہونچے سے اڑا ہاتھ تبر جس نے اُٹھایا
کیسے قدر انداز خطا کار کہاں کے
ترکش تھا نہ چلّہ تھا نہ گوشے تھے کماں کے

چھوٹا تھا بڑے بھائی سے خونریز زیادہ
کچھ ہاتھ بھی کچھ پنجہ بھی تیز زیادہ
سرتیز زیادہ شرر انگیز زیادہ
اُس گھوڑے سے گھوڑا بھی سبک خیز زیادہ
حیدر کی شجاعت بھی جلالت بھی غضب بھی
غصہ بھی تہور بھی برادر کا ادب بھی

بڑھ آئے کمیں سے جو کماندار سمٹ کر
پہونچے وہیں شہزادوں کے رہوار ہٹ کر
تھرّاتے تھے ڈر سے جو خطا کار سمٹ کر
چلّے بھی اتر جاتے تھے ہر بار سمٹ کر
سر کٹ گئے اب شکل کہاں امن و اماں کی
نیزوں کے نہ وہ نخل نہ شاخیں تھیں کماں کی

سر ایک سے لڑنے میں دو چند ایک نے کاٹے
تیر ایک نے اور نیزوں کے بند ایک نے کاٹے
سب حلقۂ گیر آئے کمند ایک نے کاٹے
قلموں کی طرح پائے سمند ایک نے کاٹے
جانبازیاں دیکھیں کہ جگرداری کو دیکھیں
جعفر ہوں تو ان ہاتھوں کی طرّاری کو دیکھیں

باندھا کسی برچھیت نے نیزے کا اگر بند
وا کر دیا بس ناخن تدبیر سے ہر بند
نعرہ تھا کہ ہم عقدہ کشا کے ہیں جگر بند
کھولیں اُسے خیبر سا اگر ہو کوئی در بند
بھولے ہو تم اس پر کہ تنومند نہیں ہیں
یہ ہاتھ کسی معرکہ میں بند نہیں ہیں

تلواروں میں ہر دم سر کٹ بھائی کی تھا ایک
اک ہوتا تھا بے تاب جو ہوتا تھا جدا ایک
رہواروں میں تھا ایک سے چالاک سوا ایک
چلنے میں ہوا ایک تو اُڑنے میں ہما ایک
دیکھا انھیں جس نے تو ہوئے ہوش گم اُس کے
نعل اس کے نہ لگتے تھے زمیں پر نہ سُم اس کے

غل تھا کہ نہ دیکھی تھی وغا آج تک ایسی
آفت کسی لشکر پہ نہ ڈالے فلک ایسی
دوزخ کے بھی شعلوں میں نہ ہوگی لپک ایسی
زائل ہوئی جاتی ہے بصارت چمک ایسی
آفت تھی قیامت تھی اُسے یار سے روکیں
دو بجلیاں گرتی ہیں برابر کسے روکیں

وہ غل عربی باجوں کا تیغوں کی وہ جھنکار
قرنا کی صدا وہ کہ ہلے گنبدِ دوار
کالی وہ گھٹا شام کے لشکر کی دُھواں دھار
بڑھ بڑھ کے یہ کڑکیت صدا دیتے تھے ہر بار
ہاں آج تو دینِ سپہ شام کا دن ہے
اے لشکریو نام کرو نام کا دن ہے

ای فوجِ ظفر موج کے جرار جوانو
یہ وقت کے ہیں جعفرِ طیار جوانو
پونہچے بھی یہ کاٹیں گے مروڑیں گے علم کو
جس غول پہ جس صف پہ چلے نیمچے ان کے
کشتہ کیا گنتی کی سواروں کو جو گن کے
فوجیں وہ کہاں اور کہاں تشنہ دہان دو
یہ کہتے تھے لشکر کا نشاں دو تواماں دیں
ہاں صلح کی حضرت کو زباں دو تواماں دیں
خونِ پسرِ سعد بہا دو تو رکیں ہم
بتلا دو ہمیں خولیِ خونخوار کدھر ہے
ارزق جسے کہتے ہیں وہ مکار کدھر ہے
ہم نیمچہ چمکا کے بڑھاتے ہیں فرس کو
تھراتے ہیں سن سن کے یہ نعرے وہ جفا جو
کہتا تھا کہ ان بچوں میں ہے شیر کی خو بو
آفت میں مدد گار ہو رنجوں سے بچاؤ
یہ سنتے ہی سب شام کا بادل امنڈ آیا
اک ظلم کا دریا سوئے مقتل امنڈ آیا
پاس آکے لڑا ایک نہ اس فوجِ عدو میں
زخمی ہوئے جب شیر تو لشکر میں در آئے
وہ نیمچے جب سن سے کسی غول پر آئے
دونوں کے فرس ابر کہیں برق کہیں تھے

دو شیر کے بچے ہیں یہ ہشیار جوانو
لشکر کے نشانوں سے خبردار جوانو
پنجہ جو بڑھایا تو نہ چھوڑیں گے علم کو
بے جان ہوئے وہ وار چلے دونوں پہ جن کے
تھرانے لگے دانتوں میں سب دابکے تنکے
دو لاکھ کے لشکر میں یہ غل تھا کہ اماں دو
دنیا کی محبت پہ نہ جان دو تواماں دیں
اصغر کو جو یہ آب رواں دو تواماں دیں
ہاں شمر کا سر کاٹ کے لا دو تو رکیں ہم
شبیث ابن ربیعی سا جفا کار کدھر ہے
کیوں حرملۂ سرکش و غدار کدھر ہے
یاں بھیجدو میدان میں سنان ابن انس کو
ڈھالوں میں چھپا تھا پسرِ سعدِ سیہ رو
ٹکڑے مرے کر دیں گے اگر پائیں کہیں تو
یارو مجھے ان شیر دلوں کے پنجوں سے بچاؤ
اک دل کا ہٹانا تھا کہ اک دل امنڈ آیا
نیزوں کا نیستاں تھا کہ جنگل امنڈ آیا
نہلا دیا بوچھار نے تیروں کی لہو میں
آفت ہوئی برپا غضب آیا جدھر آئے
ہاتھ اٹھ گئے واں تو ادھر کٹ کے سر آئے
دستانے کہیں خود کہیں فرق کہیں تھے

شیروں نے دل اُس فوج بد آئین کے توڑے
گویا کہ پرے خیبر و صفّین کے توڑے
ہاتھ آیا تو بازو کسی بے دین کے توڑے
جھنجلائے تو لشکر کے نشان چھین کے توڑے
چھینٹیں بھی ادھر خون کی نہروں کی اُڑائیں
کیا دھجیاں علموں کے پھریروں کی اُڑائیں

بیٹھی تھیں پسِ پردہ ادھر زینب ناچار
چہرہ تھا کبھی زرد کبھی سرخ تھے رخسار
بے تابی میں فضہ سے یہ فرماتی تھیں ہر بار
تو دیکھ تو پہونچے ہیں کہاں تک مرے دلدار
کھائے ہیں ابھی زخم نہ گھوڑوں سے گرے ہیں
معلوم یہ ہوتا ہے کہ فوجوں میں گھرے ہیں

نکلی جو عصا تھام کے وہ خیمے کے باہر
خم تھی کمر اور منہ عرقِ شرم سے تھا تر
چلنے میں قدم کانپتے تھے ضعف سے تھر تھر
ہلتا تھا ضعیفی کے سبب سے سرِ انور
کیوں کر یہ نہ ہو خادمہ آل عبا تھی
برقع نہ عصابہ نہ قصابہ نہ ردا تھی

شہزادوں کی سب معرکہ آرائی بھی دیکھی
جرأت بھی جلالت بھی توانائی بھی دیکھی
دانائی بھی غربت بھی شکیبائی بھی دیکھی
جانبازی بھی مظلومی بھی تنہائی بھی دیکھی
شیروں کو لہو میں بھی نہاتے ہوئے دیکھا
آگے جو بڑھیں تیر بھی کھاتے ہوئے دیکھا

روتی ہوئی خیمے میں جو آئی وہ دل افگار
زینب نے کہا قتل ہوئے کیا مرے دلدار
کی عرض نہیں تو ابھی لڑتے ہیں وہ جرار
آفت ہے سپاہ بھاگتے پھرتے ہیں جفا کار
وہ کونسا پیکاں ہے جو چو رنگ نہیں ہے
سب کہتے ہیں طوفان ہے یہ جنگ نہیں ہے

نیزے سر اسے کرتے ہیں جسے پاتے ہیں دونوں
سب ہٹتے ہیں جب تیغ چمکاتے ہیں دونوں
ڈھالوں کی گھٹا میں کبھی گھر جاتے ہیں دونوں
لڑ بھڑ کے کبھی صاف نکل آتے ہیں دونوں
کس حشم کی پتلی میں وہ کاوا نہیں پھرتا
یوں پھرتے ہیں گھوڑے کہ چھلاوا نہیں پھرتا

لاکھوں تو بلائیں ہیں وہ بچے کسے ٹالیں
تلواریں ادھر ہیں تو ادھر نیزوں کی بھالیں
زرہوں پہ نہ چار آئینہ نہ ہاتھوں میں ڈھالیں
مہلت نہیں جو سینوں سے تیروں کو نکالیں
تلواروں میں بھائی کی سپر ہوتا ہے بھائی
بہتا ہے جو بھائی کا لہو روتا ہے بھائی

قایم رہے ان بھائیوں کی خلق میں جوڑی — ہل چل تھی اُدھر باگ جو ہر شخص کی موڑی
اُلٹا جو پرا اس نے تو صف اُس نے بھی توڑی — چھوٹے نے کوئی بات علی کی نہیں چھوڑی
تیور وہی آواز وہی آن وہی تھی — نعرے وہی توقیر وہی شان وہی تھی

ساونت ہیں اُن اپنے عموزادوں کی واری — حملوں میں ہے شوکت اسد اللہ کی ساری
تلواریں بھی اُن نیمچوں سے ہو گئیں آری — خود غیرتِ گلشن تو فرس بادِ بہاری
نیچے کہیں اس شان سے توسن پہ چڑھے ہیں — میں نے تو یہ جانا کہ علی رن پہ چڑھے ہیں

چھایا ہوا تھا چار طرف شام کا بادل — میں تھی وہیں لڑنے کے لیے آے جو دو بل
تلواریں علم ہاتوں میں تھیں ابروں پہ بل — نعروں سے فلک گونج اُٹھا ہل گیا جنگل
ایک ایک کی آنکھیں تھیں کہ دو ساغرِ خوں تھے — کچھ مرحب و عنتر سے بھی دل بر میں فزوں تھے

تیغیں وہ کہ منہ لوہے کی ڈھالوں سے نہ موڑیں — نیزے وہ قیامت کہ دلِ کوہ کو توڑیں
ہم پنجۂ ہوز رستم تو کلائی کو مروڑیں — حملہ کریں جس پر نہ سلامت اُسے چھوڑیں
ہر دم تھا اشارہ پسرِ سعدِ لعیں سے — اِک نیزے میں دونوں کو اُٹھا لیتے ہیں زیں سے

تلوار اُٹھا کر جو چلے عونِ دلاور — چھوٹے نے کی عرض بڑے بھائی سے بڑھ کر
للہ نہ فرمایئے تکلیف برادر — آئے ہیں تو جاتے ہیں کہاں اب یہ ستمگر
لڑ لیں اگر ان دونوں کو لڑنے کی ہوس ہے — بھیا یہ غلام آپ کا ان کے لیے بس ہے

بی بی وہ جلالت مجھے بھولے گی وہ شان — ای شیر کے بچے تری ہمت کے میں قربان
بھائی نے جو خاطر سے کہا خیر مری جان — گھوڑے کا اُٹھانا تھا کہ بس لے لیا میدان
دکھلا دیئے انداز وغا سے اب و جد کے — غل تھا کہ غزال آ گئے پنجے میں اسد کے

اِک ضرب میں ہاتھ اس کے اُڑے تو سر اُس کا — اِس نخل کی شاخیں تھیں ندارد ثمر اُس کا
ٹکڑے تھا دل اُس کا تو لہو تھا جگر اُس کا — دم سینے سے نکلا اِدھر اس کا اُدھر اس کا
دم بھر میں نہ غرہ تھا نہ شورش رہی سر میں — ساتھ آئی تھی ادبار کے ساتھ گئی قعرِ سقر میں

سن کر یہ بیان شاد ہوئیں زینب خوش خو — پھر جوش محبت سے رہا دل پہ نہ قابو
ہر بی بی سے ارشاد کیا پونچھ کے آنسو — میدان سے سر کے نہیں ابتک مرے گلرو
لاکھوں سے لڑے تشنہ دہن کام کیا ہی — سنتی ہوں کہ چھوٹے نے بڑا نام کیا ہی

سب بی بیاں بولیں کہ یہ ہی آپ کا اقبال — اُن دونوں کا سوچو تو ابھی کیا ہی سن و سال
پرواہ رہی تو قبر زیبے حشمت وا جلال — فرمایا کہ ہاں صاحب غیرت ہیں مرے لال
بھائی کے سوا مجکو نہیں فکر کسی کی — عزت سے وہ مر جائیں میں طالب ہوں اسی کی

یہ ذکر ابھی تھا کہ صدا رونے کی آئی — دروازے سے اکبر نے یہ آواز سنائی
لوٹی گئی ہی ہی پھوپی اماں کی کمائی — مارے گئے دو ساتھ کے کھیلے ہوے بھائی
روتے ہوے عباس بھی ہمراہ گئے ہیں — خود لاشیں اٹھانے کے لیے شاہ گئے ہیں

یہ سنتے ہی قبلے کی طرف جھک گئیں زینب — سجدے سے اٹھیں جب تو کہا شکر ہی یارب
طالب تھی میں جس کی وہ بر آیا مطلب — سب مٹ گئے دھڑکے کوئی تشویش نہیں اب
لٹنے سے محمد کی کمائی کو بچالے — سب قتل ہوں پر تو مرے بھائی کو بچالے

کس منہ سے ترا شکر کروں بارِ خدایا — تو نے مرے دو بچوں کو پروان چڑھایا
گر بیاہ فلک نے نہ دکھایا نہ دکھایا — جو رتبۂ اعلائے شہادت ہی وہ پایا
عالم میں جو دکھ ان کے لیے میں نے سہے ہیں — تو رحم کر ان پر کہ یہ مظلوم مرے ہیں

فضہ کی صدا آئی کہ ای چاہنے والو — سب مل کے ارے میرے خوزادوں کو سنبھالو
روتی ہیں کہاں بانوِ عالم کو بلالو — لوٹا گیا گھر خاک عزا بالوں پہ ڈالو
مقتل سے حسین ابنِ علی لائے ہیں لاشے — سیدانیو ڈیوڑھی پہ چلو آئے ہیں لاشے

در تک گئی ناموس نبی کھولے ہوے سر — لاشوں کو لیے خیمے میں داخل ہوے سرور
اک لاش کو لائے تھے علمدار دلاور — لپٹائے تھے چھوٹے کو گلے سے شہ صفدر
جنبان تھی زمیں غل تھا یہ فریاد و بکا کا — ہلتا تھا کلس خیمۂ شاہ شہدا کا

ماتم تھا کہ برباد یہ گھر ہوگیا ہی ہی
زہرا کے نواسوں کا سفر ہوگیا ہی ہی
کس کی نظرِ بد کا گزر ہوگیا ہی ہی
یہ چاند ہر اک خون میں تر ہوگیا ہی ہی
تقدیر میں سر پیٹنا تھا نوحہ گری تھی
خالی ہوئی وہ گود جو بچوں سے بھری تھی

لاشوں کو شہِ دیں صفِ ماتم پہ جو لائے
سب اہلِ حرم پیٹتے روتے ہوئے آئے
زینب نے نہ فریاد کی نہ اشک بہائے
بیٹھی رہیں سر زانوئے اقدس پہ جھکائے
لب خشک تھے منہ زرد مژہ آنسوؤں سے تر تھی
نہ اپنی نہ بھائی کی نہ لاشوں کی خبر تھی

بانو جو قریب آئی تو بولی یہ وہ مغموم
بی بی مجھے کچھ آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم
کس جا علی اکبر ہیں کدھر ہیں شہِ مظلوم
کس کی خبر آئی ہی کہ ماتم کی ہی یہ دھوم
پردیس میں جینے سے کسے یاس ہوئی ہی
یہ کونسی ماں بیٹوں سے بے آس ہوئی ہی

عرصہ ہوا بچوں کو مرے نہیں سدھارے
کیا جانیے سر ماموں پہ وارے کہ نہ وارے
دھڑکا ہی کہ کمسن ہیں بہت وہ مرے پیارے
دریا پہ کہیں جا نہ پڑیں پیاس کے مارے
سر دے کے پھریں یہ دھوم ہو ثابت قدمی کی
میں دودھ نہ بخشوں گی جو لڑنے میں کمی کی

بولے یہ بصد درد علی اکبرِ ذی شان
حاضر ہی یہ محجوب غلام ای پھوپھی اماں
شبیر پکارے کہ یہ ہیں ترے قربان
زندہ تھا سحر تک مگر اب میں ہوا بے جان
فوجوں کو بھگایا ہی ہزاروں سے لڑے ہیں
یہ عون و محمد ہیں جو بے جان پڑے ہیں

ہوش آگیا زینب کو صدا بھائی کی سن کر
کی عرض یہ سب آپ کا صدقہ ہی برادر
خوشنود ہیں آقا تو رضامند ہی مادر
لو بخشدیا دودھ انھیں یا شہِ صفدر
یہ آپ پہ قربان ہوئے راہِ خدا میں
نام ان کے خدا عرش پہ لکھے شہدا میں

حضرت نے کہا رو کے گلے ان کو لگا کر
اب پاس تمھارے نہیں یہ آئیں گے جا کر
پانی نہ پیا تیغ میں بھی برچھیاں کھا کر
رخصت ہوئے ماموں کو لبِ خشک دکھا کر
کس سے کہوں جیسے یہ وفادار پسر تھے
دم نکلے تو دونوں کے سرِ پاؤں پہ سر تھے

بانو نے رکھے زانو پہ زینب پسر ان کے
جو بی بیاں تھیں آ گئیں منہ کو جگر ان کے
زینب نے جو کی جھک کے رخوں پر نظر ان کے
دکھلائی دیئے چاند سے منہ خون میں تر ان کے
رخسار بھی مجروح تھے ابرو بھی کٹے تھے
شانے تھے جدا چاند سے بازو بھی کٹے تھے

منہ چھاتیوں پہ رکھ کے یہ ناشاد پکاری
آرام میں ہو یا ہے غشی پیاس کی طاری
ہوتا ہے بیان شوکت و ہمت کا تمھاری
تسلیمیں کرو قبلۂ کونین کو واری
سمجھی میں کہ باعث ہے یہ بیداری شب کا
پیارے یہ طریقہ نہیں ارباب ادب کا

تعریف امام دوسرا کرتے ہیں اٹھو
عباس علمدار ثنا کرتے ہیں اٹھو
ہمشکل نبی مدح و ثنا کرتے ہیں اٹھو
سب لوگ نہ اٹھنے کا گلا کرتے ہیں اٹھو
آقا سے مصیبت میں جدا ہو نہیں جاتے
صدقے گئی یوں جنگ کے دن سو نہیں جاتے

تم تو کبھی یوں رات کو غافل نہیں سوئے
پانی نہیں کاہے سے یہاں چہروں کو دھوئے
اب تم نہ ملو گے جو کوئی جان بھی کھوئے
قسمت میں یہ لکھا تھا کہ ماں لاشوں پہ روئے
سر دے کے مرے حق سے ادا ہو کے پھرے ہو
سمجھی ہیں کہ ماموں پہ فدا ہو کے مرے ہو

احسنت مرے صف شکنو نیک خصالو
گل پیرہنو تشنہ لبو گیسوؤں والو
غش آتا ہے پیارو مجھے اٹھ اٹھ کے سنبھالو
لو چھوٹی سی باہیں تو گلے میں مرے ڈالو
مظلوم ہو دربار میں عادل کے سدھارو
جاتے ہو تو اماں کے گلے مل کے سدھارو

پیارو تم اکیلے کبھی نکلے نہیں گھر سے
رستے سے نہ واقف نہ صعوبات سفر سے
راہیں بھی وہ خالی نہیں جو خوف و خطر سے
جو خاصۂ باری ہیں وہ تھراتے ہیں ڈر سے
اس خوف سے راتوں کو نہ سوتے تھے محمد
جب موت کا ذکر آتا تھا روتے تھے محمد

بھولی نہیں اب تک مجھے بے تابی حیدر
دم بھر شب ہجرت کو نہ تکیہ پہ رکھا سر
دالان سے جاتے تھے کبھی حجرے کے اندر
روتے ہوئے حجرے سے کبھی آتے تھے باہر
اٹھتی تھی جب آواز بکا آتی تھی مجھکو
اعضا کے لرزنے کی صدا آتی تھی مجھکو

میں عرض یہ کرتی تھی کہ یا شاہِ خوش انجام
فرماتے تھے کس طرح نہ تھرّائے یہ ناکام
وہ کون ہے اعمال کا دھڑکا نہیں جس کو

بیٹی میں ہزاروں سے رہا معرکہ آرا
تھا بیرِ علم آگ سے دوزخ کا کنارا
کلمہ تھا مرے ڈر سے زبانوں پہ جنوں کی

کس سے کہوں جو آج مجھے خوف ہے طاری
مجرم کے لیے قبر کی منزل بھی ہے بھاری
لب کھل نہیں سکتے ہیں زباں ہل نہیں سکتی

قہار کی جانب سے جو ہیں حکم پہ معمور
بیزار بدی سے عمل خیر سے مسرور
آنکھیں وہ دکھائیں گے جو خاموش ہوگا

ہے ہے وہی رستہ ہمیں درپیش ہے پیارو
اب آنکھوں سے چھپ جاؤ گے ہے عرش کے تارو
ویرانی میں یا گلشن ہستی میں رہو گے

تجویز ہے قبروں کی کہاں ہیں نہیں آگاہ
یہ دہر ہے بے مہر یہ دنیا ہے گزرگاہ
ماموں کی نہ تقصیر نہ کچھ اس میں ہے ماں کی

یہ پھول سے تن اور وہ سر تیز سنانیں
گل برگ سے ہونٹوں پہ ہیں خشکیدہ زبانیں
رخ زرد ہیں اور خاک سے گیسو بھی اٹے ہیں

کیا ہے کہ نہ لیٹے نہ کیا آپ نے آرام
سرکار سے آیا ہو جیسے موت کا پیغام
درپیش ہے وہ راہ کہ دیکھا نہیں جس کو

مرحب کو تہِ تیغ کیا عمر کو مارا
کودا میں تو لشکر تہ و بالا ہوا سارا
ہر ضرب میں بن جاتی تھی جانوں پہ جنوں کی

جو ہڈیاں ہیں تن میں کھلی جاتی ہیں ساری
وہ تنگ مکاں رحم کرے خالقِ باری
کروٹ بھی بدلنے کو جگہ مل نہیں سکتی

نرمی و ترحم نہیں ان لوگوں کا دستور
نہ رفق و مدارا نہ رعایت انھیں منظور
واقف نہیں کیا پوچھیں گے اور کیا میں کہوں گا

تم مرد ہو جرار ہو ہمت کو نہ ہارو
بچّو مجھے منزل کا پتا دے کے سدھارو
تم آج کی شب کونسی بستی میں رہو گے

غربت میں مرو گے یہ نہ تھی مجکو خبر آہ
جاتا ہے تہی دست گدا ہو کہ شہنشاہ
قبریں بھی ملیں گی وہیں ہے خاک جہاں کی

وہ تیر قیامت کے غضب کی وہ کمانیں
نکلیں کہو کیونکر تنِ مجروح سے جانیں
مرتے ہوئے تڑپے ہو کہ سب زخم پھٹے ہیں

کیا تھی خبر اس کی کہ جدا ہوؤگے بچو
پردیس میں دنیا سے مجھے کھوؤگے بچو
بیداری میں گزرینگے کہ سونے میں کٹیں گے

میں روؤں گی اور تم نہ مجھے روؤگے بچو
تڑپوں گی میں اور قبر میں تم سوؤگے بچو
اب زیست کے دن مجھے رونے میں کٹیں گے

اب جینے سے اماں کا بھی دل سیر ہے پیارو
تم مر گئے دنیا مجھے اندھیر ہے پیارو
ہے کونسی دولت جسے کھونے کو رہی ہوں

جیتی ہوں یہ قسمت کا مرے پھیر ہے پیارو
کیا جانیں مری موت میں کیا دیر ہے پیارو
معلوم نہیں اب کسے رونے کو رہی ہوں

اب دھیان مرا شام و سحر کون رکھے گا
پردیس میں اب ماں کی خبر کون رکھے گا
سب ہونگے مگر گود کے پالے نہ ملیں گے

الفت کی محبت کی نظر کون رکھے گا
جھک جھک کے مرے پاؤں پہ سر کون رکھے گا
اب تم سے مجھے چاہنے والے نہ ملیں گے

ہر سال بہار آئے گی کھل جائینگے سب گل
سبزہ کہیں ہوگا کہیں نسرین کہیں سنبل
دنیا کے نہ بستانِ فرحناک میں ہوگے

سرسبز جوانانِ چمن ہوں گے بالکل
وہ سرد ہوا میں وہ خوش الحانیِ بلبل
گل باغ میں تم زیرِ زمیں خاک میں ہوگے

حضرت کو لڑائی کے پیام آتے ہیں اٹھو
لو تیرِ ستم سوئے امام آتے ہیں اٹھو
جلدی سے قباؤں کو پہنتے ہوئے نکلو

خیمے کی طرف ساکنِ شام آتے ہیں اٹھو
جرار بڑے وقت میں کام آتے ہیں اٹھو
شمشیر و سپر تھام کے تنتے ہوئے نکلو

تاریکی میں واری تمھیں نیند آئے گی کیونکر
مادر دلِ بیتاب کو سمجھائے گی کیونکر
نکلوں جو تجسس کو تو بیجا نہیں واری

شب ہوگی تو بچوں کو یہ ماں پائے گی کیونکر
واں تک مرے رونے کی صدا جائے گی کیونکر
ماں ہوں مرا پتھر کا کلیجا نہیں واری

تم دونوں نے جاں اپنی مرے بھائی پہ واری
کس منہ سے شہیدو میں کروں شکرگزاری
بہتر ہوا گر مجھ پہ چھری چل گئی پیارو

شرمندۂ احساں ہے یہ دکھ درد کی ماری
ماں پہلے تھی پر آج سے لونڈی ہوں تمھاری
کچھ تو مرے بھائی کی بلا ٹل گئی پیارو

اِس دائی نے کی تھی گلہ آمیز جو تقریر
اُس وقت نہ تھی ہوش میں بیکس و دلگیر
منظور یہ تھا پہلے ہو تم فدیۂ شبیر
شرمندہ ہوں محجوب ہوں بخشو مری تقصیر
روتے تھے کہ اماں ہیں خفا ہونے کی جو ہے
گھر کا تھا کلیجہ مرا اس غم سے لہو ہے

چلتے ہوئے منظور تلافی تھی میں قربان
رونے میں کچھ اس کا نہ رہا مجکو ذرا دھیان
لو صدقے گئی جوڑتی ہوں ہاتھ میں اس آن
نانی سے شکایت مری کیجو نہ مری جان
سمجھی تھی کہ فوجِ شہ والا میں رہو گے
کیا جانتی تھی آج نہ دنیا میں رہو گے

جنگل میں قیام آج کہاں ہوگا بتاؤ
ماں صدقے مقام آج کہاں ہوگا بتاؤ
دن تم کو تمام آج کہاں ہوگا بتاؤ
بستر سرِ شام آج کہاں ہوگا بتاؤ
ہموار زمیں شب کے بچھونے کو ملے گی
کیسی ہے زمیں جو تمھیں سونے کو ملے گی

ہمراہ نہ تکیے ہیں نہ راحت کا بچھونا
دو بھائی ہو تم ایک جگہ رات کو سونا
معلوم ہے چھوٹے کا مجھے چونک کے رونا
صدقے گئی غافل مرے بچے سے نہ ہونا
نے ماں کے سحر رونے میں بچ جاتی ہے اس کو
پہلو مرا ملتا ہے تو نیند آتی ہے اس کو

ٹکڑے تھے کلیجے یہ بیان درد کا سن کر
اک حشر تھا سیدانیاں سب پیٹتی تھیں سر
بانو نے کہا قبلۂ کونین سے اٹھ کر
مرجائے گی ماں لاشوں کو لے جائے باہر
فرزند کا غم خالقِ عالم نہ دکھائے
اللہ کسی ماں کو یہ ماتم نہ دکھائے

اکبر سے کہا تم پھوپی اماں کو سنبھالو
عباس کدھر ہیں انھیں باہر سے بلالو
شہزادی کو غش آیا ہے اے پیٹنے والو
بی بی نہ کرو خاکِ عزا سر پہ نہ ڈالو
پردہ ہے کہ لاشے نہ اٹھاتے ہوئے دیکھے
ماں خیمہ سے بچوں کو نہ جاتے ہوئے دیکھے

کیا لاشوں کے جانے کا کہوں حال انیس آہ
در تک گئے سب پیٹتے روتے حرمِ شاہ
اللہ ہی زینب کی مصیبت سے ہے آگاہ
گذرے کسی مادر پہ نہ یہ صدمۂ جانکاہ
بالائے زمیں عرش کے تاروں کو نہ دیکھا
غش سے جو کھلی آنکھ تو پیاروں کو نہ دیکھا

مرثیہ

جب زلف کو کھولے ہوئے لیلائے شب آئی
پردیس میں سادات پہ آفت عجب آئی
فریاد کناں روح امیر عرب آئی
غل تھا کہ شب قتل شہ تشنہ لب آئی
سادات کو کیا کیا غم جانکاہ دکھائے
رات ایسی مصیبت کی نہ اللہ دکھائے

کاغذ پہ لکھے کیا قلم اس شب کی سیاہی
ہر چار طرف جس کی سیاہی سے تباہی
مرغان ہوا بر میں طپاں بحر میں ماہی
تربت سے نکل آئے تھے محبوب الٰہی
فریاد کا تھا شور رسولان سلف میں
یثرب میں تزلزل تھا اداسی تھی نجف میں

صدمے سے ہوا رنگ رخ ماہ جو کافور
اختر بھی بنے مردمک دیدۂ بے نور
غم چھا گیا راحت دل عالم سے ہوئی دور
تصویر الم بن گئی جنت میں ہر اک حور
کہتے تھے ملک رات نہ ہووے گی اب ایسی
تاروں نے بھی دیکھی تھی نہ تاریک شب ایسی

شمع طرب محفل عالم تھی جو خاموش
تھی رات بھی شبیر کے ماتم میں سیہ پوش
کیا غم تھا کہ شادی تھی ہر اک کو فراموش
ہر چشم کو تھا غم میں سمندر کی طرح جوش
مضطر تھے علی اشکوں سے منہ دھوتی تھیں زہرا
مقتل تھا جہاں شاہ کا واں روتی تھی زہرا

تھا خانۂ غم خیمۂ شاہنشہ والا
آندھی یہ پریشان تھی کہ دل تھا تہ و بالا
مشعل نہ ٹھہرتی تھی نہ شمعوں کا اجالا
خیمہ بھی اندھیرے میں نظر آتا تھا کالا
خاک اڑتی تھی منہ پر حرم شیر خدا کے
تھا چیں بجبیں فرش بھی جھونکوں سے ہوا کے

جنگل کی ہوا اور درندوں کی صدائیں
تھراتی تھیں بچوں کو چھپائے ہوئے مائیں
دھڑکا تھا کہ دہشت سے نہ جانیں کہیں سہم جائیں
روتی تھی کوئی اور کوئی پڑھتی تھی دعائیں
گودوں میں بھی راحت نہ ذرا پاتے تھے بچے
جب بولتے تھے شیر تو ڈر جاتے تھے بچے

بچوں کے بلکنے پہ حرم کرتے تھے زاری
غش ہوگئی تھی بالی سکینہ کئی باری
چلاتی تھی رو رو کے وہ شبیر کی پیاری
یا حضرت عباس چلی جان ہماری
افسوس کہ پانی کا تو قطرہ نہیں گھر میں
اور آگ لگی ہے مرے ننھے سے جگر میں

تھی سب سے سوا بنتِ علی مضطر و بیتاب
فق ہو گیا تھا شام سے منہ صورتِ مہتاب
مژگاں سے رخِ پاک پہ تھی بارشِ خوناب
تلوار کلیجے پہ چلے جب تو کہاں تاب
اک کرب تھا بسمل کی طرح جانِ حزیں پر
اٹھتی تھی کبھی اور کبھی گرتی تھی زمیں پر

کہتی تھی کبھی آج پیمبر نہیں ہے ہے
حال اپنا دکھاؤں کسے حیدر نہیں ہے ہے
بیٹی پہ فلک ٹوٹا ہے مادر نہیں ہے ہے
شبیر مصیبت میں ہے شبر نہیں ہے ہے
دیکھا نہ سنا یہ جو ستم آج ہے لوگو
نازوں کا پلا پانی کو محتاج ہے لوگو

درپیش ہے کل فوج ستمگر سے لڑائی
یاں تھوڑے سے پیاسے ہیں اُدھر ساری خدائی
بے سر ہوئے رن سے نہ پھرے گا مرا بھائی
ہوجائے گی حیدر کے بھرے گھر کی صفائی
اس غم سے سدا اشکوں سے منہ دھوتی تھیں اماں
کل دن وہ ہے جس دن کے لیے روتی تھیں اماں

تھے دوسرے خیمے میں اُدھر سبطِ پیمبر
دربار میں حاضر تھے رفیقانِ دلاور
اک پہلو میں قاسم تھے اور اک پہلو میں اکبر
اکبر کے اُدھر لختِ دلِ زینبِ مضطر
شبیر محبت سے سخن کرتے تھے سب سے
عباس علی سامنے بیٹھے تھے ادب سے

سرگرم تھے مرجانے پہ سب شاہ کے انصار
عباس سے یہ کہتا تھا وہ کل کا مددگار
تم رہیو ذرا خیمۂ ناموس سے ہشیار
ڈر ہے نہ کرے بے ادبی لشکرِ کفار
بیدینوں کو راحت مری منظور نہیں ہے
شب خوں جو اُدھر سے ہو تو کچھ دور نہیں ہے

یہ ذکر ابھی تھا کہ یکایک خبر آئی
اے چاند ید اللہ کے شب دوپہر آئی
حضرت کو ستاروں کی جو گردش نظر آئی
دل یادِ خدا کرنے لگا چشم بھر آئی
فرمایا بڑا اجر ہے بیداری شب کا
اے تشنہ لبو وقت ہے یہ طاعتِ رب کا

اب عمر بھی آخر ہے نمازیں بھی ہیں آخر
ہر وقت ہے ربِ دو جہاں حاضر و ناظر
مشکل نہ کسی رنج کو سمجھے نہ بلا کو
نام اُس کا رہے وِرد سفر ہو کہ حضر ہو
سجدے ہی کرے دُکھ میں کہ راحت میں بسر ہو
عشقِ گُلِ تر ظلم کے خاروں میں نہ بھولے
چومے لبِ سوفار جو سینے پہ لگیں تیر
زخموں کو یہ سمجھے کہ بِلا گلشن توقیر
کٹنے میں رگوں کے نہ صدا آہ کی نکلے
شہ نے سخن معرفتِ حق جو سنائے
کچھ پیاس کا شکوہ بھی زباں پر نہیں لائے
تکبیریں ہوئیں لشکرِ اللہ و نبی میں
تسبیح کہیں تھی کہیں سجدے کہیں زاری
کرتا تھا کوئی عرض کہ یا حضرتِ باری
حرمت سے شریکِ شہدا کیجیو یارب
ہم ہیں ترے محبوب کے پیارے کے مددگار
یہ بندۂ بیکس ہے مصیبت میں گرفتار
فاقوں کے سبب جسم کی طاقت میں کمی ہے
بیکس ہیں مسافر ہیں وطن و رہے گھر دور
تیروں سے ہوں غربال کہ تیغوں سے بدن چور
پھر منہ کسے دکھلائیں جو سرکار کو چھوڑیں

نے توشہ پہونچتا نہیں منزل پہ مسافر
اجر اُن کا مضاعف ہے جو ہیں صابر و شاکر
بندہ وہی بندہ ہے جو بھولے نہ خدا کو
موجود سمجھ لے اُسے جنگل ہو کہ گھر ہو
تسبیح میں شب ہو تو نمازوں میں سحر ہو
معشوق کو تلواروں کی دھاروں میں نہ بھولے
دم عشق کا بھرتا رہے زیرِ دمِ شمشیر
تکبیر کا نعرہ ہو زباں پر دمِ تکبیر
ہر رنگ میں بو الفتِ اللہ کی نکلے
اشک آنکھوں میں ہر عاشقِ صادق کے بھر آئے
سجادے وہیں لا کے دلیروں نے بچھائے
سب محو ہوئے یادِ جنابِ احدی میں
تھا صوتِ حسن سے کوئی قرآں کا قاری
اب صبح کو عزت ہے ترے ہاتھ ہماری
تو حوصلۂ صبر عطا کیجیو یارب
مرنے کے لیے آئے ہیں یاں چھوڑ کے گھربار
کر رحم کہ ہے ذات تری راحم و غفار
تجھ سے طلبِ قوتِ ثابت قدمی ہے
ہفتم سے ہمیں گھیرے ہے یہ لشکرِ مقہور
احمد کے نواسے سے جدائی ہے نہیں منظور
کیونکر ترے مقبول کی سرکار کو چھوڑیں

مردوں کے لیے ننگ ہے تلوار سے ڈرنا
راحت ہو کہ ایذا یہیں جینا یہیں مرنا
تو چاہے تو مشکل نہیں کچھ سر سے گزرنا
اے کل کے مددگار مدد جنگ میں کرنا
فاقوں میں ہزاروں سے وغا ہو تو مزا ہے
کچھ حق نمک ہم سے ادا ہو تو مزا ہے

کرتے تھے مناجات اُدھر یاور و انصار
پڑھتے تھے نمازِ شب ادھر سیدِ ابرار
تھی نیتِ تسبیح بتول جگر افگار
آوازِ بُکا خیمے سے آنے لگی یک بار
اکبر سے اشارہ کیا مُڑ کر کہ یہ کیا ہے
کی عرض پھوپی جان کے رونے کی صدا ہے

یوں تو کئی راتوں سے وہ ہیں مضطر و بیتاب
راحت کی نہ صورت ہے نہ آرام کا اسباب
غش میں جو ذرا بند ہوئے دیدۂ پُر آب
روتی ہوئی چونکی ہیں ابھی دیکھ کے کچھ خواب
نعلین کہیں چادرِ پر نور کہیں ہے
اُس وقت سے بسمل کی طرح چین نہیں ہے

سب بیبیاں ہیں ورہیں بچوں کو لیے پاس
اک ایک کو اندیشہ ہے اک ایک کو وسواس
جو پوچھتا ہے وجہ تو کہتی ہیں بصد یاس
لوگو مجھے شبیر کے بچنے کی نہیں آس
مانگو یہ دعا غیب سے بیکس کی مدد ہو
صدقے کرو مجکو کہ بلا بھائی کی رد ہو

اُن کا تو یہ احوال ہے امّاں کا یہ عالم
اشکوں کی جھڑی آنکھوں سے تھمتی نہیں اکدم
اصغر کی بھی ہے فکر سکینہ کا بھی ہے غم
شش ماہ کا بچّہ بھی ہوا جاتا ہے بیدم
گودی میں اُٹھائیں اُسے یا اِسکو سنبھالیں
دو روز کے فاقے میں وہ کس کس کو سنبھالیں

رو آتی ہیں عابد کے سرہانے کبھی جا کر
گہوارۂ اصغر پہ کبھی گرتی ہیں آ کر
قرآن کی ہوا دیتی ہیں غش میں اُسے پا کر
بہلاتی ہیں بیٹی کو کبھی اشک بہا کر
وہ کہتی ہے تا صبح یونہیں روؤں گی امّاں
بابا ہی جب آوینگے تو میں سوؤنگی امّاں

بتلاؤ شہ جن و بشر کیوں نہیں آتے
اب رات بہت کم ہے یہ کیوں نہیں آتے
آزردہ ہیں کچھ مجھ سے ادھر کیوں نہیں آتے
کیا آج وہیں سوئیں گے گھر کیوں نہیں آتے
اب پیاسوں کی فریاد بھی بابا نہیں سنتے
حضرت مرے رونے کی صدا کیا نہیں سنتے

روکر علی اکبر نے جو کی شہ سے یہ تقریر
دیکھی جو نہ تھی دیر سے وہ چاند سی تصویر
بیتاب جو پایا بہت اس تشنہ دہن کو
فرمایا بہن تم نے بنایا ہے یہ کیا حال
ماتھا ہے بھرا خاک سے بکھرے ہوئے ہیں بال
دم تن سے مرا گھٹ کے نکل جائے گا زینب

جیتا ہوں میں اور آہ ابھی سے یہ تلاطم
ہوتے ہیں مرے ہوش و حواس آہ بہن گم
بس صبر کرو جی سے گزر جائینگے بچے
تلوار کسی نے ابھی تولی نہیں مجھ پر
گردن پہ کسی نے ابھی پھیرا نہیں خنجر
ہرچند کہ ساعت نہیں ٹلتی ہے قضا کی

زینب نے کہا خوش ہوں جو میری اجل آئے
خالق مجھے عابد کی یتیمی نہ دکھائے
وسواس طبیعت کو بہلنے نہیں دیتا
آتا ہے سکینہ کی یتیمی کا مجھے دھیان
سمجھانے سے کچھ دل جو بہلتا ہے میں قربان
بازو مرے کسنے کو رسن لاتا ہے کوئی

منہ ڈھانپ کے بستر پہ جو سو جاتی ہوں دم بھر
اماں کبھی چلاتی ہیں یوں کھولے ہوئے سر
کیا لیٹی ہے بستر پہ کدھر دھیان ہے زینب
پڑھتے ہوئے تسبیح گئے حضرت شبیر
قدموں پہ محبت سے گری دوڑ کے ہمشیر
شبیر نے لپٹا لیا چھاتی سے بہن کو

نہ سر پہ عصابہ ہے نہ چادر ہے نہ رومال
پیٹو نہیں جیتا ہے ابھی فاطمہ کا لال
رو لیجیو جب رونے کا وقت آئے گا زینب
یہ کرب یہ دکھ درد یہ زاری یہ تظلم
خنجر کے تلے دیکھو گی کس طرح مجھے تم
تڑپوگی تم اس طرح تو مرجائینگے بچے

سینہ ابھی تیروں سے مشبک نہیں خواہر
مرجائے گا بھائی تمھیں ثابت ہوا کیونکر
بچ جاؤں تو کیا دور ہے قدرت سے خدا کی
بھائی تمھیں اللہ اس آفت سے بچائے
بھائی کی بلا لیکے بہن خلق سے جائے
مجبور ہوں دل مجھ کو سنبھلنے نہیں دیتا

ہر وقت بھرا گھر نظر آجاتا ہے ویران
پھر جاتا ہے آنکھوں کے تلے موت کا سامان
سر پر سے ردا چھیننے لیے جاتا ہے کوئی
تو چاک گریباں نظر آتے ہیں پیمبر
بیٹی نہ بچے گا ترا مظلوم برادر
شبیر اسی رات کا مہمان ہے زینب

یہ ذکر ابھی تھا کہ سکینہ نے پکارا
سونا تو گیا آپ کے ہمراہ ہمارا
میں جاگتی ہوں اور جہاں سوتا ہے سارا
گردوں پہ چمکنے نہ لگے صبح کا تارا
نیند آئی ہے بیٹی کو سلا جائیے بابا
بس ہو چکیں باتیں اب ادھر آئیے بابا

حضرت نے کہا میں تری آواز کے قربان
اللہ تم اب تک نہیں سوئی ہو مری جان
غربت میں کہاں راحت و آرام کا سامان
بن باپ کے تم کو تو نہیں چین کسی آن
اچھی نہیں عادت یہ نہ رویا کرو بی بی
پہلو میں کبھی ماں کے بھی سویا کرو بی بی

کیا ہوئے جو ہم گھر میں کسی شب کو نہ آئیں
مجبور ہوں ایسے کہ تمھیں چھوڑ کے جائیں
تم پاؤ نہ ہم کو نہ تمھیں ہم کہیں پائیں
بی بی کہو پھر چھاتی پہ کس طرح سلائیں
جنگل میں بہت قافلے لٹ جاتے ہیں بی بی
برسوں جو رہے ساتھ وہ چھٹ جاتے ہیں بی بی

جب عمر تھی کم ہم بھی چھٹے تھے یونہیں ماں سے
سوتے تھے لپٹ کر یونہیں خاتونِ جناں سے
کوچ اُن کا ہوا سامنے آنکھوں کے جہاں سے
ماتم سے ملیں وہ نہ بکا سے نہ فغاں سے
یہ داغ یہ اندوہ و الم سب کے لیے ہیں
ماں باپ زمانے میں صدا کس کے جیے ہیں

رستہ وہ اجل کا ہے کہ ہوتا ہی نہیں بند
کوچ آج پدر کا ہے تو کل جائے گا فرزند
ہوتا ہے قلق فرقتِ اولاد میں وہ چند
کیا زور ہے بندے کا جو مرضیِ خداوند
جو آئے ہیں دنیا میں وہ سب کوچ کریں گے
اس زیست کا انجام یہی ہے کہ مریں گے

یہ کہتے تھے حضرت کہ صدا آئی اذاں کی
گلدستۂ اسلام پہ بلبل نے فغاں کی
اک دم میں بہار اور ہوئی باغِ جہاں کی
تلوار چلی گلشنِ انجم پہ خزاں کی
مہتاب ہوا گم فلکِ نیلوفری سے
پھولا گلِ خورشید نسیمِ سحری سے

گرمی کی سحر اور وہ پھولوں کا مہکنا
مرغانِ چمن کا وہ درختوں پہ چہکنا
انجم کا وہ چھپنا کبھی اور گاہ چمکنا
وہ سرد ہوا اور وہ سبزے کا لہکنا
اُس دشت میں روتی تھی جو شبنم شجروں پر
تھا موتیوں کا فرش زمرد کی زمیں پر

جلوہ وہ دمِ صبح کا وہ نور کا عالم
سُرخی وہ شفق کی اُفقِ چرخ پہ کم کم
خشکی میں بھی سردی سے ترائی کا سماں تھا
لشکر میں اِدھر مورچے بندی کی ہوئی دھوم
پیچھے تو جماعت تھی اور آگے شہِ مظلوم
سب ساجد و راکع تھے شہنشاہ کے ہمراہ

خیمہ تھا فلک آپ قمر دوست ستارے
خم ہو گیا تھا پیرِ فلک شرم کے مارے
خورشید نہیں روشنیٔ نیرِ دیں ہے
جو صف ہے وہ اک سطر ہے قرآنِ مبیں کی
کیا خوب جماعت ہے یہ اربابِ یقیں کی
کس طرح شہنشاہ سے وہ فوج جدا ہو

اُس دم تھی یہ آوازِ پسِ پردۂ قدرت
نہ پیاس کا شکوہ ہے نہ فاقوں کی شکایت
کونین میں یہ صاحبِ اقبال و شرف ہیں
کس عجز سے آگے مرے حاضر ہیں یہ بندے
مظلوم ہیں بیکس ہیں مسافر ہیں یہ بندے
صادق ہیں مری لی سے مرا ان سب کو ولا ہے

پرسش نہ لحد میں نہ حساب ان کے لیے ہے
موتی سے جو ہے صاف وہ آب ان کے لیے ہے
اِس نخلِ ریاضت کے ثمر ان کو ملیں گے

دلچسپ صدا نوبت و شہنا کی وہ باہم
وہ گل کے کٹوروں پہ وہ دُر افشانیٔ شبنم
پر مالکِ گلزارِ جناں تشنہ وہاں تھا
یاں فرض ادا کرنے لگے عاشقِ قیوم
صف بستہ ملائک میں یہی ہوتا تھا معلوم
تاباں تھے بہتّر مہِ نو ماہ کے ہمراہ

تارے بھی وہ تاروں کو فلک جن پہ اُتارے
کہتی تھی زمیں اوج ہے طالع کو ہمارے
خود عرش کو دھوکا تھا یہ میں ہوں کہ زمیں ہے
دیوار ہے قبلہ کی طرف کعبۂ دیں کی
افلاک کی زینت ہے تو رونق ہے زمیں کی
مشکل ہے کہ دریا سے کہیں موج جدا ہو

اے قدسیو دیکھو مرے بندوں کی عبادت
یہ زہد یہ تقوے یہ اطاعت یہ ریاضت
عالم ہوں کہ ان لوگوں کے دل میری طرف ہیں
دیکھو مرے محبوب کے ناصر ہیں یہ بندے
تھوڑے نہ ہوں کس طرح کہ شاکر ہیں یہ بندے
ان کا وہ صلہ ہے جو رسولوں کو ملا ہے

یہ لائقِ رحمت ہیں ثواب ان کے لیے ہے
ہم جن کا ہوں ساقی وہ شراب ان کے لیے ہے
جو عرش کے نیچے ہیں وہ گھر ان کو ملیں گے

فارغ جو صلوٰۃ سحری سے ہوئے دیندار
پوشاک پہننے کو اٹھے سید ابرار
فرمانے لگے حضرت عباس علمدار
ہاں غازیو اب تم بھی سجو جنگ کے ہتھیار
قرباں تمہیں ہونا ہے محمدؐ کے پسر پر
کمروں کو کسو گلشن جنت کے سفر پر

آمادہ شر لشکر کفار ہے کل سے
ہونا ہے تمہیں آج ہم آغوش اجل سے
در پیش ہے جنگ و جدال اس فوج کے دل سے
آقا بھی کوئی دم میں نکلتے ہیں محل سے
ہاں صف شکنو وقت ہے نصرت کی دعا کا
کھلتا ہے پھریرا علم فوج خدا کا

ہم لوگ اسی روز کے مشتاق ہیں کب سے
اب ہوگی ملاقات شہنشاہ عرب سے
سیدانیاں تم سب کو دعا دیتی ہیں شب سے
صف باندھ کے آؤ در دولت پہ ادب سے
فردوس میں نانا سے حضور آج ملیں گے
کوثر پہ تمہیں خلعت نور آج ملیں گے

اس مژدہ کو سنتے ہی مسلح ہوئے غازی
اصطبل سے آنے لگے جراروں کے تازی
شبیر صف جنگاہ تھا اک ایک نمازی
نعرے تھے کہ قربان شہنشاہ حجازی
ڈیوڑھی پہ شگفتہ تھا چمن خلد بریں کا
خیمے میں تلاطم تھا وداع شہ دیں کا

تھے گرد حرم بیچ میں وہ عاشق حق تھا
مانند سحر رنگ ہر اک بی بی کا فق تھا
بانوئے دو عالم کا جگر سینے میں شق تھا
زینب یہ تڑپتی تھی کہ حضرت کو قلق تھا
شبیر کے پہلو سے نہ ہٹتی تھی سکینہ
بڑھتے تھے تو دامن سے لپٹتی تھی سکینہ

شہ کہتے تھے بی بی ہمیں اب جانے دو گھر سے
سینہ مرا شق ہوتا ہے لپٹو نہ پدر سے
وہ کہتی تھی سایہ جو یہ اٹھ جائے گا سر سے
ہے ہے میں تمہیں ڈھونڈھ کے لاؤں گی کدھر سے
بیٹی کا سوا آپ کے کوئی نہیں بابا
شب بھر میں اسی خوف سے سوئی نہیں بابا

سمجھاتے تھے حضرت کہ میں صدقے مری پیاری
میداں سے ابھی آئیں گے ہم تو کئی باری
وہ کہتی تھی میں آپ کی مظلومی کے واری
سامان نظر آتا ہے یتیمی کا ہماری
درپیش لڑائی ہے نہیں گر فوج شقی سے
کیوں آپ سفارش مری کرتے تھے پھوپھی سے

ش

اب آپ کے جانے سے تو ثابت ہے نہ آنا ۔ کیوں کہتے تھے زینب سے چھاتی پہ سُلانا
بانو مرے پیچھے نہ سکینہ کو رُلانا ۔ پانی جو میسر ہو تو پیاس اس کی بجھانا
بہلائیو جب رو کے مجھے یاد کرے گی ۔ تڑپوں گا لحد میں جو یہ فریاد کرے گی

یہ سُنتی تھی عابد سے جو کچھ کی تھی وصیت ۔ اِس گھر کی تباہی کی خبر دیتے تھے حضرت
ہے ہے یہ مری عمر یہ صدمہ یہ مصیبت ۔ لیلو مجھے ہمراہ گوارا نہیں فرقت
ساتھ آپ کے جاؤں گی میں اس رنج و محن سے ۔ کوئی مری گردن تو نہ باندھے گا رسن سے

نادان کی اِن باتوں پہ گھر روتا تھا سارا ۔ ماتم میں کسی دل کو نہ تھا صبر کا یارا
حضرت کو بھی فرقت تھی نہ بیٹی کی گوارا ۔ ڈیوڑھی تلک اُسے گود سے اپنی نہ اُتارا
جس دم وہ چھُٹی جیتے ہی جی مر گئے شبیر ۔ کس درد سے روتے ہوئے باہر گئے شبیر

جس دم درِ دولت پہ امیرِ امم آیا ۔ بیٹھے یہ حرم گھر میں کہ ہونٹوں پہ دم آیا
تسلیم کو اسلام کا لشکر بہم آیا ۔ کس صولت و اقبال و حشم سے علم آیا
جاتی تھی چمکنے میں ضیا عرش تک اُس کی ۔ خورشید کو پنجے میں لیے تھی چمک اُس کی

آپس میں یہ کہتے تھے رفیقانِ دلاور ۔ دیکھیں یہ ہما سایہ فگن ہوتا ہے کس پر
اکبر کے تو ہے نام پہ سالاریِ لشکر ۔ عباس کو دینگے شہِ دیں منصبِ جعفر
اِک عشق ہے اُس شیر سے سلطانِ اُمم کو ۔ بھائی کو کبھی دیکھتے ہیں گاہ عَلَم کو

زینب کے پسر مشورہ کرتے تھے یہ باہم ۔ کیوں بھائی علم لینے کو ماموں سے کہیں ہم
تائیدِ خدا چاہیے گو عمر میں ہیں کم ۔ عہدہ تو ہمارا ہے یہ آگاہ ہے عالم
واقف ہیں سبھی حیدرِ جعفر کے شرف سے ۔ حق پوچھو تو حقدار ہیں ہم دونوں طرف سے

دادا بھی علمدار رہے نانا بھی علمدار ۔ ہم اپنے بزرگوں کے ہیں منصب کے طلبگار
کہتا تھا بڑا عرض کا موقع نہیں زنہار ۔ ہیں بادشہِ کون و مکاں مالک و مختار
عہدہ تو بڑا یہ ہے کہ ماموں پہ فدا ہوں ۔ چپکے رہو اماں نہ کہیں حق خفا ہوں

مطلب نہ علم سے حشم سے ہمیں کچھ کام
مٹ جائیں نشاں بس یہی عہدہ ہے یہی نام

یہ سر ہو نثار قدم شاہ خوش انجام
عزت رہے بھائی یہ دعا ہے سحر و شام

آقا جسے چاہیں علم فوج خدا دیں
مشتاق اجل ہیں ہمیں مرنے کی رضا دیں

روتی تھی جو پردے کے قریں زینب دلگیر
سب اس نے مفصل یہ سنی بیٹوں کی تقریر

غصہ سے یہ کہنے لگی وہ صاحب توقیر
دونوں کو اشارے سے بلا کے کسی تدبیر

کچھ کہنا ہے سن لیں اسے وحشت انھیں گر ہو
عباس نہ دیکھیں نہ شہ دیں کو خبر ہو

کہتی تھی زینب کہ خود آئے وہ نکوکار
چھوٹے سے یہ فرمانے لگیں زینب ناچار

کیا باتیں ابھی بھائی سے تھیں اے مرے دلدار
اس وقت میں ہو کون سے منصب کے طلبگار

سمجھے نہ کہ ماں در عقب پردہ کھڑی ہے
گھر لٹتا ہے میرا تمھیں منصب کی پڑی ہے

اللہ رے عزم کیا باندھ کے تلوار
بچو تمھیں ایسا نہ سمجھتی تھی میں زنہار

دیکھو ابھی تم دونوں سے ہو جاؤں گی بیزار
کچھ کہیو نہ ماموں سے خبردار خبردار

کیا دخل تمھیں امر میں سلطان امم کے
دیکھوں گی نہ پھر منہ جو گئے پاس علم کے

کچھ اور ہی تیور ہیں علم نکلا ہے جب سے
تم کون ہو جو آگے بڑھے جاتے ہو سب سے

استادہ ہو جا کر عقب شاہ ادب سے
عہدہ ہے یہ جس کا مجھے معلوم ہے شب سے

اس امر میں خاطر نہ کریں اور کسی کی
میں خوش ہوں بجا لائیں وصیت کو علی کی

دو روز سے بھائی پہ مرے ظلم و ستم ہے
تم فکر علم میں ہو مجھے سخت الم ہے

چھوٹے سے ہیں قد سن بھی تمہارا ابھی کم ہے
کھیل اس کو نہ سمجھو یہ محمد کا علم ہے

ہرگز نہ ابھی کچھ شہ ذی جاہ سے کہنا
کہنا بھی تو رخصت کے لیے شاہ سے کہنا

مانا کہ پہنچتا ہے تمھیں منصب جعفر
آقا کی غلامی سے ہے عہدہ کوئی بڑھ کر

چھوٹا مرا بھائی بھی ہے بیٹوں کے برابر
عاشق کا تو عاشق ہے برادر کا برادر

بگڑوں گی گاہ گر کسی اسلوب کرو گے
عباس سے کیا تم مجھے محجوب کرو گے

زینب نے عتابانہ جو کی اُن سے یہ گفتار
سُنا ہوں سے غلاموں نے بھی کی ہے کبھی تکرار
رخصت کے لیے تیغ و سپر باندھے ہوئے ہیں
زینب نے کہا لیکے بلائیں کہ سدھارو
ماں صدقے گئی سر قدمِ شاہ پہ وارو
یہ وقت ہے امدادِ امامِ ازلی کا
صدقے گئی سن لو کہ میں کہتی ہوں جتا کر
میدان میں زخمی ہوئے گر قاسمؑ و اکبرؑ
جب دل ہوا ناراض تو فرزند کہاں کے
اُن میں سے اگر رن کی طرف ایک سدھارا
جس وقت سنونگی کہ سر اُن دونوں پہ وارا
بیجاں ہوئے بعد اُن کے تو ماتم نہ کروں گی
ہیں دونوں بھتیجے مرے پیارے مرے محبوب
جینا نہیں بہتر کسی صورت کسی اسلوب
ایذا جو اُٹھاؤ گے تو راحت بھی ملے گی
دیکھو کہے دیتی ہوں خبردار خبردار
شیروں کے یہ ہیں کام کھچے جس گھڑی تلوار
توڑی ہیں صفیں جنگ میں جب کھیت پڑے ہیں
اعدا کو مرے دودھ کی تاثیر دکھاؤ
جعفر کی طرح جوہرِ شمشیر دکھاؤ
خورشیدِ امامت سے قرابت میں قریں ہو

یوں کہنے لگے جوڑ کے ہاتوں کو وہ دلدار
مالک ہیں جسے چاہیں علَم دیں شہِ ابرار
ہم صبح سے مرنے پہ کمر باندھے ہوئے ہیں
بس اب مرا دل شاد ہوا ای مرے پیارو
ہو عید مجھے گر عمر و شمر کو مارو
دے چھوٹے سے ہاتھوں میں خدا زورِ علی کا
تم پہلے فدا ہیجو سرِ شہ کے قدم پر
پھر تم مرے فرزند نہ میں دونوں کی مادر
کس کام کے وہ لال جو کام آئیں نہ ماں کے
زہرا کی قسم منہ نہ میں دیکھونگی تمھارا
اُس وقت تمھیں ہوگا مرا دودھ گوارا
دیکھو جو مرونگی بھی تو ناراض مروں گی
تم اُن پہ تصدق ہو یہی ہے مجھے مطلوب
نے سر دیئے دودھ اپنا میں بخشوں تمھیں کیا خوب
جب آئینگی اُنھیں تو یہ دولت بھی ملے گی
جیتے جو رہے دودھ نہ بخشوں گی میں زنہار
رکھ دیویں گلا بڑھ کے تہِ خنجرِ خونخوار
جنّات کے لشکر سے علی یوں نہیں لڑے ہیں
اجلالِ حسنؑ شوکتِ شبیر دکھاؤ
تن تن کے ید اللہ کی تصویر دکھاؤ
تم شیر ہو شیروں کے حسینوں کے حسیں ہو

جعفر سے نمودار کے دلبر ہو دلیر و
جرّار ہو کرّار ہو صفدر ہو دلیر و
تیروں سے جوانوں کے جگر توڑتے آؤ
خندق کی لڑائی کی طرح جنگ کو جھیلو
تیغوں میں دھنسو چھاتیوں سے نیزوں کو ریلو
دو اور جلا آئینۂ تیغِ عرب کو

خاقاں کا رہے تخت نہ قیصر کا رہے تاج
چڑھنا ہی لڑائی پہ جواں مردوں کو معراج
یوں آئیو چار آئینہ پہنے ہوئے بر میں
میلے نہ ہوں تیور یہ سپاہی کے ہنر ہیں
گہ عطر میں ڈوبے ہیں گہے خون میں تر ہیں
وہ اور کسی سے نہ جھکینگے نہ جھکے ہیں

یہ سُن کے جو نکلے وہ جری خیمے سے باہر
اکبرؑ نے یہ کی عرض کہ اے سبطِ پیمبرؐ
جلدی ہو لڑائی کی اُدھر فوجِ ستم کو
شہ بولے کہ عباس دلاور کو بُلاؤ
عاشق کو مددگار کو یاور کو بُلاؤ
یہ اوج یہ رُتبہ یہ حشم اُس کے لیے ہی

سب تکنے لگے صورتِ عباسؑ فلک جاہ
یعنی مرا حامل ہو نشانِ اسد اللہ
جاں آگئی تھی سنتے ہی اس خوش خبری کو

حیدر سے دلاور کے دِلاور ہو دلیر و
ضرغام ہو ضیغم ہو غضنفر ہو دلیر و
خیبر کی طرح کوفے کا در توڑتے آؤ
بچے اسد اللہ کے ہو جان پہ کھیلو
کوفے کو تہِ تیغ کرو شام کو لے لو
لو روم کو قبضہ میں تو قابو میں حلب کو

ہاں غازیو چین و حبش و زنگ سے لو باج
گیتی تہ و بالا ہو وہ تلوار چلے آج
جس طرح علی بعدِ ظفر آئے تھے گھر میں
جس کے ہیں یہ اُس کے ہیں جدھر ہیں یہ اُدھر ہیں
صحبت میں مصاحب ہیں لڑائی میں سپر ہیں
عزت میں نہ فرق آئے کہ سر بیچ چکے ہیں

کس پیار سے مُنہ دونوں کا تکنے لگے سرور
تیار ہو سب قبلۂ کونین کا لشکر
ارشاد جسے ہو وہ بڑھے لیکے عَلم کو
پیارے مرے محبوب برادر کو بُلاؤ
جلدی مرے حمزہ مرے جعفر کو بُلاؤ
زیب اُس سے عَلم کی ہے عَلم اُس کے لیے ہے

نازاں ہوا خود اوج پہ اپنے علمِ شاہ
بالیدہ تھا پرچم تو پھریرا تھا ہوا خواہ
پنجہ بھی اشارے سے بُلاتا تھا جری کو

خوش ہو کے یہ عمو کو پکارے علی اکبرؑ
جلد آیئے یاد آپ کو فرماتے ہیں سرور
حاضر ہوا جوڑے ہوئے ہاتھوں کو وہ صفدر
ارشاد کیا شہ نے علم بھائی کو دے کر
رکھیے اسے کاندھے پہ یہ ہے آپ کا عہدہ
لو بھائی مبارک ہو تمھیں باپ کا عہدہ

بوسہ دیا عباسؑ دلاور نے علم پر
تسلیم کی اور رکھ دیا سر شہ کے قدم پر
کی عرض کہ قربان اس الطاف و کرم پر
سو سر ہوں تو صدقے ہیں شہنشاہِ امم پر
ادنی جو ابھی تھا اسے اعلی کیا مولا
قطرے کو ترے فیض نے دریا کیا مولا

اس چتر فلک قدر کا سایا مرے سر پہ
اس دھوپ میں ہو گا یہ پھریرا مرے سر پہ
پیارا مرے سر پہ یہ طوبا مرے سر پر
قایم رہیں لاکھوں برس آقا مرے سر پر
سلطانِ دو عالم کی غلامی کے نشے ہیں
سب اوج یہ نعلین اٹھانے سے ملے ہیں

حضرت نے کہا رد کے یہ کیا کہتے ہو پیارے
حاضر ہے اگر جان بھی کام آئے تمھارے
حصہ یہ تمھارا تھا سو پہونچا تمھیں بارے
مالک ہو تمھیں ہم تو ہیں اب گور کنارے
تھا دل میں جو کچھ وہ بجا ہو نہیں سکتا
بھائی ترا حق مجھ سے ادا ہو نہیں سکتا

یہ کہہ کے بڑھے سرورِ دیں جانبِ توسن
ہتھیار لگائے ہوئے پہنے ہوئے جوشن
اسوار ہوئے آپ جو گردان کے دامن
اللہ ری ضیا خانۂ زیں ہو گیا روشن
وہ پانوں رکابوں کے لیے باعثِ ضو تھے
خورشید کے قدموں کے تلے دو مہِ نو تھے

رانوں کے اشارے سے لگا کوندنے شبدیزؑ
اسوار کے دل کا تھا اشارا اسے مہمیز
گرما کے جو شبیر نے تازی کو کیا تیز
اعدا پہ چلا غول سواروں کا جلو ریز
ایک ایک جوانِ عربی رشکِ ملک تھا
اللہ کے لشکر کا علم سر بہ فلک تھا

کیا فیض سواری تھا کہ زر ریز تھی سب راہ
طالع تھا ادھر مہر ادھر تھا علمِ شاہ
مابین دو خورشید تھی فوجِ شہِ ذیجاہ
پنجہ پہ تجلی تھی کہ اللہ ہی اللہ
بالا تھی چمک مہرِ منور کی چمک پر
ضو اس کی زمیں پر تھی ضیا اس کی فلک پر

ایک ایک جواں زیورِ جنگی کو سنوارے
نیزوں کی چمک اور وہ سمندوں کے طرارے
جعفر کے جگر بند ید اللہ کے پیارے
رستم سے ہر اک جنگ کرے شیر کو مارے
سیّافؔ ہو مرحب سا تو شمشیر سے ماریں
ارجن سے کماندار کو اک تیر سے ماریں

کمسن کوئی لڑکوں کا جدا غول تھا سب سے
سوئے بھی نہ تھے ولولۂ جنگ میں شب سے
روکے ہوئے باگوں کو شہِ دیں کے ادب سے
اعدا کی طرف دیکھتے تھے چشمِ غضب سے
ہتھیار جو باندھے تھے تو کیا اُن پہ کُھلے تھے
سب نیچے تولے ہوئے مرنے پہ تُلے تھے

وہ چاند سے مُنہ اور وہ گورے بدن اُن کے
شرمندہ ہوں غنچے بھی وہ نازک دہن اُن کے
یوسف کی طرح عطر فشاں پیرہن اُن کے
مر کر وہی کپڑے ہوئے آخر کفن اُن کے
کیا حسنِ عقیدت تھا عجب دل کے جواں تھے
آقا پہ فدا ہونے کو سب ایک زباں تھے

عمریں تو کم و بیش پہ سب گیسوؤں والے
اک غول ہیں تھے چاند کئی اور کئی ہالے
ذی مرتبہ سیدانیوں کے گود کے پالے
غنچہ تھا وہ سب اکبرِ گلرو کے حوالے
اُن تازہ نہالوں میں نمودار یہی تھے
اُس گلشنِ یکرنگ کے مختار یہی تھے

مقتل کو جو پُرنور کیا عسکرِ دیں نے
دیکھا طرفِ چرخ حقارت سے زمیں نے
اونچا نہ کیا سر فلکِ ماہ جبیں نے
کی فرش پہ حسرت سے نظر عرشِ بریں نے
اُٹھ اُٹھ کے چمک اپنی دکھانے لگے ذرّے
خورشید کے پہلو کو دبانے لگے ذرّے

کھولا جو پھریرے کو علمدارِ جری نے
لوٹے گلِ فردوس نسیمِ سحری نے
تاروں کو اتارا فلکِ نیلوفری نے
پرچم جو کُھلا کھول دیئے بال پری نے
عیسیٰ نے پکارا کہ نثار اِس کے حشم کے
خورشید نے مُنہ رکھ دیا پنجہ پہ عَلَم کے

ترتیبِ صفِ فوج کا جس دم ہوا اعلام
باندھی علی اکبر نے صفِ لشکرِ اسلام
ظاہر جو ہوئی شانِ جوانانِ گل اندام
کوفہ کے نشان جُھک گئے کانپی سپہِ شام
اللہ ری شوکت شرفا و نجبا کی
اسلام کا لشکر تھا کہ قدرت تھی خدا کی

لہ شمشیر زن

ناگاہ بجا طبل بڑھا لشکرِ سفاک
تا چرخ گیا غلغلۂ کوسِ شغب ناک
فریاد سے قرنا کی ہلا گنبدِ افلاک
تھرّا گیا آوازِ دہل سے کرۂ خاک
نوبت تھی زبس قتلِ امامِ مدنی کی
صاف آتی تھی شاخوں سے صدا سینہ زنی کی

واں شور تھا باجوں کا ادھر نعرۂ تکبیر
ایک ایک جری جھومتا تھا تول کے شمشیر
ناگاہ سوئے فوجِ خدا آنے لگے تیر
عباسِ علمدار نے دیکھا رخِ شبیر
کی عرض کہ لڑنے کو شریر آتے ہیں مولا
کیا حکم ہے اب پیاسوں پہ تیر آتے ہیں مولا

شہ نے کہا شرم آتی ہے کیا حکم میں دوں آہ
ہفتاد و دو تن یاں ہیں اُدھر سیکڑوں گمراہ
غازی نے یہ کی عرض کہ اے کل کے شہنشاہ
یہ شیر نیستانِ علی ہیں تو وہ روباہ
لاکھوں ہوں تو کیا ڈر ہے شجاعانِ عرب کو
اقبال سے آقا کے بھگا دیتے ہیں سب کو

فرمایا کہ فاقے سے ہے سارا مرا لشکر
پانی نہیں ملتا کہ لبِ خشک کریں تر
بہتر ہے اگر پہلے کٹے تن سے مرا سر
غازی نے کہا شیر گرسنہ ہیں یہ صفدر
حملوں سے الٹ دیں گے پرے فوجِ عدو کے
بھوکے ہیں یہ زخموں کے یہ پیاسے ہیں لہو کے

حضرت نے کہا خیر لڑو فوجِ ستم سے
معلوم ہے سب آج جدا ہوویں گے ہم سے
دنیا سے نہ مطلب ہے نہ کچھ جاہ و حشم سے
کٹ جائے گا اپنا بھی گلا تیغِ دو دم سے
مقبول ہیں وہ جو مری امداد کریں گے
اس جنگ کو بھی لوگ بہت یاد کریں گے

جس دم یہ سنی قبلۂ کونین کی گفتار
جانباز بڑھے فوج سے چلنے لگی تلوار
تھے پیاسوں کے حملے غضبِ حضرتِ قہار
چوٹی کے جواں بھاگ گئے پھینک کے ہتھیار
کون آنکھ ملا سکتا تھا شیروں سے عرب کے
جب کہتے تھے نعرے قدم اٹھ جاتے تھے سب کے

لڑتا تھا غضب ایک کے بعد ایک وفادار
دن چڑھتا تھا یاں گرم تھا واں عزت کا بازار
سر بیچتے تھے جنسِ شہادت کے طلبگار
بڑھ بڑھ کے خریدار پہ گرتا تھا خریدار
لیں پہلے ہم ایک ایک کی جاں اس پہ اڑی تھی
عقبیٰ کا جو سودا تھا تو قیمت بھی کڑی تھی

آیا جو عزیزوں کے لیئے موت کا پیغام
اولادِ عقیل آچکی شبیّر کے جب کام
تھا حشر بپا ندیاں بہنے تھیں لہو کی

لشکر میں تلاطم تھا غضب چلتی تھی تلوار
منہ دیکھ کے حضرت کا یہی کہتے تھے ہر بار
جی جائیں جو مولا ہمیں مرنے کی رضا دیں

کچھ اُن سے کہا چاہتے تھے سرورِ ذیشان
لاشے بھی اودھر آچکے جب خون میں غلطاں
شہ نے کہا یہ داغ تو دشوار ہے ہم پر

حضرت نے کہا ماں سے بھی ہو آئے ہو رخصت
ماں یہ ہو تمھیں اُس کا تمھیں اُس کی بضاعت
چھوٹے ہیں نہیں ہم آپ بھی پوچھ لیں سب سے

بچوں نے جو کی جوڑ کے ہاتھوں کو یہ تقریر
فرمایا چھوڑا ناہی تمھیں بھی فلکِ پیر
وہ سیدۂ پاک نواسی ہے نبی کی

یہ سُن کے جھکے آخری تسلیم کو ذیجاہ
کی سوئے فلک دیکھ کے شبیّر نے اک آہ
ماں ڈیوڑھی سے چلائی کہ رخصت ہے مبارک

سلطانِ دو عالم نے مخلع کیا واری
پروان چڑھے ختم ہوئیں شادیاں ساری
صدقے گئی بیٹوں کو ہلاتے ہوئے جاؤ

فرزندوں نے جعفر کے بڑے رن میں کیئے نام
لڑنے کو گئے مُسلمِ بیکس کے گُل اندام
بچوں نے اُلٹ دی تھیں صفیں فوجِ عدو کی

بیتاب تھے ہاں زینبِ ناشاد کے دلدار
ہم جائیں گے بعد اُن کے سوئے لشکرِ کفّار
ایسا نہ ہو قاسم کو حضور اذنِ وغا دیں

جو غل ہوا مارے گئے مسلم کے دل و جاں
پھر ہاتھوں کو جوڑا کہ ملے رخصتِ میداں
اُن دونوں نے سر رکھ دیئے ماموں کے قدم پر

کیا کہتے ہو لٹوا دوں میں ہمشیر کی دولت
چھوٹے نے یہ حضرت سے کہا تھام کے رقّت
امّاں تو رضا دے چکی ہیں مرنے کی شب سے

اُن دونوں کا مُنہ دیکھ کے رونے لگے شبیّر
اچھا میں رضامند ہوں جو مرضیِ ہمشیر
فیاض کی ہمشیر ہے بیٹی ہے سخی کی

خورشید کے آگے مہِ نو بن گئے دو ماہ
دو شیر چلے گھوڑوں پہ چڑھ کر سوئے جنگاہ
سرکارِ شہنشاہ سے خلعت ہو مبارک

تم جاتے ہو یا جاتی ہے دولہ کی سواری
لو دور سے لیتی ہوں بلائیں میں تمھاری
تسکین مجھے پھر پھر کے دکھاتے ہوئے جاؤ

تسلیم کو گھوڑوں سے جھکے دونوں وہ گلرو
باگیں جو اُٹھائیں تو فرس بن گئے آہو
میداں کی طرف یاس سے ماں تکتی رہی تک کے
میدان میں عجب شان سے وہ شیر نر آئے
غل پڑ گیا حضرت کی بہن کے پسر آئے
یوسف سے فزوں حسنِ گراں مایہ ہے اُن کا
وہ چاند سے منہ اور وہ گیسوئے معنبر
سب شان ید اللہ کی سب شوکتِ حیدر
یہ دبدبہ کس صاحبِ شمشیر نے دیکھا
تن تن کے جو شان اپنی دکھاتے تھے وہ دیکھا
شمشاد سے قامت نہ دراز اور نہ کوتاہ
ناخن میں وہ لیرو کی سب اللہ از وغا تھے
تھے حسن میں ان دونوں کے آئینہ رو ایک
شان ایک شکوہ ایک چھب رنگ ایک تو بو ایک
اور اُن سا کوئی غرب سے تا شرق نہیں ہے
پڑھنے لگے اشعارِ رجز جب وہ دلاور
ہر بیت تھی دشمن کے لیے تیغِ دو پیکر
دے کون جواب اُن کا کہ دم بند تھا سب کا
اظہارِ نسب میں جو محمد کا لیا نام
آگے جو بڑھے نامِ علی لے کے وہ گلفام
جعفر کا جو کچھ ذکر کیا بعد علی کے

دل ماں کا یہ اُمڈا کہ ٹپکنے لگے آنسو
پھر دیکھنے پائی نہ اُنھیں زینبِ خوشخو
پنہاں ہوئے بدلی میں ستارے سے چمک کے
گویا کہ بہم حیدر و جعفر نظر آئے
افلاک سے بالائے زمیں دو قمر آئے
یہ دھوپ بیاباں میں نہیں سایہ ہے اُن کا
وہ بدر سے رخسار زہے قدرتِ داور
چتون وہی غصہ وہی سارے وہی تیور
دیکھا جسے معلوم ہوا شبّر نے دیکھا
چھاتی سے لگا لیتے تھے دونوں کو یداللہ
کھیلے ہوئے تیغوں میں فنِ جنگ سے آگاہ
بچے تھے مگر بچۂ ضرغامِ خدا تھے
پیشانی و ابرو و سر و صدر و گلو ایک
دل ایک جگر ایک حبا ایک تھا ایک
دو ٹکڑے ہیں اک سیب کے کچھ فرق نہیں ہے
اللہ ری فصاحت فصحا ہو گئے ششدر
ہر مصرعِ برجستہ میں تھی تیزیِ خنجر
واں قافیہ تھا تنگ شجاعانِ عرب کا
سب پڑھنے لگے صلِّ علیٰ صاحبِ اسلام
دل ہل گئے تھرانے لگا دم سے تا شام
مجرے کو علم جھک گئے سب فوجِ شقی کے

آغاز تھا ذکرِ شرفِ حضرتِ شبیرؑ
اُس وقت بڑے بھائی سے کی چھوٹے نے تقریر
کہیے تو جدا ہو کے ستمگاروں پہ جائیں
فرمایا بڑے بھائی نے ہنس کر نہیں بھائی
ہو جاتی ہے اک آن میں ہر صف کی صفائی
بازو ہوں قوی ہاتھ سے گر ہاتھ نہ چھوٹے
نانا کی طرح فوج پہ حملے کریں آؤ
ان چھوٹے سے ہاتھوں کا ہمیں زورِ دکھاؤ
ہم شیروں پہ رستم کا بھی مُنہ پڑ نہ سکے گا
چھوٹے نے کہا جوڑ کے ہاتھوں کو کہ بہتر
دو بجلیاں کوندیں کہ لرزنے لگا لشکر
برباد کیا رو میں سواروں کو دبا کے
اِن چھوٹی سی تلواروں کے تھے کاٹ نرالے
مسل لپی جمائے تھے جو بیمثل رسالے
نازاں اپنے ہنر پر تھا شجاعانِ عرب کو
موت آئی اِدھر نیمچے دونوں جدھر آئے
گہ سینے تک آئے تو کبھی تا کمر آئے
ہر نیمچہ بجلی تھا ستمگاروں کے حق میں
اُٹھتی تھی نہ ڈر سے کسی خونخوار کی گردن
دو چار کے مُنہ کٹ گئے دو چار کی گردن
دو نیمچے بجلی سے گزرتے تھے کمر سے

ڈنکے پہ اُدھر چوب لگی چلنے لگے تیر
تلوار علَم کیجیے اب کس لیے تاخیر
اسواروں پہ ہم آپ کمانداروں پہ جائیں
تم جان ہو دشوار ہے دم بھر کی جدائی
کر دیتے ہیں سر کون سی ایسی ہے لڑائی
سر تن سے اُتر جائے مگر ساتھ نہ چھوٹے
تلواروں میں تن تن کے چلو برچھیاں کھاؤ
ہم سینہ سپر تم پہ ہوں تم ہم کو بچاؤ
جب دو ہوئے اِکدل تو کوئی لڑ نہ سکے گا
بس کھینچ لیے نیمچے دونوں نے برابر
نیزوں کے نیستاں میں در آئے وہ غضنفر
رہوار بھی اسوار تھے گھوڑوں پہ ہوا کے
تھیں کُہنیاں پہنچوں سے جدا ہاتھوں سے بھالے
تھے جائزہ اُن سب کا ہی دیکھنے والے
نیزوں کو قلم کر کے ندارد کیا سب کو
جب ہاتھ بڑھا پانوں پہ کٹ کٹ کے سر آئے
خالی نہ پھرے جس پہ گئے خون میں بھر آئے
ڈوبے ہوئے تھے دو مہِ نو خوں کی شفق میں
سر خود کا جھک جاتا تھا تلوار کی گردن
اسوار کا سر اُڑ گیا رہوار کی گردن
آدھے ہوئے جاتے تھے لعین جان کے ڈر سے

دو چھوٹی سی تیغوں سے قیامت نظر آئی
معصوموں کے ہاتھوں سے کرامت نظر آئی
سر کٹنے کی اعدا کے علامت نظر آئی
لوہے کی سپر بھی نہ سلامت نظر آئی
بیوجہ نہ پھر جاتے تھے منہ اہل جفا کے
دریا کے تھپیڑے تھے طمانچے تھے قضا کے

گردن سے بڑھے کاٹ کے پیکر نکل آئے
جوشن کو دکھاتے ہوئے جوہر نکل آئے
چار آئینہ میں تیر کے باہر نکل آئے
صابون سے دو تار برابر نکل آئے
محراب کے نیچے کسے جھکتے نہیں دیکھا
مچھلی کو بندھے پانی میں رکتے نہیں دیکھا

ہر غول میں غلطاں و طپاں تھے سر و پیکر
دستانے کہیں تھے کہیں ڈھالیں کہیں مغفر
جب تیغ تھے ان دونوں کے اٹھتے تھے برابر
منہ خوف سے ڈھالوں میں چھپاتے تھے ستمگر
روکے انھیں طاقت یہ نہ تھی پیر و جواں کی
صورت نظر آنے لگی تیغ دو زباں کی

غارت تھی وہ صف جس سے وغا کر کے پھرے وہ
دو ہاتھ میں سو سو کو فنا کر کے پھرے وہ
سرداروں کے سر تن سے جدا کر کے پھرے وہ
ہر غول میں اک حشر بپا کر کے پھرے وہ
غل تھا کہ پرے ٹوٹے ہوئے جم نہیں سکتے
سر کٹنے کی وحشت سے قدم تھم نہیں سکتے

گھوڑے تھے چھلاوہ کبھی یاں تھے کبھی واں تھے
پتلی میں تو پھرتے تھے پر آنکھوں سے نہاں تھے
یاں تھے جو سمکرو تو ادھر گرم عناں تھے
بجلی تھے کسی جا تو کہیں آب رواں تھے
ہو سکتی تھی بجلی سے یہ سرعت نہ ہرن سے
جھونکے تھے ہوا کے کہ نکل جاتے تھے سن سے

نے آنچ تھی گو ڈھل سے یہ جاندار تھے گھوڑے
ہر مرتبہ اڑ جانے پہ طیار تھے گھوڑے
اس پار کبھی تھے کبھی اُس پار تھے گھوڑے
نقطہ تھی وہ سب فوج کہ پرکار تھے گھوڑے
ونس بیش جو مر جاتے تھے ٹاپوں سے کچل کے
بڑھ سکتا نہ تھا ایک احاطہ سے اجل کے

تانے ہوئے سینوں کو جو بھر جاتے تھے دونوں
تلواروں کی موجوں سے گزر جاتے تھے دونوں
ہر غول میں بے خوف و خطر جاتے تھے دونوں
سب ہٹتے تھے پسپا تو ٹھہر جاتے تھے دونوں
اُلٹی ہوئی صف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی
بھائی کی طرف دیکھ کے ہنس دیتا تھا بھائی

دم لیکے جو گھوڑوں کو اُڑاتے تھے وہ جرّار — اعدا کے رسالوں کو بھگاتے تھے وہ جرّار
شیروں کی طرح فوج پہ جاتے تھے وہ جرّار — دو کرتے تھے یکتا جسے پاتے تھے وہ جرّار
شیروں نے جو مارا بھی تو رو داروں کو مارا — جب آنکھ ملی چُن کے نموداروں کو مارا
جمعیتِ لشکر کو پریشاں کیا دم میں — جو فوج کی جاں تھے اُنھیں بیجاں کیا دم میں
تلواروں سے جنگل کو گلستاں کیا دم میں — سر کاٹ کے خونخواروں کو غلطاں کیا دم میں
بیدست تھے علموں کو جو بے دین لیے تھے — بچوں نے جو اُن سے نشاں چھین لیے تھے

دو لاکھ کو دونوں نے کیا تھا تہ و بالا — تیغ ایک کی چلتی تھی تو اک بھائی کا بھالا
اِک بڑھ گیا گر ایک نے گھوڑے کو نکالا — دم اُس نے لیا اُس نے لڑائی کو سنبھالا
یک جا فرسِ تیز قدم ہو گئے دونوں — جب بھیڑ پڑی کچھ تو بہم ہو گئے دونوں
وہ چھیڑ کے تازی کو سواروں میں در آیا — دم بھر میں پیادوں کو یہ پامال کر آیا
جب شیر سا بپھرا وہ اُدھر یہ اِدھر آیا — جاں آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا
بچ بچ کے نکلتے تھے جو نیزوں کے تلے سے — اک بھائی لپٹ جاتا تھا بھائی کے گلے سے

کچھ بھائی سے بڑھکر جو وغا کرتا تھا بھائی — بچ جانے کی بھائی کے دعا کرتا تھا بھائی
حق بھائی کی اُلفت کا ادا کرتا تھا بھائی — ہر زور پہ بھائی کی ثنا کرتا تھا بھائی
تم سا نہیں صفدر کوئی واللہ برادر — کیا خوب لڑے سلّمک اللہ برادر
کہتا تھا بڑے بھائی سے چھوٹا بعد آداب — بھائی میں بھگا دوں ابھی اُن کو جو ملے آب
اب پیاس کی گرمی سے کلیجہ کو نہیں تاب — سینے میں مرا دل نہیں آتش پہ ہے سیماب
ہم لوگ محق کیا نہیں اس آبِ رواں کے — تالو میں خلش ہوتی ہے کانٹوں سے زباں کے

کہتا تھا بڑا بھائی میں صدقے ترے گلفام — ہم خشک زبانوں کو بھلا پانی سے کیا کام
اب جلد اجل آئے تو کوثر کا پئیں جام — غش ہم کو بھی آ جائے گا پانی کا نہ لو نام
آنکھیں تو ستمگاروں کی تیغوں سے لڑی ہیں — چپکے رہو اماں درِ خیمہ پہ کھڑی ہیں

اس نہر کا لینا تو کچھ ایسا نہیں مشکل
روکیں ہمیں کیا تاب لعینوں کی ہے کیا دل
پُل باندھ لیں لاشوں کے ابھی ہم سرِ ساحل
بتلائیے پھر نہر کے لے لینے سے حاصل
دیکھو نہ اُدھر پیاس سے گو لاکھ تعب ہے
اماں ہمیں گر دودھ نہ بخشیں تو غضب ہے

اشک آنکھوں میں بھر کر کہا چھوٹوں نے بہت خوب
ہر دم ہے رضامندیِ مادر ہمیں مطلوب
ایسے تو نہیں ہم کہ بزرگوں سے ہوں محجوب
منظور یہ تھا فخر کا نکلے کوئی اسلوب
دریا کو بھی دیکھیں گے نہ اب آنکھ اٹھا کے
پیتے بھی تو پہلے شہِ والا کو پلا کے

جعفر کے جو پوتے ہیں تو حیدر کے نواسے
کچھ ہم علی اکبر سے زیادہ نہیں پیاسے
یہ کہتے ہی لڑنے لگے پھر اہلِ جفا سے
فریاد کہ بچوں پہ گری فوج قضا سے
خوں سر کا بہا منہ پہ تو گھبرا گئے دونوں
دو لاکھ کی تیغوں کے تلے آگئے دونوں

ڈوبے ہوئے تھے شام کے بادل میں وہ دو ماہ
پردے سے کھڑی تکتی تھی زینب سوئے جنگاہ
عباس سے کہتے تھے تڑپ کر شہِ ذیجاہ
اب مجھ سے جدا ہوتے ہیں دو شبر مرے آہ
کیونکر متحمل ہو دل اس رنج و محن کا
گھر لٹتا ہے بھائی مری نادار بہن کا

اس بی بی کے فاقوں کے ہیں پالے ہوئے یہ لال
دولت ہے یہی اور یہی حشمت و اقبال
سات آٹھ برس کے ہیں ابھی کیا ہے سن و سال
سب ہاتھ ملیں گے جو یہ گل ہو گئے پامال
تازہ یہی دو پھول ہیں جعفر کے چمن میں
مر جائے گا باپ ان کی خبر سن کے وطن میں

رو کر دمِ رخصت وہ یہی کہتے تھے ہر بار
میں شاہ کا خادم ہوں یہ دونوں ہیں نمک خوار
آگاہ صعوباتِ سفر سے نہیں زنہار
اے دخترِ زہرا مرے بیٹوں سے خبردار
میں کہہ نہیں سکتا ہوں کہ ماموں پہ فدا ہیں
ابتو یہی دونوں مرے پیری کے عصا ہیں

شوہر کا تڑپنا اسے کچھ بھی نہ رہا یاد
ہے ہے مری الفت میں لٹی زینبِ ناشاد
یوں بھائی پہ صدقے کوئی کرتا نہیں اولاد
ہم دیکھتے ہیں اور بہن ہوتی ہے برباد
روئے گی وہ بیٹوں کو تو سمجھائینگے کیونکر
منہ زینبِ دلگیر کو دکھلائینگے کیونکر

عباسؑ نے کی عرض کلیجہ ہے دو پارا
ان کو تو کسی کی نہیں امداد گوارا
زخمی ہوئے نہ مجھکو نہ اکبرؑ کو پکارا
بھائی یہ غلام آپ جو فرمائیں اشارا
حضرت کی قسم دیکے میں سمجھاؤنگا ان کو
مچلیں گے تو گودی میں اٹھا لاؤنگا ان کو

حضرت نے کہا صاحبِ غیرت ہیں وہ دونوں
لختِ جگرِ شاہِ ولایت ہیں وہ دونوں
ضرغامِ نیستانِ شجاعت ہیں وہ دونوں
واللہ بڑے صاحبِ ہمت ہیں وہ دونوں
دو لاکھ تو کیا ہیں جو کروروں میں گھریں گے
نے جان دیئے وہ نہ پھرے ہیں نہ پھریں گے

بڑھنے لگے میداں کی طرف قاسمِ ذیجاہ
اکبر نے یہ کی عرض کہ میں جاتا ہوں یا شاہ
ہے دونوں کی فرقت کا مجھے صدمۂ جانکاہ
لاکھوں میں ہیں تنہا پھوپھی اماں کے پسر آہ
ریتی پہ کہیں گر نہ پڑیں برچھیاں کھاکر
میں ساتھ انھیں لے آتا ہوں اعدا کو بھگا کر

گھبرا کے درِ خیمہ سے زینب یہ پکاری
سر ننگے میں نکلوں گی جو تم جاؤ گے واری
اولاد مجھے تم سے زیادہ نہیں پیاری
بتلاؤ کہ میں ان کی ہوں عاشق کہ تمھاری
میداں کی طرف قاسم نے پر بھی نجائیں
تلواروں میں عباسؑ دلاور بھی نجائیں

زہرا کی قسم کچھ نہیں بیٹوں کا مجھے دھیان
بھائی پہ تصدق ہوں یہی تھا مجھے ارمان
وہ آئے تو وسواس سے دل ہے گا پریشان
صدقے کو نہیں پھیر کے لاتے ہیں میں قربان
خود روؤں گی پر شاہ کو غم کھانے نہ دوں گی
لاشے بھی اٹھانے کے لیئے جانے نہ دوں گی

میداں میں ہے کیا اور بجز نیزہ و شمشیر
مرجاؤں گی زخمی ہوئے گر قاسمِ دلگیر
دل کس کا چھدے تم کو لگائے جو کوئی تیر
سمجھاؤ میں صدقے گئی کیوں روتے ہیں شبیرؑ
باقی ہے اگر زیست تو پھر آئیں گے دونوں
غم کسلیئے کیا ہوگا جو مر جائیں گے دونوں

شہزادوں کو کھوتے ہیں غلاموں کے لیے آہ
میں جوڑتی ہوں ہاتھ بس اب روئیں نہ للہ
ہے شرم کی کیا وجہ میں لونڈی وہ شہنشاہ
سوا ایسے ہوں بیٹے تو نثارِ شہِ ذیجاہ
ممتاز ہے فدیہ ہے جو زہرا کے پسر کا
شان اس کی بڑھے فخر ہو جو جد و پدر کا

باپ اُن کا اگر ہوتا تو وہ سر نہ کٹاتا
بیٹوں کو یوں ہی میری طرح نذر کو لاتا
جو پاس ہے جس کے وہ عطا کا شہِ دیں ہے
بیٹوں سے ہوئی گر تو ہوئی آج جدائی
اِک دولتِ اولاد لٹائی تو لٹائی
کیونکر دُوں میں دُنیا میں جو دلبند نہیں ہیں
یہ ذکر ابھی تھا کہ ستمگار پکارے
ٹکڑے کیا معصوموں کو تلواروں کے مارے
پامالی کو ان دونوں کی اسوار بڑھینگے
یہ سُنتے ہی تھرانے لگے حضرتِ عباس
سر کھولے ہوئے بی بیاں ڈیوڑھی کی جو تھیں پاس
ٹوٹا ہے فلک بنتِ شہنشاہِ نجف پر
ہے ہے کا جو اک شور ہوا رانڈوں میں برپا
چلائی ارے چپکے رہو غل ہے یہ کیسا
ہے ہے نہ کرو صاحبو گھبرائینگے شبیر
تم روتے ہو کس واسطے میں تو نہیں روتی
دِل ہوتا جو ایسا ہی تو کیوں بیٹیوں کو کھوتی
قایم رہے اقبال محمد کے خلف کا
سر اپنے نہ کھولو کہ مجھے آتا ہے وسواس
شبیر تو سر پر ہیں جو بیٹوں سے ہوئی یاس
اب خلد میں دادی کے قریں جائینگے دونوں

زہرا کے کلیجے کے عوض برچھیاں کھاتا
اپنے کوئی محسن کو نہیں دل سے بھلاتا
کہدے مرے ماں جائے کا حق کس پہ نہیں ہے
سر پر مرے دُنیا میں سلامت ہیں بھائی
کیا لُٹ گیا وہ کونسی ایسی تھی کمائی
کیا اکبر و اصغر مرے فرزند نہیں ہیں
لو شاہ کی ہمشیر کے بیٹے گئے مارے
وہ لوٹتے ہیں خاک پہ وہ عرش کے تارے
بچوں کے سر اب کٹ کے نشانوں پہ چڑھینگے
گھبرا کے اُٹھے خاک سے شبیر بصد یاس
سب بولے کہا لو شہ کی بہن ہوگئی بے آس
زینب کو چلو لیکے بس اب ماتمی صف پر
زینب بھی ہٹی چھوڑ کے دروازے کا پردا
بھائی ہیں سلامت مجھے کیوں دیتے ہو پُرسا
پھر کون ہے زینب کا جو مرجائینگے شبیر
دامانِ مژہ بھی نہیں اشکوں سے بھگوتی
دولت کوئی ماں جائے سے پیاری نہیں ہوتی
بس نام بھرے گھر میں نہ لو ماتمی صف کا
اک شب کی دلھن گھر میں ہے اُس کا بھی نہیں پاس
اکبر مری اُمید ہے قاسم ہے مری آس
کیا بیٹے رونے سے چلے آئینگے دونوں

باتیں یہ کہیں سب سے پہ سنبھلا نہ دلِ زار
تڑپا یہ کلیجہ کہ گری خاک پہ اک بار
واں لاشوں پہ روتے ہوئے پہونچے شہِ ابرار
مہماں کوئی ساعت کے ملے وہ جگر افگار
کس عمر میں ہستی کا چمن چھوڑ رہے تھے
گودی کے پلے خاک پہ دم توڑ رہے تھے

رخ زرد تھے اور خاک میں آلودہ تھے گیسو
جھک آئے تھے لٹ کٹ کے مہِ نو سے وہ ابرو
تلواروں سے ٹکڑے تھے وہ بلور سے بازو
مہتاب سی وہ چھاتیاں اور تیر سے پہلو
کھلتا تھا جگر آنکھ نہ کھل سکتی تھی غش سے
ہونٹوں پہ زبانیں نکل آئی تھیں عطش سے

ٹکڑے ہوا سینے میں دلِ سبطِ پیمبر
ہے ہے کہا اور لاشوں سے لپٹے شہِ صفدر
چھوٹے سے بڑے نے یہ کہا ہوش میں آ کر
بالیں پہ حضور آئے ہیں چونکو تو برادر
مشتاق تھے تم سید ذیجاہ کو دیکھو
مرتے ہوئے دیدارِ شہنشاہ کو دیکھو

سن کے یہ صدا غش سے جو چونکا وہ دل افگار
دونوں نے رکھا سر قدمِ شاہ پہ اک بار
اکبر سے یہ کی عرض کہ اے شاہ کے دلدار
دشمن ہیں بہت قبلۂ عالم سے خبردار
ہم دونوں غلاموں کا نہ غم کھائیو بھائی
سر کٹیں جاں تک انھیں سمجھائیو بھائی

یہ کہہ کے لگے ہچکیاں لینے جو وہ پیارے
بس موت کے آثار نمایاں ہوئے سارے
سر پیٹ کے ہاتھوں سے یہ شبیر پکارے
ماموں سے بچھڑتے ہو میں قربان تمہارے
پھر کی نہ کوئی بات سفر کر گئے دونوں
آنسو تھے رواں آنکھوں سے اور مر گئے دونوں

حضرت کے جو رونے کی صدا خیمے میں آئی
رانڈوں نے ادھر ماتمی صف گھر میں بچھائی
زینب نے کہا ہائے غضب روتے ہیں بھائی
فضہ یہ پکاری کہ دہائی ہے دہائی!!
لو چاک گریبان کیے آتے ہیں شبیر
معصوموں کے لاشوں کو لیے آتے ہیں شبیر

بیٹھی صفِ ماتم پہ ادھر شاہ کی خواہر
سیدانیوں نے اٹھ کے ادھر کھول دیئے سر
لاشوں کو لیے آئے جو گھر میں شہِ صفدر
زینب کے قریں بیٹھ گئے سر کو جھکا کر
فرمایا کہ لو بخت جگر آئے تمہارے
لو دودھ انھیں بخشو پسر آئے تمہارے

شبیر نے جب دونوں کا زینب سے لیا نام
ہر چند کیا ضبط پہ تھرا گیا اندام
دل تھام کے کہنے لگی وہ بیکس و ناکام
آپ ان سے رضامند ہیں یا شاہ خوش انجام
فرمایا دل ان دونوں سے واللہ خوشی ہے
میں ان سے خوشی ہوں مرا اللہ خوشی ہے

عاشق تھے مرے اور مرے غمخوار تھے دونوں
بچے تھے مگر صادق الاقرار تھے دونوں
اس وقت میں ماموں کے مددگار تھے دونوں
حیدر کی طرح صفدر و جرار تھے دونوں
موت آئے کہ داغوں سے دل اب بھر گیا زینب
دونوں یہ نہیں مر گئے میں مر گیا زینب

افسوس کہ ان دونوں کی دیکھی نہ جوانی
میں کیا کہوں کیا صاحب ہمت یہ تھے جانی
ہوتی ہے بہت زخمیوں کو تشنہ دہانی
پر ہم سے دم مرگ بھی مانگا نہیں پانی
سمجھے کہ گرفتار ستم آج ہے ماموں
وہ جانتے تھے پانی کو محتاج ہے ماموں

ہمشیر سے یہ کہہ کے جو روئے شہ ابرار
بس آ گیا فرزندوں کی ہمت پہ اسے پیار
تھرائی ہوئی خاک سے اٹھی وہ دل افگار
پاس ان کے لاشوں کی بلائیں لیں کئی بار
کانپے جو قدم گر کے سنبھلنے لگی زینب
منہ خون بھرے چہروں سے ملنے لگی زینب

دیکھا جو لہو بچوں کا چھاتی امنڈ آئی
نزدیک تھا مر جائے ید اللہ کی جائی
پر فاطمہ کے صبر کی شان اس نے دکھائی
سب سے یہ کہا نیک لگی میری کمائی
بچے مرے قرباں ہوئے احسان خدا کا
اے بیبیو صدقہ ہے یہ شاہ شہدا کا

رو کر شہ والا نے کہا صدقے میں تم پر
دم بھر انھیں رو لو کہ یہ مہمان ہیں خواہر
بانو نے اشارا کیا اے سبط پیمبر
قربان گئی آپ بس اب جائیے باہر
گر ضبط اسی طرح سے فرمائیں گی زینب
یہ ماتم اولاد ہے مر جائیں گی زینب

روتے ہوئے خیمے سے جو ڈیوڑھی پہ گئے شاہ
فرزندوں کو چلانے لگی زینب ذیجاہ
یہ نیند ہے کیسی کہ خبر تم کو نہیں آہ
صدقے گئی جاؤ شہ کونین کے ہمراہ
زخمی ہوئے شبیر تو جان اپنی میں دوں گی
اچھا میں تمھیں دونوں سے ماں جائے کو لوں گی

لوٹ نیمچے کاندھوں پہ دھرو اے مرے پیارو
تنتے ہوئے شبیر کے ہمراہ سدھارو

گو پیاسے ہو دو دن کے پہ ہمت کو نہ ہارو
یہ خون میں ڈوبے ہوئے کپڑے تو اُتارو

اُٹھ بیٹھو میں صدقے گئی اتنا نہیں سوتے
اس طرح تو جاگے ہوئے دولھا نہیں سوتے

سوتا ہی لڑائی کے دن ایسا کوئی غافل
بچو تمھیں کیا سن کے کہینگے شہ عادل

دیکھو کہ تڑپتی ہی یہ ماں صورت بسمل
سلجھاؤ یہ زلفیں کہ الجھتا ہی مرا دل

کیا غش میں ہو یہ سونے کا نقشا نہیں ہوتا
ایسا تو کوئی نیند کا ماتا نہیں ہوتا

پھر دونوں کے سر زانو پہ رکھ کر یہ پکاری
لو اب ہوا معلوم کہ تم مر گئے واری

لے ہوشی میں کچھ مجھ کو خبر تھی نہ تمھاری
اب آنکھوں سے چھپ جائیگی یہ صورتیں ساری

دنیا کو نہ دیکھا کہ اجل آ گئی بچو
ہی ہی یہ تمھیں کس کی نظر کھا گئی بچو

بچو تمھیں قسمت نے نہ پروان چڑھایا
حسرت ہی ماں نے تمھیں دولہ نہ بنایا

پیدا ہوئے جس دن سے کبھی چین نہ پایا
دیکھی نہ جوانی کہ پیام اجل آیا

ہی ہی چمن دہر میں پھولے نہ پھلے تم
جب فصل بہاری کے دن آئے تو چلے تم

میں روتی تھی در پہ مجھے سمجھا نہ گئے تم
دروازے پہ دم بھر کے لیے آ نہ گئے تم

ہی ہی دو لھنیں بھی مجھے دکھلا نہ گئے تم
پیاسے تھے مگر جانب دریا نہ گئے تم

جیتی ہی وہ ماں جس کے گزر جانے کے دن تھے
یہ بیاہ کی راتیں تھیں کہ مرجانے کے دن تھے

خاموش انیس اب کہ تڑپتا ہی دل زار
کافی ہی رلانے کو تری درد کی گفتار

اس جنس کا گر آج نہیں کوئی خریدار
فیاض ہی لیکن شہ مظلوم کی سرکار

افسردہ نہ ہو غنچۂ امید کھلے گا
کھل جائیں گی آنکھیں وہ صلہ تجکو ملے گا

مرثیہ ۹

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج
کمریں وغا پہ باندھے ہے مشکل کشا کی فوج
صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج
جنت کا رخ کیے ہے شہِ کربلا کی فوج
ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے
خیمے سے اب علم کے نکلنے کی دھوم ہے

حاضر ہیں صبح سے درِ دولت پہ جاں نثار
اکثر ٹہل رہے ہیں رفیقانِ ذی وقار
پیدل کھڑے ہیں سامنے باندھے ہوئے قطار
بیٹھے ہیں زین پوش بچھائے ہوئے سوار
شوقِ زیارتِ علمِ فوجِ شاہ ہے
ایک اک کی جانبِ درِ دولت نگاہ ہے

سُرخ ہے کسی کا جوشِ شجاعت سے لالہ رنگ
کوئی سنوارتا ہے بدن پر سلاحِ جنگ
جھک جھک کے چست کرتا ہے کوئی فرس کا تنگ
چلّے سے جوڑتا ہے کوئی ناوکِ خدنگ
بھالا سنبھالتا ہے کوئی جھوم جھوم کے
تکتا ہے کوئی تیغ کے قبضے کو چوم کے

ملتا ہے ہنس کے ایک جواں ایک کے گلے
ساری خوشی یہ ہے کہ بس اب خلد میں چلے
چہرے وہ سُرخ سُرخ وہ جرأت کے ولولے
حق سے یہ التجا کہ نہ رن سے قدم ٹلے
مر کر بھی دل میں الفتِ حیدر کی بو رہے
پانی ہمیں ملے نہ ملے آبرو رہے

حاضر ہے ذوالجناح شہنشاہِ بحر و بر
کلغی ہے یا کہ خوشۂ پرویں قریبِ سر
خادم چنور لیے ہیں مگس راں اِدھر اُدھر
پیچھے ہیں بادپائے عزیزانِ نامور
گھوڑے سمند سرورِ ذی شاں کے ساتھ ہیں
پریوں کے غول تختِ سلیماں کے ساتھ ہیں

ڈیوڑھی پہ خادمانِ محل کی ہے یہ پُکار
آتے ہیں اب حضور خبردار ہوشیار!!
خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار
نذریں خوشی کے دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

یہ سن کے شاد ہو گئی فوجِ حسین سب
بولے حبیب ابن مظاہر کہ شکرِ رب
سرور کے لیے بہشت کی جس کو تلاش ہو
کون اور کائنات میں ہے دوسرا جواں
بازوئے شاہِ دیں حسدِ مرتضیٰ کے جاں
باتیں پیمبروں کی خدا کے ولی میں ہیں
الفت وہی حیا وہی مہر و وفا وہی
بخشش وہی کرم وہی جود و سخا وہی
گیتی میں اور بھی کوئی ایسا دلیر ہے
بے مثل سب ہیں قبلۂ عالم کے رشتہ دار
جیسے نبی کی فوج میں ہے شیرِ کردگار
سب فوج سے بڑھا ہوا رتبہ اسی کا ہے
باہر تو اشتیاقِ علم میں ہے سب سپاہ
سب خویش و اقربا ہیں مسلح قریبِ شاہ
رتبے کو اوجِ نخلِ ترقی مراد پہ
شبیرِ خدا کا خود مبارک ہے زیبِ سر
مہتاب ہے کہ ابر سے نکلا ہوا قمر
ڈورے جو سرخ سرخ ہیں چشمِ سیاہ میں
اس کی خوشی جو تھی کہ ملا رایتِ رسول
قد سروِ باغِ حسن نہ پستی فزوں نہ طول
یہ شور تھا نمک کا جہاں کے رواق میں

آئے رفیق سب درِ دولت پہ با ادب
ہاں سرفروشو جنگ و جدل کا مزا ہے اب
دیکھیں علم کے سائے میں کس کس کی لاش ہو
قابل اسی کے دوشِ مبارک کے ہے نشاں
پیروں کا سرپرست جوانوں کا قدرداں
سب اس میں جمع ہیں صفتیں جو علی میں ہیں
طاعت وہی وقار وہی اتقا وہی
جرأت وہی جدال وہی دبدبا وہی
خود تھا علی کا قول کہ عباس شیر ہے
لیکن خدا نے اس کو دیا ہے عجب وقار
ویسا ہی بے عدیل ہے یہ تشنہ کا جاں نثار
شبیرِ خدا کے بعد یہ حصہ اسی کا ہے
خیمے میں باندھتے ہیں کمر شاہِ دیں پناہ
ہیں سامنے علم لیے عباس عرش جاہ
گویا علی کھڑے ہیں مہیا جہاد پر
کلغی ہمائے اوجِ سعادت کے جس میں پر
ابرو ہیں ذوالفقارِ یداللہِ نامور
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں
رخسار تھے کھلے ہوئے دو ارغواں کے پھول
وہ لب کہ جس سے روح کو ہو تازگی حصول
حوریں بھی ہونٹ چاٹتی تھیں اشتیاق میں

دیتے تھے تہنیت جو عزیزانِ پُر جگر
عباس مسکرا کے جھکاتے تھے اپنا سر
فرطِ طرب سے چاند سا چہرہ تھا جلوہ گر
رُخ کی ضیا اِدھر تھی علم کی ضیا اُدھر
وہ آسماں حشم تو یہ کیواں جناب ہیں
غل تھا کہ ایک صبح میں دو آفتاب ہیں

زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھیں بار بار
منصب مبارک اے شہِ مرداں کے یادگار
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ ذی وقار
مجکو سمجھیے عون و محمد کا جاں نثار
ان کی طرف سے ہمہ تن بندوبست ہوں
مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہوں

فرماتی تھیں یہ دخترِ خاتونِ کائنات
تم دونوں کے بزرگ ہو یہ کونسی ہے بات
اُس وقت ہے خوشی جو اس آفت سے ہو نجات
سمجھوں کہ بیکسوں کو دوبارہ ملی حیات
گھیرا ہے بے گناہ شہِ مشرقین کو
تم سب شریک ہوکے بچا لو حسین کو

سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذیجاہ میں مگر
چیں بر جبیں تھے زینبِ ناشاد کے پسر
نہ جانبِ علم تھی نہ ماں کی طرف نظر
آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
اس طرح تھا عرق رُخِ پُرآب و تاب پر
جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

پھر کر اُدھر سے ماں نے جو بیٹوں کی نظر
سمجھیں علم نہ ملنے سے بیدل ہیں یہ قمر
ہٹ کر کیا اشارا کہ آؤ ذرا اِدھر
آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر
بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس تھے
قربان جاؤں کیا ہی جو چہرے اداس تھے

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس
تم نے نہ زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس
دولھا سے بن کے جاؤ امامِ امم کے پاس
کچھ ملگجے ہیں آؤ میں کپڑے اُتار دوں
سرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

شب سے تو صبح تک یہ دعا تھی ہر ایک پل
تیغوں میں پہلے ہم کو کرے سرخرو اجل
اب کیا ہوا یہ کونسا غصّہ کا ہے محل
آنکھوں میں اشک رُخ پہ عرق ابروؤں پہ بل
وہ خوش مزاجیاں نہ وہ باتوں کے طور ہیں
اس وقت دیکھتی ہوں کہ تیور ہی اور ہیں

ماں پر یہ آفتیں ہیں یہ ماموں پہ ظلم وجور
نازک مزاجیوں کے کسی دن نہ تھے یہ طور
وہ دل نہیں وہ آنکھ نہیں وہ نظر نہیں
اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں
تم میری دس برس کی ریاضت ہو میری جاں
جس پر یہ برہمی ہے وہ سب جانتی ہوں میں
پردا ہے تو سناؤ الگ چل کے اک حال
ہاں ہم کو آج بھول گئے شاہ خوش خصال
کیا وارثِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے
انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا
دیکھو سنیں نہ زوجۂ عباسِ باوفا
غبطہ نہ اُس میں چاہیے جو امرِ خیر ہو
اک دو پہر کے واسطے ناحق یہ قیل وقال
اِس دن کی دے گئے ہیں خبر شبیر ذوالجلال
پیدا ہوئی ہوں اشک بہانے کے واسطے
لو اپنے دودھ کی تمہیں دیتی ہوں میں قسم
سنتے تھے تم جو کہتے تھے عباسِ ذی حشم
صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو
کنبے میں ایک نے بھی اگر سن لیا یہ حال
ننھے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال
دیجیے ہمیں سزا جو بل ابرو پہ پھر پڑیں

پیارو ہمارے حال پہ لازم ہے تم کو غور
اب مشورے ہیں اور تصور ہیں اور اور
اوروں کا ذکر کیا تمہیں میری خبر نہیں
ہوتا ہے آفتوں میں محبت کا امتحاں
مجھ سے سوا ہے کون تمھارا مزاج داں
غصّہ کی آنکھ کا ہے کو پہچانتی ہوں میں
دونوں نے عرض کی کہ نہیں کچھ نہیں ملال
اوروں کی پرورش ہے ہمارا انہیں خیال
اِس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے
اب اُس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا
اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یہ گلے کی جا
واری وہ کون غیر ہے تم کون غیر ہو
تم ہوگے تا بہ عصر نہ عباس خوش خصال
مجکو نہیں یقیں کہ بچے فاطمہ کا لال
رہ جاؤں گی بہن قیدی بن جانے کے واسطے
اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہوگا مجھے بھی غم
دو جا کے اُن کو تہنیت عہدۂ علم
میری خوشی یہ ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو
کہتی ہوں صاف میں مجھے ہوگا بہت ملال
ہم با وفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

زینب بلائیں لیکے یہ بولیں کہ میں نثار
دونو ہو تم سعید و رشید و وفا شعار
دے ایسے بیٹے سب کو زمانے میں کردگار
ذی قدر و ذی شعور و سخن فہم ذی وقار
لازم خوشی ہے جو جسے عہدہ سپرد ہو
چھوٹوں کے تم بزرگ ہو گو کہ خورد ہو

پہنائے پیار سے اُنھیں پھر فاخرہ لباس
ہتھیار جب لگائے تو روئیں بدرد و یاس
جب اُن کو لیکے آئیں امام امم کے پاس
بولے گلے لگا کے اُنھیں شاہ حق شناس
دو چاند ہیں یہ خانۂ شبیر الٰہ میں
زینب اِنھیں بھی بھیجو گی کیا قتل گاہ میں

نکلے نہیں ہیں گھر سے ابھی تک گلبدن
تلوار اگر چلی تو پڑے گا غضب کا رن
فوجوں سے گونجتا ہے یہ سب بلا کا بن
طالب ہیں ایک جان کے دو لاکھ تیغ زن
لشکر سے تیر کیں مری جانب جو آئیں گے
میں کس طرح جیوں گا جو یہ زخم کھائیں گے

بنتِ علی نے عرض یہ کی ہاتھ جوڑ کر
رکھتی نہیں ہیں کچھ اور میں یا شاہِ بحر و بر
اِک جان ہے بسل اور یہ دو پارۂ جگر
مایہ مری یہی ہے یہی دولت یہی ہے زر
پالا ہو جس نے اُس کا نہ کچھ حق ادا کروں
اِن کو بچاؤں گر تو کسے پھر فدا کروں

پھر عرض کی کہ اے خلف شاہ قلعہ گیر
اس کا نہ کیجیے دھیان کہ یہ سن میں ہیں صغیر
دونوں نے بنتِ شیرِ خدا کا پیا ہے شیر
سینہ سپر کریں گے جب دم چلیں گے تیر
تلواریں چمکیں جو ان کے دریا چڑھے رہیں
امید ہے کہ سب سے یہ آگے بڑھے رہیں

حضرت کے آگے بات کی ان کو نہیں مجال
مخفی حضور پہ ہے ارادوں کا ان کے حال
دادا کا رعب و دبدبہ و شوکت و جلال
تیغ و سپر میں ہے شہ مرداں کی چال ڈھال
کیجے نظر سنوں پہ تو بیشک صغیر ہیں
ہمت میں نوجوان ہیں متانت میں پیر ہیں

روتی تھی میں جو آج کی شب کو بدرد و یاس
دونوں دلاسا دینے کو آبیٹھے میرے پاس
آکر کہا کہ آپ کو اتنا ہے کیوں ہراس
آسان کچھ ہے قتل شہنشاہِ حق شناس
کل شیر سب ہیں اور یہ دشتِ مصاف ہے
سُن لیجیے گا آپ کہ میدان صاف ہے

حضرت کے ساتھ فضلِ خدا سے ہیں وہ دلیر
تا کوفہ کیا عجب ہے جو ہوں زخمیوں کے ڈھیر
بچے ہیں شیر کے جنھیں بچہ سمجھتی ہیں
بیکا ہو دشمنوں کا شہِ دیں کے بال اگر
حضرت تک آ سکے کوئی کیا جان کیا جگر
پوتے شجاع کے ہیں نواسے دلیر کے
لاکھوں میں دس ہیں جوان نہیں اس آن بان کے
حملے کریں گے رن میں جو سینوں کو تان کے
سو سو کی جان لے کے ہر اک جان کھوئے گا
خالی نجائینگے یہ شجاعت کے ولولے
ہم بھی ہیں بنتِ فاطمہ کے شبر کے پلے
چمکا کے نیمچوں کو جو کھیلینگے جان پر
دونوں نے اس طرح بفصاحت کیا بیاں
گویا دوبارہ آگئی حیدر بدن میں جاں
محسن ہو آج جو مرے بھائی کی پچ کرے
ہر بار دیکھتی ہوں میں ان کی طرف بغور
کہتے ہیں ناگوار ہیں اعدا کے ظلم و جور
سکہ پڑے حسین علیہ السلام کا
نو دس برس کے ہیں ابھی بچوں کے کیا ہیں سن
یہ تو وہ معرکہ ہے کہ ہیں مضطرب مُسن
گھوڑے اُڑا اُڑا کے جو فوجوں پہ جائینگے

تھرا کے بھاگ جاتا ہے نعروں سے جن کے شیر
کردیں گے رستموں کو زبردستیوں سے زیر
کیا آپ ماموں جان کو تنہا سمجھتی ہیں
پھر کاٹ ڈالیے گا تنوں سے ہمارے سر
آنکھیں نکال لیں جو کرے غیظ سے نظر
ساعد ہیں یہ علی کے یہ بازو ہیں شبر کے
حافظ ہیں سب یہ مصحفِ ناطق کے جان کے
مل جائینگے زمین سے طبق آسمان کے
ہم سب کے بعد ہوگا جو قسمت میں ہوئے گا
رکھ دینگے دوڑ دوڑ کے تیغوں پہ خود گلے
مرتے ہیں شوق میں کہیں تلوار تو چلے
لاشے زمین پہ ہوں گے لہو آسمان پر
مجکو یقینِ فتح ہوا با شہِ زماں
خوش ہو کے بولی میں کہ تصدق ہو تم پہ ماں
اِس مُنہ کے میں نثار خدا اُس کو سچ کرے
دو تین دن سے اور ہیں کچھ تیوروں کے طور
جب چین ہو مٹے جو یزیدِ لعیں کا دور
خطبہ ہو منبروں پہ شہیدوں کے نام کا
راتیں یہ غفلتوں کی ہیں اور کھیلنے کے دن
لیکن کنیز ان کی طرف سے ہے مطمئن
اتنا میں جانتی ہوں کہ جیتے نہ آئینگے

پہروں ہنسیں جو چھوٹے کی باتیں سنیں حضور
کہتا ہے نیمچے کو ہلا کر وہ ذی شعور
نامرد ہے جو آج کرے جنگ میں قصور
اس کو نہ قصرِ خلد ملے اور نہ وصلِ حور
بس چند روز رہ چکے دنیائے زشت میں
کل پہلے داخلہ ہے ہمارا بہشت میں

ہر بار الٹے کرتے کی ننھی سی آستیں
کہتا ہے کیا لڑینگے دلیروں سے اہلِ کیں
ہیں مرتضیٰ علی کے پسر شبیرِ خشمگیں
جانیں نثار ہوں تو نثارِ امامِ دیں
کل نیچے ہیں اور عدو کی سپاہ ہے
روتی ہیں والدہ ہمیں دنیا سیاہ ہے

ہنس ہنس کے مجھ سے کرتے تھے دونوں بھی بیاں
ہم کو حضور نے نہ دیا فوج کا نشاں
میں نے کہا تو یہ ہو کچھ دستِ ناتواں
بولے کہ خیر آئے تو ہنگامِ امتحاں
ابتو غلام قبلۂ عالم کے ساتھ ہیں
کوفے کا ڈر ہے اور یہ کمزور ہاتھ ہیں

فرمایا شہ نے ان کی شجاعت میں فرق کیا
ہیں ورثہ دارِ شبّرِ الٰہی یہ باوفا
اچھا ہمارے ساتھ چلے ایک دلربا
زینب تمہارے پاس رہے ایک مہ لقا
تم کس طرح جیوگی جو دونوں سے یاس ہو
گھر لٹتے وقت ایک تو فرزند پاس ہو

زینب نے عرض کی کہ مجھے ہے یہ آرزو
دونوں نثار آپ پہ ہوں میرے روبرو
بچ جائے جان آپ کی یا شاہِ نیکخو
میں طالبِ ثواب یہ خواہانِ آبرو
بہتر ہے دونوں بیٹوں کی سوگوار ہوں
میں بھی جنابِ فاطمہ کی ورثہ دار ہوں

طفلی سے آج تک نہ ہوئے یہ کبھی جدا
کھیلے تو ایک گھر میں پلے ہیں تو ایک جا
چرچا ہے سارے کنبے میں دونو کے پیار کا
بیشک ہیں ایک جان دو قالب یہ مہ لقا
تڑپے ملاپ کو جو خفا ہو کے بھائی سے
وہ کس طرح جیے گا جدا ہو کے بھائی سے

دم بھر مفارقت ہو تو آنسو بہاتے ہیں
روتے ہیں اس طرح کہ مجھے بھی رلاتے ہیں
دونوں جب ایک جا ہوں تو کھانا کھاتے ہیں
مکتب میں ساتھ جاتے ہیں اور ساتھ آتے ہیں
بھائی جو زخمِ نیزہ و شمشیر کھائے گا
انصاف آپ کیجیے یہ مر نہ جائے گا

چھوٹا تنک مزاج ہی یا شاہ بحر و بر
سُن لے تو جان دیدے گلا اپنا کاٹ کر
نو دس برس جہان میں ہوئے جس طرح بسر
باہم یونہیں جہان سے کریں آخری سفر
ہر جا بڑے کے ہاتھ میں چھوٹے کا ہاتھ ہو
میں چاہتی ہوں دونوں کا مرنا بھی ساتھ ہو

باپ ان کا آج ہوتا جو یا شاہ نامدار
کرتا قدم پہ سر کو تصدق بہ افتخار
ایک اُن کے بدلے آپکے قدموں پہ ہوتے نثار
میرے عوض فدا کرے ایک اپنی جان زار
ان پر ہمارا حق ہی تو ہم پر حق آپ کا
یہ بھی تو کچھ ادا کریں حق اپنے باپ کا

کرتے تھے مجھ سے وقت سفر کے یہ بیاں
محروم اس شرف سے ہوں میں زار و ناتواں
بچوں کا ساتھ اور سفر خوف الاماں
مجبور دشمنوں میں چلے ہیں شہ زماں
وقت آپڑے تو پاس ہمارا نہ کیجیو
بیٹوں کو تم حسین سے پیارا نہ کیجیو

گردن جھکا کے کہنے لگے شاہ خاص و عام
تم کو جہان میں پھر نہ ملیں گے یہ تشنہ کام
ملتی ہی نسل جعفر طیار نیک نام
چھاتی سے سر لگا کے وہ بولی کہ یا امام
للہ ان کے باب میں اب کد نہ کیجیے
ہدیہ فقیر کا ہے اسے رد نہ کیجیے

چپ ہو گئے یہ بہن سے بہت خوب کہہ کے شاہ
قاسم نے کی یہ عرض کہ یا شاہ دیں پناہ
بڑھ آئی ہے ادھر سے بہت شام کی سپاہ
فرمایا آپ نے کہ نگہبان ہی اللہ
حملوں سے فوج شام کے جی چھوٹ جائینگے
جب ہم بڑھے تو مورچے سب ٹوٹ جائینگے

زینب کے نورِ عین بڑھے جب بصد حشم
کھولا سروں پہ حضرت عباس نے علم
ماں کا اشارا تھا کہ زہے شفقت و کرم
ہاتھوں کو جوڑ جلد جھکو چومنے قدم
کچھ حد ہی اس بزرگی و جاہ و جلال کی
دیکھیں نیاز نہیں شہ مرداں کے لال کی

لیکر بلائیں بھائی کی بولی وہ سوگوار
اپنے غلام سمجھو انھیں تم پہ ہیں نثار
پہلے پہل نکلتے ہیں گھر سے یہ گلعذار
ان کی مدد ضرور ہی ہنگام کارزار
صدمے سے جان اب ہی بہن ہار کی جاتی میں
ڈر کا یہ ہی کہ دیکھیے کیا ہو لڑائی میں

سیراب اُدھر ہیں سب انھیں کب نہر کی پیاس
کیا ہو جو نہر دیکھ کے ہو جائیں بے حواس
پشتی پہ جب ہو شبّر تو بیجا ہے پھر ہراس
رہنا نہ دور اِن سے اگر ہے بہن کا پاس
بچّے کہاں یہ اور وہ دَل فوجِ شام کا
بھیّا مجھے ہے دھیان بزرگوں کے نام کا

زندوں میں آئیں یہ جو مقتل سے مر کے آئیں
کنبے میں سُرخرو ہوں اگر خوں میں بھر کے آئیں
اُلٹیں بہادروں کی صفیں نام کر کے آئیں
خیمے میں آئیں اب تو جہاں سے گزر کے آئیں
بھیّا مجھے قسم ہے جنابِ امیر کی
پانی پیا تو بوند نہ بخشوں گی شیر کی

عبّاس نے کہا یہ نہ فرمائیے حضور
ایسے یہ شیر ہیں کہ کریں جنگ میں قصور
بچّے کسی نے دیکھے ہیں اس طرح کے غیور
کوفے کو شام پر جو اُلٹ دیں تو کیا ہے دُور
بچپن میں کافروں سے خدا کے ولی لڑے
یہ یوں لڑینگے جیسے اُحد میں علی لڑے

ہے سب عرب میں لیثِ غالب انھیں کا جد
مثلِ علی وغا میں کرینگے یہ جدّ و کد
جس دم رجز پڑھینگے یہ صفدر رشید و مد
غل ہوگا گونجتے ہیں ترائی میں دو اسد
یہ پارۂ جگر ہیں علی سے دلیر کے
سب خصلتیں ہیں شبّر کی بچّے ہیں شیر کے

کچھ فکر کی جگہ نہ تردّد کا ہے مقام
سُن لیجیے گا آج یہ جیسے کرینگے کام
اِن سے کبھی جدا نہیں رہنے کا یہ غلام
میں عبدِ سرفروش ہوں اے خواہرِ امام
بندے کا حفظ خالقِ عالم کے ہاتھ ہے
روتی ہیں آپ کیوں مری جان اِن کے ساتھ ہے

یہ سُن کے مضطرب جو پھری وہ جگر فگار
دیکھا بڑھے ہیں جانبِ در شاہِ نامدار
پھیلا کے ہاتھ کہنے لگے شاہِ ذی وقار
زینب گلے سے بھائی کے لپٹو پھر ایک بار
جو حالِ دل ہے کہہ نہیں سکتا زباں سے میں
چھٹتی نہیں تم آج بچھڑتا ہوں ماں سے میں

بھائی بہن کے درد کی باتیں لکھوں اگر
بہہ جائے آب ہو کے جو پتھر کا ہو جگر
چھاتی سے سر لگائے ہوئے تھی وہ نوحہ گر
رکھے ہوئے تھے دوش پہ سر شاہِ بحر و بر
غم سے جگر لہو تھا شہِ مشرقین کا
سیدانیوں میں شور تھا ہائے حسین کا

بنتِ علی کے پیچھے تھی سیدانیوں کی صف
غل تھا مدد کو آیئے اب یا شہِ نجف
لڑیاں تھیں چار ایک سی اشکوں کی ہر طرف
شہ کہتے تھے بہن نہ کرو جان کو تلف
غربت میں اور کوئی نہ یاور نہ عون ہے
تم مر گئیں تو پھر مرے بچوں کا کون ہے

فرما کے یہ بڑھا پسرِ ختمِ مرسلیں
ماتم کی صف پہ بیبیاں زینب کو لے گئیں
مشکل تھا ضبطِ غش ہوئی وہ بیکس و حزیں
خیمے سے نکلے روتے ہوئے بادشاہِ دیں
دامن علم کا کھول کے عباس رک گئے
صف باندھ کر سلام کو مجرائی جھک گئے

دیکھا جو نورِ چہرۂ سردارِ خاص و عام
پڑھنے لگے درود جوانانِ تشنہ کام
سر کو جھکا جھکا کے جھکے جب پئے سلام
جو سر تھا سر جھکانے میں وہ پا گئے امام
یعنی غلام منکسر و خاکسار ہیں
اس پائے عرش قدر پہ بہ سر نثار ہیں

سب فوج کو سلام کا جب دے چکے جواب
بس جانبِ فرس متوجہ ہوئے جناب
روح الامیں نے دی یہ صدا تھام کر رکاب
بسم اللہ اے خدیوِ زماں مالکِ رقاب
نورِ محمدی رخِ انور کی ضو میں ہے
شوکت تری رکاب میں نصرت جلو میں ہے

اس شان سے فرس پہ شہِ انس و جن چڑھے
جس طرح نکلے ابر سے خورشید دن چڑھے
بہرِ جہادِ راہِ خدا مطمئن چڑھے
گھوڑوں پہ نوجوانوں سے پہلے حسن چڑھے
سب جاں فشاں سوار تھے راہِ ثواب میں
پیدل مگر تھے ابنِ مظاہر رکاب میں

بڑھتا تھا خون جوشِ شجاعت سے دم بدم
گردن میں وہ کجی تھی نہ مطلق کمر میں خم
ہر نوجوان سے تھا یہ اشارا بصد حشم
یعنی جہاں سے جائیں گے سیدھے جناں میں ہم
بر میں زرہ کمان کیانی تھی دوش پر
قبضے پہ ایک ہاتھ تھا اک زین پوش پر

ابرو جھکے جو پڑتے تھے پلکوں پہ بار بار
رومال پھاڑ کر انھیں باندھا تھا استوار
آنکھوں سے شیرِ نر کے جلالت تھی آشکار
گویا کہ تھی غلاف میں حیدر کی ذوالفقار
جلدی چلے جو چند قدم جھوم جھوم کے
رعشہ وداع ہو گیا ہاتوں کو چوم کے

اک شور تھا کہ عود کیا پھر شباب نے
پائی دعا حبیب کے حق میں جناب نے
ریشِ سفید رُخ پہ سیہ کی خضاب نے
پائی یہ آب و تاب کہاں آفتاب نے
لبریز نور سینۂ بے کینہ ہو گیا
یوں جُھرّیاں مٹیں کہ تن آئینہ ہو گیا

کہتے تھے باگ روکے ہوئے شاہِ نامدار
یہ کس لیے پیادہ روی اے نحیف و زار
ہیں بھی اتر پڑوں گا نہ ہوگے اگر سوار
کرتے تھے عرض یہ کہ توانا ہے جاں نثار
ہرچند پیرِ خستہ دل و ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروے تو کردم جواں شدم

فرمایا تم کو دیتا ہوں اُس سر کی میں قسم
جو بعدِ عصر تیغ سے ہو جائے گا قلم
میں بھی نکالتا ہوں رکابوں سے اب قدم
اچھا تمھارے ساتھ پیادہ چلیں گے ہم
پونچھو جناں میں بحرِ مصیبت کو جھیل کے
ہم تم تو ایک گھر میں پلے ساتھ کھیل کے

وہ لوٹنا بھی خاک کا اب تک ہے یادگار
تم پر بھی گرد تھی مری زلفوں پہ بھی غبار
اُس وزم پہ مجھ سے سوا تھا نبی کا پیار
فرماتے تھے یہ ہے مرے پیارے کا دوست دار
شبیر کے حبیب کو پہچانتا ہوں میں
لوٹے گا یہ لہو میں یوہیں جانتا ہوں میں

رو کر کہا حبیب نے آخر ہوا وہ دَور
اب اُن کا دور ہے کہ جو ہیں حاکمانِ جَور
یہ وقت اور کچھ ہے وہ ہنگام تھا کچھ اور
مولا کبھی رہا نہیں دنیا کا ایک طور
گردش نئے فلک کی نئے انقلاب ہیں
کوثر ہے جن کا آج وہ محتاجِ آب ہیں

یہ عرض کر کے روئے حبیبِ وفا شعار
جھک کر کہا یہ پیرِ غلام آپ پر نثار
جب تک سمند پر وہ دلاور ہوا سوار
روکے رہے لگامِ فرس شاہِ نامدار
ہر دوست پر پدر سے زیادہ شفیق تھے
کیا قدرداں وہ شاہ تھا اور کیا رفیق تھے

بس چھیڑ کر فرس کو امامِ زماں بڑھے
آگے جو تھے رُکے ہوئے وہ سب جواں بڑھے
کاندھوں پہ رکھ کے نیزوں کو شیرِ ژیاں بڑھے
مشتاقِ تیغ و خنجر و تیر و سناں بڑھے
یوں طے کیا دلیروں نے اُس راہِ خیر کو
جاتا ہے جس طرح کوئی گلشن میں سیر کو

بشاش قتل گاہ میں پہنچے جو وہ دلیر
دعوی یہ تھا کہ بھیجواں سرکشوں کو زیر
تینوں سے روم و شام کی بستی اُجاڑ دیں
حد سے سوا تھی کثرتِ فوجِ ستم شعار
پیدل تھے نے حساب تو تھے لاکھ سوار
پیکِ خیال جا کے پھر آتا تھا راہ سے
اکناف بحر و بر میں جو لشکر کا تھا مقام
ناکوں پہ چوکیاں تھیں خبر بروں میں اہتمام
آیا کبوتر اُڑ کے جدھر صید ہو گیا
ظاہر ہوئی سیاہیِ لشکر سے دن کو رات
دُنیا پرست دشمنِ ساداتِ نیک ذات
دریا کے صرفِ آب سے لب خشک ہو گئے
دُنیا میں نیک کم ہیں بہت اور بد ہزار
چالیس کُل پیادے تھے بتّیس سب سوار
بوٹے سے قد تھے ایک بھی اُن میں جوان نہ تھا
بچوں میں سبزہ رنگ کوئی تھا کوئی صبیح
چاٹیں لبوں کو اُن کے جو باتیں سنیں فصیح
جدّ و پدر کی طرح جری تھے دلیر تھے
وہ بیچے ہلال کے دم خم پہ جن کو فوق
ہنس ہنس کے زخم کھائیں یا نوں کو اس کا ذوق
آنکھیں جو نرگسی ہیں تو رُخ بھولے بھالے ہیں

نیزوں کو گاڑ گاڑ کے گونجے مثالِ شیر
عرصہ نہ جنگ میں ہو نہ فتح و ظفر میں دیر
کوفے کے در پہ جا کے نشانوں کو گاڑ دیں
لکھی ہے راویوں نے چھ لاکھ اور دس ہزار
فوجوں کا دستِ چپ کے بھی ممکن نہیں شمار
پنہاں تھی کربلا کی زمیں سب نگاہ سے
شہر و جبل بھرے ہوئے تھے فوج سے تمام
مسدود ہو گئی تھی سبیلِ خط و پیام
قاصد جہاں ملا وہ وہیں قید ہو گیا
وہ کشمکش کہ موت کے طالب تھے ذی حیات
مقتل سے کوفے تک ہے قشون ہے یوں صفات
جتنے کنوئیں تھے راہ میں سب خشک ہو گئے
لکھا ہے فوجِ شہ کا کتابوں میں بے شمار
طفل اُن میں تھے کئی سمن اندام و گلعذار
سبزہ بھی جن کے گورے رُخوں پر عیاں نہ تھا
شیریں سخن لبوں میں نمک رنگتیں ملیح
مردوں کو دم میں زندہ کریں صورتِ مسیح
بچے کلّے یوں پہ غیض جو آئے تو شیر تھے
جرأت کا جوش تیغ زنی کا دلوں میں شوق
گیسو خوں بکانوں میں بند گلوں میں طوق
نذروں کے منّتوں کے مرادوں کے پالے ہیں

ایک ایک خوش بیاں تو ہر اک نکتہ سنج ہی
لشکر وہ ہی کہ حسن کے دریا کا گنج ہی
انگڑائیاں جو لیتے ہیں سینوں کو تان کے
کم گو کوئی حسیں کوئی شیریں سخن کوئی
نازک مزاج کوئی تو گل پیرہن کوئی
دولت یہی حسین کے حصہ میں آئی تھی
شیران دشت کو جگر ایسے نہیں ملے
حمزہ کو جنگ کے ہنر ایسے نہیں ملے
جو تھا نبی کے بعد خدا کے ولی کا تھا
پہلے پہل جو نکلے تھے گھر سے وہ گلعذار
فرماتے تھے یہ روک کے عباس نامدار
حجت تمام کی نہیں شاہ غیور نے
عجلت کو جانتے ہیں سب اچھی ہیں بردبار
دیکھو تماشہ فوج کی کثرت ہی بے شمار
جلدی نہ کیجو گو کہ لڑائی میں دیر ہو
دست ادب کو جوڑ کے بولے وہ تشنہ کام
بیٹے سے مسکرا کے یہ کہنے لگے امام
بیٹا یہ سن میں چھوٹے ہیں سب میں بڑے ہو تم
بپھرے ہوئے ہیں شیر خبردار ہوشیار
عجلت ہر ایک امر میں بچوں کا ہی شعار
جان اپنی سب دیے ہیں رگوں کے نام پر

کچھ پیاس کا نہ غم ہی نہ فاقوں کا رنج ہی
چہرہ ہر اک کا ماہ چہار و دو پنج ہی
کہنا ہی حسن خود کہ نثار ان کی شان کے
بچپن میں سرو قد کوئی رشک چمن کوئی
تصویر جد کوئی تو شبیہ حسن کوئی
مایہ تھا فاطمہ کا علی کی کمائی تھی
غواص کو کبھی گہر ایسے نہیں ملے
جعفر نے پائے بال پر ایسے نہیں ملے
حضرت کو وہ ملا کہ جو حصہ علی کا تھا
تیغیں چمکتی دیکھ کے بڑھتے تھے بار بار
شیرو ابھی نہیں ہی تمھیں حکم کارزار
سبقت نہ کرنا منع کیا ہی حضور نے
بے وقت دوڑتے نہیں ذی قدر ذی وقار
باجے بجا کے کھولینگے رایت ستم شعار
تم تو خدا کے شیر کے شیروں کے شیر ہو
کر دیجے ہمیں علی اکبر کے پا نیام
عاشق تمھارے نام کے ہیں یہ فلک مقام
اچھا صف ان کے باندھ کے آگے کھڑے ہو تم
کوئی بڑھانے پائے نہ اس صف سے راہوار
بہلا کے روکے رہنا انھیں تم پہ میں نثار
گھوڑے اڑا کے جا نہ پڑیں فوج شام پر

تسلیم کرکے شہ کو مرتب جو کی وہ صف
فرقت میں جن کی چاک رہا سینۂ صدف
اُن سے کسے جہان میں عشق ولی نہیں
شرمندہ جس سے چاند ہو ایسے وہ تابناک
خود وادی السلام جو چھانے نجف کی خاک
تسبیح ہاتھ آئے یہ کس نیک نام کو
شبیر خدا کے سات جگر بند نامدار
پوتے چھؤوں وحید زماں فخر روزگار
خود جس کی فرع واصل علی و بتول تھے
یوسف ہے ایک مصر میں اور مشتری ہزار
یوسف سے کربلا میں تھے اٹھارہ گلعذار
ہاں منزلت تھی قدر تھی قیمت تھی قوت تھی
تیغ و ترنج اگر ہوں ہلال اور آفتاب
گر دیکھ لیں وہ حسن ملیح اور وہ شباب
پریاں تو اُن کے سایہ کا پیچھا نہ چھوڑتیں
لاریب فیہ حسن میں یوسف تھے بے مثال
مثل نبی ملیح تھے یہ سب نکو خصال
شور آج تک ہے خوبی یوسف میں نمک نہیں
ناگہ نشان بڑھائے اُدھر کی سپاہ نے
چوما نشاں کو بڑھ کے ہر اک خیر خواہ نے
رفعت بڑھی زمین سعادت سرشت کی

سب جس پرے میں تھے گہر قلزم شرف
زہرا کے رشتہ دار ید اللہ کے خلف
اب تک وہ آبرو تو کسی کو ملی نہیں
دل بلبلوں کے خون تو گریباں گلوں کے چاک
ایسے کبھی ملیں نہ گہر ہائے صاف و پاک
درّ نجف تھے وہ جو ملے تھے امام کو
دونوں نواسے حضرت زہرا کے یادگار
بھانجے دو ہر پانچ بھتیجے فلک وقار
یہ سب اُسی درخت کی شاخوں کے پھول تھے
کیف و کم ثمن ہے کتابوں سے آشکار
عالم کی جان فخر حسینان روزگار
زہرا کے یوسفوں کی خریدار موت تھی
سرکائے چہرۂ علی اکبر سے پھر نقاب
حوریں گلوں کو کاٹ کے تڑپیں ہے نہ تاب
دامن کبھی جناب زلیخا نہ چھوڑتیں
گستاخیاں معاف ادب کا بھی ہے خیال
وہ خامشی سخن کی وہ شیرینی مقال
پھیکا ہے پردہ حسن کہ جس میں نمک نہیں
کھولا ادھر علم کو علمدار شاہ نے
طوبا لکم کہا شہ عالم پناہ نے
ٹھنڈی ہوا پھریرے سے آئی بہشت کی

رایت وہ سبز لشکرِ سادات کا نشاں
دامانِ پاک کشتیِ اُمت کا بادباں
پنجہ مثالِ پنجۂ خورشید زر فشاں
پرچم تھا بال کھولے تھی یا حورِ جناں
مشک و عبیر و عود کا بازار سرد تھا
مٹی کا عطر خاک کی خوشبو سے گرد تھا

نقارۂ وغا پہ لگی چوب ناگہاں
گردوں وہیں سے پار ہوئی طبل کی فغاں
شہپور کے غریو سے ہلتا تھا آسماں
قرنا کی وہ مہیب صدا تھی کہ الاماں
نیزوں کو ہر سوار اُدھر تولنے لگا
گونجے ادھر بھی شیر کہ رن بولنے لگا

شہنا کا شور سُن کے لرزتا تھا بند بند
برچھی ہلی رسالوں میں نیزے ہوئے بلند
صحرائے ہولناک کی وحشت ہوئی دو چند
ڈر کر کنوتیوں کو ہلانے لگے سمند
سن کر دہل کا شور کلیجے دہل گئے
صحرا سے ڈر کے شیر نیستاں نکل گئے

پیاسوں پہ جب اُدھر سے چلے تیر بے شمار
مولا نے غازیوں کو دیا حکمِ کارزار
نکلے وغا کو قبلۂ عالم کے جاں نثار
جن کی شجاعتیں ہیں زمانے میں یادگار
ہونگی نہ ہیں نہ ایسے کبھی باوفا ہوئے
سب جاں نثار حق نمک سے ادا ہوئے

حر و بریر و وہب و عمیر فلک مقام
وہ مسلم ابن عوسجۂ عرش احتشام
سعد و زہیر قین و حبیب خجستہ کام
وہ شیر جس کا بو عمر نہشلی تھا نام
جس غول پر جھپٹ کے یہ آئے وہ ہٹ گیا
ایک ایک مرتے مرتے پروں کو الٹ گیا

نکلے وغا کو ایلچی شاہ کے پسر
ماتم میں سب تھے کہ تھا ابھی تازہ غمِ پدر
فوجوں پہ حملہ ور ہوئے جس دم وہ شیر نر
دم میں تنوں سے کٹ کے گرے کوفیوں کے سر
رن پر چڑھے جو سوگ کے کپڑے اُتار کے
مارے گئے وہ شیر ہزاروں کو مار کے

لاشوں کو قتل گاہ سے لے آئے جب حسینؑ
نکلے پرے سے حضرتِ زینب کے نورِ عین
کی عرض با امامِ زماں شاہِ مشرقین
رانڈوں میں ہے یتیموں کے ماتم کا شور و شین
پھر وقت کونسا ہے جو اب ہم فدا نہ ہوں
دل تھر تھرا رہے ہیں کہ اماں خفا نہ ہوں

فرمایا کیا نجاؤ گے رخصت کو ماں کے پاس
دونوں نے ہاتھ جوڑ کے تب کی یہ التماس
اکبر سے آپ پوچھ لیں باشاہِ حق شناس
فرما رہی ہیں والدۂ آسماں اساس
اب گھر میں آئیو تو وغا کر کے آئیو
سر لیجیے ابنِ سعد کا یا مر کے آئیو

فرمایا خبر فوج سے جنگ و جدل کرو
جو ماں نے کہہ دیا ہے اسی پر عمل کرو
ہاں خواہشِ وصالِ عروسِ اجل کرو
بچپن میں اس بقا کو فنا سے بدل کرو
راحت نے اس طرف نہ کیا رخ نہ چین نے
دیکھے نہ ماں نے بیاہ نہ سہرے حسین نے

تسلیم کر کے گھوڑوں پہ وہ نازنیں چڑھے
غل پڑ گیا جہاد کو دو مہ جبیں چڑھے
یوں اشہبوں پہ دلبرِ ضرغامِ دیں چڑھے
نظروں سے سب کے اُڑ گئے گھوڑے زمیں چڑھے
پریاں نکل کے قاف کی راہوں سے چھپ گئیں
دو بجلیاں چمک کے نگاہوں سے چھپ گئیں

پہونچے جو رن میں برجِ شرف کے وہ آفتاب
نیزے زمیں پہ گاڑ دیے مثلِ بوتراب
نعرہ کیا کہ او پسرِ سعدِ بے حجاب
ہمراہ لے کے شمر کو آ سامنے شتاب
گو سیکڑوں سوار ہزاروں پیادے ہیں
تلوار پہلے تجھ سے چلے یہ ارادے ہیں

ہم نے سنا ہے یہ کہ قریشی نسب ہے تو
نیکوں میں ہم ہوئے ہیں بدوں میں خجستہ خو
ہم ٹوکتے ہیں او سگِ ناپاک و کینہ جو
شیروں سے آ وغا کو جو ہے پاسِ آبرو
فاقوں میں زور دیکھ جدال و قتال دیکھ
دعویٰ ہے کچھ تو ہاشمیوں کا جلال دیکھ

ماں بنتِ فاطمہ ہیں بنی فاطمہ ہیں ہم
دادا ہیں ابنِ عمِ رسولِ فلک حشم
ہیں اس طرح حسب میں نبی و علی بہم
دو نام کو ہیں ایک ہیں بر کعبہ و حرم
بھائی جدا ہے خویش جدا ہے وصی جدا
اُن سے علی جدا نہ خدا سے نبی جدا

نے فصل ہے وصی نبی مالک الرقاب
ضرغامِ دین مدینۂ علم نبی کا باب
دریائے فیضِ رحمتِ معبود کا سحاب
نورِ خدا سپہرِ جلالت کا آفتاب
جو اُن سے منحرف ہوا وہ دوزخی ہوا
ایسا کوئی شجاع نہ ایسا سخی ہوا

کہف الورے سراج ہدے حجتِ خدا
ہر ضرب جس کے ہاتھ کی تھی ضربتِ خدا
حق ساتھ ہی حسین کے ہم اُن کے ساتھ ہیں
چھوٹے نے کی یہ عرض کہ بڑھیئے بس اب حضور
ہوتا ہی اور دھوپ سے اب پیاس کا وفور
دو ہاتھ میں بھگا کے سواروں کو گھاٹ سے
کھینچے یہ کہہ کے نیمچے دونوں نے یک بیک
گاؤ زمیں ادھر تھی ہراساں اُدھر سمک
غل تھا چمک دمک وہی سب آشکار ہی
دو بجلیاں سپاہ میں کونسیں فرس بڑھے
اب کون روکے شبیر بڑھے جب تو بس بڑھے
بچوں نے زورِ حق کے ولی کا دکھا دیا
وہ دو نواسیوں کی رواروادھر اُدھر
تابندہ تھے جو آٹھ مہِ نو ادھر اُدھر
کیلوں سے آشکار تھے جلوے نجوم کے
آئے جدھر خدا کا غضب آگیا اُدھر
جھپٹے جدھر شکستِ عدو کھا گیا اودھر
انساں تو کیا کہ شیروں کے زہرے بھی آب تھے
کیا دونوں تازیوں کی سبک تازیاں لکھوں
کس طرح نیمچوں کی سرافرازیاں لکھوں
پوتے ہیں کس جری کے خلف کس ولی کے ہیں

جس سے فزوں کسی نے نہ کی طاعتِ خدا
خاکی بنا وہ آئینۂ قدرتِ خدا
پہنچا علی کا زور جنھیں یہ وہ ہاتھ ہیں
مخفی ہوا ہی خیمے میں ڈر کر وہ بے شعور
مرنا ہی ہر طرح یہ تامل ہی کیا ضرور
خیمہ گرا دو اس پہ طنابوں کو کاٹ کے
پہونچی زمیں سے آئینۂ مہر تک چمک
ڈر کر پروں پہ نادِ علی پڑھتے تھے ملک
اک جا ہیں دو یہ نیمچے یا ذوالفقار ہی
جس طرح قافلے سے صدائے جرس بڑھے
مقتل میں بیس ہو گئے جو کہ دس بڑھے
سب نے ناک ڈھنگ ضربِ علی کا دکھا دیا
کاووں میں بس کے مر گئے سو سو ادھر اُدھر
پھیلی ہوئی زمین پہ تھی ضو ادھر اُدھر
پریاں تھیں وہ کہ پھرتی تھیں جھوم جھوم کے
پلٹے جدھر یہ رعبِ علی چھا گیا اُدھر
ٹھہرے جہاں کسی سے نہ دیکھا گیا اودھر
آنکھیں ملائے کون کہ دو آفتاب تھے
کیونکر رواروی میں خوش اندازیاں لکھوں
کیا دو نوشاہزادوں کی جانبازیاں لکھوں
اعلیٰ یہ موج ہی کہ نواسے علی کے ہیں

جو شبّر حق میں تھے وہ شجاعت انھیں میں ہے
شبیر سے کریم کی ہمت انھیں میں ہے
گو ان کے مدح خوانوں کے لب بے سوال ہیں
وہ چھوٹے چھوٹے خود وہ پیشانیوں کی شان
دینداریوں کا نور خدا دانیوں کی شان
باہم چلے نہ زور گیا کچھ نہ کس گیا

جس صف پہ دور دور سے وہ جلالت قریں بڑھے
وہ کیا بڑھے کہ دو اسدِ خشمگیں بڑھے
زندہ بھی کشتۂ خطر و بیم ہو گئے
چلّہ سے جس کا تیر ملا تن پہ سر نہ تھا
زندہ جو بھاگے چین ادھر تھا ادھر نہ تھا
دریا تھا یا سپاہ صفیں تھیں کہ موج تھی

نیزوں ہیں جس طرف وہ گئے بے دھڑک گئے
زندوں کے خوفِ جاں سے کلیجے دھڑک گئے
یکسر قدم سپاہ سے دریا کے اٹھ گئے
وہ گورے گورے ہاتھ وہ نازک کلائیاں
وہ نیچوں میں تیغِ علی کی صفائیاں
جس غول پر وہ صاحبِ شمشیر آ پڑے

جس پہلوان پہ عون کی تلوار پڑ گئی
چھوٹے کی آنکھ جس سے لڑائی میں لڑ گئی
آنکھوں کو روکے صف سے وہ مردک نکل گیا

جعفر کی شان و شوکت و صولت انھیں میں ہے
کونین بخش دیں یہ سخاوت انھیں میں ہے
منہ بھر دیں موتیوں سے کہ زینب کے لال ہیں
وہ دبدبہ وہ رعب وہ عمرانیوں کی شان
وہ دونوں نیچوں کی سر افشانیوں کی شان
جب چمکے مینہ سروں کا سراسر برس گیا

غل پڑ گیا کہ دلبر ضرغام دیں بڑھے
شیروں کا وہ شکار ہوئے جو لعیں بڑھے
دو حصے ہو کے موت کے تقسیم ہو گئے
جز گوشۂ فرار کسی جا مفر نہ تھا
کشتوں کے پشتے تھے کہ نظر کا گزر نہ تھا
دو بجلیوں کے بیچ میں اعدا کی فوج تھی

شیروں کی بو جو آ گئی گھوڑے بھڑک گئے
زخموں سے کیا مزا تھا کہ بسمل پھڑک گئے
ہونٹوں کو چاٹتے ہوئے دنیا سے اٹھ گئے
وہ بازوؤں کا زور وہ تیغ آزمائیاں
وہ ولولے وہ پہلے پہل کی لڑائیاں
ثابت ہوا کہ فوج پہ دو شیر آ پڑے

چہرہ تو کیا ہے زیست کی صورت بگڑ گئی
سر تیز اک سناں تھی کہ پتلی میں گڑ گئی
گویا تھا کو توڑ کے ناوک نکل گیا

اِک شور تھا کہ چشم نمائی غضب کی ہے
آفت کا معرکہ ہے لڑائی غضب کی ہے
یہ گھاٹ قہر کا یہ ترائی غضب کی ہے
چھوٹے سے نیمچوں کی صفائی غضب کی ہے
بڑھتا تھا آپ سے نہ کوئی جنگ کے لیئے
لاتی تھی موت گھیر کے جو رنگ کے لیئے

جس پر اڑا کے رخش وہ جانباز جا پڑا
ثابت ہوا کہ صید پہ شہباز جا پڑا
دو ہو گئے تیغ پر وہ فسوں ساز جا پڑا
خود منہ کے بل سمندِ سبکتاز جا پڑا
دونوں ہیں نورِ عین علی سے غیور کے
آنکھیں نکال لیں کوئی دیکھے جو گھور کے

اللہ کا غضب اُدھر آیا جدھر بڑھے
پہونچا سروں پہ تیغ کا سایہ جدھر بڑھے
جلوہ عروسِ فتح نے پایا جدھر بڑھے
گھونگٹ سپاہِ شام نے کھایا جدھر بڑھے
گرتی تھی برق لشکرِ ابنِ زیاد پر
گویا چڑھے تھے دو نئے دولھا جہاد پر

ماتھے وہ اور وہ پیچ عمامہ کے لٹ پٹے
گیسو جو بنتِ فاطمہ نے ہاتھ سے بٹے
وہ ابروؤں کے بل کہ ہلالِ فلک کٹے
آنکھیں وہ نرگسی تھیں کہ جس سے نظر ہٹے
چہرے کسی نے دیکھے ہیں اس آب و تاب کے
رُخسار چار پھول کھلے ہیں گُلاب کے

وہ برگِ گل سے لب وہ دہن اُن کے تنگ تنگ
وہ بھینی بھینی بو کسی غنچہ میں وہ نہ رنگ
لعل و گہر ہیں اِن دُرِ دنداں کے آگے دنگ
اِک منجمد وہ قطرۂ نیساں ہے اور یہ سنگ
تشبیہ بھی جو اُن سے نہ دی نا امید ہیں
اِس غم سے موتیوں کے کلیجوں میں چھید ہیں

گورے گلے کہ جن سے نمایاں ہے نورِ حق
سُرخی نہیں یہ مہرِ منوّر پہ ہے شفق
وہ نیمچے وہ ہاتھ دلِ کفر جس سے شق
سینے میں ایک مصحفِ ناطق کے دو ورق
خالی ہیں گو شکم پہ یہ جبرا سیر ہیں
فاقہ تو ارث ہے کہ یہ شبیر کے شیر ہیں

اُن دونو اشہبوں کی وہ چھل بل وہ تنگ جائے
جو اُن کی چال دیکھنے آئے وہ دنگ جائے
صورت کا نہ پتا و نہ سرعت کا ڈھنگ جائے
اُڑتے تھے یوں کہ جیسے ہوا پر خدنگ جائے
پر یاں تھیں دو وہ اسپ سعادت اثر نہ تھے
سب تھی ہما کی تیز پری اور پر نہ تھے

اسوار آفتاب تو گھوڑے تھے ماہ رو
سرعت یہ تھی کہ دوڑتا تھا جسم میں لہو
جاندار و خوش رکاب و سعید و خجستہ خو
صاف آتی تھی پسینے سے جن کے وفا کی بو
ڈھالا تھا جوڑ بند کو سانچے میں نور کے
نازک کلائیاں تھیں کہ پونچے بلور کے

دونوں کنوتیاں کہ دو پیکانِ تیر ہیں
چاروں سُم اُن کے غیرتِ ماہِ منیر ہیں
آنکھوں پہ یہ کھبے جو نظر نے نظیر ہیں
یال ایسی جس کے بیچ میں پریاں اسیر ہیں
سرعت میں ان سے طیر کو نسبت نہ تیر کو
نرمی یہ جلد میں کہ خجالت حریر کو

آئے اُدھر سے گر تو ادھر سے نکل گئے
پہونچے کنارِ بحر تو بر سے نکل گئے
مانندِ برق لشکرِ شر سے نکل گئے
دو تیر آ گئے تیز نظر سے نکل گئے
یوں پھر رہے تھے بیچ میں فوجِ غنیم کے
جیسے سحر کو چلتے ہیں جھونکے نسیم کے

غنچے تھے دو ملے ہوئے اک جا کہ ان کے گوش
برگستواں میں جسم کہ رستم تھا درعہ پوش
سرعت کو دیکھ لیں تو اڑیں طائروں کے ہوش
گرتا تھا منہ سے کف شجاعت کا تھا یہ جوش
پریاں اُٹھا سکیں نہ روش اُن کی چال کی
بالکل مزاج شبر کا آنکھیں غزال کی

وہ سم وہ نعل اور وہ سینے وہ ترک و تاز
بدر و ہلال و آئینہ و کبک و شاہباز
زیور تھا ایک نسب کی ڈھل کا کہ ان کے ساز
وہ کلغیاں کہ طرۂ لیلیٰ سے سرفراز
بن کر گہر پسینے کے قطرے ٹپکتے ہیں
ہیکل کی تختیاں کہ ستارے چمکتے ہیں

گو چھوٹے چھوٹے پاؤں نہ جاتے تھے تار کا
پر اڑیاں جمی ہوئی تھیں مثلِ بوتراب
یوں مرکبوں کی باندھے تھی سہرو فلک جناب
بیجا قدم رکھیں یہ سمندوں کو تھی نہ تاب
غل تھا ہٹو کہ مزاج ان کا آگ ہے
حیدر سے شہسوار کی یہ ران و باگ ہے

گھوڑوں کے کس پہ ہیں قیامت بپا نہ کی
فاقہ تھا پر کمی تگ و دو میں ذرا نہ کی
وہ کونسی گرہ تھی کہ تیغوں نے وا نہ کی
کن سرکشوں کے جسم سے گردن جدا نہ کی
نیزوں کے بند قطع کمانوں کے ساتھ تھے
حلالِ مشکلات کے بچوں کے ہاتھ تھے

بچوں کے نیچے بھی غضب آبدار تھے
بسمل فنا سے تھے صاعقہ شعلہ بار تھے
دونو بہم جو ہو کے اُٹھے ذوالفقار تھے
سائے کو بھی شریک جو کیجیے تو چار تھے
دو کرتے تھے یہ راکب و مرکب کو زین کو
دو ہاتھ کاٹ دیتا تھا سایہ زمین کو

قبضے وہ تکیہ گاہ ظفر جن کا نام ہے
پھل وہ کہ جس کو کھاتے ہی قصہ تمام ہے
پانی وہ جس کو کہیے کہ زہر التیام ہے
کاٹ ایسا سنگ سخت جہاں موم خام ہے
جوہر وہ دم نکلتے ہیں جس کی مثال پر
افشاں چنی ہوئی ہے جبین ہلال پر

فولاد پوش پھینک کے ہتھیار چھپ گئے
گوشوں میں سر جھکا کے کماندار چھپ گئے
چار آٹھ ہیں جو قتل ہوئے چار چھپ گئے
زخموں کے گل بہت جو کھلے خار چھپ گئے
مشکل وہاں تمیز و بد و نیک ہو گئی
غل تھا کہ لو بہار و خزاں ایک ہو گئی

جن کے جمے تھے رنگ وہ بے رنگ ہو گئے
لڑنے کا حوصلہ نہ رہا تنگ ہو گئے
جا آئینہ جو پہنے تھے چو رنگ ہو گئے
بچوں نے وہ کیا کہ جواں دنگ ہو گئے
دُھومیں وغا کی قاف سے تا قاف ہو گئیں
اللہ رے مصاف صفیں صاف ہو گئیں

کوئی بچے نہ رومی و رازی جدھر پھرے
جھک جھک گئیں صفیں وہ نمازی جدھر پھرے
غازہ لگایا فتح نے غازی جدھر پھرے
پسپا تھے یکہ تاز وہ تازی جدھر پھرے
مہلت نہ سر اُٹھانے کی تھی فوج شام کو
دونا بلند کر گئے جعفر کے نام کو

جا پہونچے تھے مقام بن سعد کے قریں
بھاگا عقب سے چھپ کے خیمے کو وہ لعیں
کتنی طنابیں کاٹ چکے تھے یہ مہ جبیں
ہاں ہاں کا شور کر کے بڑھے سب عدوے دیں
بھاگا اُدھر تو جوش میں وہ اضطراب کے
یہ دونو بھائی رہ گئے ہونٹوں کو چاب کے

چھوٹے نے عرض کی یہ سراپا ہیں مکر و کید
دیکھا حضور چھٹ گیا پنجے میں آ کے صید
چھٹنے کی شرم ہے نہ انھیں بھاگنے کی قید
فرمایا عون نے یہ ہے استاد زرق و شید
بھاگا طنابیں کٹتے ہی کیا حیلہ ساز ہے
سچ ہے حرام زادے کی رسّی دراز ہے

بڑھکر پکارے حضرتِ عباسِ عرش جاہ
ذلت اُٹھا کے بھاگ گیا افسرِ سیاہ
سرسبز ہوتے ہیں یہیں جب کھیت ہیں پڑے
ہاں مرد اگر ہو سامنے بچوں کے آ تو جائے
مخفی کدھر ہو شیروں کو صورت دکھا تو جائے
بپھرے ہیں شیر ہاتھ میں تیغ و سپر تو لے
بھاگا رئیس خود یہ خبر چار سو گئی
آخر شغال تھا نہ وہ بکنے کی خو گئی
جب کچھ کڑی پڑی تو جفا جو نکل گیا
مرتا ہے بے حیا زر و جاگیر و مال پر
آنکھیں چرائیں شیر جب آئے جلال پر
پائے نہ گر شکار تو جا نباز کیا کرے
باتوں میں آ نا تھم جو گئے وہ فلک پناہ
دریا کی فوج اُدھر سے ہوئی بڑھ کے سدِ راہ
پتھر بھی تیر ظلم بھی نیزے بھی چل گئے
یوں تیر کھا کے فوج پہ جاتے تھے وہ دلیر
لشکر کو کر دیا تھا زبر دستیوں سے زیر
دیکھا غضب سے جس کی طرف زرد ہو گیا
تیغیں قریب جو لگانے تھے اہلِ شر
عباس بڑھ کے دیتے تھے حضرت کو یہ خبر
نامی جوان بھاگ گئے شام و روم کے

کس سمت ابنِ سعد ہے اور شمرِ روسیاہ
روکے گئے نہ اک سے دو طفل واہ واہ
یوں لشکروں سے شبر کے فرزند لڑتے ہیں
بھاگے گا پھر تو خیر کوئی زخم کھا تو جائے
بگڑی ہوئی لڑائی کو ظالم بنا تو جائے
گرتا ہے وہ جھکا ہوا خیمہ خبر تو لے
عزت سبھوں کی آج گئی آبرو گئی
خلعت پہن کے بھی نہ رذالت کی بو گئی
ضیغم جلال میں ہیں کہ آہو نکل گیا
اک نیمچے کا وار بھی روکا نہ ڈھال پر
سردار ہو کے چھپ گیا تُف اس جدال پر
گنجشک جب نہاں ہو تو شہباز کیا کرے
خیمے کو لے کے پشت پہ سب جم گئی سپاہ
چاروں طرف سے گھر گئے زینب کے رشکِ ماہ
سینوں کو توڑ توڑ کے ناوک نکل گئے
غصے میں جس طرح کہ جھپٹتا ہے زخمی شیر
انبار ادھر سروں کی دھر زخمیوں کی ڈھیر
تلوار جس پہ سن سے چلی سرد ہو گیا
اک بھائی بڑھ کے ہوتا تھا اک بھائی کی سپر
کیا کیا لڑے ہیں آپ کی ہمشیر کے پسر
خیمے پہ جا پڑے پسرِ سعد شوم کے

پر اب خدا بچائے کہ فوجیں کثیر ہیں
تیغیں ہیں برچھیاں ہیں سنانیں ہیں تیر ہیں
رو کر امامِ دیں نے کہا اب اخیر ہیں
کب تک لڑیں کہ تشنہ دہن ہیں صغیر ہیں
نو دس برس میں ماں سے بچھڑنے کے دن نہ تھے
یہ کھیلنے کی فصل تھی لڑنے کے دن نہ تھے

زینب کھڑی تھی پردے کے پیچھے جو بے قرار
فضہ خبر یہ دیتی تھی جا جا کے بار بار
کیا کیا لڑے ہیں حیدر و جعفر کے یادگار
حضرت سے مدح کرتے ہیں عباسِ نامدار
جس وقت ذکرِ معرکہ آرائی ہوتے ہیں
رومال رکھ کے آنکھوں پہ حضرت بھی روتے ہیں

رو کر کہا کہ روتے ہیں کس واسطے امام
میں اُن کی اک کنیز یہ دونوں پسر غلام
مجھکو دکھا تو دے کہ کدھر ہیں وہ لالہ فام
اُس نے کہا کہ چھائی ہے جنگل میں فوجِ شام
لاکھوں سے معرکہ ہے مگر با حواس ہیں
بی بی وہ ابنِ سعد کے خیمہ کے پاس ہیں

تلوار چل رہی ہے کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کی بدلیوں میں چھپے ہیں وہ رشکِ ماہ
کثرت ہے اس قدر کہ پہونچتی نہیں نگاہ
وہ بھاگتی ہے اور پلٹتی ہے سب سپاہ
آوازِ دار و گیر تو گردوں پہ جاتی ہے
دونوں کے نیمچوں کی چمک تا فلک آتی ہے

طبلِ ظفر پہ چوب لگی یک بیک ادھر
ڈیوڑھی سے آ کے خیمہ میں زینب جھکا کے سر
عباس نے کہا شہِ والا سے دوڑ کر
چلیے حضور لٹ گیا بنتِ علی کا گھر
گھبرا کے کشمکش میں وہ اُن کے نکل نہ جائیں
لاکھوں سوار ہیں کہیں بچے کچل نہ جائیں

تلوار لے کے قاسمِ شیریں سخن بڑھے
عباس کیا بڑھے شہِ خیبر شکن بڑھے
مانندِ شیر اکبرِ گل پیرہن بڑھے
فرزند سے یہ کہہ کے امامِ زمن بڑھے
پردے میں اہلِ بیتِ نبی کے خلل نہ آئے
ڈیوڑھی پہ تم رہو کہیں زینب نکل نہ آئے

پہونچے یہ تیغِ شیر جو مقتل میں ایک بار
کیا پیدلوں کا ذکر فراری ہوئے سوار
ریتی پہ شہ کو یوں نظر آئے وہ گلعذار
بند آنکھیں منہ کھلے ہوئے ہونٹوں پہ جانِ زار
دنیا سے وقتِ کوچ بھی دونوں کا ساتھ ہے
گردن میں ایک بھائی کے بھائی کا ہاتھ ہے

بچوں کو جاں کنی میں جو پایا حسین نے
آنکھوں سے خوں جگر کا بہایا حسین نے
آغوش میں بڑے کو شہنشاہ لے چلے
پہونچے قریب خیمہ جو شاہ فلک سریر
پردہ الٹ کے خیمہ کا با حالت تغیر
دوڑو حسین خیمہ میں لاشوں کو لاتے ہیں
دوڑے اُدھر سے چھاتیوں کو پیٹتے حرم
رایت کے نیچے بچوں کے تھیں بیتین بہم
لاشوں کے آگے اکبر یوسف جمال تھے
ماتم کی صف سے اٹھ گئیں زینب یہ کہہ کے بات
لاشوں کو رکھ کے غش ہوئے سلطان کل بنات
لڑکے بھی چھاتیوں کو بہم پیٹنے لگے
بیٹھی تھیں ایک گوشہ میں زینب جو ننگے سر
پرسے کو لوگ جمع ہیں چلیے ذرا ادھر
آنچ آمنہ کی سل کو جلائے تو کیا کروں
بس سن چکی کہ نام کیا خوب لڑ چکے
کنبہ تمام ہو چکا دو گھر اجڑ چکے
اب اُن کا غم نہ فکر مرے گھر کی چاہیے
بھائی کے آگے لاشوں پہ جا کر کروں بین
گر مر گئے تو مر گئے وہ دونو نور عین
روؤں گی میں تو پھر علی اکبر بھی روئیں گے

بوسے لیے گلے سے لگایا حسین نے
ہاتھوں سے بچوں کو چھوڑایا حسین نے
چھوٹے کی لاش قاسم نوشاہ لے چلے
تھا غیر حال مر گئے رستے میں وہ صغیر
فضہ پکاری اے حرم شاہ قلعہ گیر
دولھا بنے ہوئے مرے شہزادے آتے ہیں
ڈیوڑھی سے پہلے آیا چمکتا ہوا علم
آ پہونچے لڑکھڑاتے ہوئے سرور امم
کپڑے ہر اک کے خون سے بچوں کے لال تھے
لوگو بتاؤ کون سے دولھا کی ہے برات
دوڑیں لٹا کے بچے کو بانوئے خوش صفات
لاشوں کے گرد آ کے حرم پیٹنے لگے
واں جا کے بولیں بانوئے ناشاد و نوحہ گر
فرمایا میں نجاؤں گی بچوں کی لاش پر
گر فرق میرے صبر میں آئے تو کیا کروں
لاشوں پہ لاشیں لوٹ چکیں کھیت پڑ چکے
گودی میں جو پلے تھے وہ بچے بچھڑ چکے
بی بی سلامتی علی اکبر کی چاہیے
نے صبر ہو یہ دل میں کہیں گے شہ حسین
کیوں کر چلوں کھڑے ہیں شہنشاہ مشرقین
صدمہ مجھے یہ ہے کہ برادر بھی روئیں گے

بھائی کا حق ادا ہوا احسانِ کردگار
لاشوں کو دیکھ کر مرا دل ہو گا بے قرار
چلئے نہ ضبط کیجیے فریاد و آہ کو
لاشوں پہ لائیں بی بیاں زینب کو تھام کر
بولیں بڑھا کے دستِ مبارک ادھر ادھر
کیسی ہڑا دھڑی ہے یہ کیوں بن ٹھنے ہوئے ہیں
ماں صدقے جائے لو مرے زانو پہ سر رکھو
لازم نہیں کہ ہاتھ سے تیغ و سپر رکھو
دیکھو نہ آنچ آئے شہِ خوش خصال پر
کیسی یہ نیند آج ہے پیارو اٹھو اٹھو
کپڑے لہو بھرے یہ اتارو اٹھو اٹھو
ان پیاری پیاری آنکھوں پہ اماں نثار ہو
سینوں سے تو زمیں پہ رکھو ہاتھ اتار کے
اماں نثار گیسوؤں کے تار تار کے
نخلِ مراد میں نہ ثمر ہے نہ برگ ہے
لاکھوں سے معرکہ میں وغا کر کے آئے ہو
دولہا بنے ہو خون میں سب بھر کے آئے ہو
مجھ سے بچھڑ کے تم اسی منزل میں رہ گئے
کیونکر ملے گا ماں کو تمہارا سراغ ہائے
یوں بجھ گئے ہماری لحد کے چراغ ہائے
ہے ہے یہ گھر بھرا ہوا ویران کر گئے

رونا ہے واں بھی بین ہیں روؤں گی زار زار
کی عرض آپ صاحبِ ماتم ہیں میں نثار
لاشوں پہ بھانجوں کی غش آیا ہے شاہ کو
ماتم کی صف پہ گر پڑی وہ سوختہ جگر
بچے کدھر ہیں کچھ مجھے آتا نہیں نظر
لوگو نہ غل مچاؤ مرے لال سوتے ہیں
اس بیکسی میں ماں کی بھی جانب نظر کرو
آفت میں ماموں جان کی اپنے خبر رکھو
فوجوں کی پھر چڑھائی ہے زہرا کے لال پر
ماموں کے ساتھ رن میں سدھارو اٹھو اٹھو
الجھے ہیں گیسوؤں کو سنوارو اٹھو اٹھو
انگڑائیاں تو لو کہ جگر کو قرار ہو
باندھو کھلے ہوئے یہ عمامے سنوار کے
چونکو اٹھو کلام کرو ماں سے پیار کے
اب سمجھی میں یہ نیند نہیں خوابِ مرگ ہے
بچپن کی غفلتیں یہ نہیں مر کے آئے ہو
صدقے گئی رلانے کو مادر کے آئے ہو
ارمان شادیوں کے مرے دل میں رہ گئے
لوٹا اجل نے حیدر و جعفر کا باغ ہائے
میرا بڑھاپا اور یہ بچوں کے داغ ہائے
اماں کی قبر بنتے نہ پائی کہ مر گئے

کس طرح دیکھوں خاک میں جس کے اٹے ہوئے
الجھے ہیں میرے ہاتھ کے گیسو بٹے ہوئے
سینے فگار جان سے بازو کٹے ہوئے
ہے ہے کفن بنے یہی کپڑے پھٹے ہوئے
نہ کچھ تزک نہ تخت شہیدوں کو چاہیئے
مرنا یوہیں جہان میں سعیدوں کو چاہیئے

تابوت اٹھائی دھوم سے مرتے وطن میں گر
ہوتا پدر بھی ساتھ جنازے کے نوحہ گر
قبریں بنائی ماں کی لحد کے ادھر ادھر
کیا حشر ہوگا پہونچے گی یثرب میں جب خبر
ام البنین پیٹتی روضے پہ جائیں گی
صغرا کے پاس بی بیاں پرسے کو آئیں گی

بچو تمھیں بتاؤ میں غربت میں کیا کروں
گھر ہے نہ یہ وطن ہے مصیبت میں کیا کروں
بھائی گھرا ہوا ہے اس آفت میں کیا کروں
فاقوں میں تشنگی میں صعوبت میں کیا کروں
راحت نہ روح کو نہ کسی دل کو صبر ہے
پانی نہ غسل کو نہ کفن ہے نہ قبر ہے

مجبور تم بھی ماں بھی ہے ناچار میں نثار
تنہائی میں خدا ہے مددگار میں نثار
رستا برا ہے باندھ لو ہتھیار میں نثار
چھوٹے مرے پسر سے خبردار میں نثار
اللہ اس سفر کی بلاؤں کو رد کرے
کھٹکا جہان ہو بھائی کی بھائی مدد کرے

سنتی ہوں اس سفر میں خطرے شمار ہیں
جانیں وہی اسی جو میان مزار ہیں
پرسش ہے روک ٹوک ہے جنگل ہے خار ہیں
وہ بھی ڈرے ہوئے ہیں جو طاعت گزار ہیں
منزل کا شب کی ماں کو پتہ دے کے جائیو
قربان جاؤں ساتھ مجھے لے کے جائیو

دن ڈھل گیا قریب ہے شام اے مسافرو
کس بن میں شب کو ہوگا مقام اے مسافرو
کچھ تو کرو زبان سے کلام اے مسافرو
بھیجو گے کب پیام و سلام اے مسافرو
پیٹوں گی جنگلوں میں جو تم کو نہ پاؤں گی
میں شب کو ڈھونڈتی ہوئی مقتل میں آؤں گی

کہتا تھا باپ شب کو نہ بچے نکلنے پائیں
بھولے ہیں راستہ نہ کہیں گھر کا بھول جائیں
دربار میں بھی ہوں تو سویرے سے گھر میں آئیں
ہے ہے یہ دشت ظلم جو کرتا ہے سائیں سائیں
پہنچوں گی کس طرح میں جو ڈر کے رو دو گے
واری اندھیری رات میں کس طرح سوؤ گے

شب کو خوشی آمدیں مری کرتے تھے بار بار
تا دودھ ہم کو بخش دے مادر جگر فگار
ان بھولی بھولی باتوں کے ماں ہو گئی نثار
باتیں وہ رات کی مجھے بھولیں گی نہ وہ پیار
اب واری سرخرو ہوئے تم رب کے سامنے
لو دودھ میں نے بخشدیا رب کے سامنے

یہ بین کرکے لاشوں سے لپٹی وہ نوحہ گر
غش آیا۔ سانس الٹ گئی ٹکڑے ہوا جگر
اک حشر تھا کسی کو کسی کی نہ تھی خبر
بانو پکاری سوئے علمدار دیکھکر
بچوں کے ساتھ ماں بھی جہاں سے گزر نہ جائے
لاشے اٹھاؤ شاہ کی ہمشیر مر نہ جائے

بس اے انیس طول سے بہتر ہی اختصار
ہاں ختم کر کے مرثیہ شاہ نامدار
خالق سے ہاتھ اٹھا کے دعا کر بانکسار
قایم رہے جہاں میں یہ شاہ فلک وقار
ہر دم زیادہ حشمت و اقبال و جاہ ہو
حامی جناب فاطمہ زہرا کا ماہ ہو

رباعی

خوں بھائی کا شہ کے روبرو بہتا تھا
پیاسے کا لہو کنار جو بہتا تھا
تھا بیچ میں سقائے حرم کا لاشہ
دریا تو ادھر ادھر لہو بہتا تھا

مرثیہ (۱۰)

جاتا ہی شبیر بیشۂ حیدر فرات پر
طاری ہی خوفِ مرگ ہر اک ذی حیات پر
صدمہ عجب ہی بادشہِ کائنات پر
آنکھوں سے اشک بہتے ہیں ہر بات بات پر
بجھتا ہی وہ جو قبرِ علی کا چراغ ہی
جو حال ہو بجا ہی کہ بھائی کا داغ ہی

صابر کا ہی یہ حال کہ مشکل ہی ضبطِ آہ
فرماتے ہیں کہ تھامے بندے کو یا الٰہ
کیا مرحلہ ہی سخت یہ کیونکر کٹے گی راہ
بھائی مرا یہی ہی لشکر بھی سپاہ
آخر بشر ہوں میں جو نہ روؤں تو کیا کروں
تیغِ علی کو ہاتھ سے کھوؤں تو کیا کروں

دوری کا غم ہی کیوں نہ بہیں اشک متصل
پالا ہی بر میں آہ تجھے کس طرح سے دل
اعضا کو توڑے دیتا ہی یہ دردِ جاں گسل
اے موت آکہ روحِ علی سے نہ ہوں خجل
رخصت کا حرف لب پہ بھی لایا نہ جائے گا
مجھ سے تو یہ پہاڑ اُٹھایا نہ جائے گا

یہ نوجواں بضاعتِ حیدر ہی یا کریم
حمزہ یہی مرا ہی جعفر ہی یا کریم
پیارا پسر سے بھی یہ برادر ہی یا کریم
یوں سب ہیں پر اسی سے مرا گھر ہی یا کریم
بازو یہی ہی ہاتھ مرے اس کے ہاتھ ہیں
میں جانتا ہوں شیرِ خدا میرے ساتھ ہیں

زینب کے لال مر گئے لشکر بچھڑ گیا
سہرا دکھا کے قاسمِ نوشہ بچھڑ گیا
وہ کیا شہید ہو گئے سب گھر بچھڑ گیا
پھر میں نہیں اگر یہ برادر بچھڑ گیا
اس معرکے میں ذبح ہوں پہلے تو عید ہو
سبطِ نبی کے بعد یہ بھائی شہید ہو

حضرت اُدھر تڑپتے ہیں تھامے ہوئے کمر
عباس بی بیوں سے ہیں رخصت طلب ادھر
لائی ہی سوکھی مشک سکینہ بچشمِ تر
فرماتے ہیں بھتیجی کا منہ چوم چوم کر
پہلے تھا ذکرِ آب تسلی کے واسطے
اب جا کے پانی لاتے ہیں بی بی کے واسطے

کہتی ہے خشک ہونٹ دکھا کر وہ لالہ فام
اب موجان مجھ میں نہیں طاقت کلام
اصغر کو لے کے ہاتھوں پہ بانوئے نیک نام
فرماتی ہیں کہ مرتا ہے یہ تشنہ کام
دکھلاؤ اس کا حال شہ نامدار کو
ہچکی لگی ہوئی ہے مرے شیرخوار کو

کرتے ہیں عرض حضرت عباس نامدار
بچوں پہ جان دینے کو حاضر ہے جاں نثار
پر کیا کروں رضا جو نہ دیں شاہ ذوی الوقار
چلئے پسر کو لے کے وہاں بہر کردگار
رخصت میں سعی کیجیے کہ ہو نام آپ کا
وہ کام ہے غلام کا یہ کام آپ کا

کچھ سوچ کر یہ کہنے لگی وہ شکستہ حال
کیا کہتے ہو نہ بھائی یہ میری نہیں مجال
بیٹا ہے تم کو دیکھ کے خیر النسا کا لال
نیکی بدی ہو کچھ تو کہیں شاہ خوش خصال
بانو نے مرتضیٰ کی کمائی کو کھو دیا
بچوں کے واسطے مرے بھائی کو کھو دیا

زینب یہ بولیں آپ کا وسواس ہے بجا
کیونکر دلا دے بھائی سے ان کو کوئی رضا
پانی بھی مل سکے گا صغیروں کا ہے خدا
تنہا نہ ہوں جہان میں شہنشاہ کربلا
موقع نہ سعی کا ہے نہ مشکل کشائی کا
یہ چل بسے تو کون ہے پھر میرے بھائی کا

کہنے لگی یہ زوجۂ عباس خوش صفات
بی بی بھلا یہ کون سے وسواس کی ہے بات
مشکیزہ لے کے گر یہ چلا جائیں سوئے فرات
پھر ننھے ننھے بچوں کی کس طرح ہو حیات
ہر وقت کبریا سے طلبگار خیر ہوں
آگے جو کچھ سبھوں کی رضا میں تو غیر ہوں

جس جا حسین بیٹھے تھے عریاں سر کیے
واں خود گئے بھتیجی کو آغوش میں لیے
کی عرض تا کجا کوئی خون جگر پیے
پانی کہیں سے آئے تو یہ جاں بلب جیے
ہچکی لگی ہے اصغر ناشاد کام کو
مولا بس اب نہ روئیے اپنے غلام کو

فرمایا میری مرگ گوارا کرو تو جاؤ
مشکیزہ بھر کے چاند سی چھاتی پہ زخم کھاؤ
اچھا سکینہ جس میں خوشی تم ہمیں پہ لاؤ
یہ کیا سکھا کے لائی ہو بی بی ادھر تو آؤ
ثابت ہوا کہ ہاتھ سے عمو کو کھوؤ گی
پانی کو اب تو روتی ہو پھر ان کو روؤ گی

انجام کی خبر نہیں کچھ تم کو ہائے ہائے
خیر اب دعا کرو کہ یہ اعدا پہ فتح پائے
جب مشک بھر کے دوش پہ یہ نیک خو رکھے
گردن جھکا کے شرم سے بولی وہ مہ جبیں
اصغر کو لائیں گود میں جب بانوئے حزیں
مجرم جو لب پہ حرف شکایت بھی لائے ہوں
یہ سن کے گود میں لیا اُس تشنہ کام کو
باقی رہی نہ ضبط کی طاقت امام کو
حالت جو غیر ہو گئی زہرا کے جائے کی
بوسہ قدم پہ دے کے وہ شیر ژیاں چلا
چلائے اہل بیت کہ راحت رساں چلا
سادات کس بلا میں گرفتار ہو گئے
اللہ رے رعب آمدِ عباس عرش قدر
غل ہے قریب تر ہے سپہر وغا کا بدر
آتا ہے ابن ضیغم یزداں لڑائی کو
لشکر میں ایک ایک کو ہے زندگی سے یاس
وہ دور دور سب ہیں صفیں تھیں جو پاس پاس
غل چار سو یہ ہے کہ قدم سر کے جاتے ہیں
وہ عازم وغا ہے جو شیروں کا شیر ہے
زور آوری سے اُس کی تہمتن بھی زیر ہے
لرزہ ہے اُن کے تن میں جو مرد نبرد ہیں

یہ اودے اودے ہونٹ انھیں تم نے کیوں دکھائے
دولت ولی حق کی مرے ہاتھ سے نہ جائے
دریا کا معرکہ ہے حق آبرو رکھے
پوچھیں حضور میں نے کچھ ان سے کہا نہیں
ہاں مشک دی قصور یہ ہے یا امام دیں
لیجے قسم زباں کے جو کانٹے دکھائے ہوں
عباس خم ہوئے شہِ دیں کے سلام کو
پلٹا لیا برادرِ عالی مقام کو
قبر علی سے آئی صدا ہائے ہائے کی
غل پڑ گیا کہ یاورِ شاہِ زماں چلا
لو فاطمہ کے گھر سے علی کا نشاں چلا
ہے ہے حسین بیکس و بے یار ہو گئے
سینوں میں دل چھپے ہوئے تھے جوشنوں میں صدر
زہرے ہیں آب گھاٹ سے بھاگے ہیں اہل غدر
شیروں نے ڈر کے چھوڑ دیا ہے ترائی کو
ڈر سے کسی کے ہوش ٹھکانے ہیں نے حواس
آمد میں شیر کی بھی یہ ہوتا نہیں ہراس
گھوڑے بھگا کے حضرتِ عباس آتے ہیں
روتا ہے دل کے بھائی سے بھائی یہ دیر ہے
جرار ہے شجاع جہاں ہے دلیر ہے
شیروں کے ہاتھ پاؤں ترائی میں سرد ہیں

رن سے قدم اٹھائے ہوئے ہیں سرانِ فوج
دہشت سے منہ چھپائے ہیں تیغیں میانِ فوج
رایت تمام خوف سے تھرّائے جاتے ہیں

نکلا حرم سرا سے جو وہ آسماں حشم
شوکت وہ اُس جناب کی وہ رفعتِ عَلَم
ذرّوں سے تر نگیں تھے گہر لعل سنگ سے

وہ ضو علم کی وہ رُخِ عباسِ نامور
پنجہ اُدھر علم کا رُخِ پُر ضیا اِدھر
یکتا وہ زرق برق میں یہ آب و تاب میں

پنجے سے نورِ پنجتنی آشکار ہے
دامن بھی ابرِ رحمتِ پروردگار ہے
کشتی کا بادبان ہو تو کوثر پہ جا لگے

ناگاہ غل ہوا فرسِ تیز گام لاؤ
ہاں رخشِ تیز رَو کو بصد اہتمام لاؤ
ہے انتظار ابرشِ آہو شکار کا

آیا فرس سجا ہوا کس ترک و ناز سے
رکھتا تھا پاؤں خاک پہ اس امتیاز سے
فوق اُس کو تھا ہما سے سعادت نشان پہ

وہ تھوتنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
کیلیں نجوم نعل ہلال اور سُم قمر
کھاتی تھی ہر پری بھی قسم اُس کی جان کی

مانندِ بید کانپ رہے ہیں جوانِ فوج
دامن لپیٹتے ہیں کمر سے نشانِ فوج
لشکر کے بھاگنے کے نشاں پائے جاتے ہیں

نصرت نے گرد پھر کے لیے بوسۂ قدم
پنجے کی ضو سے برق چمکتی تھی دم بدم
صحرا زمرّدی تھا پھریرے کے رنگ سے

رُخ پہ تھا ہاتھ چہرے پہ خورشید خیرہ سر
دو نورِ سرمدی تہ و بالا تھے جلوہ گر
تھا فرق ایک نیّرے کا دو آفتاب میں

پرچم پہ طرۂ سرِ حور انتشار ہے
پہونچا جو اُس کے سایہ میں وہ رستگار ہے
طوبیٰ نہال ہو اگر اُس کی ہوا لگے

آیا علی کا سروِ رواں خوش خرام لاؤ
اسپِ گراں رکاب مرصّع لجام لاؤ
بیٹا سوار ہوئے گا دلدل سوار کا

سرعت کا قافلہ نکل آیا حجاز سے
جیسے پری چمن میں خراماں ہو ناز سے
سم تھے زمین پر تو دماغ آسمان پر

وہ انکھڑیاں غزال ہوں ہرن جن کو دیکھ کر
باریک جلد سینہ کشادہ وہ بلند سر
غصہ یہ تھا کہ تنگ ہے وسعت جہان کی

دلدل نژاد برق تجلّی براق سیر
اسوار دم دلاسے سے گر پھیر لے تو خیر
سرعت غضب ہی گو کہ وہ نے آب دانہ ہی
سایہ کا اُس کے دھوپ میں سرعت سے تھا یہ حال
گہ بر میں گاہ بحر میں گاہ سوے جبال
سایہ نہ تھا ہمائے سعادت پناہ تھا
وہ شوخیاں فرس کی وہ سرعت وہ آؤ جاؤ
جب چاہو سیر عالم امکاں کی دیکھ آؤ
رفعت میں پست حوصلہ کبک دری کا تھا
لو اب سوار ہوتے ہیں عباسِ نامور
لو ہٹ کے ہاتھ آپ نے رکھا ایال پر
برچھا لیا سمند کو زانو میں داب کے
بڑھنے میں صرف ہاں جو دہن سے نکل گیا
لشکر گلوں کی بو کا چمن سے نکل گیا
طاؤس کیا کہ برق بھی شرما کے رہ گئی
گھوڑا اُڑا کہ ہو گئی سرعت ہوا کی گرد
جا پہونچی تا بہ فرق ثریا ثرے کی گرد
خورشید کی ضیا تھی سموں کے نشان پر
شوکت وہ اُس فرس کی وہ عباس کی نمود
غل تھا کہ ہر شناہی پے واجب الوجود
سب کے گلوں میں ان کی غلامی کا طوق ہی

دریا میں موج دشت میں آہو ہوا میں طیر
گر سانس لی تو دم بھی نہ لے پھر فلک بغیر
اُس کو تو نبض کی حرکت تازیانہ ہی
وحشت میں جس طرح سے بھرے چوکڑی غزال
گم کردہ آشیاں تھا عقاب کشادہ بال
گویا ہوا کے زور میں شاہین تباہ تھا
تنو حسُن تھا فقط جسے ہیکل کا اِک بناؤ
تازی ہو روح پاؤ قدم میں وہ لطف پاؤ
چھل بل ہرن کی تھی تو جھگڑا پری کا تھا
لو دامنِ قبا نے لیا بوسہ کمر
لو آفتاب خانۂ زیں پر ہی جلوہ گر
لو دو ہلال بن گئے حلقے رکاب کے
وحشی غزال دشتِ ختن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا تھا کہ سن سے نکل گیا
پیچھلے سموں کی گرد نظر آکے رہ گئی
بوے چمن تھی یا قدمِ باد پا کی گرد
اُڑ کر سرِ فلک پہ گئی کربلا کی گرد
نخوت سے تھا زمین کا دماغ آسمان پر
پڑھتا تھا کوئی شخص تبارک کوئی درود
کیا ان کے سامنے کسی انسان کی ہست بود
یہ وہ بشر ہیں جن کو ملایک پہ فوق ہی

پیدا مثال حیدرِ کرّار رعبِ حق
رخسار تھے کہ سورۂ والشمس کے ورق
چمکا جو نورِ عرش بنا خاک کا طبق
ازبر تھا خط کو آیۂ واللیل کا سبق
موتی کی آگے دانتوں کے کچھ آبرو نہ تھی
سورہ تھا نور کا وہ بیاضِ گلو نہ تھی

وہ ہاتھ کارِ خیر رہا جن سے روز و شب
بازو وہ جن میں قوّتِ دستِ خدا تھی سب
ساعد تھے صاف ساعدِ پرنور شیرِ رب
شانے وہ جن میں شانِ نشانِ شہِ عرب
پہلو میں قلب وہ جو ہمیشہ کھڑا رہا
سینہ وہ صدر تھا جو وفا سے بھرا رہا

شان و شکوہ و صولت و عدل و ہیبت و داد
اشفاق و رحم و دوستی و خُلّت و وداد
اسلام و دین و ملّت و ایمان و اعتقاد
خوف و رجا و آرزو و مطلب و مراد
اندوہ و درد و رنج مطیعانِ نو میں تھے
سب غاشیہ بدوش فرس کی جلو میں تھے

شوکت کا قول تھا کہ مطیعِ جناب ہوں
نصرت کا ادّعا تھا کہ میں کامیاب ہوں
کہتی تھی فتح خاکِ درِ بوتراب ہوں
دعویٰ تھا قہر کو کہ علی کا عتاب ہوں
فاقے سے تھے پہ صبر بھی منہ موڑتا نہ تھا
ہر گام پر ثباتِ قدم چھوڑتا نہ تھا

تلوار وہ ہلال کٹے جس کو دیکھ کر
مہتابِ آسمانِ ظفر آہنی سپر
تھی کہکشاں کمند عدو بند شیرِ نر
خود آفتاب تھا تو جبینِ مبیں قمر
رُخ کے عرق سے نور کے قطرے ٹپکتے تھے
حلقے نہ تھے زرہ میں ستارے چمکتے تھے

نیزے کی نوک سے جگرِ آفتاب خوں
ابروے جورِ فتح و ظفر تھا کمان کا نوں
سینہ ہے آسماں کا اُسی دن سے نیلگوں
تھا ماہِ نو بھی جس کے چم و خم سے سرنگوں
دہشت سے گوشہ گیر رہبانِ شام تھے
ترکش کے سارے تیر اجل کے پیام تھے

نیزہ زمیں میں گاڑ کے گونجا جو شیرِ نر
نکلے رجز میں خشک زباں سے وہ شعرِ تر
چہروں سے رنگ اُڑ گئے تھرا گئے جگر
جس کے جواب میں فصحا نے جھکائے سر
غل تھا زبانِ ناطقہ الکن ہے لال ہے
لاریب فیہ مصحفِ ناطق کا لال ہے

نعرہ یہ تھا کہ گوہرِ برجِ شرف ہوں میں
فرزندِ صاحبِ شرفِ مَن عرف ہوں میں
فخرِ سلف جو شاہ ہے اُس کا خلف ہوں میں
اللہ و پنجتن ہیں جدھر اُس طرف ہوں میں
رایت سے پیش رَو ہوں خدا کی سپاہ کا
پیرو ہوں بادشاہِ ہدایت پناہ کا

حیدر کی ذوالفقار سے لاکھوں کے سر کٹے
جوشن ہیں سینے سینوں کے اندر جگر کٹے
خیبر میں جبرئیل کے بھی تین پر کٹے
پریوں کٹے کہ تیغ سے جیسے سپر کٹے
ضربت کا حال عمرو دلاور سے پوچھیے
حیدر کا زور مرحب و عنتر سے پوچھیے

بچوں کا ایلچی بھی ہوں اور تشنہ کام ہوں
سقائے اہلِ بیتِ رسولِ انام ہوں
شبیر کی سپر ہوں علی کی حسام ہوں
شاہوں کا شاہ ہوں شہِ دیں کا غلام ہوں
سینے پہ تیر کھاؤں گا تلواریں کھاؤں گا
یہ مشک آبِ نہر سے میں لے کے جاؤں گا

یوں تو ہیں تین روز سے بے آب و دانہ سب
لیکن قریبِ مرگ ہیں وہ طفلِ تشنہ لب
کیوں آل کو ستاتے ہو بے جرم و بے سبب
کچھ مصطفےٰ کا پاس نہیں تم کو ہے غضب
دو دن تو بیکسوں پہ عطش میں گزر گئے
کس پر یہ خون ہوگا جو معصوم مر گئے

ہم اپنا سر کٹانے کو حاضر ہیں ظالمو
تنبوؤں میں بھوک پیاس سے صابر ہیں ظالمو
بچے بھی میہمان کے مسافر ہیں ظالمو
آثارِ مرگ چہروں پہ ظاہر ہیں ظالمو
گر ہم تمہارے زعم میں تقصیروار ہیں
پر اُن کا کیا قصور ہے جو شیرخوار ہیں

ہے دھوم یہ خیام کانپتا ہے گرم بَن
مرجھا گیا ہے احمدِ مختار کا چمن
مانندِ غنچہ پیاس سے کھولے ہیں سب دہن
پانی بغیر اب نہ جئیں گے وہ گلبدن
گرمی سے ہاتھ پاؤں غریبوں کے سرد ہیں
نیلے ہیں ہونٹھ پھول سے رخسار زرد ہیں

چلایا شمر تب کہ عبث ہے سوالِ آب
دیں گے زبانِ تیغ سے ہم آپ کو جواب
بچوں کی پیاس سے ہے جو حضرت کو اضطراب
پھر کس لیے ہے بیعتِ حاکم سے اجتناب
خیمے سے گھٹنیوں اگر اصغر بھی آئے گا
جز آبِ تیر پانی کا قطرہ نہ پائے گا

ایسا سخن کبھی سُنا تھا نہ کان سے
برچھی لگی مگر نہ کہا کچھ زبان سے
جھومے فرس پہ جب شہِ مرداں کی شان سے
بس خود بخود اُگلنے لگی تیغ میان سے
نعرہ کیا کہ او سگِ ناپاک دور ہو
یہ کیا سخن ہے منہ میں ترے خاک دور ہو

حجت تمام کرنے کی خاطر تھے یہ کلام
ظالم شراب خوار کی بیعت کرے امام
سوکھی ہوئی زباں جو ہلا دے وہ تشنہ کام
حاضر ابھی ہوں چشمۂ کوثر کے لاکھ جام
قدرت ہے سب طرح کی امامِ جلیل کو
چاہیں تو وہ سبیل کریں سلسبیل کو

کیا جانتے مرتبہ پسرِ فاطمہ کا تو
عزت بہشت کی ہیں تو کوثر کی آبرو
سردار بُردبار نکوکار نیک خو
اُن کا عدو خدا و پیمبر کا ہے عدو
جاری ہے فیض فاطمہ کے نورِ عین کا
غاصب ہے تو یہ نہر بھی ہے حق حسینؑ کا

یہ کہہ کے لی نیام سے تیغِ شرر فشاں
آواز دی زمیں نے کہ یا حافظِ زماں
شعلے نے الحذر کہا بجلی نے الاماں
دہشت سے تھرتھرا گیا مریخِ آسماں
ثابت ہوا کہ چہرۂ خورشید کٹ گیا
غل تھا کہ فوجِ شام کا دفتر الٹ گیا

بجلی چمک کے ہوتی تھی جب آسماں کے پار
پڑھتا تھا عرش آیۂ کرسی کو بار بار
زیرِ زمیں تو گاو زمیں کو نہ تھا قرار
تھرّا رہا تھا ثورِ فلک وقتِ گیرودار
غل تھا علی کی تیغ کا سب رنگ ڈھنگ ہے
جبریل کانپتے تھے کہ خیبر کی جنگ ہے

اقبال و تندرستی و آسائش و قرار
امن و امان و صبر و توانائی و وقار
علم و سکون و راحت و آرام و اختیار
رعب و ثبات و سرکشی و قدر و اقتدار
آثارِ قہرِ حق اُنھیں معلوم ہو گئے
سب تیغ کے چمکتے ہی معدوم ہو گئے

غل تھا چمکتی آتی ہے تیغِ اجل چلو
ڈر کر کہا اماں نے کہ قبل از جدل چلو
دب کر صدا غرور نے دی سر کے بل چلو
بولی سلامتی کہ سلامت نکل چلو
دریا بہے گا خوں کا کنارے فرات کے
دم بھر میں بند ہوئیں گے کوچے نجات کے

ڈھالوں سے شامیوں کے اُدھر چھا گئی گھٹا
ایسا بڑھا یا ابر کہ شرما گئی گھٹا
کشتوں کو اپنے فوجِ عدو روندنے لگی

چمکی جو تیغ آمدِ قہرِ خدا ہوئی
سینے سے روح جسم سے گردن جدا ہوئی
باڑھ اس غضب کی دار وہ اس زور شور کا

ہر دم تھی معرکہ میں اجل اس کے دم کے ساتھ
رہتی تھی اس طرح ظفر و فتح خم کے ساتھ
ہر دل پہ اس کی شان و جلالت کا نقش تھا

بسم اللہ صحیفۂ نصرت تھی اس کی ناب
جوہر ہیں آبرو میں اصالت میں لاجواب
اُترے جگر سے جس کے اُسی کو خبر نہ ہو

پایا تھا باغیوں نے ثمر یہ دم جدل
شاخیں کماں کی توڑتا تھا پنجۂ اجل
گوشوں کو ڈھونڈھتے تھے کماں کش ہٹے ہوئے

گوپال و تیغ و خنجر گرز و سنان و تیر
دم میں یہ صف تمام اُدھر کا پڑا اخیر
اُڑ کر بھی مرغِ روح کا بچنا محال تھا

یوں مورچوں کو چاٹ گئی تیغ شعلہ رنگ
کمروں سے کھنچ نہ سکتے تھے خنجر میانِ جنگ
تلواریں منہ چھپائے تھیں ضربِ درشت سے

دریا پہ جھوم جھوم کے سب آ گئی گھٹا
بارانِ تیر دشت میں برسا گئی گھٹا
جنگل میں برقِ قہرِ خدا کوندنے لگی

سر پر جو آ گئی تو قیامت بپا ہوئی
خون میں ڈبو چکی تو نہ پھر آشنا ہوئی
دشمن کو اُس کا گھاٹ کنارا تھا گور کا

گرتا تھا خود کٹ کے برابر جھلم کے ساتھ
جیسے ہمیشہ رہتا ہے سکہ درم کے ساتھ
تمغہ نہ کہیے آیۂ نصرت کا نقش تھا

مانندِ ذوالفقار گراں قدر و انتخاب
وہ قد وہ خم وہ منہ کی صفائی وہ آب و تاب
کاٹے گلے ہزار کے اور خوں میں تر نہ ہو

ڈھالوں سے پھول اُڑ گئے تھے برچھیوں سے پھل
گرتے تھے سہم کر قدر انداز منہ کے بھل
رہتی پہ نخلِ تیر پڑے تھے کٹے ہوئے

دو دو تھے پیش آئینۂ تیغ بے نظیر
آفت کا معرکہ تھا قیامت کی دار و گیر
جوہر حسام میں تھے کہ لوہے کا جال تھا

لوہے کو خاکِ شور میں کھا جائے جیسے زنگ
جوشن جو کٹ گئے تھے تو چار آئینے تھے دنگ
ڈھالیں لپٹ گئی تھیں سواروں کی پشت سے

گرتی تھی کوند کر جو وہ تیغ شرارہ ریز
دوزخ کھلا تھا بند تھے سب کوچۂ گریز
چلنے میں تیغ تیز فرس تیز ہاتھ تیز
رہ رہ کے گرم ہوتا تھا ہنگامۂ ستیز
کشتہ تھے ایک ضرب میں دو ہوں کہ چار ہوں
ششدر تھے سب کہ موت سے کیونکر دوچار ہوں

کاٹی سپر تو کاسۂ سر تک پہونچ گئی
سر پر پڑی تو بہر کے بر تک پہونچ گئی
بر سے مثال برق جگر تک پہونچ گئی
پی کر لہو جگر کا کمر تک پہونچ گئی
بڑھ کر کمر سے زین پہ آئی سرنگ کے
ٹکڑے گرے نہ تھے کہ یہ نیچے تھی تنگ کے

ان کے قدم بھی اٹھ گئے جو سر گزار تھے
ممکن نہ تھا فرار کہ دل بے قرار تھے
بھڑکی تھی آگ نعل در آتش سوار تھے
تا بین فرس کی تھیں کہ سروہی وار تھے
جاتا تھا یوں غضب میں صف اہل کید پر
شیر ژیاں جھپٹتا ہے جس طرح صید پر

تیغ دو دم سروں سے گذرتی تھی دم بدم
دوزخ میں فوج شام کی بھرتی تھی دم بدم
بڑھتی تھی دم بدم تو ٹھہرتی تھی دم بدم
ندی لہو کی چڑھ کے اترتی تھی دم بدم
ڈر سے جگر بھی آب تھے زہرے بھی آب تھے
موجیں تھیں دست و پا کی سروں کے حباب تھے

نکلا ادھر سے جو وہ اجل کا شکار تھا
پیدل ہوا سوار وہ دو تھا یہ چار تھا
کوسوں لہو سے دشت ستم لالہ زار تھا
بجلی چمک رہی تھی فرس بے قرار تھا
کیا ہو زرہ سے ضرب جب ایسی کڑی لگے
سر یوں برس رہے تھے کہ جیسے جھڑی لگے

رہوار نے وغا میں کہاں رستمی نہ کی
شمشیر جانستاں نے کہاں برہمی نہ کی
مالک سے بیکسی میں کہاں ہمدمی نہ کی
سو مرتبہ چلی پہ برش نے کمی نہ کی
دم سے تھا بحر خوں کا کنارا لگا ہوا
جانوں کا گھاٹ پر تھا اتارا لگا ہوا

جس سمت گر کے تیغ کا سایہ گزر گیا
پہونچوں سے دونوں ہاتھ اڑے تن سے سر گیا
خالی ہوئی یہ صف وہ پرا خون میں بھر گیا
گھوڑے سمیت گر کے یہ تڑپا وہ مر گیا
گرتا تھا خود جری پہ جری ماجرا یہ تھا
بسمل بھی لوٹتے تھے برابر مزا یہ تھا

فتح وظفر تھی غاشیہ گیرو رکابدار
دکھلا رہی تھی راہِ عدم تیغ تابدار
جو ہاتھ تھے یا کہ سلسلۂ زلفِ تابدار
تلوار بھی ملی تو بہشتی کو آبدار
اک شور تھا کہ زیست کا عرصہ قلیل ہے
پیاسو پیو کہ تیغ کا پانی سبیل ہے

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوتے تھے جاں سے ہاتھ
سر اڑ گئے تنوں سے جدا تھے عناں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہیں منہ چھپانے کو
ہاں پاؤں رہ گئے ہیں فقط بھاگ جانے کو

سر ہر قدم پہ تھے تنِ کفار سے جدا
قبضہ کمان کا دستِ کماندار سے جدا
چلے تھے سر بسر لبِ سوفار سے جدا
ڈر سے جدا ہلاک تھے تلوار سے جدا
زہگیر کیا کرے جو نہ ترکش میں تیر ہو
چلاتے تھے کہ چل کے کہیں گوشہ گیر ہو

یوں تھرتھرا رہے تھے ہر اک پہلواں کے پاؤں
چلنے میں جیسے کانپتے ہیں ناتواں کے پاؤں
اٹھ اٹھ گئے سپاہِ ضلالت نشاں کے پاؤں
رن میں جمے رہے تو اسی نوجواں کے پاؤں
ہٹنا بھی ہے جہاد میں حق کا ولی کہیں
عباس بھی ہٹیں جو ہٹے ہوں علی کہیں

جب شیر سے ترائی کی جانب جھپٹ گئے
صف آئی صف پہ گھوڑے پہ گھوڑے الٹ گئے
اب کیا بڑھیں کہ ڈر سے لہو تن کے گھٹ گئے
جن کے قدم جمے رہے سر ان کے کٹ گئے
حملوں کے بعد تنتے تھے یوں نعرے مار کے
انگڑائی شیر لیتا ہے جیسے ڈکار کے

ہر شی تھی خوفِ ضربتِ شمشیر سے جدا
ناوک کمان سے دور کماں تیر سے جدا
پیر حزیں جوان سے جواں پیر سے جدا
چلے سمٹ کے ہوتے تھے زہگیر سے جدا
سارے عقابِ تیر غمِ بے پری میں تھے
پیکاں میں نہ سری تھی نہ پیکاں سری میں تھے

نیزے کو تولتا ہوا گر کوئی بڑھا
دریائے قہرِ حق طرفِ پُر دغل بڑھا
کچھ ہاتھ کچھ حسامِ دو دستی کا پھل بڑھا
تلوار سر پہ آئی کہ دستِ اجل بڑھا
دو ٹکڑے طول میں جو دمِ امتحاں ہوئے
غل تھا کہ معنیٔ یدِ طولیٰ عیاں ہوئے

رکتی تھی خود پہ نہ جھلم پہ نہ ڈھال پر
حیرت تھی فوجِ شام کو اس چال ڈھال پر
بالا تھا راستی میں قد اس کا ہلال پر
جوہر فروتنی کے بھی تھے اس کمال پر
چشمک یہ دم بدم تھی کہ ہر کش ذلیل ہیں
چلتے ہیں جھک کے وہ جو نجیب و اصیل ہیں

گھوڑوں کے دوڑنے سے اڑی دشت میں جو گرد
مقتل بھی زرد تھا فلکِ نیلگوں بھی زرد
جتنے جواں تھے دفترِ مردانگی میں فرد
پھرے کٹے ہوئے تھے انھیں کے دمِ نبرد
تصحیح کیسا ہوش میں اک خود غلط نہ تھا
زخمی تھے منہ کہیں اثرِ خال و خط نہ تھا

ہر سمت تھا مقدمہ جانوں کا رو بکار
آتی تھی موت جائزہ لینے کو بار بار
اسوار ہر طرف تو ندار و رسالہ دار
طبلق لیے تھے منشیِ فوجِ ستم شعار
کیا ابتری سپاہِ ضلالت اثر میں ہے
غل تھا چلو کہ فوج کی بھرتی سقر میں ہے

تسلیم کو جھکے ہوئے تھے با ادب نشان
لشکر میں بر ہمی تھی سلامی تھے سب نشان
اٹھتا تھا شور ہاتھ سے گرتے تھے جب نشان
نوبت یہ ہے تو فوج کا مٹتا ہے اب نشان
آفت بپا ہے پاؤں تھمے کیا سپاہ کا
سکہ بڑا ہے ضربِ علمدارِ شاہ کا

جب اٹھ کے تیغِ صفدرِ قدسی شرف گری
گویا کہ برقِ سطوتِ شاہِ نجف گری
آیا ادھر خدا کا غضب جس طرف گری
کٹ کر گرا پرے پہ پرا صف پہ صف گری
سیفی چلی کہ سیف صفِ کارزار پر
گھوڑے گرے پیادہ پہ پیدل سوار پر

آرے جو سوئے نہر صفیں موڑ موڑ کے
بھاگے کماں میں تیر عدو جوڑ جوڑ کے
تلواریں ٹپکیں خاک پہ دم توڑ توڑ کے
بھاگے وغا میں گھاٹ کو سنی چھوڑ چھوڑ کے
دو برچھیاں نہ پھر نہ وہ شورِ مصاف تھا
جس مورچے پہ تیغ اٹھائی وہ صاف تھا

وہ رہ گئے کہ زخموں سے جو چور چور تھے
جو تھے قریبِ نہر وہ سب دور دور تھے
غازی تھے صف شکن تھے جری تھے غیور تھے
دریا پہ اور کوئی نہ تھا بس حضور تھے
غل تھا کہ اب بچیں گے نہ ہم اس لڑائی میں
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

لڑتا کنارِ نہر جو پہونچا وہ شہسوار
خون پونچھکر رکھی تہ ران تیغ آبدار
آئی صدائے حضرتِ الیاس باوقار
ای نورِ عین ساقیِ کوثر ترے نثار
سر برہو کون تیغ پکڑ کر جو تو بڑھے
دھو ہاتھ منہ کہ نہر کی بھی آبرو بڑھے

سقائے اہلِ بیت پکارا بچشم تر
میں ہاتھ دھو کے جان سے آیا ہوں نہر پر
پیاسا ہی تین روز کا مختارِ خشک و تر
بچے تڑپ رہے ہیں لہو ہی مرا جگر
طوفان کا دھیان صاحبِ کشتی کو چاہیئے
بچوں کی پہلے فکر بہشتی کو چاہیئے

ڈالا میانِ نہر جو اسپِ صبا شتاب
آنکھیں قدم سے ملنے لگے دوڑ کر حباب
موجیں بڑھیں برائے قدم بوسیِ جناب
اچھلیں علم کے چومنے کو ماہیانِ آب
لہروں کی بجلیاں جو برابر چمکتی تھیں
کھلتی تھیں اور حبابوں کی آنکھیں جھپکتی تھیں

پانی سے منہ اٹھائے جو تھا اسپ سربلند
ڈھیلا کیا دلیر نے خود جھک کے زیربند
بولا ہلا کے سر کو سمندِ وفا پسند
پیاسا ہی ذوالجناح شہنشاہِ ارجمند
حیواں تو ہوں حضور پہ خوش اعتقاد ہوں
میں بھی تو ابنِ فاطمہ کا خانہ زاد ہوں

فرمایا آپ نے مرے غمخوار مرحبا
ڈگتا نہیں کبھی قدمِ صاحبِ وفا
تو اپنی خانہ زادی کا حق کرچکا ادا
پیشِ خدا بزرگ ہی صابر کا مرتبا
پانی سے ای فرس تجھے جب اجتناب ہو
سیراب کس طرح پسرِ بوتراب ہو

دریا سے مشک بھر کے جو نکلا وہ تشنہ کام
پھر گھاٹ پر گھٹا کی طرح آئی فوجِ شام
تنہا پہ نے وطن پہ ہوا پھر ہجومِ عام
پھر ہر طرف سے چلنے لگے نیزہ و حسام
اک شور تھا کہ بڑھنے نہ دو اس دلیر کو
کشتہ کرو ترائی میں حیدر کے شیر کو

گھوڑا کہیں گھرا کہیں اڑ کر نکل گیا
جو ڈر کے گر پڑا وہ سموں سے کچل گیا
نعروں سے مر گیا کوئی کوئی دہل گیا
صف بچھ گئی ادھر کی جدھر وہ اچھل گیا
مشکیزہ لے کے لاکھوں سے کب تک فغا کریں
کیوں ای بہادرو کہو عباس کیا کریں

برسے جو دس ہزار کمانوں سے تیرِ کیں
وارا بنا کر گیا جو برا برسے اک لعین
مڑ کر نگاہ کی کہ الٰہی یہ کیا ہوا
ٹھنڈا جو ہو گیا علمِ شاہِ دیں پناہ

دانتوں سے پکڑی مشک کہ محنت نہو تباہ
گھوڑے سے ڈگمگا کے بصد یاس گر پڑے
اُٹھ بیٹھے گر کے حضرتِ عباسِ ذی حشم
جھک کر زمیں پہ غش میں جو سنبھلا وہ باکرم

ٹکڑے ہوا جگر اسد ذو الجلال کا
مڑ کر جو فرطِ غیظ سے قاتل پہ کی نظر
جھپکی نہ آنکھ واہ رے دل واہ رے جگر
جوشِ غضب میں خاک پہ بیٹھے تھے شیر سے

شانوں سے سارے جسم کا جب بہ گیا لہو
آواز دی کہ آیئے یا شاہِ نیک خو
خوں میں تڑپ کے یہ غمخوار رہ نجائے
نکلا حرم سرا سے علمدار کا پسر

چہرے کا رنگ اُڑا ہوا کرتا عرق میں تر
شاید خبر نہیں ہے امامِ غیور کو
ڈیوڑھی سے بلبلا کے سکینہ نے یہ کہا
جلدی کسی کو بھیجیے یا شاہِ کربلا

مر جاؤں گی اگر انھیں جیتا نہ پاؤں گی

غربال ہو گیا تنِ عباسِ مہ جبیں
بالائے خاک کٹ کے گرا بازوئے یمیں
اک ہاتھ رہ گیا تھا سو وہ بھی جدا ہوا
عباسِ نامور نے بھری دل سے ایک آہ

مشکیزے پر بھی تیر لگا وامصیبتاہ
پانی کے ساتھ حضرتِ عباس گر پڑے
گھٹنے کے نیچے مشک تھی زانو پہ تھا علم
گرزِ گراں عقب سے پڑا سر پہ بے ستم

سر پاش پاش ہو گیا حیدر کے لال کا
مارا کسی نے تیر دلاور کی چشم پر
تیور جو آئے جھوم کے سنبھلا وہ شیرِ نر
گویا لہو ٹپکتا تھا چشمِ دلیر سے

ریتی پہ تھر تھرا کے جھکے آپ قبلہ رو
سر تن سے کاٹ لینے کے درپے ہیں کینہ جو
صدمہ یہ ہے کہ حسرتِ دیدار رہ نہ جائے
گورے گلے میں ہنسلیاں تھیں کان میں گہر

کی عرض شہ سے ننھے سے ہاتھوں کو جوڑ کر
آقا پدر پکار رہے ہیں حضور کو
ہاں ہاں سنی تھی میں نے بھی عباس کی صدا
اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے مرے چچا

کیونکر چچی کو ہائے یہ صورت دکھاؤں گی

حضرت نے آہ کی کہ لرزنے لگی زمین
اب جلد سر کٹانے کو آئیں امامِ دیں
بڑھنے دیا نہ گھاٹ سے آگے دلیر کو
تیروں سے جسم چھن گیا بازو ہوئے قلم
آئے ہیں یاں پھریرے کے پرزے اُڑا کے ہم
دنیا سے آج اُٹھ گیا حال نشان کا
سُنتے ہی اس صدا کے شکستہ ہوئی کمر
کانپے جو پاؤں تھام لیا بازوئے پسر
خورشید کیوں چھپا ہے یہ کیا واردات ہے
عباس کے پسر سے تو کہدو کہ گھر میں جائے
فضہ ابھی خبر نہ کسی رانڈ کو سنائے
پُرسا تو دوں نجف کی طرف مجکو موڑ دو
یہ روزِ قتلِ حمزہؑ و جعفر ہے ای پسر
یہ ماتم شہادتِ حیدر ہے ای پسر
میرا الم بتول کی جائی سے پوچھیے
غربت میں لُٹ گیا مرا گھر ہائے ہائے
تازہ ہے آج داغ پدر ہائے ہائے
عباس کیا جہاں سے گئے ہم گزر گئے
کرتا تھا عرض باپ کو تھامے ہوئے پسر
زندہ ابھی ہیں حضرتِ عباس نامور
خادم اُٹھائے گا جسد پاش پاش کو

ناگاہ واں سے بڑھ کے پکارے کئی لعیں
کہدے کوئی کہ مر گئے عباس مہ جبیں
کیا گھیر کر کچھار میں مارا ہے شیر کو
افتادہ ہے وہ خاک پہ ٹوٹا ہوا علَم
پانی نہ مشک میں ہے نہ عباس میں ہے دم
کٹتا ہے سر ترائی میں کڑیل جوان کا
تڑپے اُٹھے گرے نہ سنبھالا گیا جگر
چلاتے تھے کہو علی اکبر چلیں کدھر
کچھ سوجھتا نہیں ہمیں دن ہے کہ رات ہے
دیکھو حرم سرا سے سکینہ نکل نہ آئے
اکبر اجڑ گیا مرا گھر ہائے ہائے
سر پیٹتا چلوں گا مرے ہاتھ چھوڑ دو
یوم وفات حضرت شبر ہے ای پسر
صبر اب کہاں یہ داغِ برادر ہے ای پسر
صدمہ جوان بھائی کا بھائی سے پوچھیے
سیدھی نہ ہوگی اب یہ کمر ہائے ہائے
کاٹا گیا چھری سے جگر ہائے ہائے
محسن ہوا شہید حسنؑ آج مر گئے
دل کو ذرا سنبھالیے یا شاہِ بحر و بر
گھبرائیے نہ اب ہے ترائی قریب تر
چلیے حرم میں لے کے بہشتی کی لاش کو

جس دم قریبِ لاش کے لائے حسین کو — عباسِ جاں بلب نظر آئے حسین کو
تڑپا وہ شیر سن کے صدائے حسین کو — اکبر نے ہاتھ اُٹھا کے دکھائے حسین کو
دو کوہ غم کے دل پہ جو اک بار گر پڑے — پہلو میں لاش کے شہِ ابرار گر پڑے

بھائی کی لاش بھائی نے دیکھی جو خوں میں تر — اُمڈا یہ دل کہ منہ کے قریب آگیا جگر
بولے یہ آنکھیں کھول کے عباسِ نامور — اکبر سنبھالو قبلۂ عالم کو بیٹھ کر
صدقے ہزار جان امامِ غیور کے — مجھکو اُٹھا کے گرد پھرا دو حضور کے

منہ مل کے منہ پہ کہنے لگے شاہِ خوش خصال — عباس تم کو نزع میں بھی ہی مرا خیال
ای میرے بھائی جان کہو اپنے دل کا حال — صفدر نے مسکرا کے کہا شکرِ ذوالجلال
آرام آگیا تپشِ روح و دل گئی — آپ آئے کیا کہ دولتِ کونین مل گئی

مولا نزولِ رحمتِ پروردگار ہی — اب آمد آمدِ شہِ دُلدل سوار ہی
شبر کھڑے ہیں راہ میں چشم اشکبار ہی — شاید جنابِ فاطمہؑ کا انتظار ہی
قدسی قطار باندھے ہیں ناقوں پہ نور کے — آتے ہیں باغِ خلد سے نانا حضور کے

کیا بندہ پروری ہی زہے عز و افتخار — لاکھوں برس کی زیست ہی اس موت کے نثار
تھم تھم کے جسم سے جو نکلتی ہی جانِ زار — دُشوار ہی مفارقتِ شاہِ نامدار
کیونکر نہ ایسی مرگ پہ نازاں غلام ہو — ہنگامِ نزع جس کے سرہانے امام ہو

رونے لگے یہ کہہ کے جو عباسِ ذی وقار — فرمایا شہ نے روتے ہو کیوں تم پہ میں نثار
کی عرض اب بدن سے نکلتی ہی جانِ زار — غم ہی کہ آپ اکیلے ہیں یا شاہِ نامدار
تلواریں کھینچ کھینچ کے لشکر جو آئے گا — اب کون ہی جو قبلۂ دیں کو بچائے گا

کیا بے بسی ہی موت سے ای قبلۂ امام — باتیں تو تھیں بہت پہ نہیں طاقتِ کلام
بگڑا ہی دم کی آمد و شد کا بھی انتظام — کچھ ایسی آ بنی ہی کہ مجبور ہی غلام
پاؤں گا اب کہاں میں امامِ غیور کو — جی چاہتا ہی یہ کہ نچھوڑوں حضور کو

گھبرا کے نزع میں علی اکبر سے یہ کہا
میرا تو کوچ ہی طرفِ گلشنِ بقا
گر منع بھی کریں تو اکیلا نہ چھوڑیو
یہ کہہ کے پائے شاہ کی جانب بڑھا یا سر
ٹپکے مژہ سے خون کے قطرے اِدھر اُدھر
من کا جری کا ڈھل گیا بھائی کی گود میں
چلائے سر کو پیٹ کے سلطانِ بحر و بر
بیکس ہوا حسین لٹی دولتِ پدر
فرزند تھا مرا یہ تمھارا غلام تھا
یہ سب شرف ہی تیری غلامی کا ای پسر
جعفر بھی ہیں عقیل و حسن بھی ہیں نوحہ گر
پُرسا تمھیں شہید کا دینے کو آئے ہیں
اُٹھ کر پکارے حضرتِ شبیرِ نامدار
ہی ہی مرا شفیق مرا یار و غمگسار
بھائی کا کیا سفر ہوا میں آپ مر گیا
بازو شکستہ ہو گیا ٹوٹی کمر مری
اب نے خبر ہیں کون رکھے گا خبر مری
کیوں مجھ سے منہ پھرا لیا تقصیر کیا ہوئی
یہ کہہ کے گر پڑے شہِ والا بروے خاک
بیٹا تڑپ گیا کہ پدر ہو گئے ہلاک
تیور چڑھائے گر کے شہِ مشرقین کو

ای شاہزادہ دو جہاں میں ترے فدا
فرزندِ فاطمہ سے خبردار اک ذرا
عمو نثار باپ کو تنہا نہ چھوڑیو
کانپے لہو بھری ہوئی آنکھوں کو کھول کر
کس یاس سے حسین پہ کی آخری نظر
بھائی کا دم نکل گیا بھائی کی گود میں
فریاد ہی کہ مر گئے عباسِ نامور
آئی صدا علی کی کہ شبیر صبر کر
جو حال ہو بجا ہی کہ پیارا غلام تھا
زہرا سرہانے لاش کے روتی ہیں ننگے سر
نانا تمھارے روتے ہیں تھامے ہوے جگر
یہ سب تمھارے بھائی کے ملنے کو آئے ہیں
میں لٹ گیا دوہائی ہی یا شبیر کردگار
خدمت گزار عاشقِ صادق وفا شعار
بچے مرے یتیم ہوئے باپ مر گیا
آنکھیں اُدھر تھیں اس کی جدھر تھی نظر مری
وا حسرتا زرہ مری ہی ہی سپر مری
سب جس سے کانپتے تھے وہ شمشیر کیا ہوئی
تر ہو گئی شہید کے خوں سے قبائے پاک
کرڈالا دستِ غم سے گریباں چاک چاک
چلائی فاطمہ کہ سنبھالو حسین کو

جلدی عبا اُڑھا کے دلاور کی لاش پر
خیمے سے نکلی آتی ہیں رانڈیں برہنہ سر
آیا وہ گر تو ساتھ سکینہ بھی آئے گی
فرمایا شہ نے آپ کا مطلب ہے اس سے کیا
مجھ سے ابھی تو بچھڑے ہیں عباس باوفا
ہے ہے ابھی سے رشتۂ الفت کو توڑ دوں
آواز پھر علی کی یہ آئی کہ اے پسر
ڈیوڑھی پہ غش ہے زوجۂ عباس نامور
صدمے جہان میں نئے پدری کے عظیم ہیں
ناچار لاش چھوڑ کے اُٹھے امامِ دیں
کوتل تھا ساتھ اسپِ علمدارِ مہ جبیں
لٹکی ہوئی تھی تیغ و سپر بھی دلیر کی
ماتھا لہو سے ڈوبا ہوا تھوتھنی فگار
گردن پھرا کے تکتا تھا دریا کو بار بار
خادم برہنہ سر لیے آتا ہے اس طرح
صدمے سے تھی علم کی بھی ٹوٹی ہوئی کمر
پرچم پہ یوں جھکا ہوا پنجہ تھا خوں میں تر
پیدا تھی ہر قدم پہ علامت نشان سے
پہونچے حسین خیمۂ اقدس کے جب قریں
دوڑا تڑپ کے دلبرِ عباس مہ جبیں
کوتل ہے کیوں فرس مرے بابا کدھر گئے

اکبر نے عرض شاہ سے کی ہاتھ جوڑ کر
تنہا کھڑا ہے راہ میں عباس کا پسر
دیکھی چچا کی لاش تو جیتی نہ جائے گی
روئے نہ پیارے بھائی کو مظلومِ کربلا
راحت ہو شمر آکے جو کاٹے مرا گلا
کس پر میں ان کی لاش کو جنگل میں چھوڑ دوں
تو جا کہ میں تو ہوں ترے بھائی کی لاش پر
دونوں غلام زادے تمہارے ہیں نوحہ گر
اک سوگوار رانڈ ہے اور دو یتیم ہیں
مشک و علم کو لے کے چلے اکبرِ حزیں
باگیں کٹی تھیں تیغوں سے ڈھلکا ہوا تھا زیں
پرخوں زرہ سمند پہ رکھی تھی شیر کی
سینہ بھی سب چھنا ہوا گردن بھی تھی خمدار
یعنی پڑا ہے دشت میں تنہا مرا سوار
دُلدل کو لوگ لاتے ہیں مجلس میں جس طرح
چھینٹیں تھیں خوں کی سبز پھریرے پہ سربسر
جس طرح پیٹتا ہے کوئی سوگوار سر
پیٹو کہ اُٹھ گیا مرا لال جہان سے
آگے بڑھے جھکا کے علم اکبرِ حزیں
چلایا کیا غضب یہ ہوا یا امامِ دیں
سر پیٹ کر حسین پکارے کہ مر گئے

یہ سن کے ننگے پاؤں پھرا وہ جگر فگار
مادر پکاری خیر تو ہے تم پہ میں نثار
پانی کو جو سدھارے تھے وہ خوں میں تر ہوئے

پردا الٹ کے خیمے کا فضہ نے دی صدا
لاتے ہیں گھر میں مشک و علم شاہ کربلا
موت آئی ان کو پیاسوں کی تقدیر سو گئی

خیمے میں حشر ہو گیا سنتے ہی یہ خبر
ماتم کی صف پہ بیٹھ گئی کوئی نوحہ گر
ہے ہے کا غل ہوا کہ سکینہ اچھل پڑی

اکبر نے آکے گاڑ دیا صحن میں علم
حضرت پکارے پیٹ کے زانو بدرد و غم
جیتے رہے تھے اس الم و یاس کے لیے

برپا ہوا یہ حشر کہ ہے ہے علی کے لال
بیٹی پچھاڑیں کھا کے جو بابا کی خوش خصال
غش ہو گیا سکینہ کا منہ سانس الٹ گئی

منہ دامن علم سے چھپائے بصد بکا
اس خوں بھرے علم کے میں قربان میں فدا
بابا اکیلے ہو گئے آفت گزر گئی

اللہ رے دل خراش علی کی بہو کے بین
چادر پڑی تھی منہ پہ کہ تھے سامنے حسین
ٹکڑے تھے تیغ غم سے دل سوگوار کے

آیا حرم میں مضطر و نالاں و بے قرار
چلایا چاک کر کے گریبان وہ سوگوار
اماں اڑاؤ خاک کہ ہم بے پدر ہوئے

اے پردے والو ڈیوڑھی سے ہٹ جاؤ اک ذرا
مارے گئے جہاد میں عباس باوفا
ہے ہے علی کی چھوٹی بہو رانڈ ہو گئی

رانڈوں کے دل الٹ گئے تھرا گئے جگر
غش کھا کے گر پڑی کوئی کھولا کسی نے سر
حجلے سے بال کھولے دلھن بھی نکل پڑی

کھولے سروں کو زیر علم آئے سب حرم
لو زینب اپنے بھائی کو رو کے رن میں ہم
رنڈسالہ لاؤ زوجۂ عباس کے لیے

بکھرائے حسین کی بہنوں نے سر کے بال
مٹی پہ لوٹنے لگے اطفال خرد سال
پھیلا کے ننھے ہاتھ علم سے لپٹ گئی

چلاتی تھی کدھر گئے ہے ہے مرے چچا
مشکیزہ کیوں دیا تھا یہ سب ہے مری خطا
ہے ہے یہ پانی مانگنے والی نہ مر گئی

مسکن آسمان و زمیں کو بھی تھا نہ چین
تھامے تھی ہاتھ خواہر سلطان مشرقین
حکم حیا یہ تھا کہ نہ رونا پکار کے

کچھ سوچکر جو ہٹ گئے واں سے امامِ دیں
منہ کرکے سوئے نہر پکاری وہ دل حزیں
جنگل بسادیا شہِ والا کو چھوڑ کے
صاحب سکینہ جان بلکتی ہیں آیئے
صدقے گئی بھتیجی کو پانی پلایئے
الفت کے دلدہی کے منافی نہ چاہیے
کل تھی سہاگن آج تو میں سوگوار ہوں
جانِ علی ہیں آپ تو میں جاں نثار ہوں
جنگل میں چھوڑیے نہ مجھے ہاتھ تھام کے
والی کہاں یہ رانڈ یتیموں کو لیکے جائے
اب گھر سے کام کیا جو رضا سوگوار پائے
کیا اُس کی زندگی ہے وارث سے یاس ہو
ہی ہی علم کے ملنے کی شادی کہوں میں کیا
باہر سے پہلے آکے مرے پاس یہ کہا
صدقے سے شہ کے جعفرِ طیار ہم ہوے
میں نے بلائیں لیکے پس از تہنیت کہا
سردارِ فیض بخش علمدارِ باوفا
کیا کیا نوازشیں ہیں امامِ غیور کی
کہنے تھے شب کو بھر کے دم سرد دم بدم
سو سر خدا جو دے تو نثارِ شہِ اُمم
کل ہم ہیں اور خنجر و شمشیر و تبر ہیں

اُس وقت ہاتھ اُٹھا کے علم کی بلائیں لیں
صاحب حسین روتے ہیں تم کو خبر نہیں
صاحب کدھر چلے گئے آقا کو چھوڑ کے
کانٹے زباں کے دیکھ کے آنسو بہایئے
قربان جاؤں مشک بھری ہو تو لایئے
صادق ہیں آپ وعدہ خلافی نہ چاہیے
بیوہ ہوں جاں بلب ہوں غریب الدیار ہوں
ہاں ناز ہی تو یہ ہی کہ خدمت گزار ہوں
بیٹے ہیں آپ امام کے بھائی امام کے
اِس کربلا نے لوٹ لیا مجکو ہائے ہائے
سر پیٹتی ہوئی لبِ دریا کنیز آئے
میری بھی قبر آپ کی تربت کے پاس ہو
خضر ان کو مل گئے علمِ سبز کیا ملا
تھی جس کی آرزو ہمیں عہدہ وہی ملا
صاحب تمھیں خبر ہی علمدار ہم ہوے
آقا کو اور تم کو سلامت رکھے خدا
بولے یہ سب حسین کی ہی شفقت و عطا
لے آؤ تم بھی جا کے بلائیں حضور کی
تم ہم کو چاہتی ہو تمھیں چاہتے ہیں ہم
گر ہی تو بس تمھاری جدائی کا ہی الم
اس کا بھی غم بڑا ہی کہ بچے صغیر ہیں

کیسی یہ غفلت آج ہے اے شیرِ حق کے لال
بھائی تھی جس کے بالوں کی بو آپ کو کمال
اب وصل کے نہ دن نہ شبِ اشتیاق کی
صاحب تمھیں تو سونے کو ہاتھ آئی خوب جا
میں اور آپ آج کی شب تک نہ تھے جدا
تڑپوں نہ کس طرح کہ نئی واردات ہے
ہے ہے مرے نصیب کہ تم سے بچھڑ گئی
کن راحتوں میں تھی کہ مصیبت یہ پڑ گئی
کیا راہ و رسم ہے یہی دنیا کے رشتے میں
کیونکر کہوں کہ آپ میں مہر و وفا نہ تھی
اتنا گلہ ہے بس کہ یہ غفلت روا نہ تھی
نے وجہ خیر خواہ سے منہ موڑتے نہیں
یوں منہ کو موڑنا تو طریقِ وفا نہیں
کیونکر تمھیں جہاز موافق ہوا نہیں
دیتی ہوں واسطہ میں شہِ مشرقین کا
صاحب تمھیں سکینۂ ناشاد کی قسم
تم کو حسینِ کشتۂ بیداد کی قسم
جب تم نہ ہو تو خاک ہے دنیا کے رشتے میں
یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی سر وہ سوگوار
بھاوج کے ہاتھ تھام کے بولے بحالِ زار
انجام کار سب کے لیے مرگ و گور ہے

بچوں کی اب نہ فکر نہ لونڈی کا ہے خیال
اُس نے تمھارے سوگ میں کھولے ہیں سر کے بال
کیونکر کٹیں گی وحشت میں راتیں فراق کی
دریا کا قرب سرد ترائی خنک ہوا
بستر کو خالی دیکھ کے گزرے گی مجھ پہ کیا
صدقے گئی فراق کی یہ پہلی رات ہے
غم ہے کہ کیوں نہ میں دمِ رخصت بگڑ گئی
والی مجھے بلاؤ کہ دنیا اجڑ گئی
لونڈی تو قید خانہ میں صاحب بہشت میں
میری ہی خاک قابلِ خاکِ شفا نہ تھی
کیا پائنتی بھی اک مری تربت کی جا نہ تھی
ساتھی برا بھی ہو تو اسے چھوڑتے نہیں
صدقے گئی مرا تو کوئی آسرا نہیں
منجدھار میں ہوں ناؤ ہے اور ناخدا نہیں
والی مجھے نباہیے صدقہ حسین کا
صاحب تمھیں مصیبتِ سجاد کی قسم
تم کو ہمارے نالہ و فریاد کی قسم
مجھ کو بھی اپنے پاس بلا لو بہشت میں
ڈیوڑھی پہ آئے روتے ہوئے شاہِ نامدار
بس بس خدا کو یاد کرو اب اے جگر فگار
بی بی خدا سے کیا کسی بندے کا زور ہے

بس اے انیس طول کی آگے نہیں ہے تاب
طاری ہے ضعف دیتی ہے طاقت بھی اب جواب
بلواؤ خاکسار کو یا ابن بو تراب
ڈر ہے کہ ہند میں مری مٹی نہ ہو خراب
جلوہ رہے مزار پہ مولا کے نور کا
خاکِ شفا میں قبر ہو صدقہ حضور کا

رباعی

نا فہم سے کب داد سخن لیتا ہوں
دشمن ہو کہ دوست سب کی سن لیتا ہوں
چھپتی نہیں بوے دوستانِ یکرنگ
کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

رباعی

چل جلد اگر قصدِ سفر رکھتا ہے
تو کچھ بھی مآل کی خبر رکھتا ہے
راحت دنیا میں کس نے پائی ہے
جو سر رکھتا ہے دردِ سر رکھتا ہے

مرثیہ (۱۱)

جس دم حسینؑ دلبرِ شبّر کو رو چکے
غربت میں یادگارِ برادر کو رو چکے
پالا تھا جس کو اُس مہِ انور کو رو چکے
صفدر کو تشنہ لب کو دلاور کو رو چکے
دل پر ہجومِ حسرت و اندوہ و یاس تھا
ایک بھائی اور ایک پسر شہ کے پاس تھا

رعشہ تنِ ضعیف میں لب خشک رنگ زرد
سینے میں گاہ ہوک اُٹھی گاہ دل میں درد
چھینٹیں قبا پہ خون کی تھیں گیسوؤں پہ گرد
خالی پروں کو دیکھ کے بھرتے تھے آہِ سرد
غم تھا کہ ابنِ فاطمہ آفت میں کیا کرے
اب ہم سے دیکھیے کسے قسمت جدا کرے

بھرتے تھے آہ سرد کبھی تھام کر جگر
روتے تھے گاہ زانوئے آقا پہ رکھ کے سر
تکتے تھے مسکرا کے کبھی جانبِ پسر
کرتے تھے یاس سے کبھی عباس پر نظر
وہ نونہال اور یہ پھولے پھلے ہوئے
حضرت کی ایک گود کے دونوں پلے ہوئے

ماتم ادھر تھا فوج کے باجوں کی دھوم اُدھر
یاں بیکسی تھی فوجِ عدو کا ہجوم اُدھر
باہم تھے سرکشانِ رے و شام و روم اُدھر
زر بانٹتا تھا خود پسرِ سعدِ شوم اُدھر
ہر شخص نعمتوں سے اُدھر کامیاب تھا
گرمی میں تین روز سے یاں قحطِ آب تھا

عباس چاہتے تھے کہ پہلے ہوں میں نثار
اکبر کا عزم تھا کہ بس اب سر ہے تن پہ بار
بھائی کے غم میں روتے تھے آقائے نامدار
عموں سے پہلے جائیں ہمیں بہرِ کارزار
جاتا ہے وقت ہاتھ سے گر اب فدا نہ ہوں
حضرت یہ چاہتے ہیں کہ دونوں جدا نہ ہوں

اُٹھتا ہے اہلبیت سے جب شورِ العطش
شہ کہتے ہیں قریبِ ہلاکت ہیں فاقہ کش
کرتے ہیں عرض رو کے علمدار باہوش
شاید سکینہ جان کو پھر آگیا ہے غش
کس سے کہیں جو قلب پہ صدمے گزرتے ہیں
افسوس ہم تو جیتے ہیں معصوم مرتے ہیں

دیکھا ہی جب سے لاشۂ قاسم کو پائمال — چھریاں جگر پہ چلتی ہیں یا شاہِ خوش خصال
گر قبلۂ اُمم سے ملی رخصتِ جدال — دشتِ نبرد کو ابھی کر دیں لہو سے لال
روکے غلام کو یہ کسی کا جگر نہیں — دریا نہ چھین لیں تو علی کے پسر نہیں

جا ہیں جدھر لہو کی اُدھر ندیاں بہائیں — ظالم کسی پرے میں سلامت نظر نہ آئیں
کاسے سروں کے ٹھوکریں اک اک قدم پہ کھائیں — مشکیزہ بھر نہ لیں تو نہ منہ آپ کو دکھائیں
چھوٹے نہ تیغ ہاتھ سے جب تک کہ دم رہے — چھاتی پہ مرتے وقت بھی مشک و عَلَم رہے

شہ نے کہا کہ اس میں کسی کو ہی کیا کلام — تم غیظ میں جو آؤ تو ہل جائے روم و شام
بھائی مگر یہ غیظ و غضب کا نہیں مقام — میری تو یہ دعا ہی کہ ہو صابروں میں نام
پہلے مروں میں تم نہ اگر سدِ راہ ہو — مجکو نہیں قبول کہ امت تباہ ہو

بولے بہا کے اشک علمدارِ نامدار — ہل من مبارز کی ہی اس فوج میں پکار
یاں ایک شاہزادہ ہی اور ایک جاں نثار — آخر حضور دیں گے کسے اذنِ کارزار
دیکھیں تو آپ اُن کے نشانوں کے اوج کو — اتنا تو ہو کوئی کہ نہ بڑھنے دے فوج کو

شہ نے کہا انھیں بھی تو ہی شوقِ جنگ کا — غازی نے کی یہ عرض کہ یا شاہِ کربلا
اچھا جہاد کی علی اکبر کو دی رضا — انصاف کیجیے مجھے خلقت کہے گی کیا
کس منہ سے پاس جاؤنگا خیرالانام کے — جب شاہزادہ قتل ہو آگے غلام کے

بانو کی روح جسمِ شہِ بے وطن کی جان — دنیا کی زیب آلِ رسولِ زمن کی جان
چھوٹے بڑوں کی آنکھوں کا تارا بہن کی جان — پامال ہو وہ گل جو ہی سارے چمن کی جان
اُس زندگی پہ خاک اگر ایکدم جئیں — ہم شکلِ مصطفیٰ تو نہ ہو اور ہم جئیں

شہ نے کہا کہ پھر مجھے کھانے دو تیغ و تیر — تم سا جوان قتل ہو جیتا رہے یہ پیر
تم یادگارِ شیرِ خدا شاہِ قلعہ گیر — ہم صورتِ رسولِ خدا یہ مہِ منیر
سمجھے ہو سہل تم نے مجھے مشکل ہی کیا کروں — دو داغ اور ایک میرا دل ہی کیا کروں

تم ہو گئے تو تباہ نہ ہوگا ہمارا گھر
عابد کو بیڑیاں نہ پنہائیں گے اہلِ شر
عریاں نہ ہوں گے بلوے میں سیدانیوں کے سر
زینب کو شام میں نہ پھرائیں گے دربدر
بچ جائیں گے سنبھوں کے گلے ریسماں سے
بُندے نہ پھر چھنیں گے سکینہ کے کان سے

کہنے لگے یہ رو کے علمدارِ ذی حشم
میرا ہے افتخار نگہبانیِ حرم
کرتے ہیں گر سپرد یہ عہدہ شہِ اُمم
بہتر ہے پھر کسی کو عنایت ہو یہ علم
نام و نشاں سے کام نہ دنیا سے کام ہے
مجکو رضائے سیدِ والا سے کام ہے

سمعاً و طاعةً ہمیں کیا آبرو سے کام
کچھ عرض کی مجال نہ تکرار کا مقام
بہتر ہے بیڑیاں بھی پہن لے گا یہ غلام
کھولوں سلاحِ جنگ اجازت جو دیں امام
آقا کریں عتاب نہ گر جاں نثار پر
جا بیٹھوں منہ چھپا کے علی کے مزار پر

رونے لگے یہ سن کے شہنشاہِ بحر و بر
عباس آئے خیمہ کے اندر جھکائے سر
سیدانیاں یہ کہنے لگیں تھام کر جگر
کیا ہے جو روتے آئے ہیں عباسِ نامور
اکبر کی خیر ہو شہِ والا کی خیر ہو
یارب وطن میں فاطمہ صغرا کی خیر ہو

سب بی بیاں تھیں گردِ علمدارِ نامدار
جو پوچھتا تھا اور یہ روتے تھے زار زار
کہتی تھی رو کے زوجۂ عباسِ ذی وقار
صاحب کہو تو کچھ کہ میرا دل ہے بے قرار
آنکھوں سے اشک بہتے ہیں چہرہ بھی لال ہے
مقتل میں کیا ہوا جو تمھارا یہ حال ہے

لیکر بلائیں کہتی تھی بانوئے شاہِ دیں
بھیا بتاؤ خیر سے ہیں اکبرِ حزیں
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ مہ جبیں
ہے خیریت حضور نہ گھبرائیں کچھ نہیں
کرتا نہیں مدد کوئی لاکھ التجا کریں
جو بانصیب ہوں وہ نہ روئیں تو کیا کریں

بنتِ علی کے پاس جو پہونچا وہ سیم بر
ماتم کی صف پہ رکھ دیے ہتھیار کھول کر
گھبرا کے بولی زینبِ ناشاد و نوحہ گر
عباس کیا ہے کھولتے ہو کس لیے کمر
اب تو کوئی لڑے گا نہ بیکس امام سے
کیوں بھائی صلح ہو گئی کیا فوجِ شام سے

روئے کی وجہ کیا ہے اُلجھتا ہے میرا دم
قاسم کے غم میں کیا ہوا کچھ اور تازہ غم
بہتے ہیں اشک نرگسی آنکھوں سے دم بدم
بولو تو کچھ حسین کے سر کی تمھیں قسم
آخر کھلے گا سب پہ کوئی واردات ہو
مجھ سے الگ کہو جو چھپانے کی بات ہو

کہنے لگی یہ زوجۂ عباس خوش خصال
وہ کونسی ہے بات کہ جس کا ہے یہ ملال
قسمیں جناب دیتی ہیں تم کو نہیں خیال
صاحب بڑی بہن سے کہو اپنے دل کا حال
صدقہ انھیں کا سب ہے کہ پھولے پھلے ہیں ہم
بیٹوں کی طرح گود میں ان کی پلے ہو تم

قدموں پہ سر جھکا کے یہ عباس نے کہا
کیونکر نہ روؤں قتل ہوئے خویش و اقربا
ہے اب کفیل کوئی نہیں آپ کے سوا
مجھکو حسین مرنے کی دیتے نہیں رضا
ہے اب نہیں خیال شہِ خاص و عام کو
دیجے نجف میں جانے کی رخصت غلام کو

فرماتے ہیں کہ اکبر مہ رو وغا کو جائیں
بچے ہوں کامیاب شہادت ہمیں نہ پائیں
دیکھیں انھیں شہید یہ دل ہم کہاں سے لائیں
پردہ اسی میں اب ہے کہ عالم سے منہ چھپائیں
کب اُٹھ گئے جہاں سے کسی کو خبر نہ ہو
اُس بن میں جا رہیں کہ بشر کا گزر نہ ہو

زینب نے تب کہا کہ یہ آزردگی ہے لو
معلوم اب ہوا مجھے مطلب ہے ان کا جو
کیونکر کہوں کہ بھائی کو مرنے کا اذن دو
اچھا بلا کے کہتی ہوں لگے جو ہو سو ہو
رونا اِدھر۔ اُدھر کو غریبی و یاس ہے
ان کا بھی درد ہے مجھے اُن کا بھی پاس ہے

مشکل مجھے ہے کس سے کہوں اپنا حالِ زار
وہ ماں کی جان و روح یہ بابا کی یادگار
بیکس بہن سے پوچھے کوئی بھائیوں کا پیار
کیونکر جئیں گے ہائے شہنشاہِ نامدار
کہتے ہیں موت خلق میں سب اس جدائی کو
یارب مفارقت نہ ہو بھائی سے بھائی کو

زاری ادھر تھی اور پریشاں تھا سب کا حال
آیا اُدھر حسین کو عباس کا خیال
ہمشکل مصطفےٰ سے یہ بولا علی کا لال
آزردہ ہو گئے ہیں علمدارِ خوش خصال
بیتاب دل ہے چھاتی سے لپٹائیں بھائی کو
آؤ حرم میں چل کے منا لائیں بھائی کو

اکبر کا ہاتھ تھام کے گھر میں حسین آئے
پھیلا کے ہاتھ لب پہ شہِ دیں سخن یہ لائے
تم تو عزیز ہو مجھے اس نورِ عین سے

عباس ہاتھ جوڑ کے بولے کہ کیا مجال
کیا ذکر ہے ملال کا اے فاطمہ کے لال
حضرت غلام کہہ کے پکاریں تو شاد ہوں

حضرت کے منہ کو دیکھ کے زینب نے یہ کہا
صدقے بہن ہو بھائی انھیں دیجیے رضا
مثلِ علی جہاں کے شجاعوں کے تاج ہیں

وہاں ہے وغا طلب سپہ خانماں خراب
حضرت کے ڈر سے دے نہیں سکتے ہیں کچھ جواب
بگڑیں تو پھر بپا ہو قیامت جہان میں

اکبر کو آپ بھیجتے ہیں سوئے فوجِ شام
مطلب یہ ہے کہ فوج پہ چمکے مری حسام
پہلے ہمیں حسین پہ سر کو فدا کریں

نیت سفر پہ باندھی ہے ہتھیار کھول کر
کیا آپ نے کہا تھا کہ اکبر کٹائے سر
میرے حواس ان کے تڑپنے سے کھوئے ہیں

کیونکر زباں سے اپنی کہوں ہیں جگر فگار
حضرت پہ ان کے دل کا تو مطلب ہے آشکار
صفدر ہیں جان دینے کو کچھ جانتے نہیں

دیکھا کھڑے ہیں حضرتِ عباس سر جھکائے
آؤ گلے لگو کہ دلِ زار چین پائے
کس بات پر خفا ہوئے بیکس حسین سے

ہیں شیرِ کبریا کی جگہ شاہِ خوش خصال
عاجز ہوں شکر میں جو زباں سب ہوں تن کے بال
مادر مری کنیز ہے میں خانہ زاد ہوں

آپ ان پہ شیفتہ ہیں یہ ہیں آپ پر فدا
دنیا میں اور بھی ہے کوئی ایسا باوفا
ظاہر ہے آپ پر کہ یہ نازک مزاج ہیں

ان کو کسی کی بات کے سننے کی کب ہے تاب
غصہ بھی ہے اور یہی ان کو پیچ و تاب
رونا یہ ہے کہ آتا ہے فرق آن بان میں

ہو جائیں دشمن ان کے تڑپ کر ابھی تمام
دنیا میں مجھ سے بڑھ کے نہ ہوئے کسی کا کام
پالا ہے دکھ سے اب انھیں کیونکر جدا کریں

بہنوں کی بیکسی پہ بھی اب تو نہیں نظر
مجکو کبھی یقیں نہیں یا شاہِ بحر و بر
روئی ہوں میں بھی ساتھ یہ جس طرح روئے ہیں

ضد ہے یہی کہ جلد ملے اذنِ کارزار
خیر اب خوشی انھیں کی کریں شاہِ نامدار
غصے میں یہ تو بات کوئی مانتے نہیں

شہ نے کہا کہ بس ہی اسی بات کا ملال
قسمت میں ہی کہ یہ بھی نہ ہو وقتِ انتقال
قاتل ہو زخمی چھاتی پہ خنجر ہو پیاس ہو

ہم چاہتے ہیں ساتھ جئیں ساتھ ہی مریں
تلواریں کھا کے ایک جگہ خون میں بھریں
مشتاق ہیں بہشت کے حوروں کے قصر کے

سب اہلِ بیت رونے لگے سُن کے یہ کلام
تقصیر بخشئیے مری ای شاہِ تشنہ کام
بھائی سے دل بُرا کہیں ہوتا ہی بھائی کا

لائیں سلاح سامنے زینب بچشمِ تر
تسلیم کی ادب سے جری نے جھکا کے سر
غم چھا گیا امید چلی یاس رہ گئی

لیکر علم اُدھر سے بڑھا وہ فلک جناب
گھوڑے پہ جلوہ گر جو ہوئے مثلِ آفتاب
اسوار بے نظیر فرس بے مثال تھا

آمد علی کے شیر کی ہی رزم گاہ میں
ہر چند ابھی سواریِ صفدر ہی راہ میں
غل ہی وہ شیر قصد کیے ہی ترائی کا

یوں چھیڑتے فرس کو اُس آفت کے بن میں آئے
اس دبدبے سے لشکرِ پیماں شکن میں آئے
جنگل کے شیر صورتِ آہو دبک گئے

لیں اذنِ جنگ خیر سدھاریں پئے جدال
تنہا مسافرت میں مرے فاطمہ کا لال
کٹنے لگے جو حلق تو کوئی نہ پاس ہو

مرنے لگیں جو ہم تو یہ زانو پہ سر دھریں
خبر ان کی جو خوشی یہی پہلے سفر کریں
یہ قبل ظہر پہونچیں گے ہم بعد عصر کے

قدموں پہ شہ کے جھُک کے یہ بولا وہ نیک نام
چھاتی سے سر لگا کے یہ کہنے لگے امام
یہ روٹھنا فقط تھا بہانہ جدائی کا

پٹکا اُٹھا کے شہ نے کہا باندھیے کمر
ہتھیار سج کے خیمہ سے نکلا وہ نامور
بس سر جھُکا کے زوجۂ عباس رہ گئی

خادم اُدھر سے لائے فرس کو بصد شتاب
نورِ قدم سے چاند بنے حلقۂ رکاب
جو نعل کا نشاں تھا زمیں پر ہلال تھا

دہشت سے تہلکہ ہی عدو کی سپاہ میں
بجلی چمک رہی ہی عدو کی نگاہ میں
پھر معرکہ ہی آج علی کی لڑائی کا

جیسے نسیمِ فصلِ بہاری چمن میں آئے
اک شور پڑ گیا اسد اللہ رن میں آئے
جتنے بڑھے ہوئے تھے پرے سب سرک گئے

اللہ رے رعبِ حضرتِ عباسِ عرش جاہ
صف پر گریں صفیں تہ و بالا ہوئی سپاہ
دیکھا جدھر شکار پہ کی شیر نے نگاہ
ہٹ ہٹ گئے جو نہر کو روکے تھے روسیاہ
کھایا نگہ کا تیر اگر آنکھ چار کی
دکھلا دی ابروؤں نے برش ذوالفقار کی

کاندھے پہ ساتھ مشک و علم پشت پر سپر
وہ تیغ تیز دم میں جو کر دے ہم کو سر
وہ تیر الحفیظ کماں وہ کہ الحذر
وہ ضربِ گرز توڑ دے جو کوہ کی کمر
وہ ڈھال روک لے جو تہمتن کے وار کو
نیزہ وہ جو فرس سے اٹھا لے سوار کو

سر پر وہ خود گرد پھرے جس کے آفتاب
نورِ جبیں سے بدرِ فلک قدر کو حجاب
بیت ابروؤں کی حسن کے دیواں میں لاجواب
جو خالِ مشکبیز کا نقطہ وہ انتخاب
مرجائے شیر پر جو پڑے اُس ولی کی آنکھ
آنکھوں کو دیکھیے تو بعینہٖ علیؑ کی آنکھ

قرآن و رحل روئے مبین و خطِ سیاہ
ظلمت میں آفتاب ہے یا جوفِ شب میں ماہ
سونگھے لبوں پہ برگِ گلِ تر کا اشتباہ
مدح دہن میں اب نہیں ملتی سخن کو راہ
ایسا دقیق اور معمّا کہیں نہیں
موجود اسم ہے پہ مسمّا کہیں نہیں

کیونکر کہیں کہ غنچۂ تصویر ورد ہے
یاں یاسمن بھی فرطِ خجالت سے زرد ہے
کس طرح منقسم ہو وہ جوہر جو فرد ہے
حیراں خیالِ فلسفی ہرزہ گرد ہے
میزانِ عقل میں حکما کے تلا نہیں
یہ وہ طلسم ہے جو کسی سے کھلا نہیں

دانتوں میں وہ چمک کہ نظر کو نہیں ہے تاب
خود جس کی برق و شرق تلے کا ہس کو حجاب
کیا ان کے سامنے گہرِ بے بہا کی آب
دعوے ہو کچھ تو واں بھی دنداں شکن جواب
گر منہ سے دُر کہوں تو فصاحت سے دور ہے
دانا کو آبرو کی حفاظت ضرور ہے

شانوں کو آفتاب اگر کیجیے رقم
ذرے سے آفتابِ جہاں تاب یاں ہے کم
لو کاٹتا ہے غیظ سے اپنی زباں قلم
یہ وہ ہے جس پہ فوجِ خدا کا رہا علم
کون ایسا نوجواں تھا خدا کے ولی کے بعد
بیشک علم انہیں کے لیے تھا علیؑ کے بعد

شانے وہ گول گول وہ بازو بھرے بھرے
فرقت میں جن کی حور نہ تکیہ پہ سر دھرے
پہنچوں کے زور سے تہ و بالا ہوں پرے
پنجہ وہ جس کو دیکھ کے شیر ژیاں ڈرے
ضو اُن ہتھیلیوں کی کہاں آفتاب میں
وہ اُنگلیاں در ایسی جو خیبر کے باب میں

سینہ وہ آئینہ ہے کہ صدق و صفا کا گھر
مسکن ادب کا علم کا ماخذ حیا کا گھر
سینے میں اس طرح ہے دل باوفا کا گھر
جس طرح سب گھروں میں مقدس خدا کا گھر
کعبہ ہے گو زمیں پہ مگر عرش قدر ہے
دل صدر میں ہے صدر جہاں ہے وہ صدر ہے

قربان ہیں ثبات قدم پر ہزار سر
رکھتا ہے فخر جس پہ بصد افتخار سر
اعدا جو لاکھ ہوں تو کریں ایک بار سر
سر کیں نہ اور کٹ کے گریں بے شمار سر
نقش اس قدم کا خاک پہ رہتا ہے اس طرح
مٹتا نہیں کبھی خطِ تقدیر جس طرح

ناگہہ صدا بلند ہوئی طبلِ جنگ کی
جو تھے بہادر اُن کے دلوں میں اُمنگ کی
نکلے نقیب اور یہ صدا بے درنگ کی
باگیں اُٹھاؤ اسپ کمیت و سرنگ کی
نامی جواں وہ ہے جو لڑے ابن شیر سے
اب سامنا ہے شیر الٰہی کے شیر سے

جب یوں بڑھائے دل تو سواروں کے دل بڑھے
گرز اپنے تول تول کے لشکر کے بل بڑھے
ہر صف سے یوں اُڑے ہوئے نیزوں کے پھل بڑھے
جس طرح قبض روح کو دستِ اجل بڑھے
تنہا تھا وہ صفیں تھیں بہم جس کے واسطے
یہ معرکہ تھا اک متنفس کے واسطے

اُلٹی علی کے شیر نے بھی آستیں اِدھر
قبضے پہ ہاتھ اُدھر گیا کانپی زمیں اِدھر
ظاہر ہوا جلالِ جہاں آفریں اِدھر
آیا جلال میں اسدِ خشمگیں اِدھر
صف پر جو صف گری تو پیادے سوار پر
گویا علی نے ہاتھ رکھا ذوالفقار پر

یوں تیغِ شعلہ نا نکل آئی نیام سے
نکلی بیاضِ صبح شبِ تیرہ فام سے
جس طرح برقِ ابر سے معنی کلام سے
چہرہ دکھایا حور نے دارالسلام سے
آئینہ ظفر تھا کہ نکلا غلاف سے
کھینچا پری کو فخرِ سلیمانی قاف سے

چمکی جو تیغ برق جہندہ بنا سمند — آہو جو خاک پر تو ہوا کی طرف پرند

خود آگ تھا وہ رخش تو سیماب جوڑ بند — اسوار کو چھپالے وغا میں وہ سربلند

ہر نعل و سم کو فوق تھا بدر و ہلال پر — طاؤس و کبک وجد میں تھے اُس کی چال پر

گھوڑا کہیں پرند کسی جا پری کہیں — آہو کہیں ہما کہیں کبک دری کہیں

تیرو نے اُس سے رو میں نہ کی ہمسری کہیں — نرمی کہیں شتاب کہیں صفدری کہیں

رکھتا تھا معرکہ میں قدم اس وقار سے — جیسے چمن میں پھول گرے شاخسار سے

کلک اس کے ہاتھ پاؤں کو لکھے تو کیا لکھے — مردم ہوا پرست کہیں گر ہوا لکھے

خودنے سعادتی ہی جو بالِ ہما لکھے — مشہور نارسا ہو جو ذہن رسا لکھے

ناقص کہیں جو طالبِ تشبیہ تام ہیں — یہ سب اُسی کی غاشیہ داری کے نام ہیں

پریاں نثار ہوتی ہیں چال اُس کی دیکھیے — حوروں کے بال دیکھ کے بال اُس کے دیکھیے

سرعت دمِ جدال و قتال اُس کی دیکھیے — کیا حسن ہی رکاب و دوال اس کے دیکھیے

روشن ہیں پتلیاں کہ قدم اُس جری کے ہیں — آنکھیں یہ حور کی ہیں وہ گیسو پری کے ہیں

آغازِ جنگ میں وہ تک و دو وہ آؤ جاؤ — گھونگھٹ نیا تھا چال نئی تھی نیا بناؤ

جاتا تھا یوں اُتار ہو رستے میں یا چڑھاؤ — جیسے ہوا میں جاتی ہی آبِ رواں پہ ناؤ

تھا صاحبِ عَلَم بھی جدل پر تُلا ہوا — کشتی کا بادباں تھا پھریرا کھلا ہوا

ڈھالوں کو روکتے تھے جوانانِ پُر جگر — بجلی گری پڑے گی تو پھر کیا کرے سپر

وہ اُڑ گئیں کلائیاں دھڑ سے گرا وہ سر — بازو ہوا وہ قطع وہ دو ہو گئی کمر

وہ آتش فساد و غضب خاک ہو گئی — سینہ وہ کٹ گیا وہ زرہ چاک ہو گئی

جب سن سے وہ چلی تو گرے سر زمین پر — سر تھے کسی جگہ کہیں پیکر زمین پر

وہ تیغ دم نہ لے کہیں دم بھر زمین پر — جبریل بھی بچھائیں اگر پر زمین پر

فتح و ظفر حسامِ دو دستی کے ساتھ ہی — دستِ خدا کے جوشنِ بازو کا ہاتھ ہی

وہ برق جب ادھر سے اُدھر جا کے پھر گئی
خوں پی کے سر گرا کے صفیں کھا کے پھر گئی

لے جان سے کیا اُسے تڑپا کے پھر گئی
تھی اک چھری کہ حلق پہ اعدا کے پھر گئی

چڑھتے ہی رن پہ نشۂ جرأت اُتر گئے
دیکھا نہ صاف منہ اسی حسرت میں مر گئے

یوں تھیں صفیں کہ موج کے پیچھے ہو جیسے موج
تھا دم بدم شناور دریائے خوں کو اوج

چکر میں تھی بصورت گرداب ساری فوج
تلوار فرد فرد کو کرتی تھی زوج زوج

بیدم ہیں وہ جو تیغ دو دم سے دو چار ہیں
گر چار ہیں تو آٹھ جو دو ہیں تو چار ہیں

غصہ ستم تھا قہر غضب تھا جفا نئی
اُڑنے لگے سر تنوں سے چلی تھی ہوا نئی

مضموں نئے ہیں بندشِ مہر و وفا نئی
تیزی نئی ہر چال نئی ہر ادا نئی

جیسے مگس ہوا سے پرے یوں اُلٹتے ہیں
سو سو گلے اشارۂ ابرو میں کٹتے ہیں

فوجوں میں ابتری تھی علی کے طفیل سے
سیفی سے صاف تیز دعائے کمیل سے

جوہر کہیں فزوں تھے ضیا میں سہیل سے
ہاتوں بڑھے ہوئے تھے روانی میں سیل سے

نازل تھا قہر منزلِ ہستی خراب تھی
گھر گر رہے تھے کفر کے بستی خراب تھی

اعدا کے حق میں ہو گیا تھا آبِ حسام سم
کرتے تھے آہوؤں کی طرح خوش خرام رم

نیزے تھے خوف سے صفتِ چوبِ خام خم
ایسا لڑا جہاں میں کوئی تشنہ کام کم

دشمن بھی معترف تھے وہ بیکار کر گئے
مقتل سے اُڑ کے تا سرِ کہسار سر گئے

اک آگ تھی کہ خاک میں سب کو ملا گئے
سم ہو گیا اُسے جسے پانی پلا گئے

آئے جدھر زمین کے طبقے ہلا گئے
زخموں کے پھول نخلِ بدن پہ کھلا گئے

تیروں کو بلبلوں کا نشیمن بنا دیا
رن کی زمینِ شور کو گلشن بنا دیا

رہوار پھر رہا تھا طرارے اِدھر اُدھر
سب بھاگتے تھے خوف کے مارے اِدھر اُدھر

اُڑتے تھے اُس کے دم سے شرارے اِدھر اُدھر
دنبالہ دار گرتے تھے تارے اِدھر اُدھر

دریا پہ ہاتھ دھوئے تھے سب اپنی جان سے
تلوار کیا برستی تھی آگ آسمان سے

شمشیر زن کے ہاتھ میں دستِ خدا کا زور
پہونچا تھا ہاتھوں ہاتھ جسے مرتضیٰ کا زور
کس بل غضب کا قہر کی ضربت بلا کا زور
نعرہ یہ تھا کہ مجھ میں ہے مشکلکشا کا زور
مرحب سا اتنی فوج میں اک نامور نہیں
کیونکر کھلے یہ زور کہ خیبر کا در نہیں

حسرت رہی وغا کی دلِ حق پسند کو
کھولا نہ ایک نے مرے نیزہ کے بند کو
پستی میں لاؤں اوج سے کس سربلند کو
خندق میں عمر ہو تو اڑاؤں سمند کو
دو ٹکڑے کردوں رستم و سیاں سے گیو کے
پٹکے سے باندھوں مثلِ علی ہاتھ دیو کے

جم کر لڑو صفوں کی صفائی تو دیکھ لو
گردن کی اور سروں کی جدائی تو دیکھ لو
ابن علی کی قلعہ کشائی تو دیکھ لو
پیاسے مسافروں کی لڑائی تو دیکھ لو
سرسبز ہوں میں تیغِ دودم سرخرو رہے
تم کو ہوس رہے نہ مجھے آرزو رہے

ہر بار رن پہ رن پڑے ایسی نبرد ہو
ہنگامہ گرم ہو کے نہ بازار سرد ہو
تھرائے آسماں رخِ خورشید زرد ہو
بڑھنے نہ دو مجھے تو یہ جانوں کہ مرد ہو
بالائے دوش مشک ہے تلوار ہاتھ میں
دریا کا گھاٹ لیتا ہوں دو چار ہاتھ میں

یہ سن کے واں کی فوج سے اک پہلوان بڑھا
گویا کہ جھومتا ہوا پیلِ دماں بڑھا
نیزہ بڑھا ادھر سے ادھر سے نشاں بڑھا
پنجہ اٹھا کے صید پہ شیرِ ژیاں بڑھا
دیکھا جو نعرہ مار کے اس بدخصال کو
سمجھے یہ سب اسد نے دبوچا غزال کو

نیزہ ادھر ادھر سے بصد کر و فر تُلا
باندھا ادھر جو بند شقی نے ادھر کھلا
ہوتا ہے کیا ہزار کرے فوج غلغلہ
یہ موج بحرِ قہر وہ پانی کا بلبلہ
تھی چوٹ پر جو چوٹ تکاں پر تکان تھی
نیزہ میں نوک تھی نہ کلائی میں جان تھی

جوڑا بچا کے سر کو ستمگر نے رہ سے تیر
تھرا رہا تھا شورِ تکبیر و یدہ سے تیر
زخمی ہوا نہ صدر نہ گذرا زرہ سے تیر
گوشے کماں کے کٹ گئے ٹوٹا گرہ سے تیر
سرزد خطا یہ کیا ہوئی ششدر شریر تھا
اوچھے سے وار میں نہ کماں تھی نہ تیر تھا

ظالم پکارا تول کے پھر گرز گاوسر — اس کی ہوا لگے تو سلامت بچا و سر
ممکن نہیں کہ خاک پر گر کر اٹھا و سر — ہاں نورِ چشم حیدرِ صفدر بچا و سر
رستم سا پہلوان ہو تو جی اس کا چھوٹ جائے — ایک اس کی ضرب میں کمرِ کوہ ٹوٹ جائے

عباس نے کہا کہ خموش او زبان دراز — گو میں ضعیف ہوں پہ توانا ہے کارساز
اللہ خاکسار کو کرتا ہے سرفراز — کیا گرز گاوسر کی حقیقت ہے او گراز
برہم اگر ہوں لال شہ قلعہ گیر کے — پھینکیں زمیں پہ کلہ اژدر کو چیر کے

نے شرم راست بازوں سے یہ کج ادائیاں — کیا تجھ سے گاوزور سے زور آزمائیاں
نیکوں سے یہ بدی یہ بھلوں سے برائیاں — ہم توڑ ڈالتے ہیں اسد کی کلائیاں
ضیغم دبک کے بیشۂ حیدر میں آتے ہیں — یاں کے غزال شیر کو آنکھیں دکھاتے ہیں

مارا جھپٹ کے گرزِ گراں روسیاہ نے — روکا سپر پہ ضرب کو اس دیں پناہ نے
پکڑی کلائی ہاتھ سے بازوے شاہ نے — چھوٹی نہ لاکھ زور کیا روسیاہ نے
نقصان جان بھی دست درازی کے ساتھ ہو — چھوڑے نہ گرز کو تو نہ بازو نہ ہاتھ ہو

جب پھٹ کے انگلیوں سے ٹپکنے لگا لہو — پہنچا سزا کو میں یہ پکارا وہ کینہ جو
بولے یہ ہاتھ جوڑ کے عباس نیک خو — پھر کیجیو نہ لاف زنی میرے روبرو
تو ہاتھ جوڑتا ہے تو منہ موڑتا ہوں میں — صیدِ زبوں سمجھ کے تجھے چھوڑتا ہوں میں

یہ گھاٹ چھین کر ہمیں بھرنی ہے مشکِ آب — تڑپا رہا ہے قلب کو بچوں کا اضطراب
تلوار جلد کھینچ لے او خانماں خراب — رکنا ہے کیوں لڑائی کا ہو فیصلہ شتاب
مشکلکشا کی تیغ کا یہ فیضِ عام ہے — جب چار ہاتھ چل گئے قصہ تمام ہے

جب اس طرح سے چل گئے تیغِ زباں کے وار — تیغِ دو دم کو تول کے آیا وہ نابکار
رو کر کے چند وار صدا دی کہ ہوشیار — شمشیر سر پہ آئی کہ مرحب پہ ذوالفقار
سب غول چار آئنہ والوں کا دنگ تھا — سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ تنگ تھا

دو ہو گیے منہ کے بھل جو گرا وہ ستم شعار
بس سرنگوں گیا سوے دوزخ وہ نابکار

گو آپ کی ہی تیغ میں آفت کا کاٹ ہے

غازی پکارا بڑھ کے ہمارے قدم ہٹیں
ممکن نہیں کہ صاحبِ سیف و قلم ہٹیں
سر کے ہیں نہیں قدم کبھی آگے بڑھے ہوئے

دریا یہ کیا ہے اور تمھاری بساط کیا
یہ گھاٹ کیا ہے قہر ہو تو کیا رباط کیا
اُڑنے کو پر ملیں گے اگر تیر کھائیں گے

رکھیں گے تیغ تیز کے قبضے پہ ہاتھ جب
دریا ہے جن کے جد کا وہ بچے ہیں تشنہ لب
ہتھیار کیا ہیں فوج کے جی چھوٹ جائیں گے

اعدا جمے سنبھال کے ہتھیار گھاٹ پر
آئی چمک کے برقِ شرربار گھاٹ پر
اعدا ہزار ڈھالوں میں منہ کو چھپاتے تھے

جھپٹے مثالِ شیر جدھر صف اُلٹ گئی
جو فوج مثلِ موج بڑھی تھی وہ ہٹ گئی
اللہ کا غضب تھا کہ تلوار ہاتھ میں

بجلی تھی یا کہ تیغ کا پرتو ادھر اُدھر
چلتے تھے تھم کے وقت تگ و دو ادھر اُدھر
عنصر بھی تھے شریکِ دمِ تیغ لاگ میں

عباس سوے نہر بڑھے بہرِ کارزار
نیزے اُٹھا اُٹھا کے یہ کہنے لگے سوار
بڑھیے ذرا سنبھل کے یہ تیغوں کا گھاٹ ہے

تیغیں ہٹیں نشان ہوں سلامی عَلم ہٹیں
دریا سے تم ہٹو یہ نہ ہوگا کہ ہم ہٹیں
اُترے ہیں شیر پیر کے دریا چڑھے ہوئے

ثابت قدم کو تیغوں کا ڈر کیا صراط کیا
جب جان دی تو جسم کی پھر احتیاط کیا
کوثر پہ اب تو ہم اسی دریا سے جائیں گے

کھل جائے گا اشارے میں بند و بست سب
سر لوٹتے پھریں گے جو ٹوکا کسی نے اب
یہ مورچے بندھے ہوئے سب ٹوٹ جائیں گے

ڈھالیں نہ تھیں گھٹا تھی دھواں دھار گھاٹ پر
چلنے لگی دلیر سے تلوار گھاٹ پر
کیا وار تھا کہ ناریں سر اُڑکے جاتے تھے

یہ ہاتھ تن سے اُڑ گیا وہ ڈھال کٹ گئی
دیکھا جو گھاٹ تیغ کا جرات بھی گھٹ گئی
دریا کا گھاٹ لے لیا دو چار ہاتھ میں

مر کر سوار گرتے تھے سو سو ادھر اُدھر
ہل چل تھی بیچ میں تو روا رو ادھر اُدھر
پھینکا ہوا نے خاک میں پانی نے آگ میں

ہر بار اُڑ کے جاتا تھا چاروں طرف سمند
تلوار نے گریز کے کوچے کیے تھے بند
گھوڑوں سے گر کے پست ہوئے کتنے سربلند
دریا میں گر کے مر گئے کتنے جفا پسند
صف پر گری تھی صف تو پرے بھی پروں پہ تھے
دو پاؤں تھے زمیں پہ اور دوسروں پہ تھے

اللہ ری سمند کی چھل بل لڑائی میں
تلوار چل رہی تھی مسلسل لڑائی میں
بجلی تھی یا چمکتی تھی ہیکل لڑائی میں
پھٹ پھٹ گئے تھے ڈھالوں کے بادل لڑائی میں
بھاگے ہیں شہسواروں کی ہوا چھٹ گئے
جی چھوٹے گھاٹ چھٹ گیا ہتھیار چھٹ گئے

جس سمت تیغ تیز چلی سر پہ سر گرا
خوں ناریوں کا اُڑ کے مثالِ شرر گرا
بھائی پہ بھائی باپ پہ مر کر پسر گرا
چمکی جو دو طرف یہ ادھر وہ اُدھر گرا
کشتوں کے پشتے ہو گئے ضرب دلیر سے
عرصہ فرس پہ تنگ تھا لاشوں کے ڈھیر سے

بجلی تھی سر پہ یا چمک اُس شعلہ ریز کی
یارا نہ جنگ کا تھا نہ طاقت گریز کی
زہرے تھے آب تاب کسے تھی ستیز کی
گھاٹ اُس طرف تھا باڑھ ادھر تیغ تیز کی
ہٹ کر بشکل امن نہ بڑھ کر نجات تھی
آگے لہو کی نہر تھی پیچھے فرات تھی

ساحل پہ تیغ تول کے گونجا وہ شیر نر
جو ہم کو روکتی تھیں وہ فوجیں گئیں کدھر
توڑا ہے ایک ہاتھ سے خیبر کا ہم نے در
کرتے ہیں مرتضیٰ کے پسر یوں ہم کو سر
ہم سے مقابلہ تھا اسی کائنات پر
یہ مورچے تھے چیونٹیاں تھیں یا فرات پر

جن کو نہ دو دو دن ہو بہم قوتِ لایموت
اُن کے جواب میں یہ تحیر ہی یہ سکوت
زرہیں تھیں یا کہ موم کچھ اب تک نہیں ثبوت
حلقے یہ تھے کمند کے یا تارِ عنکبوت
ثابت نہیں غبار تھے یہ یا عمود تھے
پانی پہ حباب تھے یا سر پہ خود تھے

تینوں نے کچھ نہ کاٹ دکھایا نہ کس بل
نیزے وہ کیا ہوئے جو تلے تھے دمِ جدل
پرزے کہاں ہیں اُن کے جو ڈھالیں تھیں بدل
کیا برچھیوں نے غیر مذلت دکھائے پھل
سر اُن کے کس طرف کو سنانیں کدھر گئیں
وہ تیر کیا ہوئے وہ کمانیں کدھر گئیں

ترشے عرق میں ہاتھ میں تھی تیغِ خوں چکاں
بولے یہ کانپ کے عباسِ نوجواں
بس اے صبا جہاں کی فضا ہے قفس ہمیں
ساحل سے نہر میں جو گیا وہ فلک حشم
پانی میں جلوہ گر تھا جو عکسِ رخِ علم
آئی صدا درود کی ہر نخل و سنگ سے
عباسِ نامور جو کیے تھے لبوں کو بند
گردن پہ ہاتھ پھیر کے بولا وہ ارجمند
با آبرو مزا ہے سوئے خلد جانے میں
چھینٹیں جو منہ پہ دینے لگا وہ فلک وقار
پانی گیا جو منہ میں تو میں ہونگا شرمسار
آقا لہو جگر ہے سکینہ کے حال پر
مشکیزہ بھر کے رخش کو آواز دی کہ چل
آئے تھے گھاٹ تک بڑھے برچھیوں کے پھل
گھیرے تھے لوگ اُن کی راہیں بھی بند تھیں
اک شور تھا کہ شیر دلاور نہ جانے پائے
فرزند فاطمہ کا برادر نہ جانے پائے
پھر ہے ظفر یزید کی گر یہ شہید ہو
نعرہ کیا جری نے کہ ہم رُکنے والے ہیں؟
ابتر کیا تھا جن کو وہی یہ رسالے ہیں
پستی کو ڈھونڈھتی ہے بلندی نشانوں کی

ٹھنڈی ہوا کچھار سے آئی جو ناگہاں
واحسرتا کہ دھوپ میں ہیں شاہ انس و جاں
پانی کی آرزو نہ ہوا کی ہوس ہمیں
دوڑے حبابِ بحر کہ آنکھوں پہ یہ قدم
تھے مہر و ماہ آئنۂ آب میں بہم
دریا زبرجدی تھا پھریرے کے رنگ سے
پانی پہ ڈالتا تھا نہ منہ اسپِ سربلند
احسنت اے سمندِ رضا جو وفا پسند
تیری وفا کا شور رہے گا زمانے میں
گردن ہلائی اُس نے کہ یہ بھی ہے ناگوار
پیاسا ہے ابن فاطمہ کا طفل شیر خوار
فاقہ یہ تیسرا ہے محمد کی آل پر
یاں منتظر تھی راہ کو روکے ہوئے اجل
تیغوں پہ تیغیں فوج پہ تھی فوج دل پہ دل
نیزے تُلے ہوئے تھے کمانیں بلند تھیں
سقائے اہلبیتِ پیمبر نہ جانے پائے
ہاں نورِ عین ساقیِ کوثر نہ جانے پائے
عباس کے گلے کو جو کاٹیں تو عید ہو
یہ دیکھے بھالے سب ہیں جو بھالے سنبھالے ہیں
ثابت ہوا کہ دن ابھی ڈھالوں پہ کاٹے ہیں
شاید ابھی کبھی یہ ہے قسمت کمانوں کی

اس وقت سب جہان مجھے مل کر تو روک لے
فوجیں تو آئیں سامنے لشکر تو روک لے
دیوارِ تیغ و نیزہ و خنجر تو روک لے
تم کیا ہو مجھکو سدِ سکندر تو روک لے
آیا ہوں جاں بلب کئی بچوں کو چھوڑ کر
حائل پہاڑ ہو تو نکل جاؤں توڑ کر

فرما کے یہ فرس کو بڑھایا دلیر نے
دریا لہو کا دم میں بہایا دلیر نے
شیرِ خدا کا زور دکھایا دلیر نے
پٹکا زمیں پر جسے پایا دلیر نے
یوں توڑ ڈالیں نیزوں کی ڈانڈیں مروڑ کے
جس طرح پھینک دے کوئی تنکے کو توڑ کے

ہتھیار پھینک پھینک کے بھاگے شریر سب
چوٹیں پڑیں کہ بھول گئے دار و گیر سب
کٹ کٹ گئے ملے ہوئے چلوں سے تیر سب
چھپتے تھے سہم سہم کے برنا و پیر سب
تھیں برچھیاں پھریروں کی طرح اُڑ رہی ہوئی
ڈھالوں میں منہ چھپاتی تھیں تیغیں مڑی ہوئی

جس دوش پہ تھی مشک اُسی ہاتھ میں علم
سینہ سپر تھی کوندتی تھی تیغ برق دم
برسا رہے تھے تیروں کا مینہ بانیِ ستم
رکتے نہ تھے مگر کہیں عباس ذی حشم
کیا شیر دل سوار تھا کیا راہوار تھا
جب باگ اُٹھائی فوج کی حلقوں کے پار تھا

لشکر یزید کا تھا کہ دریائے بے کنار
پیدل جو گر پڑے تو بڑھے جنگ کو سوار
بھاگے جو وہ تو آئے کنارے پہ نیزہ دار
نیزے قلم کیے تو چلے برچھیوں کے وار
کیونکر مہم یہ سر ہو اک آفت نصیب سے
پلے سے تیر چلتے تھے نیزے قریب سے

فوجوں سے اس تباہی میں لڑتے ہوئے جو آئے
مجبور ہے بشر جو نہ مہلت اجل سے پائے
تلواریں سر پہ لگ گئیں پہلو پہ تیر کھائے
غازی کے ہاتھ کٹ گئے شانوں سے ہائے ہائے
پانی بہا تو جان چلی زور گھٹ گیا
دانتوں سے مشک چھوٹ گئی دم اُلٹ گیا

غش سے فرس پہ جھک کے جو سنبھلا وہ دیں پناہ
مارا کسی نے دیدۂ حق بیں پہ تیر آہ
سر پہ لگا جو گرز تو حالت ہوئی تباہ
رہوار سے گرا پسرِ ضیغمِ الٰہ
اُٹھ بیٹھتے ہیں لوٹ کے یوں ارضِ پاک پر
جس طرح زخمی شیر تڑپتا ہے خاک پر

اِک شور تہنیت کا ہوا فوج میں اُدھر
تلوار ٹیکتے ہوئے دوڑے جو ننگے سر
نے ہاتھ تھامے پاؤں بڑھانا محال تھا

بھائی کا داغ درد جگر تین دن کی پیاس
فرماتے تھے پسر سے ٹھہر کر بدر دو یاس
بتلاؤ اب کہ حال ہمارا تباہ ہے

دم چڑھ گیا ہے سانس اُکھڑتی ہے دم بدم
دُنیا سے کھو گئے ہمیں عباس ذی حشم
سب گھٹ گیا ہے خوں جو میرا رنگ زرد ہے

دم توڑتا ہے نہر پہ شاید وہ مہ لقا
کس وقت میں بچھڑ گیا ہم سے وہ باوفا
ڈھونڈے گی اُن کو روح اگر مر بھی جاؤں گا

پہونچے ترائی میں جو شہِ دیں بصد تعب
بازو کٹے تھے خون میں ڈوبا تھا جسم سب
آنکھوں سے نزع میں بھی رواں جوے اشک تھی

سینے پہ مُنہ کو رکھ کے پکارے شہِ زمن
اے میرے شیر اے مرے جرّار صف شکن
مرتے ہیں ہم جلا دو ہمیں منہ سے بول کے

غازی نے آنکھیں کھول کے دیکھا رخِ امام
کروٹ جو لی کراہ کے کانپا بدن تمام
مانند بوے گل دمِ آخر گزر گیا

یاں بارِ غم سے ٹوٹ گئی شاہ کی کمر
تھاما پسر نے بازوے شبیرِ نوحہ گر
جس طرح بے قرار ہو بسمل یہ حال تھا

ضعفِ بصر شکستہ کمر منتشر حواس
اکبر کدھر ہے لاشۂ عباسِ حق شناس
رستہ پہاڑ ہو گیا کیا سخت راہ ہے

صدمے سے بیٹھا جاتا ہے دل کیا اُٹھیں قدم
سیدھا ہوں کس طرح یہ برادر کا ہے الم
دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے

یہ کہتی کراہنے کی اُسی شیر کی صدا
دو بھائیوں کو موت بھی آئی نہ ایک جا
پیدا نہ باپ ہوگا نہ بھائی کو پاؤں گا

سقاے اہلِ بیت نظر آئے جاں بلب
دم توڑتے تھے ہچکیاں لے لیکے ہے غضب
پرخوں علم پہ ہاتھ تھا چھاتی پہ مشک تھی

حاضر ہوا برادرِ مظلوم و بے وطن
آزردہ ہو کے دیر میں پہنچا یہ خستہ تن
دیکھو تو حال بھائی کا آنکھوں کو کھول کے

اینٹھی تھی یہ زباں کہ نہ کچھ ہوسکے کلام
آنا تھا ہچکیوں کا کہ تھا موت کا پیام
منزل پہ بوجھ رکھ کے مسافر گزر گیا

بھائیٔ جواں جو مر گیا بھائی کے سامنے
حضرت سے عرض کی پسرِ تشنہ کام نے
ماتم بپا نہ ہو جسدِ پاش پاش پر
فرمایا شاہ نے کہ برادر کو رو تو لوں
سقاے اہلِ بیتِ پیمبر کو رو تو لوں
صبر آئے کس طرح ابھی تازہ جدائی ہے
مر جائے بھائی اور نہ بھائی بکا کرے
چھاتی پھٹے اگر نہ گریباں قبا کرے
مرتے ہی اس کے رشتۂ الفت کو توڑ دوں
ناگاہ در سے خیمے کے فضہ نے دی صدا
کیسا یہ غل ہے نہر پہ اے شاہِ کربلا
تن کانپتا ہے ضعف سے ہاتھوں میں پاتھ ہے
یہ شور سن کے لاش سے اٹھے امامِ دیں
چلائی رو کے عاشقِ عباسِ مہ جبیں
چھائی ہوئی ہے کیسی اداسی نشان پر
لائے علم جو خیمے میں سلطانِ بحر و بر
دیکھا جو اس علم کا پھریرا لہو میں تر
سر پیٹتی تھی کوئی کوئی خاک اڑاتی تھی
چلاتے تھے حسین کہ غم خوار مر گیا
توت تھی جس سے ہاے وہ جرار مر گیا
اب کون آفتوں میں رکھے گا خبر مری

پٹکا زمیں پہ سر سے عمامہ امام نے
چلیے اب اہلِ بیتِ محمد کو تھامنے
نکلی سکینہ گر تو سب آئیں گی لاش پر
مظلوم کو شہید کو صفدر کو رو تو لوں
عاشق کو نیے وطن کو دلاور کو رو تو لوں
اولاد باپ کی ہے برابر کا بھائی ہے
غربت میں ہو یہ جس پہ مصیبت وہ کیا کرے
میری بھی موت اب تا بہن جلد ہی خدا کرے
گودی میں جو پلے اسے جنگل میں چھوڑ دوں
دریا سے کس طرف گئے عباسِ باوفا
گھر سے نکل پڑی ہے سکینہ برہنہ پا
عباس کا پسر بھی سکینہ کے ساتھ ہے
مشک و علم کو لیکے چلے اکبرِ حزیں
ہے ہے علم تو آتا ہے میرے چچا نہیں
کیا بن گئی ارے مرے عمو کی جان پر
رابت کے ساتھ ساتھ تھے بچے برہنہ سر
سیدانیاں زمیں پہ گریں تھام کر جگر
ہے ہے کا شور تھا کہ زمیں تھرتھراتی تھی
زینب ہمارا یارِ وفادار مر گیا
سقاے آلِ احمدِ مختار مر گیا
سیدھی نہ ہو گی قبر میں بھی اب کمر مری

غش جس جگہ تھی نوجۂ عباسِ نوجواں
سب مل کے اُس کو زیرِ علم لائیں بی بیاں
بکھرا کے سر کے بال پکاری وہ خستہ جاں
لوگو بتاؤ لاشِ علمدار ہے کہاں
پوچھو بلائیں لیکے شہِ تشنہ کام کی
کیا وجہ ہے کہ لاش نہ لائے غلام کی

بولی یہ رو کے بانوئے بیکس بدردِ غم
وہ کر گئے تھے آپ وصیت بہ مرتے دم
چلائی سر کو پیٹ کے وہ کشتۂ الم
صاحب ترستے رہ گئے دیدار کو بھی ہم
مرتے ہوئے نہ چاند سی صورت دکھا گئے
کس بات پر کنیز سے صاحب خفا گئے

خاموش اب انیس کہ اک حشر ہے بپا
مجلس میں چار سمت ہے اک شورِ مرحبا
کر حق سے ہاتھ اُٹھا کے بصد عجز یہ دعا
یارب دکھاوے روضۂ سلطانِ کربلا
اچھی نہیں مریض کو دوری مسیح سے
حسرت یہ ہے کہ روؤں لپٹ کر ضریح سے

رباعی

رعبِ شہِ ذی جاہ سے تھرّاتے ہیں
سب طرز غلامانہ بجا لاتے ہیں
آداب یہ ہے کہ تعزیہ خانے میں
آتے ہیں تو جھک جھک کے علم آتے ہیں

رباعی

شاہانِ جہاں سب ہیں گدائے حیدر
ہے ابرِ کرم دستِ سخائے حیدر
یعقوب و خلیل و یوسف و آدم و نوح
سب کی مشکل میں کام آئے حیدر

مرثیہ ۱۲

جب لشکرِ خدا کا علَم سرنگوں ہوا
سقائے اہلِ بیتِ نبی غرقِ خوں ہوا
ڈوبا لہو میں چاند شہِ مشرقین کا
یارب کوئی جہان میں اسیرِ محن نہ ہو
ماں باپ سے جدا کوئی گل پیرہن نہ ہو
بھائی بچھڑ چکا ہے شہِ مشرقین سے

طاقت تھی جس سے شہ کو سفر کر گیا وہ شیر
پیاسا جہان سے لبِ کوثر گیا وہ شیر
غم آ گیا کمر میں شہِ خوش خصال کی
لشکر میں شادیاں تھیں اُدھر غم تھا اس طرف
امید اُدھر تھی یاس کا عالم تھا اس طرف
کمریں کسے ہوئے تھا زمانہ جدال پر

مرنا جوان بھائی کا اور اس پہ یہ ستم
اعدا صفیں جمائے ہوئے جنگ پر بہم
نرغے میں اُن کے سبطِ رسالت پناہ تھا
نہ پاس انھیں نبی کا نہ مطلق خدا کا ڈر
باتوں میں نرم دل میں بدی طینتوں میں شر
پیدا تھا کفر شرم و حیا ناپدید تھی

اِک شور تھا کہ خانۂ دیں بے ستوں ہوا
سیدانیوں میں اور تلاطم فزوں ہوا
خالی کیا اجل نے بھرا گھر حسین کا
جنگل میں گھر لٹا کے کوئی بے وطن نہ ہو
پھولا پھلا اُجاڑ کسی کا چمن نہ ہو
اب نوجواں پسر کی ہے رخصت حسین سے

جس سے مزاجیات کا تھا مر گیا وہ شیر
سقائی کر کے خون میں خم دھر گیا وہ شیر
تصویر مٹ گئی اسدِ ذوالجلال کی
ساماں وہاں تھا جشن کا ماتم تھا اس طرف
اعدا میں عید تھی تو محرم تھا اس طرف
کیا وقت پڑ گیا تھا محمد کے لال پر

پرسا نہ دلدہی نہ تشفی نہ درد و غم
ہنستے تھے سوگواروں کے رونے پہ دم بدم
مشرب میں جن کے پانی کا دینا گناہ تھا
قرآں سے نے وقوف حدیثوں سے بے خبر
بدکار و بدخصال و بدافعال و بدگہر
سادات ذبح ہوتے تھے اور ان کو عید تھی

کیسے وہ کلمہ گو تھے تعجب کا ہی مقام
اسلام اگر یہی ہی تو اسلام کو سلام
کس جا چھپینگے روزِ عدالت ضرور ہی
یا منتقم ظہور امامِ زماں دکھا
آنکھیں ہیں منتظر رُخِ آرامِ جاں دکھا
دشمن رہے نہ ایک شہِ مشرقین کا

اولاد والے دل میں کریں اک ذرا خیال
بیٹا وہ نوجواں جسے اٹھارھواں ہی سال
ماں باپ کے لیے تو اجل کا پیام ہی
بھائی وہ مر چکا ہی کہ تھا جس کے دم سے گھر
اب طالبِ رضائے وغا ہی جواں پسر
پیری میں اس جوان کو بھی کھوئیں تو کیا کریں

قابو ہی اب جگر پہ نہ ہی دل پہ اختیار
ماں باپ سے پسر کو چھوڑائے نہ کردگار
راحت ہی گر گلوے پدر پر چھری چلے
بڑھتا ہی ہاتھ جوڑ کے جب شہ کا نورِ عین
فرماتے ہیں کہ سنتے ہو سیدانیوں کے بین
بھائی جہان سے جانبِ خلدِ بریں گئے

بیکس پھوپھی کو گھر میں تمھارا ہی انتظار
چھوٹی بہن پکارتی ہی تم کو بار بار
ہم کوئی دم میں آبِ دمِ تیغ پیتے ہیں

کافر بھی لیتے ہیں تو کراہت سے اُن کا نام
کُھل جائے گا کھنچے گی جو کل تیغِ انتقام
ہم دور ہیں نہ وہ نہ قیامت ہی دور ہی
اب دم لبوں پہ ہی درِ امن و اماں دکھا
پھر برقِ ذوالفقار کو آتش فشاں دکھا
اُس دن غلام سوگ اتاریں حسین کا

ہوتی ہی کیسی الفتِ فرزندِ خوش جمال
کیا ہوگا نورِ چشمِ رسولِ خدا کا حال
دشمن بھی رونے لگتے ہیں یہ وہ مقام ہی
سیدھی ابھی ہوئی نہیں ٹوٹی ہوئی کمر
نوکوں میں برچھیوں کی ہی شبیر کا جگر
کیوں منصفو کہو جو نہ روئیں تو کیا کریں

یہ مرحلہ وہ ہی کہ ہیں صابر بھی بے قرار
زخمِ سنان و تیغ گوارا یہ ناگوار
جو ہو سو ہو مگر نہ جگر پر چھری چلے
خیمے کو تکنے لگتے ہیں منہ پھیر کر حسین
عباس کے الم میں یہ برپا ہی شور و شین
پرسے کو بھی چچی کے تم اب تک نہیں گئے

دھڑکے سے ماں کے دل کو نہیں ایک دم قرار
دیکھ آؤ اپنے چاہنے والوں کو میں نثار
یہ چند دم تمھارے بھروسے پہ جیتے ہیں

اصغر کو دیکھو عابدِ مضطر کی لو خبر
سمجھاؤ بی بیوں کو کہ پیٹیں نہ اپنا سر
رانڈوں کے تم پسر ہو یتیموں کے تم پدر
گھر تھامتے ہیں باپ کا ذی مرتبہ پسر
کس کو یہ داغ پیرِ فلک نے دیا نہیں
سر پر کسی کے باپ ہمیشہ جیا نہیں

تم سے بھی کم تھے عمر میں جب ہم ہوئے یتیم
ماں بھی نہ تھی یہ اور تھی اک آفتِ عظیم
ہم دونوں بھائیوں کے جگر غم سے تھے دونیم
پر ہر بلا میں حافظ و حامی رہا کریم
رانڈوں کو یہ الم ہے کہ منہ موڑے جاتے ہیں
ہم نوجہاں ہیں تم سا پسر چھوڑے جاتے ہیں

کنبے کی جان باپ کا اقبال گھر کا نور
یوسف جمال صاحبِ توقیر ذی شعور
جرّار و بردبار و دلاور سخی غیور
آنکھوں کی روشنی جگر و قلب کا سرور
خرد و کلاں کو اجرِ زیارت حصول ہے
تم ہو تو اہلِ بیت میں گویا رسول ہیں

نعمت ہے زیست خلق میں ایسے سعید کی
پیارا ہے نورِ رخ سے ضیا صبحِ عید کی
تھی سب کو آرزو رخِ روشن کے دید کی
تصویر ہو رسولِ خدا کے حبیب کی
کیونکہ جدا نگاہ سے بیٹا کریں تمھیں
آنکھیں یہ چاہتی ہیں کہ دیکھا کریں تمھیں

راحت کے دن ہیں آمدِ فصلِ شباب ہے
پہلا ابھی کتابِ جوانی کا باب ہے
اٹھارھویں برس کا بھلا کیا حساب ہے
نے حاشیہ ابھی ورقِ آفتاب ہے
نقطے ہیں خال کے خطِ عنبر فشاں نہیں
بابا نثار ہو ابھی پورے جواں نہیں

اکبر تمھاری قدر نہیں ہے کسی کو آہ
اس حسن کا بشر نہیں کوئی خدا گواہ
ہوتے جو لوگ احمدِ مرسل کے خیر خواہ
تم کو سمجھتے ثانیِ پیغمبرِ الٰہ
آنکھوں پہ رکھتے فخر سے نعلینِ پاک کو
اکسیر جانتے انھیں قدموں کی خاک کو

جینے کی اب خوشی ہے نہ دنیا کی ہے ہوس
ہے دل کو شوقِ آبِ دمِ تیغ ہر نفس
بچھڑینگے تم سے گر ہے تو صدمہ یہی ہے بس
جیتے تو کرتے بیاہ تمھارا اسی برس
دولھا بنا کے شانِ شہانی بھی دیکھتے
طفلی تو دیکھی حسنِ جوانی بھی دیکھتے

پھولو پھلو کہ زینب باغ جہاں ہو تم
شاداں رہے گی روح کہ راحت رساں ہو تم
گر ہم نہیں تو خانۂ زہرا میں تم رہو
اکبر کا رنگ اُڑ گیا سُنتے ہی یہ کلام
فرزند ارجمند ہیں سجاد نیک نام
اس امر سے فزوں کوئی شرمندگی نہیں
بندے ہزار ہم سے نثار سر حضور
روشن جو ہے جہان اسی دم کا ہے ظہور
ظلمت زدائے خلق شہ دیں کی ذات ہے
رونق زمیں کی ہے کہ امام زماں ہیں آپ
بہر جہاں ہیں باعث امن و اماں ہیں آپ
فردوں کی ابتری ہے جو دفتر کشانہ ہو
افضل ہے کون سبط رسالت مآب سے
سرسبز ہے زراعت عالم سحاب سے
چھٹ کر رہے باپ کے پیارے کہاں رہیں
دم سے حضور کے ہے غلاموں کی ہست و بود
اے چشمۂ عطا و کرم بحر فیض و جود
سب خلق شاہ دیں سے طلبگار عون ہے
پھر زیست کیا کرے وہ جو بعد آپ کے جیے
غیروں نے آج پائے مبارک پہ سر دیے
اب پنجتن کا خاتمہ ہے کوئی آن میں

آخر ہے عمر پیر ہیں ہم نوجواں ہو تم
مرنے کے بعد باپ کا نام و نشاں ہو تم
اب زندگی یہی ہے کہ دنیا میں تم رہو
کی عرض ہاتھ جوڑ کے شہ سے کہ یا امام
اکبر تو ہے حضور کا ادنیٰ سا اک غلام
آقا کے بعد موت ہے یہ زندگی نہیں
دُنیا ہو اور آپ ہوں اے کبریا کے نور
ذرہ ہر اک ہے نور قدم سے چراغ طور
دنیا میں آفتاب نہ ہو جب تو رات ہے
سایہ ہے جس کا عرش پہ وہ آسماں ہیں آپ
شیرازۂ صحیفۂ کون و مکاں ہیں آپ
کیونکر تھمے جہاز اگر نا خدا نہ ہو
دُنیا میں ہے تو یہ برکت ہے جناب سے
ذروں کی زندگی ہے فقط آفتاب سے
جب آسماں نہ ہو تو ستارے کہاں رہیں
مولا ہیں اس جہاں میں در رحمت و ودود
دریا اگر نہ ہو تو حبابوں کی کیا نمود
جب نوح غرق خوں ہو تو کشتی کا کون ہے
کھائے غم اور خون جگر عمر بھر پیے
بچپن سے ہم نے باندھی ہے تلوار کس لیے
پھر بھی یہ معرکہ کبھی ہوگا جہان میں

سب بھائی بند قتل ہوئے رن میں تشنہ لب — حضرت مجھے بچاتے ہیں کیوں اس کا کیا سبب
خادم کو بھی سعادتِ عقبیٰ کی ہے طلب — دیجیے رضا جہاد کی بہرِ رسولِ رب
کہیے نہ یہ کہ ساتھ نہ دو تشنہ کام کا
منہ سے نکل پڑے گا کلیجہ غلام کا

سینے میں دل لرزتا ہے جینے کے نام سے — زندہ وہی ہے پہلے مرے جو امام سے
سیراب ہونے دیجیے شہادت کے جام سے — آقا یہ بوجھ اُٹھ نہ سکے گا غلام سے
دیکھے گا کون لوٹنے فوجیں جو آئیں گی
خادم سے بیڑیاں کبھی پہنی نہ جائیں گی

عابد خدا کے فضل سے ہیں صابروں میں فرد — مظلوم پر دبا رغم انگیز اہلِ درد
سہ لینگے وہ یتیمی و غربت میں گرم و سرد — ہم اور کام کے نہیں لایق بجز نبرد
وہ آلِ مصطفےٰ کا مدار المہام ہو
جو ہو پسر امام کا خود بھی امام ہو

خوں میں نہا کے گر نہ ہوا آج سُرخ رو — پھر کس کو مُنہ دکھاؤنگا یا شاہِ نیک خو
چمکا رہے ہیں برچھیاں میداں میں جنگ جو — غصے سے جوش کھاتا ہے اب جسم کا لہو
کس سے کہوں اگر نہ کروں عرض آپ سے
بیٹے کی آبرو متعلق ہے باپ سے

طے ہو یہ مرحلہ جو کریں پرورش حضور — خلدِ بریں بعید نہ باغِ ارم ہے دور
کوشش میں اس طرف سے تو مطلق نہیں قصور — اے آفتاب ذرہ نوازی ہے اب ضرور
نہ زندگی نہ جاہ و حشم چاہتا ہوں میں
آقا کی اک نگاہِ کرم چاہتا ہوں میں

ماں کا پھوپھی کا پیار ہے اب حق میں میرے زہر — امداد کا مقام ہے اب یا امامِ دہر
آبِ فرات کی نہیں اب تشنگی میں لہر — جنت میں شہد و شیر کی خالق دکھائے نہر
مٹی ملے تو سبطِ پیمبر کے ہاتھ سے
پانی پیوں تو ساقیِ کوثر کے ہاتھ سے

دیجیے رضائے حرب کہ مرتا ہے اب غلام — خیمے میں چلیے لیکے مجھے یا شہِ انام
چپ ہو رہینگی سُن کے پھوپھی آپ کے کلام — بن جائے گا زباں کے ہلانے میں میرا کام
مانے گا وہ ادب سے جو صابر ہے اہل ہے
مشکل کشا کے لال کو ہر امر سہل ہے

بولے بہلکے اشک شہنشاہِ نامور
سچ ہی بھلا تمھیں مرے دل کی ہی کیا خبر
اس معرکے سے جو نہیں واقف وہ آپ ہیں
کھوتا ہی اس کو کوئی بڑھاپے کی ہو جو آس
صابر وہ ہر بلا میں ہیں جو ہیں خدا شناس
مشہورِ خلق بیٹے کا اور ماں کا پیار ہی
بولا یہ ہاتھ جوڑ کے فرزندِ نیک نام
تنہا یہاں نہ چھوڑے گا حضرت کو یہ غلام
کرتے ہو رحم حال پہ مظلوم باپ کے
فرما کے یہ چلے طرف خیمہ شاہِ دیں
پہونچا قریب در جو محمد کا نازنیں
لوگو بلاؤ اکبرِ یوسف جمال کو
بنتِ علی کے پاس ہی بانو بھی بے حواس
زینب سے عرض کرتی ہی رو کر وہ حق شناس
کہتی ہیں چین اب مجھے دم بھر نہ آئے گا
فضہ نکل کے خیمے سے باہر خبر تو لا
سنتی ہوں میں کہ شاہ سے ہیں طالبِ رضا
چلیے نہیں پھوپھی کو نہ پھر پائیے گا آپ
بیٹے سے مڑ کے کہنے لگے شاہِ بحر و بر
نازک ہی عورتوں کا دل ای غیرتِ قمر
ان کو ہی اور فکر تمھیں کچھ خیال ہی

مرنے کی تم کو ماں سے دلائے رضا پدر
پوچھو یہ اس سے جس کا جوان ہو کوئی پسر
بیٹا ہمارے حق بطرف ہی کہ باپ ہیں
ہم میں تو بات کرنے کے مطلق نہیں حواس
اچھا یہی خوشی ہی تو جاؤ پھوپھی کے پاس
طی ہو یہ مرحلہ بھی تو پھر اختیار ہی
خیمے میں چلیے ساتھ مرے یا شہِ انام
آنسو بہلکے کہنے لگے شاہِ تشنہ کام
پھر کون ساتھ دے گا مرا بعد آپ کے
گردن جھکائے ساتھ تھا فرزندِ مہ جبیں
تھم کر سنا تو کہتی ہیں یہ زینبِ حزیں
کیوں رن میں اتنی دیر لگی میرے لال کو
بیٹے میں جان پیاس سے لب خشک جی اداس
کڑھتے نہ ہونگے اکبرِ مہرو پدر کے پاس
نکلوں گی خود اگر علی اکبر نہ آئے گا
آنے میں دیر کیوں ہوئی یہ ماجرا ہی کیا
پوچھیں تو کہیو نزع میں ہی بنتِ مرتضا
جب دم نکل چکے تو چلے جائیے گا آپ
کیوں گفتگو پھوپھی کی سنی تم نے ای پسر
ماں کی ابھی رضا نہیں اور پیٹتی ہیں سر
رخصت وہ دینگی مرنے کی جن کا یہ حال ہی

آساں اسے سمجھتے ہو تم اے پدر کی جاں
اظہار ماں سے مرنے کی رخصت کا الاماں
بتلائیے گرے گا جو یہ غم کا آسماں
کیونکر جیے گی زینبِ ناشاد و ناتواں
تم زندگی ہو دخترِ شبیر اللہ کی
کیسی رضا وہاں تو دعائیں ہیں بیاہ کی

ہم کو نہ ساتھ لیکے چلو بہرِ کردگار
اچھا ہمیں نظر نہیں آتا مآلِ کار
پردہ اُٹھا کے شہ سے یہ بولا وہ ذی وقار
چلیے تو آپ خیمے میں با شاہِ نامدار
دامانِ ابن فاطمہ پر ہاتھ چاہیے
مشکل ہو جب تو عقدہ کشا ساتھ چاہیے

زینب جو بیحواس کھڑی تھی قریبِ در
اکبر کا روئے پاک اُنھیں آگیا نظر
جلدی بلائیں لیکے پکاری وہ نوحہ گر
صدقے پھوپھی اس آنے کے اے غیرتِ قمر
خوشبو مہک رہی ہے رسالت مآب کی
ڈیوڑھی میں روشنی ہے مرے آفتاب کی

اکبر نے کی یہ عرض کہ حاضر ہوا غلام
حضرت کو لیکے آیا ہوں اے آسماں مقام
مژدہ سُنا جو یہ تو پکاری وہ تشنہ کام
آنکھوں پہ فرق پر قدمِ قبلۂ انام
رونا مرا سُنا تھا تو گھبرا کے آئے ہو
صدقے تو ہوں کہ تم مرے بھائی کو لائے ہو

ڈیوڑھی میں آکے روتے ہوئے بادشاہِ دیں
تھامے تھا ہاتھ باپ کا فرزندِ مہ جبیں
شوق لقائے شہ میں بڑھی زینبِ حزیں
بھائی کے گرد پھر کے پسر کی بلائیں لیں
سوزش نہ وہ رہی جگر و دل کے داغ میں
گویا بہار آگئی پژمردہ باغ میں

بیت الشرف میں آئے جو شبیرِ خوش خصال
رانڈوں کو روتے دیکھ کے صدمہ ہوا کمال
بڑھکر پھوپھی سے بولے یہ اکبر بصد ملال
چلیے ذرا الگ تو کہوں کچھ پدر کا حال
سب گھر نثار حضرتِ شبیر کیجیے
لٹنے کا طور ہے کوئی تدبیر کیجیے

بڑھکر کہا پھوپھی نے کہو جلد میری جاں
گھبرا کے دیکھنے لگی بیٹے کے منہ کو ماں
آہستہ اُن سے روکے یہ بولا وہ نوجواں
رن میں چلے تھے مرنے کو شاہنشہِ زماں
میں پاؤں پر گرا ہوں جو تشریف لائے ہیں
گھر میں حسین آخری رخصت کو آئے ہیں

غربت میں جو مریں گے شہنشاہِ بحر و بر
اس وقت کس سے میں کہوں دردِ دل و جگر
اُٹھ جاؤں میں جہان سے بابا کے سامنے
امّاں قیامت آتی ہے جاتی ہے آبرو

کُل مِن مُبارِز کا اُدھر غل ہے چار سو
کفّار لوٹ لینگے محمّد کی آل کو
دیتے نہیں رضا جو مجھے شاہِ حق شناس
کہیے امید کس سے رکھیں اور کسے آس

حق بھی ادا ہوا نہ شہِ خوش خصال کے
حضرت کے پیار کی ہے بدولت یہ رنج و غم
ہے اب نفس کی آمد و شد خنجر دو دم
کیا لطف زیست وقت جو رخصت کا ٹل گیا

مرتے جو سر کٹا کے تو ہوتا ہمارا نام
جو دونوں صاحبوں کی رضا کیا کرے غلام
آساں ہے جبر دل پہ اگر اختیار ہو
مہماں ہیں کوئی دم کے شہنشاہِ بحر و بر

صدقے کیے پھوپھی نے تو حضرت پہ دو پسر
بیٹوں میں کس کو سبطِ نبی پر فدا کیا
ہوتا ہے معرکے میں محبت کا امتحاں
نے جان ہے کہ جو دشمنِ سردار انس و جاں
گھر اپنا فاطمہ کی بہو نے ڈبو دیا

پھر کون سرپرست ہے کس سے تھمے گا گھر
مانگو دعا کہ باپ سے پہلے مرے پسر
میرا گلا کٹے شہِ والا کے سامنے
اِک جان بابا جان کی اور سیکڑوں عدو

دیکھو نہ اب رہینگے شہنشاہِ نیک خو
روکو خدا کے واسطے زہرا کے لال کو
کہتا ہوں صاف میں کہ فقط آپ کا ہے پاس
ہم کو تو اب حصولِ سعادت بھی ہے یاس

خوب آبرو حضور نے دی ہم کو پال کے
گھر بھی چھٹا پدر بھی کہیں کے رہے نہ ہم
مر جاؤنگا ابھی قدمِ پاک کی قسم
بابا اُدھر گئے کہ اِدھر دم نکل گیا

خیر اب تڑپ کے خاک پہ ہو جائینگے تمام
لیکن جگہ ہے صبر کی ہمت کا ہے مقام
وہ کیجیے کہ فاطمہ سے آنکھ چار ہو
رخصت کو گھر میں آئے ہیں باندھے ہوئے کمر

امّاں جگہ حجاب کی ہے سوچیے اگر
بتلائیے کہ آپ نے زہرا سے کیا کیا
اب گھر میں کس کے پاس ہے فرزندِ نوجواں
چرچا یہی کریں گی وفاداری بیاں
فرزند کو بچا لیا وارث کو کھو دیا

چھاتی پہ رکھیے صبر کی سل بہر کردگار
لے چلیے مجھکو پیش شہنشاہ نامدار
کہیے کہ آپ کرتے ہیں کیوں عزم کارزار
حاضر ہے صدقے ہونے کو آقا پہ جاں نثار
کام اس سے کیا زبان کو جو باتیں کیک ہوں
لیکن یہ شرط ہے کہ پھوپھی بھی شریک ہوں

زہرا کے بعد قافلہ سالار ہیں یہی
ہاں رتبہ دان سید ابرار ہیں یہی
کہنے کو سب ہیں پر مری مختار ہیں یہی
ماں ہیں یہی پھوپھی یہی غمخوار ہیں یہی
ارشاد یہ کریں تو نثار امام ہوں
بیٹا ہوں آپ کا مگر ان کا غلام ہوں

کانپا یہ سن کے بانوئے ناشاد کا جگر
کی بنت فاطمہ کی طرف یاس سے نظر
ٹپکا کے اشک آنکھوں سے بولی وہ نوحہ گر
ہے ہے یہ کیا کریں کہ مصیبت میں ہے پدر
بیجا ہلاک کوئی بھی کرتا ہے آپ کو
کس طرح چھوڑے نرغۂ اعدا میں باپ کو

یہ ذکر تھا ادھر کہ پکارے امام دیں
لو الوداع اے حرم ختم مرسلیں
آ پہونچے متصل در خیمہ کے اہل کیں
لے آؤ جامۂ کہن اے زینب حزیں
رخصت کو آئیں جو مرے نازوں کے پالے ہیں
اکبر کو روکیو یہ تمھارے حوالے ہیں

اکبر پھوپھی کو دیکھ کے بولے کہ ہے غضب
لو آفت آگئی کہ چلے شاہ تشنہ لب
دوڑے سروں کو کھولے ہوئے اہل بیت
بانو گری تڑپ کے قدم پر بصد تعب
بیٹے نے تھامے ہاتھ شہ کربلائی کے
زینب نے سر جھکا دیا سینہ پہ بھائی کے

شانے پہ منہ کو رکھ کے پکارے شہ زمن
اماں کی تم سے بو مجھے آتی ہے اے بہن
بولی یہ ہاتھ جوڑ کے بانوئے خستہ تن
آقا ابھی تو زندہ ہے اکبر صف شکن
دکھ درد میں پدر کے پسر کام آتے ہیں
آپ ان کے ہوتے کس لیے میداں میں جاتے ہیں

شہ نے کہا بہن مجھے اس کا نہیں خیال
ہے تم کو صابروں کی طرح صبر میں کمال
اپنے چمن کو دیکھ کے ہوتے ہیں سب نہال
خود چاہتا ہوں میں کہ یہ گل ہو نہ پائمال
شادی کے دن ہیں اس غریب الوطن کی ہے
صدمہ مجھے یہ ہے کہ ریاضت بہن کی ہے

بولی وہ عندلیب چمن پرورِ بتولؑ
طرہ وہی ہی سب پہ میسر چڑھے جو پھول
ای نخلِ باغ فیض و گلِ گلشنِ رسولؑ
داغِ گلِ ریاض تمنا بدل قبول
شادی سدا نہیں چمنِ روزگار میں
روے خزاں میں وہ جو ہنسا ہو بہار میں

کیجے کنیز کی نہ ریاضت کا کچھ خیال
صدقے گلِ ریاض نبیؐ پر ہزار لال
بھائی پہ آ بنی تو بھتیجے کا کیا ملال
اُن کو بھی صدقہ ہونے کی ہی آرزو کمال
ہاں دل تو چاہتا ہی کہ دم بھر جدا نہ ہوں
کام آئیں غیر جب تو یہ کیونکر فدا نہ ہوں

گر کر قدم پہ شہ کے یہ بولا وہ نوجواں
بس اب رضا جہاد کی دیں قبلۂ زماں
صدمہ ہوا پھوپھی کے جگر پر کہ الاماں
کانپے جو پاؤں گرنے لگی تھرتھرا کے ماں
خوں گھٹ گیا امامِ زماں زرد ہو گئے
اچھا کہا مگر ہمہ تن درد ہو گئے

اکبر پھرے جو گرد قدم سے اُٹھا کے سر
بولے گلے لگا کے شہنشاہِ بحر و بر
ای نورِ عین ای سببِ قوتِ جگر
کیا اپنا زورِ خیر جہاں سے کرو سفر
بس قطع ہو گئی جو توقع تھی آپ سے
اٹھارھویں برس میں بچھڑتے ہو باپ سے

نقصان کونسا ہی جو مرتے پدر کے ساتھ
ہوتا سناں پہ چاند سا سر میرے سر کے ساتھ
افسوس زخمی ہو گیا دل بھی جگر کے ساتھ
زینب ہماری جان چلی اس پسر کے ساتھ
کنبے کی جان آنکھوں کا تارا یہی تو تھا
بابا کی زندگی کا سہارا یہی تو تھا

تم سے بھی رک سکا نہ یہ دلبر ہزار حیف
کچھ کر سکی نہ بانوے نے پر ہزار حیف
خالی ہوا بس آج بھرا گھر ہزار حیف
لو صاحبو چلے علی اکبر ہزار حیف
یہ آفتاب اب کوئی دم میں غروب ہی
دولہا بنا کے مرنے کو بھیجو تو خوب ہی

خلعت پنھایا ماں نے وہ کپڑے اُتار کے
رکھا عمامہ فرق پہ زلفیں سنوار کے
زینب پکاریں ہاتھوں کو چھاتی پہ مار کے
سہرا بھی باندھو سر پہ مرے گلعذار کے
بولا پسر کہ عزم ہی اب رزم گاہ کا
اماں کفن پنھا دو یہ خلعت ہی بیاہ کا

سجنے لگا یہ کہہ کے وہ صفدر سلاح جنگ
پہنی زرہ تو دل کو وغا کی ہوئی اُمنگ
بڑھ کر چلے جو قبلۂ دیں کے سلام کو
غل پڑ گیا کہ خلق سے اکبر کا کوچ ہے
لٹتا ہے گھر شبیہ پیمبر کا کوچ ہے
اس کربلا میں کونسی کرب و بلا نہیں
حلقے سے بی بیوں کے جو نکلا وہ آفتاب
چڑھنے لگا فرس پہ تو دل کو رہی نہ تاب
تڑپا جو دل تو ہاتھوں کو حضرت نے تھام کے
تھرا کے عرض کی خلفِ مرتضےٰ ہیں آپ
شہ نے کہا مسافرِ ملکِ بقا ہیں آپ
الفت نہیں یہ پاسِ رسالت مآب ہے
صدقہ ہیں اس لحاظ کے ای زینۂ داں مرے
مہرو مرے حسین مرے شیرِ ژیاں مرے
طاقت تھی جس سے دل کو وہ دولت بچھڑ گئی
آتے ہیں ہم بھی خیر سدھارو سفر کرو
تیغوں میں آفتاب سا سینہ سپر کرو
اک جا رہے یہ غنچۂ خاطر کھلے نہیں
کیونکر دھواں اُٹھے نہ جگر سے ہزار حیف
پانی گر اس شباب میں ترسے ہزار حیف
گو نہر تھی قریب مگر دسترس نہ تھا

رکھا جو خود سرخ ہوا اور رُخ کا رنگ
تن کر چلے لپٹ گئی بر سے قبائے تنگ
تڑپا دل اس طرح کہ غش آیا امام کو
لو روشنی چلی مہِ انور کا کوچ ہے
گلنار مرتضےٰ کے گلِ تر کا کوچ ہے
کٹتا ہے وہ نہال جو پھولا پھلا نہیں
ہمراہ تھے پسر کے امامِ فلک جناب
گھبرا کے شہ نے ہاتھ بڑھایا سوئے رکاب
سر رکھ دیا پسر نے قدم پر امام کے
کعبہ ہیں آپ یا شہِ دیں رہنما ہیں آپ
ہم صورتِ جنابِ رسولِ خدا ہیں آپ
ایسے سعید لال کی خدمت ثواب ہے
عاشق مرے شفیق مرے مہرباں مرے
پیری میں باپ کیا کرے اے نوجواں مرے
میں تو یہ جانتا ہوں کہ دُنیا اُجڑ گئی
اچھا بساؤ دشت کو ویران گھر کرو
پھر دیکھ لے یہ باپ ذرا مُنہ اِدھر کرو
مدت گزر گئی کہ گلے سے ملے نہیں
خدمت بھی کچھ ہوئی نہ پدر سے ہزار حیف
پیاسے چلے حسین کے گھر سے ہزار حیف
تم خوب جانتے ہو کہ بابا کا بس نہ تھا

کوثر پہ جا کے کہیو علی سے ہمارا حال
لال آپ کا بلا میں ہے یا شیرِ ذوالجلال
کٹ جائے میرا حلق کہ لاشا ہو پائمال
حضرت کو اپنی بیٹیوں کا چاہیے خیال
ان کے قدم تھمیں جو کوئی دستگیر ہو
ایسا نہ ہو کہ دخترِ زہرا اسیر ہو

یہ کہہ کے خود سوار کیا نورِ عین کو
کس صبر سے ادا کیا خالق کے دین کو
روتا اُس آفتاب نے چھوڑا حسین کو
روشن ضیائے رخ نے کیا مشرقین کو
قدسی درود پڑھتے تھے چہرے کے نور پر
گھوڑے پہ آپ تھے کہ تجلی تھی طور پر

وہ شوخیاں سمندِ فلک سیر کی وہ چال
پیلِ دماں کہیں کہیں ضیغم کہیں غزال
مرکب جو بے عدیل تو راکب بھی بے مثال
رعب و نہیب و دبدبہ و سطوت و جلال
بجلی کی زرق برق تھی ساز و یراق پر
غل تھا چڑھے ہیں احمدِ مرسل براق پر

پھیلی ہوئی تھی دشت میں زلفِ رسا کی بو
کچھ بو تھی گیسوؤں کی تو کچھ کربلا کی بو
غل تھا یہ بو ہے سلسلۂ مصطفےٰ کی بو
مٹی ہے اس کے سامنے مشکِ ختا کی بو
حلقے نہیں یہ گیسوئے عنبر سرشت کے
دیکھو کھلے ہوئے ہیں دریچے بہشت کے

صدقے ہے عود عنبرِ سارا نثار ہے
جنگل ہے مشک بیز ہوا مشکبار ہے
حلقہ ہے جو وہ نافۂ مشکِ تتار ہے
سنبل کا اس کے سامنے کیا اعتبار ہے
ہمسر نہیں جو گیسوؤں کے پیچ و تاب سے
مخفی ہے آج تک شبِ قدر اس حجاب سے

پیدا ہے زلف و روئے منور سے شانِ رب
نکلا ہے آفتاب میانِ سوادِ شب
یہ لطف روزِ عید و شبِ قدر میں ہے کب
ہے دو طرف تو چین و ختا بیچ میں حلب
رستہ نہ بھول جائے مسافر ہجوم میں
اک شب کا فاصلہ ہے فقط شام و روم میں

معراجِ مصطفےٰ کی یہ شب ہے تو وہ سحر
زیبا ہے اس کو کہیے اندھیرے کا چاند اگر
ہے زلف و رُخ مفسّرِ واللیل والقمر
اے خضر ہاں ظفر کا وسیلہ ہے یہ سفر
دن جس کا ہے سعید مبارک وہ رات ہے
ظلمت کو طے کیا تو پھر آبِ حیات ہے

پہلو میں دن کے رات زہے شانِ کارساز
افزوں ہے سب سے رونقِ دینِ شہِ حجاز
اب تو نظر پہ پہ شبِ معراج چڑھ گئی
کیوں زلف کی ثنا میں اُلجھتے ہیں مو شگاف
تعقید سر بسر ہے فصاحت کے برخلاف
فکریں رسا ہیں جن کی یہاں وہ بھی ہیچ ہیں
وہ خود فرقِ پاک پہ وہ چاندسی جبیں
قرآں کی لوح مطلعِ نو آفتابِ دیں
اس کو جو اس جبیں کے برابر نہ دیکھتا
ابرو ہے یا کھنچی ہوئی شمشیرِ تیز دم
پایا بھلا کمانِ کیانی نے کب یہ خم
مدت کھنچے تو پھر کشش ان کی بیاں نہ ہو
خمدار وہ بھویں وہ جبینِ قمر مثال
مطلع ہے صاف غور سے بینا کریں خیال
خوبی میں وہ تو یہ ہمہ تن لاجواب ہے
ہے آسمانِ حسن و شرف یہ فلک جناب
منظور شمسی و قمری کا ہو گر حساب
باریک ہیں سمجھ گئے مطلب انیس کا
مانند شانہ گر ہمہ تن ہو کوئی زباں
قربانِ حسنِ صنعتِ خلاقِ انس و جاں
موئے نگینِ دُرِّ ثمینِ نجف یہ ہے

یوسف جو دیکھ لے تو جھکائے سرِ نیاز
زیبا ہے گورے رخ پہ غضب گیسوے دراز
حیرت ہے دن تو کم نہ ہوا رات بڑھ گئی
سلجھا ہوا بیاں ہو تو مضموں ہو صاف صاف
باریک اس ختن کی ہیں لڑیں ہیں خطا معاف
رشتہ تو مال بھر کا ہے اور لاکھ پیچ ہیں
پرتو سے جس کے غیرتِ مہتاب ہے جبیں
آئینۂ حلب یدِ بیضا مہِ مبیں
پھر اپنے آئینہ کو سکندر نہ دیکھتا
صانع نے ایک لوح پہ کھینچے ہیں دو قلم
کیا متصل ہے گوشہ سے گوشہ زہے حشم
قرباں ہو لاکھ بار تو خاطر نشاں نہ ہو
تابندہ ایک چاند کے پیچھے ہیں دو ہلال
نقطہ ہے نورِ حسن کا ابرو پہ ہے جو خال
دیوانِ حسن میں یہی بیت انتخاب ہے
ابرو ہیں دو ہلال تو پیشانی آفتاب
ہاں دیکھ لیں رُخِ خلفِ ابنِ بوتراب
اُنتیس کا وہ چاند ہے یہ چاند تیس کا
تو بھی مژہ کا وصف سرِ مو نہ ہو بیاں
پیدا ہے بہرِ چشم کبھی گاہ سائباں
آنکھوں پہ جس کو رکھتے ہیں مردم شرف یہ ہے

اس چشم کو وہی کہیے نرگس جو ہو بصیر
کیوں ہرزہ گرد ہو کے نگاہوں میں ہوں حقیر
اس نور کے مکاں سے نکلنا فضول ہے
دکھلاتی ہے بیاض و سواد ان کی شان رب
پائی کسی ہرن نے یہ چشم سیاہ کب
دیکھیں جو رعب شیر نیستاں غزال ہوں
بیمار کہتے ہیں شعرا چشم کو جو سب
دارالشفا یہ خود ہیں پئے بندگان رب
چشمک ہے ان کو عیسیٔ گردوں پناہ سے
آنکھیں وہ نرگسی جنھیں دیکھے سے ہو سرور
یا صاف و ستاروں کا ہے ایک جا ظہور
حق بیں ہیں حق شناس ہیں یزداں پرست ہیں
ضیغم نظر ہیں صاحب رعب و جلال ہیں
یہ نشۂ رحیق [illegible]انی سے لال ہیں
پتلی نہیں یہ چشم سیہ کے حجاب میں
جاگے ہیں رات کے تو نقاہت ہے آشکار
مستانہ ہے یہ طور کہ جھکتے ہیں بار بار
روئے ہیں فرقت شہ عالی جناب میں
رخسار کو قمر جو کہوں اس میں داغ ہے
ذروں کو سر چڑھائے یہ کس کو دماغ ہے
دنیا میں کوئی شے نہیں اس آب و تاب کی

پیش نظر یہ دیدۂ حق بیں ہیں بے نظیر
یہ عین مردمی ہے کہ مردم ہیں گوشہ گیر
گھر بیٹھے ان کو سیر دو عالم حصول ہے
دن کے قریب صبح سحر کے قریب شب
پیدا ہے ان سے عین علی کا جلال سب
دنیا ہو غرق خوں جو یہ غصہ سے لال ہوں
صحت میں اس کی شک ہے غلط ہو تو کیا عجب
دیدار ان کی ہر مریض کی صحت کا ہے سبب
مردے جلا دیئے ہیں کرم کی نگاہ سے
روشن میان کعبہ ہیں یا دو چراغ طور
کوثر سے یا بھرے ہوئے ہیں ساغر بلور
ہشیار کیوں نہ ہوں مے عرفاں سے مست ہیں
ہاں شیر ان کے غیظ کے آگے غزال ہیں
ساحر بھی ہیں تو ساحر سحر حلال ہیں
پنہاں ہے روئے حضرت یوسف نقاب میں
ڈورے جو سرخ ہیں تو یہ ہے نیند کا خمار
آنسو ہیں یہ صدف میں ہیں یا دُرِّ شاہوار
نرگس کے پھول تیر رہے ہیں گلاب میں
خورشید ہے تو کیا ہے وہ دن کا چراغ ہے
وہ گل ہیں جن کے ذکر سے دل باغ باغ ہے
رنگت ہے بیوفتی کی تو خوشبو گلاب کی

گل سرخ رو ہوا نہ کبھو ان کے سامنے — مخفی چمن کا روئے نکو ان کے سامنے

بے رنگ ہے گلاب کی بو ان کے سامنے — باغ بہشت ساختہ رو ان کے سامنے

خوشبو سے عطر بیز ہیں پردے دماغ کے — تازہ یہ دونوں پھول ہیں زہرا کے باغ کے

آیا لبوں کا ذکر بس اب ناطقہ ہے بند — ہے بے نمک یہ بات کہوں گر نبات و قند

کیا لطف گر مزہ نہ اٹھائیں سخن پسند — خود ہر سخن سے ان کی فصاحت ہے بہرہ مند

اعجاز ہے زبان بلاغت نظام میں — قرآں کی ساری شکل ہے ان کے کلام میں

مشکل ہے وصف گوہر دندان بے مثال — غواص بحر حسن دکھا اپنا کچھ کمال

اس مدح میں صلہ کے جو ملنے کا ہے خیال — بھر دیگا موتیوں سے دہن فاطمہ کا لال

قبضے میں آسماں کے خزانے زمیں کے گنج — ہنس ہنس کے یہ لٹاتے ہیں در ثمیں کے گنج

اعجاز دونوں ہاتھوں میں مشکل کشا کا ہے — زور ان کلائیوں میں شہ لافتا کا ہے

گھر بازوؤں میں قوت خیر الورےٰ کا ہے — سینہ نہ جانیو یہ خزانہ خدا کا ہے

کیوں شور ہو نہ ان کے قدم کے ثبات کا — جس سے تھما ہوا ہے سفینہ نجات کا

پڑتا ہے ماہ رخ کا جو پرتو ادھر ادھر — پھرتی ہے چاندنی کی طرح ضو ادھر ادھر

گرتے ہیں کانپ کانپ کے سوسو ادھر ادھر — لشکر میں نے دغا ہے روا رو ادھر ادھر

غل تھا عمر کا سر ابھی لائیں جو زور ہو — اس کو نگاہ بد سے جو دیکھیں تو کور ہو

دیکھو تو منصفو یہ ملک ہے بشر نہیں — چہرے پہ ضو یہ ہے کہ مجال نظر نہیں

سب محو ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں — پھر کون ہے پیمبر برحق اگر نہیں

وقت ادب ہے ہاتھ سے تیغ و تبر رکھو — آئے رسول دوڑ کے قدموں پہ سر رکھو

نکلا لگائے چتر زری ابن سعد شوم — بولا یہ کیا ہراس ہے شیرو یہ کیا ہے دھوم

تنہا وہ اک جواں یہ ادھر فوج کا ہجوم — کھوتے ہو آبروئے رئیسان شام و روم

پیارا یہی پسر ہے شہ مشرقین کا — خوش ہو کہ خاتمہ ہوا فوج حسین کا

تلواریں لو نیاموں سے جلدی پرے جماؤ
نیزے ہلا ہلا کے سوار ادھر کو آؤ
ہاں ای کماں کشو قدر اندازیاں دکھاؤ
فرزندِ فاطمہ کے پسر کا لہو بہاؤ
گر نورِ احمدی کی جہاں میں ضیا نہ ہو
انعام پھر وہ دوں جو کسی نے دیا نہ ہو

لالچ میں آئے سُن کے یہ باتیں وہ زیردست
سمجھے کہ اس طرف ہی ظفر اس طرف شکست
دریا پہ کچھ سوا ہوا پہلے سے بندوبست
جھومے یلانِ فوجِ ستم مثلِ پیل مست
جنگل تھا سب سیاہ ہجومِ سپاہ سے
کوسوں چھپی ہوئی تھی ترائی نگاہ سے

اس طرح بڑھ کے ہٹتے تھے وہ بانیِ حسد
اُٹھتا ہے جس طرح کہ سمندر سے جزر و مد
پیاسے پہ آئے تیر اُدھر سے جو لاتعد
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے کہا یا علی مدد
دیکھا نگاہِ قہر سے ہر نابکار کو
گویا خدا کا شیر بڑھا کارزار کو

اللہ رے نہیبِ رجز خوانیِ ہژبر
جھنجلا کے گونجتا ہو نیستاں میں جیسے ببر
چھائی ہوئی تھی فوجِ ضلالت شمال پر
جو منچلے تھے فوج میں بڑھتا تھا اُن پہ جبر
غل تھا کہ سب علی کا جلال آشکار ہے
فقرہ ہر اک رجز کا نہیں ذوالفقار ہے

نعرہ کیا جو مثلِ علی آسماں سے ہلے
تھرّائی یوں زمیں کہ کڑک کر مکاں ہلے
سینوں میں دل ہلے تو صفوں میں نشاں ہلے
کیا منہ کسی کا تھا کہ دہن میں زباں ہلے
گردن نہ ان کی اُٹھتی تھی جو سربلند تھے
اللہ رے رعب نطق فصیحوں کے بند تھے

بعدِ ستائشِ اب و جد شیرِ نر بڑھا
ہٹتی ہوئی گھٹا کی طرف جوں قمر بڑھا
لاکھوں تھے پر نہ ایک اُدھر سے اِدھر بڑھا
جرار تیغ تولے ہوئے بے سپر بڑھا
یوں خندہ رو گیا وہ جری رزمگاہ میں
جاتا ہے جس طرح کوئی اپنی سپاہ میں

نیزوں سے روکنے لگے ڈر ڈر کے سب سوار
صفدر نے بڑھ کے میان سے لی تیغِ آبدار
سب کی نظر میں کوند گئی برقِ ذوالفقار
ٹوٹے عَلَم گرے جو الف ہو کے راہوار
غل تھا کہ سربلند ہیں جو وہ بھی پست ہے
اکبر نے دی صدا یہ نشانِ شکست ہے

فرماکے یہ کمر میں رکھی اسپ کی لجام
پھرنے لگا نظر کے اشارے میں خوش خرام
سرعت وہ خنگ کی وہ درخشانیِ حسام
اک برق کوندتی تھی میانِ سیاہِ شام
دلدل کی چال جو وہ چلن یاد پاکا تھا
بجلی کی تھی جو تیغ تو گھوڑا ہوا کا تھا

کہنی تک آپنے جو اُلٹ لی تھی آستیں
اک زلزلہ تھا کانپتی تھی دشت کی زمیں
روکے تھے منہ پہ خوف سے ڈھالوں کو اہلِ کیں
ہنس ہنس کے دیکھتے تھے علی اکبرِ حسیں
افزوں تھی انگلیوں کی ضیا شمعِ طور سے
جنگل میں روشنی تھی کلائی کے نور سے

ناگہ چلی میانِ وصف تیغ شعلہ ریز
دم بھر میں گرم ہو گیا ہنگامۂ ستیز
آئی چمک چمک کے سروں پر جو تیغِ تیز
ان میں سے ایک کو نہ ملی مہلتِ گریز
سالم تھے نخلِ قد پہ نشانِ قمر نہ تھا
دونوں صفوں میں ایک کی گردن پہ سر نہ تھا

بڑھتے تھے یوں کہ شیر جھپٹتا ہے جس طرح
ہٹتے تھے دل کہ ابر سمٹتا ہے جس طرح
ہاتھ اُڑتے تھے شجر کوئی چھٹتا ہے جس طرح
یا نرم خامہ تیغ سے کٹتا ہے جس طرح
جو اونچی دو چار ہوا صاف چار تھا
فولاد موم خام سکیلہ خیار تھا

تھی استخوانِ شانہ سپر اُس کے سامنے
دامِ زرہ تھا سنبلِ تر اُس کے سامنے
مو دار سب تھے کاسۂ سر اُس کے سامنے
ڈھیلی گرہ تھا بندِ کمر اُس کے سامنے
آفت کا کاٹ قہر کا خم منہ بلا کا تھا
سب ناگ ڈسنگ ضربتِ مشکل کشا کا تھا

آئی جو سن سے سینہ کی جانب اُڑا کے سر
دھڑ سے گرا سمند کی ٹاپوں پہ آکے سر
مرکب نے کی نظر سوئے راکب ہلا کے سر
نکلی وہ تیغ تیز بغل سے جھکا کے سر
ظالم نئی طرح سوئے دوزخ روانہ تھا
سر تھا نہ صدر تھا نہ کمر تھی نہ شانہ تھا

برسا رہی تھی دشت میں وہ شعلہ رو لہو
حیدر کا لال بیچ میں تھا چار سو لہو
تا سینہ اس طرف تو ادھر تا گلو لہو
کوسوں تھا سرزمینِ عرب میں لہو لہو
بہتا تھا خون زمین پہ جو اہلِ خلاف کا
فرطِ خوشی سے سرخ تھا چہرہ مصاف کا

جب آئی سن سے کاٹ کے جوشن نکل گئی
اُڑ کر صفوں کے بیچ سے ناگن نکل گئی
یوں چاک کر کے سینۂ دشمن نکل گئی
شہرگ سے جان صدمے سے گردن نکل گئی
سالم رگیں نہ جسم کی نہ استخواں رہے
ٹوٹے قفس میں طائر وحشی کہاں رہے

اللہ ری تیزیِ دمِ شمشیرِ سر شگاف
قبضہ میں جس کے حکم قضا تھا بسانِ قاف
دریائے خوں میں پیر کے نکلی دم مصاف
پھر منہ لہو پیے پہ جو دیکھا تو پاک صاف
نسبت تھی ذوالفقار سے اس بے عدیل کو
دھبّا کہیں لگا ہی نجیب و اصیل کو

تھا نہرِ علقمہ کے قریں بحرِ خوں کا اوج
تھے آگے پیچھے دست بریدہ بسانِ موج
سر صورتِ حباب نمایاں تھے فرد و زوج
طوفانِ آبِ تیغ میں ڈوبی ہوئی تھی فوج
بھاگیں تو گھاٹ تیغ کا مابین راہ تھا
خشکی میں فوجِ شام کا بیڑا تباہ تھا

پھول اُڑ گئے پھل اس کا جو چمکا سپر کے پاس
نکلی اُدھر سپر سے کہ آ پہونچی سر کے پاس
سر سے اُتر گئی دلِ بیداد گر کے پاس
دل سے جگر کے پاس جگر سے کمر کے پاس
کھولا کمر کا بند تو در آئی زین میں
زین سے گئی فرس میں فرس سے زمین میں

اب دم نہ کیجو بڑھ کے قضا اس سے کہہ گئی
ندی لہو کی دشت پرآفت میں بہہ گئی
کاٹی زرہ کڑی بھی پڑی جو وہ سہہ گئی
بھاگا کوئی شقی تو لہو پی کے رہ گئی
غصہ میں مثلِ برق قرار اُس نے کم لیا
لاکھوں میں ڈھونڈھ کر اُسے مارا تو دم لیا

پھل اس کا نا سپر پہ نا جوشن پہ رہ گیا
جس پر پڑی تڑپ کے وہ توسن پہ رہ گیا
دو ٹکڑے ہو کے سر نہ فقط تن پہ رہ گیا
خوں بھی اجل گرفتہ کی گردن پہ رہ گیا
دم میں نہ وہ غرور نہ وہ خودسری رہی
مجرم وہی رہا یہ خطا سے بری رہی

جنگل میں چار سمت لہو کے چمن بنے
جو خیرہ سر تھے نقشِ فنا اُن کے تن بنے
مُردے شکست پا کے وہ پیماں شکن بنے
چار آئینے جو قبر تو جوشن کفن بنے
کشتوں پہ پشتے لاشوں پہ لاشوں کا بار تھا
عصیاں کا اُس پہ بوجھ غضب کا فشار تھا

بل کھائے اس طرف سے کوئی بل بڑھا اگر
پہونچا سمند اڑا کے برابر وہ شیر نر
چمکی جو تیغ برق سی کوندی ادھر ادھر
آئی لہو میں پیر کے وہ ماہیِ ظفر
چھوڑا اسوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

قبضوں میں تیغیں چھپتی تھیں دہشت تھی اس قدر
گرد اپنے آپ کرتی تھی گرد آوری سپر
یہ خوف تھا کہ زیں سے نکلتے نہ تھے تبر
سہمے تھے تیر یوں کہ اٹھا سکتے تھے نہ سر
ہر اک کمند دامِ بلا میں اسیر تھی
واں خود اماں کی طرح کماں گوشہ گیر تھی

نصرت جلو میں گھوڑے کے پھرتی تھی مثلِ باد
کہتی تھی فتح آج بر آئی مری مراد
تھی یہ ظفر کی عرض کہ یا خالقِ عباد
جلدی شکست پائیں یہ سب بانیِ فساد
پامال کرکے یوں انھیں یہ مہ لقا پھرے
جس طرح جنگ بدر سے شیرِ خدا پھرے

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب
آتش کسی جگہ کہیں بجلی کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کی شکم پر کہ اس کی تاب
تیزی زباں میں وہ کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خونِ فوج کی اور آبدار بھی
غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی ابرِ تر بھی خزاں بھی بہار بھی
تلوار بھی چھری بھی سپر بھی کٹار بھی
پانی نے اس کے آگ لگا دی زمانے میں
اک آفتِ جہاں تھی لگانے بجھانے میں

کرتی تھی پائمال صفوں کو وہ برق سیر
وحشت سے تھا سیاہ شقاوت کا حال غیر
نہ خود کو پناہ نہ اس سے سپر کی خیر
چار آئنہ سے لاگ تھی اس کو سپر سے بیر
سکتے پڑے تھے اکبرِ غازی کی حرب کے
لوہا بھی دب گیا تھا یہ معنی ہیں ضرب کے

تیر افگنانِ کوفہ و شام و عراق و ری
چلاتے تھے رہے گی کشاکش یہ تا بکی
قادر ہی مثلِ حکمِ قضا خجستہ پے
سر کاٹے اس نے تیر چلے اس طرف سے جے
پچتائے علمِ تیر میں برسوں گزار کے
بس پھینک دو چڑھے ہوئے چلے اتار کے

نیزوں کے بند بند قلم برچھیاں دونیم
مثلِ قلم زبانِ درازِ سناں دونیم
چار آئینہ کٹے ہوئے گرزِ گراں دونیم
مغفر سے تا کمر جسدِ پہلواں دونیم
سالم تھا پیش آئینۂ تیغ جو نہ تھا
لشکر میں کونسا تھا وہ یکتا جو دو نہ تھا

وہ تیغ جب بڑھی صفِ کفار ہٹ گئی
چمکی جو برق ڈھالوں کی بدلی سمٹ گئی
دم بھر میں یوں صفوں کو الٹ کر پلٹ گئی
گردن کی نہر میں لہو کے ڈریڑوں سے کٹ گئی
دریا بھی آبِ تیغ سے بے آبرو ہوا
غل تھا کہ لو فرات کا پانی لہو ہوا

گیتی ہلا دی نعرۂ ضرغامِ دہر نے
گھیرا ہر اک کو حضرتِ باری کے قہر نے
مانگی پناہ چھوڑ کے ساحل کو بحر نے
گرداب کو سپر کیا سینے پہ نہر نے
گھرا ان کا جو بحر میں نایاب ہو گیا
کانپیں یہ مچھلیاں کہ جگر آب ہو گیا

بولے نہنگ خوب نہیں یہ اگر مگر
اب تم نکل کے بحر سے بر میں بناؤ گھر
برپا ہے شامیوں کے ستم سے یہ شور و شر
لڑتے ہیں اپنے حق پہ یداللہ کے پسر
چشمہ ہے یا محیط ہے شط ہے کہ نہر ہے
اس کے گواہ ہم ہیں کہ زہرا کا مہر ہے

ہل چل ہوئی غضب کی صفِ کارزار میں
دبکے نکل کے شیر نیستاں کچھار میں
پوشیدہ مارے خوف کے اژدر تھے غار میں
جنگل سمٹ کے چھپنے لگا کوہسار میں
اک شور تھا کہ آگ لگی کائنات میں
رہتی یہ مچھلیاں تھیں سمندر فرات میں

جب کوند کر سمند یہاں سے وہاں گیا
ثابت نہ کچھ ہوا کدھر آیا کہاں گیا
جھاڑیں جو پتلیاں تو نظر سے نہاں گیا
گھوڑا براق بن کے سوئے آسماں گیا
غل تھا وہ آکے دیکھ لے اس بادپا کے پاؤں
دیکھے نہ ہوں زمانہ میں جس نے ہوا کے پاؤں

سرعت سے شرمسار نسیمِ سحر ہوئی
آنکھوں میں پھر گیا نہ مژہ کو خبر ہوئی
تن سے عرق کی بوند جو ٹپکی گہر ہوئی
جب خاک اڑی ادھر تو دم اس کی خضر ہوئی
گھوڑا نہ کہیے تختِ سلیماں ہوا نہ تھا
اس کے لیے تو جنبشِ رگ تازیانہ تھا

باریک جلد وہ کہ خجل قاقم و حریر — مشکیں پرند آہوئے رم خوردہ شبگیر
حلقے سے یوں نکل گیا جیسے کماں سے تیر — آتش مزاج بادیہ پیما فلک مسیر
یوں فتح ساتھ ساتھ تھی اس راہوار کے — جیسے پیادہ چلتا ہے آگے سوار کے

تلوار تھی جو ابر تو گھوڑا بھی برق تھا — مثلِ عروس نور یہ خوبی میں غرق تھا
کچھ اس میں اور ابر میں مطلق نہ فرق تھا — دو گام اس کو فاصلۂ غرب و شرق تھا
پاکھر تھی موتیوں کی عرق جسمِ پاک پر — آئی تھی باد تند فرس بن کے خاک پر

تھا اس گروہ میں یہ تلاطم یہ انتشار — ناگہ اُٹھا جو شام کی جانب سے اک غبار
بولا یہ فوج سے عمرِ سعد نابکار — بھیجی کمک یزید نے لو شکر کردگار
یہ اکبرِ جری کی اجل کا بہانہ ہے — آیا وہ پہلواں جو وحیدِ زمانہ ہے

یہ سُن کے فوج سب متوجہ ہوئی اُدھر — دیکھا کہ اک جواں ہے فرس پہ بہ کر و فر
نیزے پہ آگے آگے تو ہیں ہزار نوک سر — پیچھے ہیں دو ہزار جوانانِ پُر جگر
قامت سے شان عمرِ شقی آشکار ہے — سمجھے یہ سب کہ رخش پہ رستم سوار ہے

وہ خود جس کو دیکھ کے مرحب ہو سرنگوں — کیفِ شرابِ غیظ سے آنکھیں ہیں جامِ خوں
قتال بدمزاج و مہیب و سیہ دروں — بکتاش و خیلتاش سے بھی توش ہیں فزوں
تیغ و سناں میں رشکِ نریماں و گیو تھا — کہنے کو آدمی پہ حقیقت میں دیو تھا

بعد از سلام بڑھ کے عمر نے کیا بیاں — آپ آئے کیا کہ آگئی تنِ مُردوں میں جاں
نیزہ زمیں پہ گاڑ کے بولا وہ پہلواں — سرگرمِ کارزار ہے یہ کونسا جواں
عباس ہے کہ فاطمہ کا نورِ عین ہے — کی عرض اُس شقی نے کہ ابن الحسین ہے

کاٹے ہیں جب سے دستِ علمدارِ نامور — سرگرمِ کارزار ہے یہ شاہ کا پسر
پوچھا شقی نے ہوئے گا سن اس کا کس قدر — اُس نے کہا جواں نہیں پورا یہ پُر جگر
اٹھارھواں یہ سال ہے سن کے حساب میں — سبزہ ابھی نمو ہے باغِ شباب میں

بولا شقی کہ فوج کا لڑکے سے ہے یہ حال
ٹوٹے ہیں مورچے صفِ لشکر ہے پائمال
تب شمر نے کہا کہ یہ ہیں شیرِ حق کے لال
طفل و جوان و پیر ہیں اس گھر کے بے مثال
سر بر ہو کون قہرِ خدا ہے وغا نہیں
اس پر کہ تین روز سے پانی ملا نہیں

ناری کے آگ لگ گئی سُن کر علی کا نام
بولا بگڑ کے وہ کہ مرے منہ پہ یہ کلام
پھر کہا اگر علی کا خلف ہے یہ تشنہ کام
کرتی ہے شق پہاڑ کا سینہ مری حسام
پیدا کیا ہے نام ہزاروں کو مار کے
اُتروں گا اب فرس سے سر اس کا اُتار کے

یہ کہہ کے پھر کیا کمرِ آہنی کو چُست
آلاتِ حرب تن پہ کیے سر بسر درست
سارے قویٰ قوی تھے مگر عقل سخت سُست
سر میں وہی غرور وہی غرّہ نخست
کوڑا کیا فرس کی جو باگ اِس نے پھیر کے
ہر صف میں غل ہوا کہ چلا منہ میں شیر کے

آیا اُڑا کے رخش وہ جس دم قریبِ زد
ہمشکلِ مصطفےٰ نے کہا یا علی مدد
پشتی پہ ہوئے شیرِ الٰہی سا جس کا جد
ہوتا ہے کیا حریف کرے لاکھ جد و کد
دریائے موج خیز پہ تھے وہ حباب تھا
زہرہ شقی کا آنکھ ملانے ہی آب تھا

ڈھلکر ہٹا لرز کے جو سنبھلا وہ پُر غرور
بولے یہ مسکرا کے علی اکبرِ غیور
آمد میں وہ شکوہ و تعلّی وہ مکر و زور
گرجا تھا اِس قدر تو برسنا بھی تھا ضرور
سرکش زمیں پہ گر کے سنبھلتا نہیں کبھی
نخلِ غرور پھولتا پھلتا نہیں کبھی

مقدور پر بھی کرتے ہیں عاقل فروتنی
عاجز ہیں سب خدا کی مگر ذات ہے غنی
ہم سے زیادہ کون ہے تلوار کا دھنی
چلتے ہیں جھک کے صورتِ شمشیرِ آہنی
دیکھا نہ راستی کا مزہ کج ادائی میں
سبقت کسی پہ ہم نہیں کرتے لڑائی میں

سب جانتے ہیں وستِ علی کی صفائیاں
سرکیں نبی کے سامنے کیا کیا لڑائیاں
عالم کے سرکشوں نے شکستیں اٹھائیاں
بدر و احد میں خون کی نہریں بہائیاں
مدحِ علی رسولِ خدا کی زباں پہ ہے
لا سیف و لا فتی کی صدا آسماں پہ ہے

غرہ ہمیں نہیں تجھے دعوے ہی گر تو آ
آمد تو دیکھی جنگ کا بھی کچھ ہنر دکھا
ساتوں جہنم آتشِ فرقت میں جلتے ہیں
تو لاشقی نے سنتے ہی یہ گرز گاؤسر
آیا ادھر سے گرز ادھر سے چلا تبر
گرز اس طرح نکل گیا پنجے سے چھوٹ کے
بھالا سنبھالا دشمنِ ایماں نے مل کے ہاتھ
پہلے ہی بک چکا تھا ستمگر اجل کے ہاتھ
کم تھے نہ یہ بھی زور میں گو وہ زیاد تھا
رکھ کر تبر نیام سے لی تیغِ شعلہ ور
بھالے کے ہاتھ بھول گیا سب وہ خیرہ سر
جاتا کدھر یہ تیغ سے جائے اماں نہ تھی
بالائے سر جو ڈانڈ کو لایا وہ خود پسند
پھینکی شقی نے فرق پہ جھنجلا کے پھر کمند
گردش تھی ہاتھ کی نہ بڑھے کچھ نہ گھٹ گئے
ہٹ کر خطا شعار نے جوڑا کماں میں تیر
سرکش خدنگ مرگ سے کیونکر ہو گوشہ گیر
زبان زور و ضربت نصرت نشان کے
خادم نے تیر جوڑ کے دی دوسری کمان
سیسر ادھر اٹھی تھی کہ چمکی ادھر سناں
سہما یہ دل کہ بن گئی موذی کی جان پر

تیری طرف یزید ہماری طرف خدا
مالک تجھے سقر میں بلاتا ہی جلد جا
شعلے تری تلاش میں باہر نکلتے ہیں
اکبر نے دوشِ پاک سے لی ہاتھ میں سپر
دو ہو گیا عمود مثالِ خیارِ تر
سمجھے یہ سب زمیں پہ گرا ہاتھ ٹوٹ کے
نیزے کے چار پانچ لگائے سنبھل کے ہاتھ
بڑھتا نہ تھا جو پاؤں تو رکتا تھا چل کے ہاتھ
نیزے کے بند بند کا توڑ ان کو یاد تھا
تھرا کے خود اماں نے صدا دی کہ الحذر
یہ بھی ادھر تھے پھرتا تھا نیزہ جدھر جدھر
دیکھا جو غور سے تو سناں کی زباں نہ تھی
کھولے تمام نیزۂ بیداد گر کے بند
سر کو بچا کے شیر نے تلوار کی بلند
حلقے کھلے تھے جو وہ اشارے میں کٹ گئے
تیر افگنی میں شہرۂ آفاق تھا شریر
چلہ کٹا کمان کا زہے تیغِ بے نظیر
کھل کر قفا سے بندھ گئے بازو کمان کے
نیزہ اٹھا کے شیر نے آواز دی کہ ہاں
بھالے کی نوک جھونک نئی تھی نئی تکاں
ناوک زمیں پہ تھا تو کماں آسمان پہ

رجز

ہاں اے محیط طبع روانی دکھا مجھے | پیری میں زور شورِ جوانی دکھا مجھے
ہاں اے زبان سیف زبانی دکھا مجھے | اے نطق آج سحر بیانی دکھا مجھے
تلواریں کھنچ گئیں دم تیغ آزمائی ہے | آفت کا معرکہ ہے غضب کی لڑائی ہے

اے تیغ بادشاہِ نجف شعلہ بار ہو | اے شہ سوار مستعدِ کارزار ہو
اے برق طبع کوند کے گردوں کے پار ہو | اے سیف خامۂ دوزباں شعلہ بار ہو
ہاں معرکہ ہے بن کے لڑائی بگڑ نہ جائے | چوٹیں نئی ہوں سب کی مضموں لُٹ نہ جائے

ہاں غازیو دکھاتا ہوں تصویرِ حرب گاہ | غل ہو درود کا عوضِ شورِ واہ واہ
تولے ہے تیغ اِدھر پسرِ شاہِ دیں پناہ | آمادۂ نبرد اُدھر ہے وہ روسیاہ
دونوں کو معرکہ میں تمنا ہے جنگ کی | باگیں اُٹھی ہوئی ہیں کمیت و سرنگ کی

دوزخ اُدھر ہے خلد بریں کا چمن اِدھر | کانٹے اُدھر ہیں لالہ رُخ و گلبدن اِدھر
کافر اُدھر شبیہ رسول زمن اِدھر | مرحب ہے اُس طرف شہِ خیبر شکن اِدھر
باطل چلا جہاں سے کہ حق کا ظہور ہے | جو نار ہے وہ نار ہے پھر نور نور ہے

عاری ہیں تیغ زن شہِ مرداں کے سامنے | گل ہیں چراغ مہرِ درخشاں کے سامنے
کیا سحر سامری بن عمران کے سامنے | کیا مور کی بساط سلیماں کے سامنے
آہو کا اور شیر کا انداز اور ہے | حقا کہ سحر اور ہے اعجاز اور ہے

دو بجلیاں سی کوند کے گرتی ہیں بار بار | ڈھالوں کے پرزے اُڑتے ہیں دونوں ہیں ہوشیار
طاؤس ہیں ہرن ہیں چھلاوہ ہیں راہوار | لشکر ہے اک زباں کہ یہ جرأت ہے یادگار
غالب یہی ہیں گو وہ قوی تر ہے گیو سے | غل ہے کہ لڑ رہے ہیں یداللہ دیو سے

بڑھتا ہے مثل تیغ ادھر سے وہ نامور | دب دب کے پیچھے ہٹتا ہے وہ صورتِ سپر
یوں نعرہ زن ہے غیظ میں شبیر کا پسر | یہ اضطراب جنگ میں ظالم ٹھہر ٹھہر
حملے تو دیکھ رُخ سے جھلم کو اُتار کر | او روسیاہ آنکھ تو شیروں سے چار کر

کٹ کٹ کے وار کرتا ہے پیہم وہ روسیاہ
پر ان کی تیغ سے کہیں ملتی نہیں پناہ
روباہ وہ یہ بخت دلِ ضیغمِ الٰہ
جن کے غلام ملکِ شجاعت کے بادشاہ
زیبا ہے برق شعلہ فشاں میغ کے لیے
تیغ ان کے واسطے ہے یہ ہیں تیغ کے لیے

اس دوپہر کی دھوپ میں تیغوں کی وہ چمک
دو بجلیاں سی کوند رہی تھیں تہِ فلک
حیرت میں تھے زمیں پہ بشر چرخ پر ملک
مثلِ علی جھپکتی نہ تھی شیر کی پلک
رُخ پر ہراس کچھ دمِ جنگ و جدل نہ تھا
تلوار چل رہی تھی پہ ابرو پہ بل نہ تھا

گھاتیں ہزار کرتا تھا وہ لاکھ مکر و زور
لیکن کہاں چراغ کہاں مہرِ دیں کا نور
اوچھڑ سپر کی ہے جو اُٹھائے سرِ غرور
بولے تو موت کا بھی طمانچہ نہیں ہے دور
سچ کہتے ہیں ہراس میں کیا زور چل سکے
پنجہ میں شیر کے ہو تو کیونکر نکل سکے

شانہ کٹا سپر سے بچایا جو اُس نے سر
ٹکڑے اُڑے جھلم کے ہٹی منہ سے جب سپر
چار آینہ میں جسم تو محفوظ تھا مگر
سارا چھنا ہوا تھا زرہ کی طرح جگر
تاب و تواں کو حرب میں ہارا ہوا تھا وہ
تیغِ زباں کے زخم کا مارا ہوا تھا وہ

خالی گئیں منجی ہوئی چوٹیں جو اُس کی سب
مُنہ کو پھرا پھرا کے شقی کاٹتا تھا لب
تلوار کو اُٹھا کے پکارا وہ شیر تب
ہشیار ہو او لعین اجل آتی ہے سر پہ اب
مہلت ابھی ہے تیغ و سپر کو سنبھال لے
باقی ہو کچھ ہوس تو اُسے بھی نکال لے

بولا سپر کو فرق پہ رکھ کر وہ پُر غرور
پُھنکتا ہے تن یہ دھوپ سے ہے پیاس کا وفور
میداں کرہ ہے نار کا اے کبریا کے نور
بھڑکی ہے آگ سینے میں اک صورتِ تنور
ہر چند ہاتھ دھوے ہوں اپنی حیات سے
مہلت ملے تو پی لوں میں پانی فرات سے

تلوار روک کر یہ پکارا وہ لا کلام
تو نے سُنا تو ہوگا کہ ہم بھی ہیں تشنہ کام
تلوار روکنے کا نہیں گرچہ یہ مقام
پر خیر پی لے نہر سے پانی کا بھر کے جام
فیاض ہیں کریم ہیں ابن کریم ہیں
دشمن پہ رحم کرتے ہیں ہم وہ رحیم ہیں

خنداں ہوئے شقی پہ لبِ تیغِ جاں گداز
بڑھکر زبانِ طعن سناں نے بھی کی دراز
آواز دی کماں نے زہے شانِ بے نیاز
سوفار نے صدا دی کہ سرکش ہے حیلہ ساز
ہے خوف ضربِ تیغ سے طالب پناہ کا
بولی سپر کہ پھر گیا رخ روسیاہ کا

لے آیا آب سامنے خادم بصد شتاب
پانی پہ گر پڑا وہ کہ تھی ضبط کی نہ تاب
ظالم نے سامنے جو پیالہ ڈگڈگا کے آب
پیاسے تھے تین دن کے ہوا دل کو اضطراب
تڑپا جو قلب چشم کے ساغر چھلک پڑے
اٹھا دھواں جگر سے کہ آنسو ٹپک پڑے

سیراب ہو چکا جو وہ سفاک و بدگہر
کی عرض کیجیے آپ بھی پانی سے حلق تر
فرمایا تشنہ لب ہے شہنشاہِ بحر و بر
آبِ حیات ہو تو نہ پییں ہم نہ لے پدر
ڈوبے ہوئے ہیں چشمۂ کوثر کی چاہ میں
یہ آب نہر خاک ہے اپنی نگاہ میں

شبیر نے جو دور سے دیکھا یہ ماجرا
دو چار گام بڑھ کے یہ بیٹے کو دی صدا
اے مرحبا رسول کے ہم شکل مرحبا
سیراب سلسبیل سے تم کو کرے خدا
کیونکر نہ صبر و شکر میں ایسا کمال ہو
کیونکر نہ ہو کہ ساقیِ کوثر کے لال ہو

تسلیم کر کے شہ کو بصد عجز و انکسار
مثلِ اسد شکار پہ آیا وہ شہسوار
نعرہ کیا کہ او سگِ بزدل ستم شعار
ہاں اب تو تازہ دم ہے اٹھا تیغ آبدار
ہنستا ہے کیوں عرب کی حمیت کو تو نہ کھو
پانی تو پی چکا ہے بس اب آبرو نہ کھو

سن کر برس پڑا وہ جفاکار و بدگہر
رد کر کے سارے وار بڑھا شاہ کا پسر
لہرا رہی تھی فرق پہ وہ ماہی ظفر
مارا جو ہاتھ برق سی کوندی قریب سر
چھوڑا سوار کو نہ فرس کو نہ تنگ کو
اک شور تھا کہ کھا گئی مچھلی نہنگ کو

دو ہو کے گر پڑا جو برابر وہ پہلواں
جبریل پر اٹھا کے پکارے کہ الاماں
نکلی زمیں میں ڈوب کے شمشیر خوں چکاں
تکبیر کہہ کے جوش میں جھوما وہ نوجواں
افلاک سے گزر گئی سادات کی صدا
آئی خدا کے عرش سے احسنت کی صدا

منہ پھیر کر حسین کی جانب جو کی نظر
فریاد کی کہ اے خلفِ سید البشر
موت آئے اب تو روح کو راحت نصیب ہو
فرمایا شہ نے اے علی اکبر ترے نثار
کوثر پہ شیرِ حق کو تمہارا ہے انتظار
لائے کہاں سے دل کہ یہ صدمہ اُٹھا سکے

ڈیوڑھی پہ روئی بنتِ علی سُن کے یہ کلام
رانڈوں کے روکنے کو بڑھے اس طرف امام
سب طور تھا وغاے جنابِ امیر کا
قلب و جناح کے جو دلاور ہوئے تلف
یہ غول اُس طرف تو وہ مجمع تھا اس طرف
یوں حملہ ور تھے تیغ زنوں کی قطار پر

آئے گئے جو بیچ سے لشکر کے بار بار
اب اُس طرف ہیں آ پڑے ہر فوجِ نابکار
نیزے ملا دو سینوں سے گھوڑوں کو پھیر کے
روکی تمام فوج نے اک تشنہ لب کی راہ
ڈھالوں سے دشت بن تھا کئی کوس تک سیاہ
لاکھوں سے معرکہ میں کوئی یوں لڑا نہیں

گردوں پہ تھی صدا کہ چکا چاک تیغ و تیر
فرماتے تھے جو رُکتا تھا اسپ فلک سیر
زخموں سے تو بھی چور ہے اور ہم بھی چور ہیں

دیکھا زمیں پہ سجدے میں ہیں شاہ بحر و بر
نزدیک ہے کہ پاس سے شق ہو دل و جگر
کیجے دعا کہ جلد شہادت نصیب ہو
میں کیا کروں نہیں مرا پانی پہ اختیار
مظلوم باپ تم سے نہایت ہے شرمسار
تم مانگو اور حسین نہ پانی پلا سکے

روتی ہوئی نکل پڑیں سیدانیاں تمام
گھوڑا اُڑا کے فوج میں ڈوبا وہ تشنہ کام
حملے نہ تھے غضب تھا خدائے قدیر کا
گھبرا کے میمنہ پہ گری میسرہ کی صف
گویا کہ لڑ رہے تھے غضب میں شہِ نجف
جاتا ہے شیر جیسے غزالوں کی ڈار پر

مابین راہ تیغوں سے تن ہو گیا فگار
غل ہے ادھر اب آنے نہ پائے یہ نامدار
کشتہ کرو ہیں علی اکبر کو گھیر کے
گھوڑا اُڑا کے بیچ میں آیا وہ رشکِ ماہ
تلوار چل رہی تھی کہ اللہ کی پناہ
غل تھا عرب میں رن کبھی ایسا پڑا نہیں

ڈوبا تھا خوں میں سب شہِ دیں کا مہِ منیر
اب ہم بھی ہیں تمام لڑائی بھی ہے اخیر
افسوس بس یہی ہے کہ بابا سے دور ہیں

نکلا پرے سے شیث ربیعی جفا شعار
تیروں کا مینہ برس گیا پیاسے پہ ایک بار
اُڑ اُڑ کے طے جو کرتا تھا راہِ ثواب کو
نکلے کماں کشوں کے جو حلقے سے وہ جناب
ڈونے لہو میں لٹنے لگا گلشنِ شباب
مجروح شبیر بیچ میں تھا اس ہجوم کے

طے کر کے معرکہ یہ پھرے تھے کہ ناگہاں
دل توڑ کر انی جو ہوئی پشت سے عیاں
ٹکڑے کبد کے خوں کے ڈریڑوں میں بہہ گئے
سینہ دھرے تھے زیں پہ ایالِ فرس پہ سر
اٹکا ہوا تھا پسلیوں کے بیچ میں جگر
تڑپا تھا جو گھوڑے پہ صدمہ تھا ان کا

چلا رہا تھا یوں پسرِ سعد روسیاہ
ہم میں کسی سے قتل نہ ہوتا یہ رشکِ ماہ
کردے خبر کوئی علی اکبر گزر گئے
بڑھ کر پکارا شمر ستمگار و بدخصال
جلد آکے دیکھیے پسرِ نوجواں کا حال
جو حملہ ور تھا تیغ و دو دم تول تول کے

پہونچی یہ جاں گزا جو صدا گوشِ شاہ میں
دوڑے گرے اُٹھے کئی جا اثنائے راہ میں
چاروں طرف جلال میں جاتے تھے اس طرح

ہمراہ تھے شقی کے کماں دار دس ہزار
راکب کا جسم گھوڑے کے پہلو ہوئے فگار
غل تھا کہ پر خدا نے دیئے ہیں عقاب کو
تھی پھر تو برچھیوں کی کرن گرد آفتاب
روتے تھے خوں کے آنسوؤں سے دیدۂ رکاب
نیزے پہ نیزے کھا رہے تھے جھوم جھوم کے

چھاتی پہ سامنے سے لگی ظلم کی سناں
نیزہ جگر سے کھینچ کے تڑپا وہ نوجواں
گھوڑے پہ یا علی ولی کہہ کے رہ گئے
چھوٹی تھی لٹکے ہاتھوں سے نے تیغ نہ سپر
لختے جمے ہوئے تھے لہو کے ادھر اُدھر
غل تھا کہ دم نکلتا ہے کڑیل جوان کا

ابنِ نمیر کہتا تھا نیزہ چلا ہے واہ
بیکس حسینؑ ہو گئے دنیا ہوئی تباہ
دیکھو تڑپ رہے ہیں کہ شبیر مر گئے
ای ابنِ فاطمہ خلفِ شبیر ذوالجلال
لاشہ سموں سے گھوڑوں کے ہوئے گا پامال
دم توڑتا ہے اب وہی منہ کھول کھول کے

دُنیا سیاہ ہو گئی شہ کی نگاہ میں
آئے جگر کو تھامے ہوئے قتل گاہ میں
بچے کو کھو کے شبیر تڑپتا ہے جس طرح

دوڑے گئے ادھر کبھی جھپٹے ادھر کبھی
بن میں کبھی تھے رن میں کبھی نہر پر کبھی

تھامی کمر کبھی تو سنبھالا جگر کبھی
کی مُڑ کے خیمہ گاہ کی جانب نظر کبھی

تشویش تھی کہ مادر اکبر نکل نہ آئے
خیمہ سے بنت فاطمہ باہر نکل نہ آئے

چلاتے تھے کہ ای علی اکبر کدھر ہو تو
مرتا ہی باپ ای مرے دلبر کدھر ہو تو

کچھ سوجھتا نہیں مرے یاور کدھر ہو تو
دن ہی کہ رات ای مہ انور کدھر ہو تو

آباد گھر حسین کا تاراج ہو گیا
خورشید دوپہر سے غروب آج ہو گیا

بیٹا ضعیف باپ کدھر ڈھونڈھنے کو جائے
بچھڑے پدر سے عین جوانی میں ہائے ہائے

دشمن کو بھی خدا نہ فراق پسر دکھائے
پھر بابا جان کہہ کے پکارو تو چین آئے

مرنے کی جس کی فصل تھی اُس نے قضا نہ کی
واحسرتا کہ عمر نے تم سے وفا نہ کی

ناگہ صدا یہ آئی کہ بابا ادھر ہوں میں
ای نخل باغ فاطمہ زیر شجر ہوں میں

خالق سے لو لگی ہی چراغ سحر ہوں میں
جلد آئیے کہ آپ کا پیارا پسر ہوں میں

درد جگر کہیں نہ اجل کا بہانہ ہو
دیدار دیکھ لے تو مسافر روانہ ہو

دوڑے حسین سن کے یہ آواز دردناک
دامن تھا سب قمیص تن یوسفی کا چاک

فرزند لوٹتا نظر آیا بروئے خاک
بس گر پڑے پسر کی برابر امام پاک

تڑپا جو دل تو لخت جگر سے لپٹ گئے
روحی فداک کہہ کے پسر سے لپٹ گئے

دیکھا کہ جسم سرد ہی بیحس ہیں دست و پا
دم ہی مگر حباب میں ہو جس طرح ہوا

منہ رکھ کے منہ پہ کہنے لگے شاہ کربلا
کیوں بابا جان کہہ دو گزرتی ہی دل پہ کیا

بولو تو منہ سے کچھ کہ میں بیکس امام ہوں
سوکھی زباں دکھا کے کہا تشنہ کام ہوں

سر پیٹ کر امام پکارے کہ ہائے ہائے
بیٹا حسین ڈھونڈھ کے پانی کہاں سے لائے

جاں اپنی دے کے لوں اگر اک جام ہاتھ آئے
ای نور عین پیاس تمہاری خدا بجھائے

سیّد سے بغض ہی سپہ بدصفات کو
گھیرے ہوئے ہیں خون کے پیاسے فرات کو

آنسو بہے یہ سنتے ہی اُس رشکِ ماہ کے
چاہا کہ مل لے آنکھوں کو قدموں پہ شاہ کے
کروٹ امامِ دیں کی طرف لی کراہ کے
کھولا جو منہ نکل گیا دم ساتھ آہ کے
اینٹھی زباں تو ہونٹھ بھی تھرّا کے رہ گئے
گیسو زمینِ گرم پہ بل کھا کے رہ گئے

جھک کر پکارے شاہ کہ بیٹا کدھر گئے
غش آگیا ہے دردِ جگر سے کہ مر گئے
باتیں بھی کچھ نہ کیں کہ جہاں سے گزر گئے
چلتے تھے ہم بھی اور نہ دم بھر ٹھہر گئے
یوں قافلے سے چھوٹ کے شبیر رہ گیا
سب نوجوان چلے گئے یہ پیر رہ گیا

سمجھے تھے ہم نبھے گا نہ پیر و جواں کا ساتھ
پیر و جواں کا ساتھ ہے تیر و کماں کا ساتھ
غربت میں کون دے پدرِ ناتواں کا ساتھ
واحسرتا کہ چھوٹ گیا کارواں کا ساتھ
خیر آگے آگے جاتے ہو تم آسرا تو ہے
گو ہم شکستہ پا ہیں پہ سر پر خدا تو ہے

آگے تمھارے مر نہ گئے ہم ہزار حیف
نکلا نہ اب بھی تن سے مرا دم ہزار حیف
تم نے کیا نہ باپ کا ماتم ہزار حیف
یہ عمر اور یہ الم و غم ہزار حیف
گھر جس کے دم سے ہو وہ سعادت نشاں مرے
قدرت خدا کی پیر جیے نوجواں مرے

تڑپے یہ کہہ کے شاہ جو بیٹے کی لاش پر
اس سانحہ کی ہو گئی رانڈوں کو بھی خبر
اک غل اُٹھا حرم سے کہ ہے ہے مرے پسر
بچوں کو لے کے بی بیاں دوڑیں برہنہ سر
آفت میں ایک کو خبرِ دست و پا نہ تھی
سر پر کسی کے تھی تو کسی کے ردا نہ تھی

سب بی بیوں میں ایک ضعیفہ کا تھا یہ حال
خم تھا کمر میں دوش پہ بکھرے ہوئے تھے بال
پیدا تھی زخمیوں کی تڑپ بسملوں کی چال
چلاتی تھی کدھر ہے ارے میرے نونہال
دیتی ہوں واسطہ میں رسالت پناہ کا
رستہ مجھے بتا دے کوئی قتل گاہ کا

کچھ سوجھتا نہیں مجھے مقتل ہے کس طرف
زخمی ہے جس میں شیر وہ جنگل ہے کس طرف
جس میں چھپا ہے چاند وہ بادل ہے کس طرف
لوگو شبیہِ احمدِ مرسل ہے کس طرف
ماں کا پیام کچھ اسے دینے کو آئی ہوں
اپنے مراد والے کے لینے کو آئی ہوں

ہی ہی کدھر ہی گیسوؤں والا پسر مرا
جنگل میں نے چراغ کیا کس نے گھر مرا
کس خاک پہ پڑا ہی لختِ جگر مرا
کس نخل کے تلے ہی وہ نورس ثمر مرا
پیٹوں گی بین کر کے تن پاش پاش پر
بٹھلا دو ہاتھ تھام کے اکبر کی لاش پر

لوٹا اجل نے میرے بھرے گھر کو ہی غضب
خوں میں ڈبو دیا مرے نور کو ہی غضب
پرزے کیا شبیہ پیمبرؐ کو ہی غضب
برچھی لگی مرے علی اکبر کو ہی غضب
اِس عمر میں یہ نخلِ جوانی کا پھل ملا
بستی مری لٹی تجھے کیا ای اجل ملا

ای میرے خوش بیاں مجھے اپنی صدا سُنا
ای میرے نوجواں مجھے اپنی صدا سُنا
ای میرے تن کی جاں تجھے اپنی صدا سُنا
ای میرے قدرداں مجھے اپنی صدا سُنا
عاشق کے دل کو صبر کہاں ہی فراق میں
گھر سے نکل پڑی ہوں ترے اشتیاق میں

ای پیچدار گیسوؤں والے ترے نثار
ای یادگارِ گیسوؤں والے ترے نثار
ای مشکبار گیسوؤں والے ترے نثار
ای میرے چاند گیسوؤں والے ترے نثار
دنیا سیاہ ہو گئی رستہ پہاڑ ہی
جنگل بسا ہوا ہی مرا گھر اُجاڑ ہی

ای میرے گلبدن مرے ابرو کماں جواں
ای میرے کم سخن مرے شیریں بیاں جواں
ای میرے صف شکن مرے حیدر نشاں جواں
ای میرے تیغ زن مرے شبیر زباں جواں
لاکھوں سے معرکہ طپش آفتاب میں
دو دن کی پیاس نے تجھے مارا شباب میں

وہ بھینی بھینی تن کی مجھے بو سنگھاؤ پھر
ماں صدقے جائے تنتے ہوئے گھر میں آؤ پھر
کھل جائے ماں کا غنچۂ دل مسکراؤ پھر
جی بھر کے میں گلے سے لگا لوں تو جاؤ پھر
غربت میں شوق سے شہ والا کا ساتھ دو
مجکو بٹھا کے پردے میں بابا کا ساتھ دو

گھبرا کے ایک شخص نے راوی سے یوں کہا
بی بی یہ کونسی ہی جو نکلی ہی نے ردا
مریم ہی یا خدیجہ ہی یا بنتِ مصطفےٰ
بولا وہ کانپ کر کہ قیامت ہوئی بپا
خواہر حسین کی ہی نواسی نبی کی ہی
منہ پھیر لے ارے یہی بیٹی علیؑ کی ہی

لکھا ہی ایک راوی غمگین و دل کباب
تھی دشت بے نوا میں وہ بی بی جو بے نقاب
چہرے پہ آفتاب کے تھا دامنِ سحاب
گیتی کو زلزلہ تھا زمانہ کو اضطراب
گر گر کے آشیانوں سے طائر پھڑکتے تھے
چنگھاڑتے تھے شیر ہرن سر پٹکتے تھے

اس حشر میں جو شہ نے بہن کی سنی صدا
جلدی اُٹھا کے لاش چلے شاہِ کربلا
دیکھا کہ دوڑی آتی ہی زینب برہنہ پا
رو کر پکارے واعجبا وامصیبتا
سر ڈھانپ لو رداسے قیامت بپا نہ ہو
گھر میں چلو بہن علی اکبر خفا نہ ہو

اب روک دے کمیتِ قلم کی عناں انیس
بزمِ عزا میں سب ہیں ترے قدرداں انیس
پیری ہی یہ سفر کا رہے دھیان ہاں انیس
کیا جانیے روانہ ہو کب کارواں انیس
خیمے مسافرانِ عدم نے نکالے ہیں
جس قافلہ میں تم ہو وہ سب چلنے والے ہیں

رباعی

دم الفتِ حیدر کا جو بھرتا ہوں میں
حال آتا ہی دل کو وجد کرتا ہوں میں
ممکن ہی کہاں صفاتِ ہمنامِ خدا
کیا آگے کہوں خدا سے ڈرتا ہوں میں

رباعی

سینے میں یہ دم مثلِ سحر گاہی ہی
جو ہی اس کارواں میں وہ راہی ہی
پیچھے کبھی قافلہ سے رہتا نہ انیس
ای عمرِ دراز تیری کوتاہی ہی

مرثیہ (۱۳)

جب غازیانِ فوجِ خدا نام کر گئے
اُمت کی مغفرت کا سر انجام کر گئے
لاکھوں سے تشنہ کام لڑے کام کر گئے
فیض اپنا مثلِ ابرِ کرم عام کر گئے
پڑھتے ہیں سب درود جو ذکر اُن کے ہوتے ہیں
ایسے بشر وہ تھے کہ ملک جن کو روتے ہیں

دیندار و سرفروش و شجاع و خوش اعتقاد
زخموں کو نخلِ قد پہ وہ سمجھے گلِ مراد
ہاتھوں میں تیغیں اور دلوں میں خدا کی یاد
مردانگی یہ پیاس میں فاقوں میں یہ جہاد
تیغوں سے بند کونسا اُن کا کٹا نہ تھا
پر معرکے سے پاؤں کسی کا ہٹا نہ تھا

برسوں رہے گا چرخ میں گر آسمانِ پیر
گو رے نہ اُن کے بازو نہ روئے مہِ منیر
لیکن نظر نہ آئے گا اُن کا کہیں نظیر
خورشید جن کے سامنے اک ذرّۂ حقیر
پُرخوں قبائیں جسم میں سینے تنے ہوئے
پہونچے ریاضِ خلد میں دولہا بنے ہوئے

رستم اُٹھا نہ سکتا تھا سر اُن کے سامنے
شیروں کے کانپتے تھے جگر اُن کے سامنے
پھیکی تھی روشنیِ قمر اُن کے سامنے
اُڑتا تھا رنگِ روئے سحر اُن کے سامنے
بخشا تھا نورِ حق نے ہر اک خوش صفات کو
ہوتا تھا دن جو گھر سے نکلتے تھے رات کو

پیشانیوں پہ جلوہ نما اخترِ سجود
رُخ سے عیاں جلال و جوان مردی و نمود
دیکھیں جو اُن کا نور تو قدسی پڑھیں درود
شیدائے آلِ شیفتۂ واجب الوجود
جینے کی شاہِ دیں کو دعا دے کے مر گئے
ایمان کے آئینہ کو جِلا دے کے مر گئے

تاثیر کر گئی تھی اُنھیں صحبتِ امام
لبریز تھے محبتِ حیدر سے دل کے جام
تھا نزع میں بھی خشک لبوں پر خدا کا نام
ذی قدر و ذی شعور و دلاور خجستہ کام
لشکر جو اُن پہ ٹوٹ پڑے شام و روم کے
تلواریں کھائیں سینوں پہ کیا جھوم جھوم کے

لاکھوں میں انتخاب ہزاروں میں لاجواب
وہ نورِ رو وہ جلال وہ رونق وہ آب و تاب
بس یک بیک جہاں میں اندھیرا سا چھا گیا
گُل ہو گئے عقیل کی تربت کے جب چراغ
ماتم سے بھانجوں کے ہوا تھا نہ انفراغ
لاشے اُٹھائے جنگ کرے یا بکا کرے
صدمہ یہ تھا کہ لُٹنے لگی دولتِ پدر
مارے گئے جہاد میں جب دم وہ شیر نر
دریا بہے لہو کے بڑا کشت و خوں ہوا
پیری میں قہر ہے خبرِ مرگِ نوجواں
نکلیں سروں کو پیٹتی خیمے سے بی بیاں
یوں گھر اُلٹ پلٹ تھا امامِ حجاز کا
غل تھا کہ خوں میں بھر گیا سقائے اہلِ بیت
ہم لُٹ گئے گزر گیا سقائے اہلِ بیت
ہے ہے کہاں سے اپنے بہشتی کو لائیں گے
ہلتا تھا خیمہ روتے تھے یوں اہلِ بیتِ شاہ
چلاتی تھی کہ نہر کی مجھکو بتاؤ راہ
خم تھے گرا تھا کوہِ مصیبت حسین پر
ماتم اِدھر تھا جشن میں تھے اہلِ شر اُدھر
انعام بانٹتا تھا ہر اک کو عمر اُدھر
غل تھا کہ بس حسین بہت روئے بھائی کو

تھا خشک و تر پہ جن کا کرم صورتِ سحاب
زہرا کے گھر کے چاند زمانے کے آفتاب
دن بھی ڈھلا نہ تھا کہ زوال اُن پہ آگیا
جعفر کے لاڈلوں نے دیئے شہ کے دل کو داغ
پامال ہو گیا حسنِ مجتبیٰ کا باغ
جس پر گرے یہ کوہِ مصیبت وہ کیا کرے
نکلے نبرد کو اسد اللہ کے پسر
رخصت ہوئے حسین سے عباسِ نامور
ڈھلتے تھے دوپہر کہ علم سرنگوں ہوا
ریتی پہ تھرتھرا کے گرے شاہِ انس و جاں
تھا خانۂ علی میں تلاطم کہ الاماں
جس طرح ٹوٹ جاتا ہے لنگر جہاز کا
دنیا سے کوچ کر گیا سقائے اہلِ بیت
فریاد ہے کہ مر گیا سقائے اہلِ بیت
سوکھی زبان اب کسے بچے دکھائیں گے
صدمے سے حالِ زوجۂ عباس تھا تباہ
ہے ہے میں لٹ گئی مرے بچے ہوئے تباہ
ماتم تھا بی بیوں میں سکینہ کے بین پر
بجتے تھے شادیانۂ فتح و ظفر اُدھر
روتے تھے دیکھ دیکھ کے حضرت اِدھر اُدھر
کوئی جواں ہو اور تو بھیجو لڑائی کو

باقی نہیں کوئی تو وغا کو خود آئیے
حیدر کی ذوالفقار کے جوہر دکھائیے
زخم سناں و خنجر و شمشیر کھائیے
گرمی بڑی ہے آج لہو میں نہائیے
آمادہ ہم تو دیر سے بہر ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

کاٹے ہیں جس نے بازو و لخت دل امیر
ہے خوب آبدار وہ شمشیر بے نظیر
چھیدا ہے جس سے مشک کو موجود ہے وہ تیر
یہ گرز وہ ہے ضرب سے جس کی ہوئے اخیر
تڑپے تھے جس سے مشک کو دانتوں سے چھوڑ کر
برچھی وہ ہے جو نکلی تھی پہلو کو توڑ کر

صابر بڑے ہیں آپ یا شاہ انس و جاں
اک بھائی کے فراق میں یہ نالہ و فغاں
رونے سے جی اٹھیں گے نہ عباس نوجواں
حضرت پکارتے ہیں کسے بھائی کہاں
ملتا ہے کب جہاں میں بھلا جو گزر گیا
اب فکر اپنی کیجیے وہ شیر مر گیا

اکبر نے کی غضب کی نظر سوئے فوج شام
کانپے یہ غیظ سے کہ اگلنے لگی حسام
کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے قبلۂ انام
سنتے ہیں آپ لشکر اعدا کے یہ کلام
خوں تن میں جوش کھاتا ہے ہنگام جنگ ہے
مولا بس اب تو حوصلۂ صبر تنگ ہے

ان کے کلام سننے کی کس کے جگر میں تاب
خادم زبان تیغ سے دے گا انھیں جواب
کیا اپنے دل میں سمجھے ہیں یہ خانماں خراب
نعرہ کروں تو شیر کا زہرہ ہو آب آب
آداب شاہ سے نہیں ہم بول سکتے ہیں
زخم جگر پہ اب تو نمک یہ چھڑکتے ہیں

عمو کو قتل کر کے بہت ہو گئے ہیں شیر
ان ظالموں کے زعم میں اب ہم نہیں دلیر
معلوم ہوگا لاشوں کے جب ان میں ہونگے ڈھیر
دیکھیں تو کون اب ہے زبردست کون زیر
مجمع جو ہے ادھر ہمیں تنہا سمجھتے ہیں
اچھا یونہیں سہی ہم انھیں کیا سمجھتے ہیں

جوہر دکھائیں ہم کو بہادر جو ہیں بڑے
تب جانیں ایک ایک نکل کر اگر لڑے
کیا لطف ہے جو ایک پہ سو لے کے گر پڑے
چاہیں جو ہم تو نہر کو لے لیں کھڑے کھڑے
دیتے ہیں سرکشوں سے کوئی جو دلیر ہیں
فاقہ ہو یا کہ پیاس ہو پھر شیر شیر ہیں

ہم کو یہ طعن و طنز کی باتیں نہیں پسند
کوفے میں لینگے دم جو اٹھائینگے پھر سمند
ہونٹوں پہ غم سے اب ہے یہاں جانِ دردمند
کاٹیں تبر سے تیغ سے خنجر سے بند بند
ہنس ہنس کے جسم پر تبر و تیر کھائیں گے
تیغِ زباں کے زخم اٹھائے نہ جائینگے

گھبرا کے دیکھنے لگے بیٹے کے منہ کو شاہ
فرمایا خیر کہہ لیں جو کہنے ہیں رو سیاہ
کیوں کانپتے ہو غیظ سے اے میرے رشکِ ماہ
لازم ہے صبر و شکر کہ راضی رہے اللہ
غصہ اسی طرح اگر آئے گا آپ کو
خنجر کے نیچے دیکھ لیے کس طرح باپ کو

برہم نہ ہو تمھیں سرِ شبیر کی قسم
لو گھر میں جاؤ خیر سمجھ لیں گے ان سے ہم
دیکھو ہمیں کہ بھائی کے بازو ہوئے قلم
تلوار دل پہ چل گئی مارا نہ ہم نے دم
سب جل کے خاک ہوں علی بھی دعا کروں
پر اُمتِ نبی ہے بجز صبر کیا کروں

یہ سن کے زرد ہو گئے ہمشکلِ مصطفا
رو کر کہا یہ کرتے ہیں ارشاد آپ کیا
وہ وقت وہ گھڑی نہ دکھائے ہمیں خدا
بابا نہ ہو تو بیٹے کے جینے کا کیا مزا
آمادۂ فنا ہیں خوشی دل سے فوت ہے
پھر خضر کی حیات ملی گر تو موت ہے

کیا پہلے سر کٹائیے گا یا شہِ زماں
کس اشتیاق سے شہِ دیں نے کہا کہاں
آگے جو کچھ رضائے خدا اے پدر کی جاں
جیتے ہیں پیر سامنے مرتے ہیں نوجواں
دیکھو کہ چھوٹے بھائی کے ماتم میں روتے ہیں
پالا تھا جن کو ہم نے وہ دریا پہ سوتے ہیں

یہ کہہ کے اٹھ کھڑے ہوئے سلطانِ بحر و بر
پٹکے سے باندھنے لگے ٹوٹی ہوئی کمر
قدموں پہ گر پڑے علی اکبر بچشمِ تر
کی عرض رحم کیجیے مر جائے گا پسر
آگے مرے جو ہو گی شہادت امام کی
دنیا میں آبرو نہ رہے گی غلام کی

چھوٹے تھے جو کہ سن میں بڑے کر گئے وہ کام
یا شاہ کیا لڑائی کے قابل نہیں غلام
عمو کے خوں کا لینگے لعینوں سے انتقام
ہم نے بھی تیغ باندھی ہے بچپن سے یا امام
عزت ملی ہے خلق میں صدقے سے آپ کے
بیٹا وہی جو رنج میں کام آئے باپ کے

انصاف آپ کیجیے یا سرورِ عرب
بیٹا تو گھر میں بیٹھے لڑے باپ تشنہ لب

مارا گیا نہ آج تو کل یہ کہیں گے سب
کیسا لہو سفید ہے دنیا کا ہے غضب

سر کو کٹا کے باپ جہاں سے گزر گیا
بیٹا جوان باپ کے آگے نہ مر گیا

بہرِ رسول رن کی رضا دیجیے مجھے
صدقہ علی کا اذنِ وغا دیجیے مجھے

مرتا ہوں یا امام جِلا دیجیے مجھے
یادِ خدا میں دل سے بھلا دیجیے مجھے

کھولیں کمر حضور تو دل کو قرار ہو
کہہ دیجیے کہ جا علی اکبر نثار ہو

شہ نے کہا تمھیں مرے دل کی نہیں خبر
پیارے کہاں سے لاؤں میں اس طرح کا جگر

ہو باپ کا عصائے ضعیفی جواں پسر
جب تم نہ ہو گے پاس تو مر جائے گا پدر

ایسے ہنسے نہ تھے کہ ہمیں تم رلاتے ہو
شادی کے دن جو آئے تو مرنے کو جاتے ہو

راتیں یہ عیش کی ہیں مرادوں کے ہیں یہ دن
پورے جواں نہیں ابھی کیا ہے تمھارا سن

اکبر تری جوانی پہ روئیں گے انس و جن
کیونکر قرار آئے گا ماں کو تمھارے بن

کیسی ہوا چلی چمنِ روزگار میں
سید کا باغ لٹتا ہے فصلِ بہار میں

دیتا اگر تمھیں کوئی فرزند ذوالجلال
ہوتی پدر کی قدر سمجھتے ہمارا حال

رخصت کا آپ سے یوں ہی کرتا وہ جب سوال
تب جانتے کہ دیتے اسے رخصتِ جدال

کیا جانے وہ مزہ جسے اس کا ملا نہیں
اچھا سدھارو تم سے ہمیں کچھ گلا نہیں

تسلیم کرکے بولے علی اکبرِ غیور
لاکھوں برس جہاں میں سلامت رہیں حضور

فرمایا شہ نے خیر اجل بھی نہیں ہے دور
برچھی لگا کے دل پہ خوشی آمد یہ کیا ضرور

تقریر میں پدر کو نہ اب بند کیجیے
خیمے میں جا کے ماں کو رضامند کیجیے

ہیں مبتلائے رنج بھلا کیا ہمارا پیار
تم سے جو سو پسر ہوں تو اس راہ میں نثار

ہر دم خدا سے خیر کا ہوں میں امیدوار
ہاں ماں جو جانے دے تو مرا کیا ہے اختیار

سینے میں دل ہلے گا بدن تھرتھرائے گا
رخصت کا نام سنتے ہی غش اُس کو آئے گا

سب جانتے ہیں جو ہی پھوپھی کو تمھاری چاہ
باہیں گلے میں ڈالے گی زینب باشکِ آہ
یہ مرحلہ بھی کم نہیں زنجیر و طوق سے
حسرت یہ ایک کو ہی کہ دولھا بنے پسر
پوتے کی آرزو میں ہی اک سوختہ جگر
ہردم یہی ہی ذکر جو فضلِ الٰہ ہو
ماں کہتی تھی بناؤں گی دولہ اسی برس
کچھ اس میں نہ ور ہی نہ ہمارا نہ اُن کا بس
شکوہ نہ چرخ کا نہ شکایت ہی آپ کی
روتے ہوئے چلے علی اکبر سوئے خیام
روتا ہوا جو ڈیوڑھی سے آیا وہ نیک نام
دامن سے آکے بالی سکینہ چمٹ گئی
ماں گرد پھر کے بولی کہ اے میرے گلعذار
در پر تڑپ تڑپ کے میں جاتی تھی بار بار
گرمی یہ اور قحط کئی دن سے آب کا
تر ہی قبا پسینے میں پنکھا کوئی ہلاؤ
جھاڑوں ردا سے گرد میں زلفوں کی بیٹھ جاؤ
صدمہ جو دل پہ ہو اسے کچھ مُنہ سے کہتے ہیں
صغرا کی تو وطن سے کچھ آئی نہیں خبر
اکبر نے عرض کی کہ ہیں سب خیر سے مگر
ملتی نہیں رضا ہمیں آنسو بہلتے ہیں

معلوم ہوگا جاؤ گے جب سوئے خیمہ گاہ
قدموں پہ گر کے آپ کے ماں ہوگی سدِّ راہ
دونوں رضا جو دیں تو چلے جاؤ شوق سے
آئے دُلھن جو چاند سی آباد ہو یہ گھر
نخلِ مراد کا یہی دنیا میں ہی ثمر
اُنیسویں برس علی اکبر کا بیاہ ہو
مرنے کی تم کو عین جوانی میں ہی ہوس
ہم بھی مرینگے خیر نہیں اتنا پیش و پس
پیری میں یہ بھی رنج تھا قسمت میں باپ کی
کانپا یہ دل کہ بیٹھ گئے خاک پر امام
دوڑی پسر کو دیکھ کے بانوئے تشنہ کام
زینب بلائیں لیکے گلے سے لپٹ گئی
تم صبح سے گئے تھے اب آئے یہ ماں نثار
کھولو بس اب کمر کہ مرا دل ہی بے قرار
رُخ تمتما گیا ہی مرے آفتاب کا
سنولا گئے ہو دھوپ میں واری ہوا میں آؤ
گھٹ جائے گا لہو مرا آنسو نہ تم بہاؤ
کیا ہی جو اشک نرگسی آنکھوں سے بہتے ہیں
جلدی کہو کہ مُنہ سے نکلتا ہی اب جگر
لُٹتا ہی کوئی آن میں خیر النسا کا گھر
بابا گلا کٹانے کو میداں میں جاتے ہیں

اس وقت کس سے درد دل اپنا کہوں میں آہ — تم بھی ہو سد راہ پھوپھی بھی ہیں سد راہ
چھائی ہے واں گھٹا کی طرح شام کی سیاہ — اماں مدد کرو کہ کمر باندھتے ہیں شاہ
اب زندگی ہے تلخ بہت دق ہیں جان سے — الفت نے آپ کی ہمیں کھویا جہان سے

دینے نہیں رضا جو امام فلک اساس — خاطر فقط یہ آپ کی ہے اور پھوپھی کا پاس
اب غیر پاس کوئی نہیں ان کے آس پاس — ناطاقتی ہے ضعف ہے فاقہ ہے اور پیاس
کیونکر لڑینگے وہ کہ سراپا ضعیف ہیں — پیری میں دل ضعیف ہے اعضا ضعیف ہیں

عباس جب سے مر گئے روتے ہیں دم بدم — رخ زرد ہے کماں کی طرح ہو گئے ہیں خم
چلوں میں تیر جوڑتے ہیں واں بانی ستم — قرباں ہوں کس طرح پسر فاطمہ پہ ہم
سب روکتے ہیں ان کی طرف جائیں کس طرح — ماں کو پھوپھی کو بہنوں کو سمجھائیں کس طرح

بابا کا حکم ہے کہ رضا جا کے ماں سے لاؤ — راضی پھوپھی ہوں جب تو لڑو اور زخم کھاؤ
مرضی ہے آپ کی کہ مرے پاس سے نجاؤ — یا فاطمہ تمھیں علی اکبر کے کام آؤ
چلنے لگیں نہ تیر شہ مشرقین پر — نرغہ ہے ظالموں کا تمھارے حسین پر

دیکھی گئی نہ ماں سے یہ بیتابی پسر — وارث کی بےکسی پہ لگا کانپنے جگر
ہاتھوں سے دل کو تھام کے بولی وہ نوحہ گر — دولت پہ فاطمہ کے تصدق تمام گھر
پہلے نہ کچھ کہا تھا نہ اب روکتی ہوں میں — روتے ہو کس لیے تمھیں کب روکتی ہوں میں

زہرا کے لال پر مرے مادر پدر نثار — عابد نثار اصغر تشنہ جگر نثار
جانیں ہزار ہوں تو فدا لاکھ سر نثار — قربان گھر کنیز تصدق پسر نثار
گھبرائی گو کہ ہوں پہ بہو میں علی کی ہوں — مانگو گے جو وہ دونگی کہ لونڈی سخی کی ہوں

مجھ پر حوالہ کرتے ہیں گر شاہ خوش خصال — رخصت نہ تم کو دوں یہ بھلا ہے مری مجال
صدقہ انھیں کا ہے کہ ملا تم سا نونہال — رخصت کا صدقے جاؤں پھوپھی سے کرو سوال
ہم سب کنیزیں بنت امیر عرب کی ہیں — اصغر ہو یا کہ تم وہی مختار سب کی ہیں

کہنے کو یوں ہیں چاہنے والے تمہارے سب
دن کو انھوں نے دن کبھی جانا نہ شب کو شب
مجھ سے نہ کچھ نہ سیدِ عالی سے پوچھیے
روتے ہوئے گئے علی اکبر پھوپھی کے پاس
زانو پہ سر لیے ہو کبرا ہی بے حواس
اب تاب و طاقت جسد روح و دل گئی
اکبر سے مجکو یہ نہ توقع تھی ہی غضب
اس گل نے ہائے میری ریاضت بھلا دی سب
ہیں محو رن کے شوق میں رخصت کے دھیان میں
یاں نے ہمارے چین نہ آتا تھا کوئی دم
کیا دخل تھا جو ڈیوڑھی سے باہر رکھیں قدم
جاگی ہوں میں جو چونک کے راتوں کو روئے ہیں
کنگھی کسی کے ہاتھ کی بھاتی نہ تھی کبھی
نے اُن کے ماں کی قبر پہ جاتی نہ تھی کبھی
میرے سوا کسی کو کبھی جانتے نہ تھے
ہر چند دونوں تھے مرے فرزند خُرد سال
راتوں کو جب لپٹتے تھے مجھ سے وہ نونہال
وہ دونوں مرنے والے تو پہلو میں ہوتے تھے
چھوٹا تو ضد بھی کرتا تھا راتوں کو بارہا
دن رات تھی خوشامدِ ہم شکلِ مصطفا
آقا کے نورِ عین ہیں عالی مقام ہیں
لیکن ہے اُن کے عشق سے نسبت کسی کو کب
پوچھیے انھیں سے آپ کو جس شے کی ہے طلب
گر پوچھیے تو پالنے والی سے پوچھیے
دیکھا کہ غش پڑی ہے زمیں پر وہ حق شناس
اس حال میں بھی لب پہ یہی ہیں کلامِ یاس
کیوں صاحبو رضا علی اکبر کو مل گئی
اتنا نہیں خیال کہ ہے کون جاں بلب
نامِ خدا جواں ہوئے کیا ہم سے کام اب
سچ ہے کسی کا کون ہوا ہے جہان میں
مالک اب اور ہو گئے کوئی ہوئے نہ ہم
ہے ہے وہ پیار درد مصیبت وہ رنج و غم
پوچھو تو کس کی چھاتی پہ بچپن میں سوئے ہیں
نے میرے لپٹے نیند انھیں آتی نہ تھی کبھی
روئیں پسر پہ ان کو رلاتی نہ تھی کبھی
جو تھی سو میں تھی ماں کو تو پہچانتے نہ تھے
پر ان کے آگے اُن کا مجھے کچھ نہ تھا خیال
میں کہتی تھی ہٹو علی اکبر ہے میرا لال
پھیلا کے پاؤں یہ مری چھاتی پہ سوتے تھے
پر عون کیا عقیل تھا سمجھنے اُسے خدا
سینے پہ جب یہ سوتے تو اس نے یہی کہا
اماں یہ شاہزادے ہیں اور ہم غلام ہیں

رہتے تھے پاس باپ کے وہ غیرتِ قمر
قرآں پڑھنے بیٹھتی تھی جب دمِ سحر
غافل نہ ان کے پیار سے میں ایک آن تھی

اُلفت میں ان کی مجھکو کچھ اُن کی نہ تھی خبر
صورت پہ تھی انھیں کی تلاوت میں بھی نظر
قرآں تو رحل پر تھا حمایل میں جان تھی

میں نے انھیں پہ صدقے کیے اپنے دونوں لال
مانگے تو آ کے مجھ سے بھلا رخصتِ جدال
کیا خوب جیتے جی مرے جائینگے مرنے کو

تسکین تھی کہ باقی ہے اکبر سا نونہال
نکلوں گی ساتھ خیمے سے بکھرا کے سر کے بال
تلوار باندھ لی ہے ہمیں ذبح کرنے کو

بچپن میں تھا نہ ہم سے زیادہ کسی کا پیار
بھیگیں مسیں نمود ہوا سبزۂ عذار
ثابت ہوا ادھر ہی اُدھر مرنے جائینگے

اب کیا غرض گزر گئی وہ فصل وہ بہار
مالک ہیں خود بھلا مرا اب کیا ہے اختیار
میں مر بھی جاؤنگی تو وہ یاں تک نہ آئینگے

باہر سدھارے یا ابھی ہیں ماں سے کچھ کلام
سینے پہ مُنہ کو رکھ کے یہ بولا وہ لالہ فام
خادم جدا نہ تھا شہِ گردوں سریر سے

بھابھی نے کیوں لیا تھا ابھی کے پسر کا نام
آنکھیں تو آپ کھولیے حاضر ہے یہ غلام
کس جرم پر حضور خفا ہیں حقیر سے

کیا ہے قصور جس پہ یہ غصہ ہے یہ عتاب
روتا ہوں اب کہ صبر کی مجھکو نہیں ہے تاب
ہر دُکھ میں ہر بلا میں مددگار آپ ہیں

کرتا ہوں بات میں کوئی بے مرضیِ جناب
شکوہ یہ خاکسار کا ای بنتِ بوتراب
پالا ہے مجھکو مالک و مختار آپ ہیں

پیدا ہوا تو آپ کی صحبت مجھے ملی
یوسف کو کب ملی تھی جو دولت مجھے ملی
صدقہ ہے اس قدم کا جو سر تا فلک گیا

کرتی ہے روح شکوہ وہ راحت مجھے ملی
رکھا عزیز آپ نے عزت مجھے ملی
کی مہر آفتاب نے ذرہ چمک گیا

مرضی نہ ہو تو رن کو بھی جائے نہ یہ غلام
تکرار کی مجال نہ اصرار کا مقام
روتی ہیں آپ کس لیے اچھا نہ جائینگے

بندے ہیں ہم اطاعتِ مالک ہے ہم کو کام
مرتے اگر تو اس میں بھی تھا آپ ہی کا نام
پر یاد رکھیے مُنہ نہ کسی کو دکھائیں گے

یہ کہہ کے جھک گیا جو قدم پر وہ ذی وقار
پھیلا کے دونوں ہاتھوں کو اُٹھیں بحالِ زار
اُمڈا یہ دل کہ چشم کے ساغر چھلک پڑے
لیکر بلائیں بولیں کہ واری خفا نہ ہو
باتیں تھیں یہ تو پیار کی ساری خفا نہ ہو
آئے بلا حسین پہ جو اُس کو رد کرو
اُلفت کے جوش میں تو یہ منہ سے کہا مگر
کُبرے کو روتے دیکھ کے بولی وہ نوحہ گر
میں روکنے نہ پائی کہ وار اُن کا چل گیا
کیا جاکے اب نہ آئے گا گھر میں یہ نونہال
جس وقت سے شہید ہوے رن میں ذوالجلال
ایسا ہی اضطراب کہ کچھ جس کی حد نہیں
میں ہوش میں نہ تھی یہ قدم پر گرے تھے جب
لو مجھ پہ اب کھلا کہ یہ رخصت کی تھی طلب
اصلا خبر نہیں مرے دلبر نے کیا کہا
کیا کہدیا تھا مرنے کو جاے یہ گلبدن
بیخود ہوں جب سے رن میں ہارے تشنہ زمن
اتنی خبر نہیں علی اکبر کے پیار میں
زندوں میں ہوتی گر تو یہ کہتی کہ مر نہ جائیں
اٹھارھواں برس ہے دلھن تو نے مجھے دکھائیں
مرتی ہوں اشتیاق میں سہرا تو دیکھ لوں

بس ہوگئیں محبتِ قلبی سے بے قرار
شکوے کے بدلے منہ سے یہ نکلا کہ میں نثار
دیکھا جو آفتاب کو آنسو ٹپک پڑے
صدقے ہے تم پہ جان ہماری خفا نہ ہو
روتے ہو کیوں منگاؤ سواری خفا نہ ہو
اچھا سدھارو دُکھ میں پدر کی مدد کرو
اُٹھا یہ دل میں درد کہ تھرّا گیا جگر
کیا ماجرا ہوا مجھے مطلق نہیں خبر
کیا میں نے کہدیا کہ کلیجہ نکل گیا
ہے ہے مری کمائی پہ آجائے گا زوال
بے ہوش ہوں حواس میں ہے میرے اختلال
جو آپ میں نہ ہو سخن اس کا سند نہیں
میں بھی کہوں یہ بانوں پہ گرنے کا کیا سبب
اکبر کو میں نے ہاتھ سے کھویا تھا ہے غضب
میں نے جواب کیا دیا اکبر نے کیا کہا
راضی ہوئی تھی میں کہ خزاں ہو مرا چمن
کہتی ہوں کچھ زبان سے نکلتا ہے کچھ سخن
قابو میں ہے نہ دل نہ زباں اختیار میں
اِس پیاس میں شہید ہوں فاقوں میں زخم کھائیں
پالا ہے منتوں سے مرادیں مری بر آئیں
سہرے کے نیچے چاند سا چہرہ تو دیکھ لوں

رخصت کے نام سے مرا پھٹتا ہے اب جگر
ایسا نہ ہو کہ بانوے بیکس کو ہو خبر

گر سن لیا تو دل میں کہینگی وہ نوحہ گر
پیارا ہوا نہ بنتِ علی کو مرا پسر

سمجھی تھیں کیا جو دی اُسے رخصت جدال کی
زینب نے ہائے قدر نہ کی میرے لال کی

سچ ہے کہ اُس کی چاہ سے نسبت مجھے کہاں
ہوں لاکھ اُن کی چاہنے والی وہ پھر ہے ماں

آنکھوں کا نور قلب کی طاقت بدن کی جاں
آنچ آ گئی تو ہے وہ قیامت کہ الاماں

کیا سوچتے ہو صاحبو کچھ تم کو خیر ہے
ماں ہے تو ماں ہے خلق میں پھر غیر غیر ہے

ماں کی نہ کم تو ہے اور نہ کسی کا پیار
غصہ ہو یا کہ سخت کہے دل ہے پر نثار

بلبل فدا ہے گل پہ شکایت کرے ہزار
دنیا میں عاشقوں کے دلوں کو کہاں قرار

دیں ماں کا ساتھ نامِ خدا اب جوان ہیں
میرا ہے جب یہ حال پھر اس کی تو جان ہیں

جس دم سُنے یہ دور سے بانو نے سب کلام
آئی قریب حضرتِ زینب وہ نیک نام

کی عرض ہاتھ جوڑ کے اے خواہر امام
میں ہوں کنیز آپ کی اور یہ پسر غلام

کس کی مجال ہے جو کہے گا یہ کیا کیا
بی بی نے دی غلام کو رخصت بجا کیا

لونڈی ہے فاطمہ کی کنیزوں میں باوفا
ہو قطع وہ زباں جو کرے آپ کا گلا

حضرت کو ان کے سر پہ سلامت رکھے خدا
مالک ہیں آپ اس میں کسی کو ہے دخل کیا

کچھ جائے گفتگو ہے نہ ماں کو نہ باپ کو
ہے دخل اذن دینے نہ دینے کا آپ کو

غم کھائیے نہ خونِ جگر آپ پیجیے
عابد کو بھیجیے بھیجیے اصغر کو بھیجیے

ہے اختیار دیجیے رخصت نہ دیجیے
قربان جاؤں جو ہو مناسب وہ کیجیے

شادی ہو یا کہ غم ہو شریکِ ثواب ہوں
ہر طرح سے میں تابعِ حکمِ جناب ہوں

گھر میرا جب سے لٹ گیا اس گھر میں آئی ہوں
شکوے کا کوئی حرف کبھی لب پہ لائی ہوں

کسریٰ کی گو کہ پوتی ہوں سلطاں کی جائی ہوں
لونڈی ہوں آپ کی علی اکبر کی دائی ہوں

صدقہ یہ آپ کا ہے جو شہ کو عزیز ہوں
بھاوج نہ جانیے مجھے ادنیٰ کنیز ہوں

آپ اس کی ماں ہیں آپ کا فرزند ہی یہ لال
یہ عازم جدال ہی اور آپ کا یہ حال
آپ اس کو چاہتی ہیں یہ صدقے ہی آپ پر
قسمت بُری ہی اس میں کسی کا قصور کیا
پروا ہماری ہی نہ خیال ان کو آپ کا
عابد ہوں یا کہ یہ سبھی آنکھوں کے تارے ہیں

یہ سُن کے کانپنے لگی زینب جگر فگار
اللہ یہ محبتِ فرزند اور یہ پیار
رخصت نہ دے گی تو اگر اس نورِ عین کو
آواز سُن کے کانپ گئی بنت مرتضا
واری سدھارو خیر جو کچھ مرضیِ خدا
یاں والدہ بہشت سے تشریف لائی ہیں

تسلیم کرکے خیمے سے وہ سیمبر چلا
بانو پکارتی تھی کہ پیارا پسر چلا
لٹتے ہیں اہل بیت دوہائی امام کی
بھائی کے غم سے عابدِ بیکس تھے بے قرار
بہنیں پکارتی تھیں کہ بھیا ترے نثار
اک حشر تھا جدا علی اکبر جو ہوتے تھے

ہلتا تھا خیمہ رانڈوں میں تھی یہ دھڑا دھڑی
کوئی ادھر کو غش تھی کوئی تھی اُدھر پڑی
ماتم تھا یہ حسین کے تازہ جوان کا

دخل اس معاملہ میں کوئی دے یہ کیا مجال
قدموں کو چھوڑتا نہ کبھی یہ نکو خصال
پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہی باپ پر
اچھا رہیں کہ جائیں ہمارا بھی ہی خدا
تابع ہم آپ کے بھی ہیں ان پر بھی ہیں فدا
پر اب تو یہ نہ آپ کے ہیں نہ ہمارے ہیں

آئی صدا کے فاطمہ بیٹی یہ ماں نثار
تنہا ستم کی فوج میں ہی میرا گلعذار
کون اب بچائے گا مرے بیکس حسین کو
بانو کے منہ کو دیکھ کے اکبر سے یہ کہا
ترک ادب ہی تم کو اگر اب نہ دوں رضا
بنتِ نبی تمھاری سفارش کو آئی ہیں

پیچھے حرم کا قافلہ سب ننگے سر چلا
چلاتی تھی پھوپھی مرا لختِ جگر چلا
تصویر گھر سے جاتی ہی خیر الانام کی
اُٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار
سینوں کو پیٹتی تھیں جو اصغر بحالِ زار
جھولے میں پھوٹ پھوٹ کے اصغر بھی روتے تھے

آہوں کی بجلیاں تھیں تو نالوں کی تھی جھڑی
آفت کا وقت تھا تو قیامت کی تھی گھڑی
جاتا ہی گھر سے جیسے جنازہ جوان کا

نکلا حرم سرا سے جو وہ نورِ حق کا نور
حضرت کھڑے تھے خیمہ کی ڈیوڑھی پہ مثلِ طور
رخصت ہوں اب جو حکم شہِ نامدار ہو
گھوڑے پہ شاہزادۂ عالم ہوا سوار
تھا ثانیٔ براق فلک سیر راہوار
یوں سامنے سے وہ دمِ جولاں نکل گیا
حضرت تو یاں زمیں پہ گرے تھام کر جگر
آتا ہے اک جوان حسیں غیرتِ قمر
شان و شکوہ سب اسدِ کبریا کی ہے
ہے دھوم ذرّہ ذرّہ میں اس آفتاب کی
سر تا قدم ہے شان رسالت مآب کی
گھوڑے کے گرد جن و ملک کا ہجوم ہے
روشن کیا ہے روے منوّر نے راہ کو
حیراں ہے عقل دیکھ کے زلفِ سیاہ کو
چہرے کے نور سے شبِ مہتاب ماند ہے
یہ ذکر تھا کہ نورِ خدا جلوہ گر ہوا
چلائے اہلِ شام کہ طالع قمر ہوا
جلوہ دکھایا برق تجلیٔ طور نے
غش ہو گیا کوئی کوئی گر کر سنبھل گیا
خجلت سے آفتاب کا نقشہ بدل گیا
دریاے نورِ حق کا فقط اوج موج تھا

خادم نے دی صدا کہ برآمد ہوے حضور
دستِ ادب کو جوڑ کے بولا وہ ذی شعور
رو کر کہا حسین نے اچھا سوار ہو
گویا چلے جہاد کو محبوبِ کردگار
صرصر سے تند و تیز تو بجلی سے بے قرار
گویا ہوا پہ تختِ سلیماں نکل گیا
جاسوس نے یہ لشکرِ اعدا کو دی خبر
چہرے پہ جس کے نورِ محمد ہے جلوہ گر
کہتے ہیں سب بشر نہیں قدرت خدا کی ہے
خوشبو ہے زلف و جسم میں مشک و گلاب کی
تصویر ہے رسولِ خدا کے شباب کی
صلوا علی النبی کی بیاباں میں دھوم ہے
رخ پر نہیں ٹھہرنے کا یارا نگاہ کو
آغوش میں لیے ہے شبِ قدر ماہ کو
خالق گواہ ہے کہ اندھیرے کا چاند ہے
گویا رسولِ پاک کا رن میں گزر ہوا
ہنگام ظہر تھا پہ گمانِ سحر ہوا
خورشید کو چھپا دیا چہرے کے نور نے
صلِّ علیٰ کسی کی زباں سے نکل گیا
چمکا جو نور دھوپ کا جوبن بھی ڈھل گیا
سب پست تھے زمیں کے ستارے کا اوج تھا

صحرا کو شمع حسن نے تابندہ کر دیا
جو مردہ دل تھے دم میں انہیں زندہ کر دیا
ذروں کو آفتاب درخشندہ کر دیا
گردوں کو اُس زمین نے شرمندہ کر دیا
پایہ زمیں کا عرش کے ہمدست ہو گیا
جلوے سے اوجِ کاہکشاں پست ہو گیا

اللہ رے نبیرۂ مشکل کشا کی شان
تھی جس کے عضو عضو سے پیدا خدا کی شان
حیراں تھے لوگ دیکھ کے اُس مہ لقا کی شان
حمزہ کا رعب نورِ علی مصطفیٰ کی شان
پاکیزگی نسب میں بزرگی صفات میں
شیرینیٔ کلام حسن بات بات میں

کچھ حسن بچپنے کا تو کچھ آمدِ شباب
وہ گل سا جسم اور وہ چہرے کی آب و تاب
اپنی جگہ پہ خال کے نقطے ہیں انتخاب
پتلی کا نور جن کی سیاہی سے بہرہ یاب
گردن کی ضو میں طور تجلی طور کے
سب عضو تن ڈھلے ہوئے سانچے میں نور کے

دل پاک روح پاک نظر پاک جسم پاک
طینت میں آبِ خلد تھا اور کربلا کی خاک
غزوں سے جس کے حُسن کی حوروں کو جھانک تاک
یوسف جو دیکھ لے تو کہے روحنا فداک
نام اس کا لوح پر جو قلم نے رقم کیا
سو بار پڑھ کے سورۂ نور اس پہ دم کیا

کیا دخل چار ہو جو کسی نے ادب کی آنکھ
رکھتی تھی ان کا رعب یہ نہ عجم نہ عرب کی آنکھ
لاکھوں تھے اس طرف پہ جھپکتی تھی سب کی آنکھ
غصہ ستم کا قہر کی چتون غضب کی آنکھ
پانی تھا خوفِ جاں سے جگر ہر دلیر کا
آہو شکار کرتے تھے میداں میں شیر کا

غل تھا رسول پاک کے ثانی کو دیکھنا
حسن بہار باغ جوانی کو دیکھنا
کھلتے ہیں گل شگفتہ بیانی کو دیکھنا
یہ سب نمو ہے یہ غنچہ دہانی کو دیکھنا
نازک لب اس صفت کے دہن اس طریق کا
خاتم پہ جڑ دیا ہے نگینہ عقیق کا

کچھ عمر بھی نہیں ابھی اٹھارواں ہے سال
یہ بلوغ کس بہار میں ہوتا ہے پائمال
قامت ہے یہ کہ سروِ گلستانِ اعتدال
ماں باپ دیکھ دیکھ کے کیونکر نہ ہوں نہال
آنکھوں کے سامنے جو یہ قامت نہ ہوئے گی
بتلاؤ ماں کے دل پہ قیامت نہ ہوئے گی

زخمی جو ہو گی تیر سے یہ چاند سی جبیں — پٹکے گی سر کو خاک پہ بانوئے دل حزیں
نیزوں سے جب کٹینگے یہ رُخسار نازنیں — پیٹینگے دونوں ہاتھوں سے مُنہ اہلِ شاہِ دیں
سینہ چھدے پسر کا تو کیا دل کو کل پڑے — ایوب بھی جو ہو تو کلیجا نکل پڑے

ناگاہ فوجِ کیں سے عمر نے کیا کلام — یہ وقتِ کارزار ہے ای ساکنانِ شام
بس ہے یہی بساطِ شہنشاہِ خاص وعام — مارا گیا یہ شیر تو مرجائیں گے امام
لوٹو جناب فاطمہ زہرا کے باغ کو — ٹھنڈا کرو حسین کے گھر کے چراغ کو

تصویر مصطفےٰ کی مٹائے گا آج جو — کہتا ہوں میں کہ صاحبِ جاگیر ہوگا وہ
محبوبِ کبریا کے مشابہ ہے گر تو ہو — اب مصلحت یہی ہے کہ مہلت اُسے نہ دو
ہے اس سے کیا مراد حسین ہے کہ نیک ہے — دو لاکھ اس طرف ہیں دلاور وہ ایک ہے

دنیا نہ جائے دین کا گر ہو تو ہو ضرر — ٹکڑے کرو اسے کہ یہ دشمن کا ہے پسر
تم آبدیدہ ہو لب خشک اُس کے دیکھ کر — قطرہ نہ دوں میں گھٹنیوں اصغر بھی آئے گر
غیر از یزید اور کوئی حکمراں نہ ہو — اولادِ مرتضےٰ میں کسی کا نشاں نہ ہو

ہاں غازیو نہ اس کی جوانی کا غم کرو — نیزے پہ نیزے مارو ستم پر ستم کرو
برچھی اُٹھاؤ ہاتھوں میں تیغیں علم کرو — نخلِ مرادِ سبطِ نبی کو قلم کرو
بیٹا نہ جب رہا تو کدھر جائینگے حسین — گھوڑے سے یہ گرے گا تو مرجائینگے حسین

چھد جائے گا سناں سے جو اس شبیر کا جگر — تڑپیں گے کیا زمیں پہ شہنشاہِ بحر و بر
ڈیوڑھی سے ماں پکارے گی ہے ہے مرا پسر — نکلے گی خیمہ گاہ سے زینب برہنہ سر
حضرت تو پیٹتے ہوئے لاشے پہ آئینگے — ہم لوٹنے کو خیمۂ اقدس میں جائیں گے

یہ گلعذار دخترِ حیدر کی جان ہے — بہنوں کی زندگی ہے برادر کی جان ہے
بابا کی روح ہے تنِ مادر کی جان ہے — بے جان کرو اسے کہ یہ سب گھر کی جان ہے
جوشن یہی ہے بازوئے برنا و پیر کا — بعد اس کے خاتمہ ہے صغیر و کبیر کا

یہ سُن کے فوجِ کیں ہوئی آمادۂ نبرد
غل سن کے ہو گیا شہِ والا کا رنگ زرد
ماں گر پڑی زمیں پہ پھوپھی بلبلا گئی

قرنا پھکی سپاہ میں طبل و غا بجا
پیدل چلے نبرد کو باجے بجا بجا
حضرت پکارے لال پہ اعدا کے ریلے ہیں

لڑنے کو اس طرف سے عدو سب کے سب بڑھے
چومے قدم مہیب نے جھک کر یہ جب بڑھے
دہشت سے فوجِ شام کی بدلی سمٹ گئی

ڈھالوں کو رکھ کے چہروں پہ گر گر پڑے حسود
تھرّا گیا تمام جنودِ سقر ورود
عبرت سپاہِ شام پہ وہ چند ہو گئی

جرّار کی زرہ پہ لگے جب کئی خدنگ
چمکا اک آئنہ کہ ہوئی فوجِ شام تنگ
تھی کس کو تاب صاعقۂ شعلہ بار کی

تھم تھم کے یوں گیا صفِ اعدا پہ وہ دلیر
غازی جو بھوک پیاس میں تھا زندگی سے سیر
اک سیلِ زور و شور سے آئی گزر گئی

جب یہ بڑھے لہو تنِ اعدا کا گھٹ گیا
لشکر میں فرد فرد کا چہرہ جو کٹ گیا
سر داخلِ خزانۂ سرکار ہو گئے

دردِ دلِ حسین کا تھا ایک کو نہ درد
کانپے جو پاؤں بیٹھ گئے بھر کے آہ سرد
بدلی ستم کی واں علی اکبر پہ چھا گئی

باندھے پرے سواروں نے بڑھ بڑھ کے جابجا
چلّائے اہلِ بیت کہ ہے ہے یہ کیا بجا
رانڈو دعا کرو علی اکبر اکیلے ہیں

تنہا ادھر سے اکبرِ عالی نسب بڑھے
گویا پئے جہاد امیرِ عرب بڑھے
قدرت خدا کی دن جو بڑھا رات گھٹ گئی

گو تھے کئی ہزار پہ کیا ان کی ہست و بود
نورِ خدا کے سامنے ظلمت کی کیا نمود
باجوں کی فوجِ کیں کے صدا بند ہو گئی

صفدر نے پڑھ کے فاتحہ لی تیغِ شعلہ رنگ
دکھلائے تیغِ تیز نے بجلی کے رنگ ڈھنگ
یاد آ گئی ہر اک کو چمک ذوالفقار کی

جاتا ہی داؤں کر کے غزالوں پہ جیسے شیر
کشتوں کے پشتے ہو گئے دم میں کئی ڈھیر
ثابت نہ یہ ہوا صفِ اول کدھر گئی

باقی تھا جو حساب وہ لاشوں سے پٹ گیا
بس دفعۂ سپاہ کا دفتر الٹ گیا
پہلا ہی جائزہ تھا کہ بے کار ہو گئے

چہرے پہ ایک کے نہ بحالی نظر پڑی
جو صف بھری ہوئی تھی وہ خالی نظر پڑی

سر پر سبھوں کے تیغِ ہلالی نظر پڑی
سوے جنوب فوجِ شمالی نظر پڑی

غل تھا کہ تیغ تیز نہیں موت آتی ہے
کیونکر قدم تھمیں کہ زمیں سرکی جاتی ہے

ٹکڑے پڑے تھے خاک پہ بھالے اِدھر اُدھر
چھپتے تھے ڈر کے برچھیوں والے اِدھر اُدھر

پیشِ نظر تھے خون کے تھالے اِدھر اُدھر
ابتر تھے وحشت کیں میں رسالے اِدھر اُدھر

ملتا تھا فصل کا نہ ٹھکانا نہ باب کا
شیرازہ کھل گیا تھا ستم کی کتاب کا

بڑھ کر کسی نے وار جو روکا سپر کٹی
چار آئنہ کٹا زرہ غیرہ سر کٹی

نیزے کی ہر گرہ صفتِ نیشکر کٹی
سینہ کٹا جگر ہوا زخمی کمر کٹی

رہوار بھی دو نیم میانِ مصاف تھا
اِن سب کے بعد منہ کو جو دیکھا تو صاف تھا

وہ گھاٹ باڑھ اور وہ اس کی چمک دمک
کانپی کبھی زمیں کبھی تھرا گئے فلک

شعلہ میں یہ چمک تھی نہ بجلی میں یہ لپک
ہر ضرب میں سماسے تلاطم تھا تا سمک

کونین میں حواس بجا تھے نہ ایک کے
گاو زمیں سمٹتی تھی گھٹنوں کو ٹیک کے

سیدھی چلی وہ جب صفِ دشمن اُلٹ گئی
باقی تھی جتنی عمر تہِ تیغ کٹ گئی

آکر زمیں پہ جب سوے گردوں پلٹ گئی
بجلی سے رعد رعد سے بجلی لپٹ گئی

گرتے تھے جن زمین پہ منہ ڈھانپ ڈھانپ کے
ہٹتے تھے جبرئیل امیں کانپ کانپ کے

ملتا نہ تھا صفوں میں علم کا نشاں کہیں
چلّے کہیں تھے شست کہیں اور کماں کہیں

نیزے کہیں تھے ڈانڈ کہیں اور سناں کہیں
جمدھر کہیں کمند کہیں برچھیاں کہیں

اک اک سیاہ رو کا جگر داغ داغ تھا
جنگل تمام ڈھالوں کے پھولوں سے باغ تھا

چمکی گری اٹھی اِدھر آئی اُدھر گئی
خالی کیے پرے تو صفیں خوں میں بھر گئی

کاٹے کبھی قدم کبھی بالائے سر گئی
ندی غضب کی تھی کہ چڑھی اور اُتر گئی

اِک شور تھا یہ کیا ہے جو قہرِ خدا نہیں
ایسا تو رودِ نیل میں بھی جزر و مد نہیں

سر خود سروں کے چنبر گردن سے اُڑ گئے
ڈر ڈر کے سب پرند نشیمن سے اُڑ گئے
تھے قتل عام پر علی اکبر تلے ہوئے
اللہ رے دو آبۂ تیغ دو دم کا کاٹ
مقتل سے تا بہ نہر تھا دریائے خوں کا پاٹ
سختی کو جوڑ بند کے کب مانتی تھی وہ
آئی جدھر پلٹ کے صفوں کو بچھا گئی
ہر اک کڑی کو نرم سمجھ کر چبا گئی
چار آئنہ کا کاٹ اسی پر حوالہ تھا
یارا قرار کا تھا نہ صورت فرار کی
رویں تنوں کو تاب نہ تھی ایک وار کی
آگے بڑھے تو منہ وہیں کٹ جائے گیو کا
اتری زمیں پہ وہ سرِ دشمن پہ جب چڑھی
اک شور تھا صفوں میں کب اتری کب چڑھی
مقتل سے بھاگنے پہ تنک ظرف تُل گئے
زندہ کسی کو تیغ دو دم چھوڑتی نہ تھی
نے دم لیے گلا کوئی دم چھوڑتی نہ تھی
خود وہ دیے جو لڑتے تھے گھوڑوں کو داب کے
قعرِ سقر میں کشتۂ ضربِ نخست تھے
قبضہ میں تھا نہ زور نہ بازو درست تھے
ہر کج نہاد تیرِ اجل کا نشانہ تھا

ہاتھ آستیں سے اُڑ گئے سر تن سے اُڑ گئے
پائی جو راہ طائرِ جاں سن سے اُڑ گئے
رستے تھے بند زخموں کے کوچے کھلے ہوئے
آفت تھی جس کی باڑھ قیامت تھا جس کا گھاٹ
ہر دم تھی اس کو تازہ لہو چاٹنے کی چاٹ
ہر استخواں کو مغزِ قلم جانتی تھی وہ
تن سے اڑا دیا وہیں سر جس کو پا گئی
فولاد کی زرہ کو اشارے میں کھا گئی
ذکر اُس کا کیا ہے خود تو منہ کا نوالہ تھا
پیدل کی موت تھی تو خرابی سوار کی
ٹکڑے تھے دو کے ہاتھ پہ کھائی تھی چار کی
بجلی کی تھی کڑک کہ طمانچہ تھا دیو کا
دم بھر میں آبِ تیغ کی ندی غضب چڑھی
سب کو بخار تیغ سے لرزے کی تپ چڑھی
کانپے یہ نیزہ باز کہ سب بند کھل گئے
پیاسی یہ تھی کہ جسم میں دم چھوڑتی نہ تھی
بھاگیں کہاں کہ موت قدم چھوڑتی نہ تھی
بیڑی قدم میں بن گئے حلقے رکاب کے
نے سر ہوئے بہت جو لڑائی میں چست تھے
کھینچیں کسے کمانوں کے بازو بھی سست تھے
شانے بھی تھے قلم یہ نیا شاخسانہ تھا

تینوں کو ڈر کے عربدہ جو پھینکنے لگے
مغفر سروں کے مثل سبو پھینکنے لگے
حلقے کماں کے سب لب جو پھینکنے لگے
تنکا سمجھ کے تیر عدو پھینکنے لگے
ترکش بھی اہل ظلم کے آفت رسیدہ تھے
چلّے بھی کشمکش میں کماں سے کشیدہ تھے

کرتے تھے فتح جنگ کو جو ایک آن میں
رعشہ تھا اُن کے ہاتھ میں لکنت زبان میں
اُلجھاتے تھے کمند دیکھنے کمان میں
ترکش میں تیغیں رکھتے تھے نیزوں کو میان میں
تلوار رکھ کے ہاتھ سے منہ ڈھانپ لیتے تھے
آتی تھی تیغ جب تو سپر پھینک دیتے تھے

بڑھتے تھے جو پرے سے بڑے بول بول کے
پہلے اُنھیں کو مار لیا رول رول کے
حملہ کیا جو تیغ دودم تول تول کے
ہتھیار سب نے پھینک دیئے کھول کھول کے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دو دن کی پیاس میں علی اکبر غضب لڑے

دہشت سے کتنے ڈوب کے دریا میں مر گئے
اِس گھاٹ پر جو آئے سر اُن کے اُتر گئے
رستہ تھا ایک اِدھر وہ گئے یا اُدھر گئے
پھر پھر کے ہر طرف سے میانِ سقر گئے
نار اُن کے اشتیاق میں آب اُن کی لاگ میں
پھینکا ہوا نے آب میں پانی نے آگ میں

وہ حرب وہ شکوہ وہ شانِ پیمبری[۳]
نعرے وہ زور و شور کے وہ ضربِ حیدری
وہ تیغ خوں چکاں وہ جلالِ غضنفری
راکب جو رشکِ حور تو رہوار بھی پری
چالاک آہوانِ ختن اس قدر نہ تھے
اُڑ جاتا تھا ہما کی طرح اور پر نہ تھے

باریک جلد وہ کہ نظر آئے تن کا خوں
کُنڈے کو دیکھ کر مہِ نو ہوئے سرنگوں
رفتار میں وہ سحر کہ پریوں کو ہو جنوں
غنچے بھی کچھ بڑے ہیں کنوتی کو کیا کہوں
قرباں ہزار جاں فرسِ بے نظیر پہ
سوفار[۲] دو چڑھے ہوئے ہیں ایک تیر پہ

کوتاہ و گرد و صاف کنوتی کمر کفل
کیا خوشنما کشادگیِ سینہ و بغل
سیماب کی طرح نہیں آرام ایک پل
پھرتا تھا اس طرح کہ پھرے جس طرح سے کل
راکب نے سانس لی کہ وہ کوسوں روانہ تھا
تارِ نفس بھی اُس کے لیے تازیانہ تھا

وہ جست و خیز و سرعت و چالاکی سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سُم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج و شوخ و چشیم و سربلند
گر ہاں گئی ہوا سے ذرا باگ، اُڑ گیا — پتلی سوار کی نہ پھری تھی کہ مُڑ گیا

آہو کی جست شیر کی آمد پری کی چال — کبکِ دری خجل دلِ طاؤس پائمال
سبزہ سبک روی میں قدم کے تلے نہال — اک دو قدم میں بھول گئے چوکڑی غزال
جو آگیا قدم کے تلے گرد بر وہ تھا — چھل بل غضب کی تھی کہ چھلاوا بھی گرد تھا

بجلی کبھی بنا کبھی رہوار بن گیا — آیا عرق تو ابرِ گہر بار بن گیا
گہہ قلب گاہ گنبدِ دوار بن گیا — نقطہ کبھی بنا کبھی پرکار بن گیا
حیراں تھے اُس کے گشت پہ لوگ اُس ہجوم کے — تھوڑی سی جا میں پھرتا تھا کیا جھوم جھوم کے

جب اس جری نے قتل کیے پانچسو جواں — ہر صف سے ہر پرے سے اٹھا شورِ الاماں
چلایا ابن سعد سیہ قلب سخت جاں — نکلیں وہ دس ہزار کماندار ہیں کہاں (جہاں)
برچھی کا اب ہو کام نہ تلوار چاہیے — اِس نوجواں پہ تیروں کی بوچھار چاہیے

فاقہ ہے تین روز کا سولہ پہر کی پیاس — دیکھے نبیرۂ اسداللہ کے حواس
دریا سے تم قریب ہو اور اس قدر ہراس — برساؤ تیر دور سے جاؤ نہ اس کے پاس
بپھرے ہوئے اسے کہیں تلوار کھاتے ہیں — جب اُٹھ سکے نہ شیر تو نزدیک جاتے ہیں

یہ سُن کے تشنہ لب پہ چلے چار سو سے تیر — پتھر عقب سے پڑنے لگے روبرو سے تیر
آتے تھے فوج فوج سپاہِ عدو سے تیر — سب سرخ تھے شبیہ نبی کے لہو سے تیر
مقتل میں کیا ہجوم تھا اُس نورِ عین پر — پروانے گر رہے تھے چراغِ حسین پر

سینے پہ تیر کھا کے اُٹھایا جو راہوار — بجلی چمک کے ہو گئی گویا فلک کے پار
سر خاک پر گرانے لگی تیغ آبدار — تیروں کو پھینک پھینک کے بھاگے خطا شعار
حملہ کیا تھا جن پہ رُخ اُن کے تو پھر گئے — پر یہ پلٹ کے برچھیوں والوں میں گھر گئے

یوں آگیا سنانوں میں وہ آسمان جناب
سوکھی زباں میں پڑ گئے کانٹے بغیر آب
آمد ہوئی جو غش کی سر پاک جھک گیا
اِس حال میں بھی تیغ سے لیکن چھپایا قلم
زخم جگر سے بہنے لگا خون دم بدم
کھینچا جو اُس نے سینے سے نیزہ نکال کے ساتھ
نیزہ لگا کے بھاگ چلا تھا وہ نابکار
زخم سناں تھا سینۂ انور کے وار پار
پہونچوں سے اُس کے ہاتھ قلم ہو کے گر پڑے
گرنا تھا بس کہ سر پہ لگا گرز ہی ستم
رکھدی گلے پہ شیث نے شمشیر تیز دم
غل تھا کرو نہ رحم تن پاش پاش پر
حضرت کھڑے تھے خیمے کی پکڑے ہوئے طناب
ناگاہ آئی رن سے صدا ای فلک جناب!
لاشے پہ ظلم و جور بد افعال کرتے ہیں
سن کر یہ استغاثۂ فرزند خوش خصال
کھولے جناب فاطمہ کی بیٹیوں نے بال
ہی ہی پسر سے کون سی مادر بچھڑ گئی
نیزے سے کس کے لال کا زخمی ہوا جگر
کہتا ہی کون رن میں تڑپ کر پدر پدر
پروا نہ مجھ سے کیجیے سب جانتی ہوں میں

ہو جس طرح خطوط شعاعی میں آفتاب
طاقت بھی فرط ضعف سے دینے لگی جواب
وا حسرتا کہ ہاتھ بھی لڑنے سے رک گیا
لیکن جگر پہ لگ گیا اک نیزۂ ستم
نکلے ہوئے رکابوں سے تھراتے تھے قدم
دوپارۂ جگر نکل آئے سناں کے ساتھ
قربان جرأت پسر شاہ نامدار
ماری شقی کو دوڑ کے اک تیغ آبدار
لیکن فرس سے آپ بھی خم ہو کے گر پڑے
یوں جھک گئے کہ جھکتے ہیں سجدے میں جیسے خم
تلوار اک پڑی کہ ہوئیں پسلیاں قلم
دوڑا وہ گھوڑے اکبر مہرو کی لاش پہ
سن کر یہ غل رہی نہ دل ناتواں کو تاب
بیٹا جہاں سے جاتا ہے اب آئیے شتاب
گھوڑوں سے اہل کین اسے پامال کرتے ہیں
سیدانی آہ کی کہ ہلا عرش ذوالجلال
بانو پکاری خیر تو ہی ای علی کے لال
صاحب بتاؤ کیا مری بستی اُجڑ گئی
کرتے ہیں کس کی لاش کو پامال اہل شر
اب گھر سے میں نکلتی ہوں ہے ہے [illegible]
آواز یہ اُسی کی ہی پہچانتی ہوں میں

بانو کو تسلیں دے کے چلے شاہِ نامدار
وہ پیاس اور وہ دھوپ کا صدمہ وہ اضطرار
دل تھا الٹ پلٹ تو کلیجہ تھا بے قرار
اٹھتے تھے اور زمین پہ گرتے تھے بار بار
چلاتے تھے شبیہِ پیمبر ہم آتے ہیں
گھبرا کے ہو نہ اے علی اکبر! ہم آتے ہیں

بیٹا پکارو پھر کہ بصارت میں فرق ہے
اے نورِ عین جسم کی طاقت میں فرق ہے
تم یہ نہ جانیو کہ محبت میں فرق ہے
زخمی ہے قلب روح کی راحت میں فرق ہے
داغِ جگر ملا ہمیں گودی میں پال کے
کس کو دکھاؤں اپنا کلیجہ نکال کے

آؤں کدھر کو اے علی اکبر جواب دو
چلا رہی ہے ڈیوڑھی پہ مادر جواب دو
اکبر برائے خالقِ اکبر جواب دو
بیٹا جواب دو مرے دلبر جواب دو
گرتے ہیں ہم ثواب کا ہاتھوں سے کام لو
بیٹا ضعیف باپ کے بازو کو تھام لو

کچھ سوجھتا نہیں میں کدھر جاؤں کیا کروں
اے نورِ چشم تجھ کو کہاں پاؤں کیا کروں
مضطر ہے جان و دل کسے سمجھاؤں کیا کروں
کیونکر پسر کو ڈھونڈ کے میں لاؤں کیا کروں
پایا تھا ماتوں میں جسے خاک چھان کے
وہ لعل ہم نے کھو دیا جنگل میں آن کے

بس اب خبر حسین کی لے جلد اے اجل
اے جسمِ زار زیست کا باقی نہیں محل
اے جانِ ناتواں تنِ مجروح سے نکل
ہاں اے نفس چھری کی طرح سے گلے پہ چل
چھوٹے نہ اس کا ہاتھ جو پیری کی آس ہو
لاشہ بھی لاشۂ علی اکبر کے پاس ہو

جنگل سے نے ہواس پھرے نہر پر گئے
واں بھی جو وہ گہر نہ ملا سوے بر گئے
دوڑے کسی طرف تو کسی جا ٹھہر گئے
تھالے ملے لہو کے برابر جدھر گئے
ٹپکا ہوا زمیں پہ جگر کا لہو ملا
لیکن کہیں نہ وہ پسرِ ماہرو ملا

جا کر صفوں کے پاس پکارے باشک و آہ
ہے کس طرف مرے علی اکبر کی قتل گاہ
اے ظالمو یہ شب ہے کہ دن ہو گیا سیاہ
کس ابر میں چھپا ہے مرا چودھویں کا ماہ
بتلاؤ جان ہے کہ نہیں جسمِ زار میں
زخمی پڑا ہے شیر مرا کس کچھار میں؟

لاش پسر کو ڈھونڈھتے تھے شاہ بحر و بر
پیٹنے کی جا ہی کہ ہنستے تھے اہل شر

کہتا تھا شمر ای پسر سید البشر
کس کو حضور ڈھونڈھتے ہیں مر گیا پسر

خود ڈھونڈھ لیجیے جسد پاش پاش کو
بتلائینگے نہ ہم علی اکبر کی لاش کو

یہ سن کے کھینچ لی شہ والا نے ذوالفقار
چمکی جو برق تیغ تو بھاگے ستم شعار

شہ کو نظر پڑا علی اکبر کا راہوار
چلائے ای عقاب کدھر ہی ترا سوار

دکھلا دے مجکو لاش مرے نور عین کی
کس دشت میں پڑی ہی بضاعت حسین کی

ملنے دے ان کا بوس کے حلقوں سے چشم نم
ہر راہ اسی میں تھے مرے فرزند کے قدم

بوسے تری لگام کے لوں میں اسیر غم
اکبر کے ہاتھ میں تھی یہی باگ ہی ستم

ہی ہی وہ ہاتھ پاؤں مرے آفتاب کے
قرباں تری لگام کے صدقے رکاب کے

گھوڑے نے ہنہنا کے سوئے دشت کی نظر
یعنی کہ لاش آپکے پیارے کی ہی ادھر

جاتا تھا آگے آگے وہ تازی بچشم تر
گھوڑے کے پیچھے پیچھے تھے سلطان بحر و بر

جنگل میں لاشۂ پسر نوجواں ملا
وہ مہ لقا ملا تو مگر نیم جاں ملا

دیکھی عجیب حالت فرزند نوجواں
پیکاں گلے میں ہونٹوں پہ نکلی ہوئی زباں

تن پہ جراحت تبر و خنجر و سناں
گردن تھی کج پھری ہوئی آنکھوں کی پتلیاں

ٹاپوں سے مرکبوں کی جراحت پھٹے ہوئے
چہرہ سفید خاک میں گیسو اٹے ہوئے

ہچکی کے ساتھ کہتے ہیں والد کے چشم تر
ای جان جسم زار میں اک بار دم ٹھہر

ای موت نوے وطن کی جوانی پہ رحم کر
ای درد تھم ذرا کہ پھٹا جاتا ہی جگر

پھر ایک بار سید والا کو دیکھ لوں
مہلت بس اتنی دے کہ میں بابا کو دیکھ لوں

دشمن کو بھی نہ بیٹے کا لاشہ خدا دکھائے
حضرت زمیں پہ گر کے پکارے کہ ہائے ہائے

زندہ رہے یہ پیر جواں یوں جہاں سے جائے
ای لال تین دن کے فاقہ میں زخم کھائے

شاید جگر کے زخم سے تم بے قرار ہو
زخمی تمہاری چھاتی پہ بابا نثار ہو

کیوں کھینچتے ہو پاؤں کو ای میرے گلعذار
کیوں ہاتھ اُٹھا اُٹھا کے پٹکتے ہو بار بار

آنکھیں تو کھول دو کہ مرا دل ہی بے قرار
بیٹا تمھاری ماں کو تمھارا ہی انتظار

بہنیں کھڑی ہیں در پہ بڑے اشتیاق میں
اکبر تمھاری ماں نہ جیے گی فراق میں

غش میں سنا جو ہیں علی اکبر نے ماں کا نام
کس یاس کی نگاہ سے دیکھا سوے خیام

سوکھی زباں دکھا کے یہ بولا وہ تشنہ کام
شدت یہ پیاس کی ہی کہ دشوار ہی کلام

اب اور کوئی دم کا پسر میہمان ہی
امداد یا حسین کہ پانی میں جان ہی

فرمایا شہ نے ای علی اکبر میں کیا کروں
پانی نہیں ہی مجکو میسر میں کیا کروں

گھیرے ہیں نہر کو یہ ستمگر میں کیا کروں
کچھ بس نہیں مرا مرے دلبر میں کیا کروں

اعدا نہ دینگے بوند اگر لاکھ کد کریں
بیٹا تمھاری ساقی کوثر مدد کریں

حضرت یہ کہتے تھے کہ چلا خلق سے پسر
اتنی زباں ہلی کہ اللہ حافظ ای پدر

ہچکی جو آئی تھام لیا ہاتھوں سے جگر
انگڑائی لے کے رکھدیا شہ کے قدم پہ سر

آباد گھر لٹا شہِ والا کے سامنے
بیٹے کا دم نکل گیا بابا کے سامنے

لکھا ہی ایک راوی غمگین و پُر ملال
یعنی اِدھر ہوا علی اکبر کا انتقال

نکلی حرم سے ایک زنِ فاطمہ جمال
گویا جناب سیدہ کھولے ہوئے تھیں بال

تھی اِس طرح سے رُخ پہ ضیا اُس جناب کے
حلقہ ہو جیسے نور کا گرد آفتاب کے

چلاتی تھی ارے مرا پیارا ہی کس طرف
ای آسماں وہ عرش کا تارا ہی کس طرف

ای ابر شام چاند ہمارا ہی کس طرف
ای ارضِ کربلا وہ سدھارا ہی کس طرف

ہی ہی سناں سے جان گئی میہمان کی
میت کدھر کو ہی مرے کڑیل جوان کی

ای میرے لمبے گیسوؤں والے کدھر ہی تو
ہی ہی مرے غریبی کے پالے کدھر ہی تو

واری کہاں سے لگے تجھے بھالے کدھر ہی تو
کیونکر پھوپھی جگر کو سنبھالے کدھر ہی تو

اٹھارھواں برس تھا کہ موت آگئی تجھے
ای نورِ عین کس کی نظر کھا گئی تجھے

ہے ہے مرے سعید و رشید و خلیق جواں
صفدر جواں شکیل جواں نازنیں جواں
آغاز تھیں سنین ابھی ایسے مسن نہ تھے
یہ بین کرتی جاتی تھی وہ سوختہ جگر
جاتی تھی بے حواس ادھر سے وہ نوحہ گر
دیکھا لہو رواں جو تن پاش پاش سے

ہاں شاہ دیں کے تعزیہ دارو بکا کرو
ماتم میں ہاتھ سینہ پہ مارو بکا کرو
سمجھو شریک بزم شہ مشرقین کو
اولاد والو درد کرو شہ کے دل کا یاد
کیسے تڑپتے ہوئینگے شبیر خوش نہاد
خوش وضع خوش مزاج تھے شیریں بیان تھے

ہے ہے حسین آپ کا دلبر بچھڑ گیا
واحیف وادریغ دلاور بچھڑ گیا
مظلومیت پہ تشنہ دہانی پہ روئینگے
آقا انیس ہند میں کب تک پھرے تباہ
ضعف اس برس بہت ہے اجل آنہ جائے آہ
قرب مزار شاہ دو عالم نصیب ہو

خوش وضع جوان غریب جواں مہ جبیں جواں
کس نے تجھے مروڑ لیا اے حسیں جواں
بچے مرے ابھی ترے مرنے کے دن نہ تھے
سیدانیوں کا غول تھا پیچھے برہنہ سر
آئے ادھر سے لاش لیے شاہ بحر و بر
سب بی بیاں لپٹ گئیں اکبر کی لاش سے

ہاں اے خدا کے دوست کے پیارو بکا کرو
اکبر جہاں سے اٹھ گئے یارو بکا کرو
دے لو جوان بیٹے کا پرسا حسین کو
نہ آج کی خبر ہے نہ ہے کل کا اعتماد
بیٹا جہاں سے اٹھ گیا ناشاد نامراد
بیٹو جوانو اکبر مہرو جوان تھے

فریاد ہے شبیہ پیمبر بچھڑ گیا
دردا و حسرتا علی اکبر بچھڑ گیا
جب تک جئیں گے اس کی جوانی پہ روئینگے
گھٹتی ہے عمر بڑھتے چلے جاتے ہیں گناہ
بلوائیے غلام کو اے میرے بادشاہ
بس کربلا میں ابکی محرم نصیب ہو

مرثیہ ۱۴

طے کر چکے حسین جو راہِ ثواب کو
مقتل نظر پڑا شہِ گردوں رکاب کو
الفت جو واں کی خاک سے تھی اس جناب کو
اک عید ہو گئی خلفِ بوتراب کو
دل مثلِ غنچہ واں کی ہوا کھا کے کھل گیا
رستہ ریاضِ خلد میں جانے کا مل گیا

صحرا پہ ہر طرف شہِ دیں نے نگاہ کی
سب تھم گئی سپاہ شہِ کم سپاہ کی
فرمایا آج چھٹ گئے ایذا سے راہ کی
ہاں اب کرو پسند جگہ خیمہ گاہ کی
آگے کہیں نہ جائینگے اس ارضِ پاک سے
الفت ہماری خاک کو ہے یاں کی خاک سے

مشتاق اس نواح کا تھا فاطمہ کا لال
رہتا تھا خواب میں بھی اسی دشت کا خیال
آفاق میں یہ ارضِ مقدس ہے بے مثال
سبزہ یہاں کا رحمتِ خالق سے ہے نہال
ابتک کسی صدف کو نہ ایسے گہر ملے
گردوں کو ایک اس کو بہتّر قمر ملے

شکر خدا کہ رنجِ سفر سے ہوا فراغ
غربت کے اشتیاق میں بھولا وطن کا داغ
خاطر شگفتہ ہو گئی اور دل ہے باغ باغ
طبقہ یہ حشر تک نہیں ہونے کا بے چراغ
حاصل ملے گا حشر میں اس کار و کشت کا
روئے زمیں پہ ہے یہی ٹکڑا بہشت کا

عالم میں قدر و منزلت اس کی سوا ہوئی
گرد اس کی بہرِ چشمِ ملک توتیا ہوئی
ہر درد کی خدا کے کرم سے دوا ہوئی
یہ خاکِ پاک آج سے خاکِ شفا ہوئی
تیغِ عذابِ حق سے لحد میں پناہ ہو
طوفاں میں پاس ہو تو نہ کشتی تباہ ہو

کی سرو بوستانِ حسن نے یہ گفتگو
آتی ہے اس زمیں کے گلوں سے دلہن کی بو
اکبر یہ بولے تھی ہمیں صحرا کی آرزو
عباس سے یہ کہنے لگے شاہِ نیک خو
ہاں کونسی جگہ تمھیں بھائی پسند ہے
اس شیر نے کہا کہ ترائی پسند ہے

دریا کو دیکھ دیکھ کے لہرا رہا ہے دل ‏ ‏ پانی بھی خوشگوار ہوا بھی ہے معتدل
مولا قدم پکڑتی ہے کچھ یاں کی آب و گل ‏ ‏ بہتر ہے گر خیام ہوں ساحل کے متصل
پانی سے ہاتھ منہ کو نہ زنہار دھوئیں گے ‏ ‏ جاگے بہت ہیں پانوں کو پھیلا کے سوئیں گے

فرمایا شہ نے خیر جو اللہ کی رضا ‏ ‏ موقع ہو جس جگہ وہیں خیمہ کرو بپا
آرام سے غریب مسافر کو کام کیا ‏ ‏ رہتے ہیں دھوپ میں بھی بہت بندۂ خدا
دو چار دن میں عمر کی مدّت تمام ہے ‏ ‏ میداں سے پھر غرض ہے نہ دریا سے کام ہے

زینب نے جب یہ سرورِ دیں سے سنا کلام ‏ ‏ محمل سے یوں پکاری کلیجے کو تھام تھام
کیوں چلتے چلتے آپ نے یاں روک لی لگام ‏ ‏ بھیا اِدھر تو آؤ یہ ہے کونسا مقام
بستی بھی ہے کوئی کہ یہی ایک نہر ہے ‏ ‏ اس دشت پُرخطر میں اُترنا تو قہر ہے

جنگل میں ہے بشر کے لیے سو طرح کا ڈر ‏ ‏ اُٹھتے ہیں بار بار بگولے اِدھر اُدھر
دن کٹ گیا تو ہوئے گی شب کس طرح بسر ‏ ‏ لشکر میں غل رہے گا درندوں کا رات بھر
بچے بھی مارے ہول کے تر ہیں پسینے میں ‏ ‏ میرا تو دل ابھی سے اچھلتا ہے سینے میں

اس سرزمیں کے گل نظر آتے ہیں مجکو خار ‏ ‏ نشتر سے کم نہیں رگِ جاں کو یہ سبزہ زار
یہ باد تند تیر سی ہوتی ہے دل کے پار ‏ ‏ اس بن کی خاک سے مری خاطر پہ ہے غبار
کیا رنگ آگے دیکھیے قسمت دکھاتی ہے ‏ ‏ یاں کی زمیں سے خون کی بو مجکو آتی ہے

لوگو مجھے بتاؤ یہ دریا ہے یا سراب ‏ ‏ کاسے سروں کے ہیں کہ یہ ہیں ساغرِ حباب
موجوں کو دیکھ دیکھ کے ہے دل کو پیچ و تاب ‏ ‏ ڈوبا ہے کون شور ہے کیسا میانِ آب
دھاریں لہو کی مل گئیں دریا کی موج میں ‏ ‏ لہریں یہ ہیں کہ چلتی ہیں تلواریں فوج میں

پوچھو کسی سے مسلمِ مظلوم کی خبر ‏ ‏ تربت مرے غریب مسافر کی ہے جدھر
بچوں کے اُس کے کیا نہیں کاٹے گئے ہیں سر ‏ ‏ لاشے بہا دیے اسی دریا میں کھینچ کر
رنج و غم و الم کی گھٹا دل پہ چھائی ہے ‏ ‏ اماں کے پیٹنے کی صدا مجکو آتی ہے

یوں نہر کی ترائی میں کوئی ہی نوحہ گر
مرتا ہی جس طرح سے کسی کا جواں پسر

صاف آتی ہی صدا کہ فدا تجھ پہ ہو پدر
یاں سوئے گا تو اے مرے عباس نامور

وسواس کا مقام ہی جاگہ قلق کی ہی
پہچانتی ہوں میں یہ صدا شبرِ حق کی ہی

غش کھلکے اب میں گرتی ہوں تجھ میں نہیں ہی اس
عباس کو بلاؤ کہ آئیں بہن کے پاس

اصغر بلک رہا ہی سکینہ کو ہی ہراس
خیمے یہاں ہوئے تو ہوئی زندگی یاس

نقشہ وہ پھر گیا مری چشمِ پُر آب میں
ایسا ہی دشت تھا جسے دیکھا تھا خواب میں

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولی غریبِ زمن
اُترو نہیں کہ خوف کی جاگہ نہیں بہن

یہ نہر علقمہ ہی یہ ہی کربلا کا بن
آئے اسی کے شوق میں ہم چھوڑ کر وطن

رہنے میں اس جگہ کے ضرر کیا فقیر کا
خیمہ یہاں ہوا تھا جنابِ امیر کا

کچھ مال و زر نہیں کہ تلف کا ہو جس کے ڈر
یکساں ہی نے وطن کے لیے شہر و دشت و در

مسکن یہی زمین ہی بھی نے گھروں کا گھر
کیا جانیں اس مقام سے ہو کس طرف سفر

انساں کو چاہیے کہ گناہوں سے پاک ہو
شاید ہماری خاک اسی بن کی خاک ہو

یہ سُن کے بنت فاطمہ نے کی جگر سے آہ
بولیں یہ کربلا ہی تو لو ہم ہوئے تباہ

ہاہی حسین کو نہ ملے گی کہیں پناہ
ڈوبے گا بحرِ خوں میں دو عالم کا بادشاہ

سر پہ اڑاؤ بیبیو اس سرزمیں کی خاک
شیشے میں رکھ گئے ہیں محمد یہیں کی خاک

اُترے فرس سے حضرت عباسِ نیک نام
ٹھلائے اونٹ خیمے کے سب کھینچ کر زمام

فراش چاہتے تھے کہ برپا کریں خیام
تلواریں کھینچے گھاٹ پہ آپہونچی فوج شام

زینب کے دل پہ ظلم کی شمشیر پھر گئی
شہ کی نظر میں موت کی تصویر پھر گئی

گھوڑا بڑھا بڑھا کے لعینوں نے یہ کہا
بتلاؤ کس نے حکم اُترنے کا یاں دیا

ہٹ جاؤ ابن سعد کے خیمے کی ہی یہ جا
ڈھونڈو کنوئیں کہیں تمھیں دریا سے کام کیا

گرمی میں بند ہووے گا پانی امام پر
ہوگا نہ کل ہوا کا گزر اس مقام پر

چھپ جائے گی سپاہ کی کثرت سے سب زمیں
موسم وہ ہے کہ اُتریں گے سب نہر کے قریں
دریا بھی سوکھ جائے تو اُس کا عجب نہیں
جلدی کنارہ کش ہوں کنارے سے شاہ دیں
دُنیا میں آج شام کے حاکم کا زور ہے
یاں وہ پہرے سے شمر کے آنے کا شور ہے

برہم ہوئے یہ سُنتے ہی عباسِ خوش خصال
غازی کو شیرِ حق کی طرح آ گیا جلال
قبضہ پہ ہاتھ رکھ کے یہ بولا علی کا لال
اب یاں سے ہم کو کوئی ہٹا دے یہ کیا مجال
حملہ کریں چڑھا کے اگر آستین کو
ہم آسماں سمیت اُلٹ دیں زمین کو

دیکھیں ہٹا تو دو نہیں ہٹنے کے یاں سے ہم
برپا کرینگے اب تو یہیں خیمۂ حرم
گر واں بہت ہے فوج تو ہم بھی نہیں ہیں کم
آلِ نبی بڑھا کے ہٹاتے نہیں قدم
ہم اور خوفِ جان سے لڑائی کو چھوڑ دیں
دیکھا نہیں کہ شیر ترائی کو چھوڑ دیں

گو فوج کم امامِ دلاور کے ساتھ ہے
روحِ رسول نائبِ حیدر کے ساتھ ہے
عباس سا غلام برادر کے ساتھ ہے
لاکھوں تو لے سکیں یہ زمیں جس کے ساتھ ہے
غصّے کے وقت جاں کو نہیں جاں سمجھتے ہیں
ہم ایک و لاکھ کو یکساں سمجھتے ہیں

یاں سے کہیں بتول کا پیارا نہ جائے گا
ہم وہ نہیں کہ جان کو وارا نہ جائے گا
لاشہ بھی اُٹھ کے یاں سے ہمارا نہ جائیگا
مر کر بھی ہاتھ سے یہ کنارا نہ جائے گا
رکھتے ہیں اس زمیں کے لیے سر کو ہات پر
قبضہ ہے تا بہ حشر ہمارا فرات پر

اعدا پکارے تب کہ نہ مانینگے ہم یہ بات
اُترے گی آ کے فوج ہماری لبِ فرات
بولا یہ سُن کے بازوئے سلطانِ کائنات
ہٹ جاؤ میرا ہاتھ ہے دستِ خدا کا ہات
کیا تم کو ضربِ تیغِ علی کی خبر نہیں
آگے بڑھا قدم تو کسی تن پہ سر نہیں

ہٹ ہٹ کے کھینچنے لگے تیغوں کو اہلِ شر
عباس نے بھی رکھدیا قبضہ پہ ہاتھ ادھر
زینب پکاری پیٹ کے محل سے اپنا سر
بھائی خدا کے واسطے بھائی کی لو خبر
للہ شبیر بیشۂ حیدر کو روکیے
تلواریں کھنچ گئی ہیں برادر کو روکیے

عباس کو یہ بڑھ کے پکارے شہِ اُمم — کھینچو نہ تیغ روحِ علی کی تمھیں قسم
اچھا کنارِ نہر رہیں بانیِ ستم — خیمہ کرینگے اور کہیں یاں سے جا کے ہم
پہلے کرو وہ کام کہ جو فرضِ عین ہو — نے چین ہوں تو ہم ہوں نہ اُمت کو چین ہو

غصہ یہ کس پہ میری طرف تم کرو نظر — تم کو ہٹا سکے کوئی کس کا ہے یہ جگر
پہچانتے نہیں تمھیں بھائی یہ اہلِ شر — جانے دو آؤ دور کرو دھیان ہے کدھر
منظور ناریوں کو ہے پانی کا آسرا — کوثر ہے اپنی تشنہ دہانی کا آسرا

بیکس ہیں ہم کو تیغ پکڑنا نہ چاہیے — غربت میں قافلہ سے بچھڑنا نہ چاہیے
گر جان پر بنے تو بگڑنا نہ چاہیے — اُمت سے نانا جان کی لڑنا نہ چاہیے
شکلِ حباب خلق میں آخر فنا تو ہے — دریا اگر قریب نہ ہوگا خدا تو ہے

کیوں کانپتے ہو غیظ سے ابرو پہ کیوں ہے بل — مالک ہو تم تمھارا ہی دریا پہ ہے عمل
ہمت میں فرق کچھ نہ شجاعت میں ہے خلل — غصہ کو تھام لو یہ نہیں جنگ کا محل
مانو مرا کہا میں تمھارا امام ہوں — غازی نے سر جھکا کے کہا میں غلام ہوں

سمعاً و طاعتاً نہیں طاقت کہ دوں جواب — ذرے کو تاب کیا ہے بھلا پیشِ آفتاب
بخشی ہے عزت آپ نے اے آسماں جناب — ہٹتا نہ ان میں سے کبھی ابنِ بوتراب
ارشاد ہو جو کچھ مرے حق میں قبول ہے — حکمِ حضور حکمِ خدا و رسول ہے

بندہ ہوں جاں نثار ہوں یا شاہ بحر و بر — مولا عدول حکمی کی کیا تاب کیا جگر
دیدیں گر اُن کو آپ مرے ہاتھ باندھ کر — ہمراہ ہوں غلام کی صورت جھکا کے سر
گر یہ بدی کریں نہ شہِ کائنات سے — سر اپنا کاٹ دوں میں انھیں اپنے ہات سے

فرمایا شہ نے میں ترے ہاتوں کے ہوں نثار — سر میرا تیرے سر پہ تصدق ہزار بار
ہے ابنِ فاطمہ کی کمر تجھ سے استوار — بولا وہ باوفا کہ غلامی ہے افتخار
ہاں یہ ملال ہے کہ سر اُن کے کٹے نہیں — تیغوں کے سامنے سے کبھی ہم ہٹے نہیں

حضرت کے حکم سے تو لیا میں نے ہاتھ تھام
ہٹ جائیں پہلے یہ تو ہٹے آپ کا غلام
حضرت نے ہاتھ اُٹھا کے کہا اے سپاہِ شام
ہٹ جاؤ ورنہ سب ابھی ہو جاؤ گے تمام
لاکھوں ہو گر تو ہو اسے ٹوکا نہ جائے گا
بگڑے گا پھر یہ شیر تو روکا نہ جائے گا

جس وقت یہ سُنے شہِ ذی جاہ کے کلام
پسپا ہوئی سمجھ کے غنیمت سپاہِ شام
بھائی کو ساتھ لیکے پھرے سید الانام
سر کو جھکا کے رہ گئے عباس نیک نام
کہتے تھے راہ میں کہ نہ وار اپنا چل گیا
افسوس ہے کہ ہاتھ سے دریا نکل گیا

وقت ایسا اب نہ آئے گا یا سیدِ اُمم
گرمی میں پیاس لگتی ہے بچوں کو دم بدم
پانی بھی چھاگلوں میں بہت رہ گیا ہے کم
فرمایا شہ نے چاہیئے اللہ کا کرم
پانی کے بند کرنے پہ وہ ہیں تُلے ہوئے
جنت کے در ہماری طرف ہیں کھلے ہوئے

یہ کہہ کے آیا دھوپ میں زہرا کا آفتاب
برپا ہوئے خیامِ امامِ فلک جناب
خا تھی موجِ رحمتِ حق جس کی ہر طناب
نے چوبہ فلک نظر آنے لگا حباب
صحن اُس کا سب بتول کے پیاروں سے بھر گیا
اِک آسمان تھا کہ ستاروں سے بھر گیا

خیمہ میں اُترے یاں تو شہِ عرش بارگاہ
آ آ کے اُس طرف بھی اُترنے لگی سپاہ
کوسوں علم کھلے تھے جدھر کیجیے نگاہ
یاں تک کہ بند ہو گئی چاروں طرف سے راہ
فوجوں سے تا بہ صبح زمیں رن کی بھر گئی
اِک رات میں چڑھی ہوئی ندی اُتر گئی

اِس کثرتِ سپاہ پہ ناگہ ہوئی یہ دھوم
آ پہنچا شام سے پسرِ سعد نحس و شوم
جس کے جلو میں لاکھ سواروں کا ہے ہجوم
اکثر ہیں یکہ تاز جوانانِ شام و روم
بس کھل گیا نہ طور صفائی کا ہوئے گا
اب کل سے بند و بست لڑائی کا ہوئے گا

یہ ذکر تھا کہ دور سے ظاہر ہوئے نشان
اُمڈا زمیں پہ ظلم کا دریائے بیکراں
موجوں کی طرح سب تھیں صفیں پیش و پس رواں
لہراتے تھے ہوا سے علم مثلِ بادباں
ہلتا تھا دشتِ کیں دہل اس طرح بجتے تھے
باجوں کا تھا یہ شور کہ بادل گرجتے تھے

جنگی وہ رومیوں کے پرے شامیوں کے دل
مکار و اہلِ نار و دغا باز پُر دغل
خوفِ خدا نہ جن کو نہ اندیشۂ اجل
شکلیں مہیب دیو سے قد ابروؤں پہ بل
بدخواہِ خاندانِ رسالت پناہ تھے
ایسے جلے ہوئے تھے کہ چہرے سیاہ تھے

تلواریں کھینچے بڑھ کے جمے دو طرف سوار
ڈنکے کی دم بدم تھی صدا آسماں کے پار
غل ہو گیا سلامی کے باجوں کا ایک بار
آگے بڑھے چلو پہ نقیبوں کی تھی پکار
گھوڑوں پہ گرد و پیش رئیسانِ شام تھے
زریں کمر جلو میں کئی سو غلام تھے

اُترا قریبِ خیمہ فرس سے وہ خیرہ سر
سر پہ لگایا دوڑ کے خادم نے چترِ زر
پہلے تو اپنی فوج پہ ظالم نے کی نظر
بولا کسی سے پھر وہ سوئے نہر دیکھ کر
خیمہ ہے کس طرف کو شہِ خوش خصال کا
دریا پہ تو عمل نہیں زہرا کے لال کا

خولی نے تب کہا کہ ہماری طرف ہے نہر
آئے تھے یاں اُترنے کی خاطر امامِ دہر
فرماتے تھے یہ نہر تو ہے میری ماں کا مہر
ہم نے اُٹھا دیا اُنھیں لیکن بہ جبر و قہر
عباس مستعد تھے سبھوں سے لڑائی کو
شبیر پھیر لے گئے سمجھا کے بھائی کو

وہ دھوپ میں ہے خیمۂ زنگاریِ حسین
راحت نہ رات کو ہے کوئی دم نہ دن کو چین
پھروں علی کی بیٹیاں روتی ہیں کرکے بین
آفت میں مبتلا ہے محمد کا نورِ عین
بچوں کی مارے پیاس کے حالت عجیب ہے
خیمہ نہ سایہ میں ہے نہ دریا قریب ہے

بولا شقی کہ کتنی ہے فوجِ شہِ اُمم
سُنتے تھے واں سپاہِ حسینی کی دھوم ہم
اُس نے کہا حسین کے یاور بہت ہیں کم
فاقوں کے مارے دم میں کسی کے نہیں ہے دم
ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں
میں نے تو خود گنا ہے اکیاسی جوان ہیں

ہے ایک علم یہ قلتِ لشکر کا ہے نشاں
یہ حال ہے لُٹا ہوا جیسے ہو کارواں
اُردو میں جنسِ غم کے سوا جنس ہے گراں
غلہ کی یہ کمی ہے کہ ہے قحطِ آب و ناں
اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں
کل سترہ تو اونٹ ہیں اور بیس گھوڑے ہیں

مطبخ ہے سرد آگ کا اُس میں نہیں ہے نام
خاک آبدار خانے میں اُڑتی ہے صبح و شام
یاں سیکڑوں کمانیں ہیں فوجِ امیر میں
یہ سب غلط سُنا تھا کہ ہے لشکرِ کثیر
ہیں اُن میں سات آٹھ تو لڑکے کئی صغیر
کیا چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طاقت دکھائینگے

کیا جانے دل میں سمجھے تھے کیا شاہِ کربلا
لشکر تو یہ قلیل اور اس فوج سے وغا
کچھ آزمودہ کار نہیں کچھ مُسن نہیں
ہم شکل مصطفےٰ کو تو اٹھارھواں ہے سال
نو دس برس کے ہونگے زینب کے دونوں لال
چھوٹے ہیں اور سب کوئی ان میں جواں نہیں

سُنتا ہوں میں ہیں دو پسرِ شاہِ نامدار
زینب کے دو ہیں تین حسن کے ہیں گلعذار
زہرا کے جان و دل ہیں محمد کے پیارے ہیں
بتیس سب سوار شہِ دیں کے پاس ہیں
آفت میں مبتلا ہیں مگر با حواس ہیں
کھانے کا ہے خیال نہ پانی کی فکر ہے

بولا وہ تب کہ ہونگے جواں لاکھ کو ہزار
ہیں تین چار کوس کے گردے میں سب سوار
کیا کوئی لڑ سکے گا قیامت کی فوج ہے
بچے ہوائے گرم سے بے تاب ہیں تمام
کیونکر لڑینگے بیکس و مظلوم و تشنہ کام
دو دو گرینگے خاک پہ اک اک تیر میں

کچھ نوجوان ہیں طفل ہیں کچھ اور کچھ ہیں پیر
پس جائینگے وہ ٹاپوں سے ہنگامِ دار و گیر
اُن سے تو نیمچے بھی سنبھالے نہ جائینگے
مقتل میں کھینچکر انھیں لے آئی ہے قضا
عمریں ہیں چھوٹی چھوٹی بھلا وہ لڑینگے کیا
اُن کے ابھی تو گھر سے نکلنے کے دن نہیں

تیرہ برس کا ہے ابھی شبرؑ کا نونہال
ہاں اک جواں ہیں حضرتِ عباس خوش خصال
خط اک طرف میں بھی کسی کی عیاں نہیں
بیمار اُن میں ایک ہے اور ایک شیرخوار
دس ہیں عقیل و مسلم و حیدر کے یادگار
یہ سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

اب رہ گئے پیادے سو دو کم پچاس ہیں
غازی ہیں سرفروش ہیں اور حق شناس ہیں
سجدے ہیں اور دُعائیں ہیں اور حق کا ذکر ہے
خولی نے کی یہ عرض کہ ممکن نہیں شمار
ایک ایک جواں ہے رستمِ میدانِ کارزار
لشکر کی ہیں صفیں کہ سمندر کی موج ہے

پیدل ہیں اک طرف تو رسالے ہیں اک طرف
خنجر ہیں ایک سمت تو بھالے ہیں اک طرف
جانباز ہاتھ قبضوں پہ ڈالے ہیں اک طرف
اور دس ہزار برچھیوں والے ہیں اک طرف
سب لوگ فکرِ قتلِ شہنشاہِ دیں میں ہیں
کھینچے ہوئے کمانوں کو سرکش کمیں میں ہیں

ہاتھوں میں پہلوانوں کے ہیں گرز گاؤ سر
ضربت سے جن کے ٹوٹتی ہے کوہ کی کمر
ہر جا بچھی ہوئی ہیں کمندیں ادھر اُدھر
کالی گھٹا سی چھائی ہے ڈھالوں کی نہر پر
سب لوگ جابجا پئے قتل و ستیز ہیں
تیغیں بھی ہیں اوپی ہوئی خنجر بھی تیز ہیں

بھالا ہلا کے کوئی یہ کہتا ہے بار بار
نوک اُس کی سینۂ علی اکبر کے ہوگی پار
کہتا ہے کس غرور سے اک شام کا سوار
آئے تو رن میں حضرتِ شبر کا یادگار
اب کوئی دم میں گھر کی حسن کے صفائی ہے
تلوار آج زہر میں سنے بجھائی ہے

تیغا اُٹھا کے کوئی یہ کہتا ہے بد مزاج
قیمت ہے اُس کی شام کا اور روم کا خراج
دریا پہ اُن کو لائے تو پانی کی احتیاج
عباسؑ نامدار کے کاٹوں گا ہاتھ آج
جب دولتِ علی کو فضا لُوٹ جائے گی
فرزندِ فاطمہ کی کمر ٹوٹ جائے گی

کہتا ہے کوئی تیر کو چلّے میں جوڑ کے
گزرے گا یہ گلا علی اصغر کا توڑ کے
سوئیں گے جب زمین پہ جھولے کو چھوڑ کے
دونوں کڑے اتاروں گا پہونچے مروڑ کے
اصغر کا طوق اپنے پسر کو پنھاؤں گا
سوغات کربلا سے یہی لیکے جاؤں گا

سُنتا تھا میں کہ کہتا تھا اک شخص برملا
گھوڑے سے جب گرینگے شہنشاہ کربلا
جو فاطمہ کے دودھ کی دھاروں سے ہے پلا
چھاتی پہ چڑھ کے کاٹوں گا اُس شاہ کا گلا
وارث نہ کوئی ہوئے گا سیّد کی لاش کا
لوٹوں گا سب لباس تنِ پاش پاش کا

کوفے کے لوگ کرتے ہیں آپس میں یہ سخن
اب بعدِ فتح بازوئے زینب ہے اور رسن
سر پر ردا نہ ہوگی کہ بھائی کو دے کفن
خیمہ جلا کے لوٹیں گے اسباب پنجتن
ہے آرزو کہ دولتِ آلِ عبا ملے
دیکھیں کسے علی کی لہو کی ردا ملے

بولا خبر یہ سُن کے وہ بانیِ ظلم و جور
حاکم ہیں آج زیرِ فلک ہی ہمارا دور
فرصت اب ایک دم کی نہ ہاں ہو حسین کو
بولا کوئی کہ ہُو انھیں بیعت سے اجتناب
کہنے لگا وہ تیرہ دروں کھلکے پیچ و تاب
پیاسوں پہ تیر یاں سے بھی پڑتے ہیں کس طرح

کل تک ابھی تو شام سے آئے گی فوج اور
سر کاٹ لیں گے صلح کا ہوگا اگر نہ طور
بیعت اگر کریں تو اماں دو حسین کو
مرنے کو راہِ حق میں سمجھتے ہیں وہ ثواب
ہاں اب خیامِ شہ میں پہونچنے نہ پائے آب
دیکھیں حسین لاکھوں سے لڑتے ہیں کس طرح

یہ کہہ کے اپنے خیمہ میں آیا وہ خیرہ سر
ظاہر ہوئی جو رن میں شبِ قتل کی سحر
گردوں نشیں سروں کو بہم پیٹنے لگے
زینب تھی نے جو اس پریشان تھے سر کے بال
روتے روتے دیکھ کے حضرت بہن کا حال
فرما کے الوداع ہر اک سوگوار سے

یاں غازیوں نے رات عبادت میں کی بسر
پڑھ کر نمازِ شہ نے کسی جنگ پر کمر
بکھرا کے بال اہلِ حرم پیٹنے لگے
چلاتی تھی وہائی ہی یا شیرِ ذوالجلال
غل تھا کہ مرنے جاتا ہی خیر النسا کا لال
خیمے سے نکلے شاہِ پیمبر مزار سے

جب صدرِ زیں پہ دوشِ نبی کا مکیں چڑھا
گویا کہ آسمان پہ خورشیدِ زریں چڑھا
ایک ایک رخ پہ قدرتِ حق کا ظہور تھا
مجرے کو جھک گئے رفقا باندھ کر پرا
ہنسکر نظر عزیزوں کی جانب جو کی ذرا
تھے اس طرح جوانوں میں لڑکے ملے ہوئے

خاتم پہ جیسے دُرِّ نجف کا نگیں چڑھا
غل پڑ گیا جہاد پہ ضرغامِ دیں چڑھا
لشکر نہ تھا حسین کا دریائے نور تھا
حضرت نے سر پہ ہاتھ عجب پیار سے دھرا
سب باغِ فاطمہ نظر آیا ہرا بھرا
ہوں جس طرح سے پھول چمن میں کھلے ہوئے

ہنگامِ صبح تھی عجب اُس باغ پر بہار
لٹکے ہوئے تھے چہروں پہ گیسوئے پیچدار
شملے چھٹے جہاد پہ کمریں کسے ہوئے

جوں غنچہ مُسکراتا تھا اک ایک گلعذار
گھوڑے ہوا تو نکہتِ گل تھے وہ شہسوار
خوشبو سے تن کی عطر میں کپڑے بسے ہوئے

قد چھوٹے چھوٹے سرو گلستان اعتدال
شمشاد جن کے سایۂ قامت سے پائمال
چہرے برنگ لالہ شجاعت سے لال لال
رخ صاف صاف جن پہ نمایاں نہ خط نہ خال
کیا دخل نور حسن میں خال سیاہ کو
نقطہ کی احتیاج نہیں مہر و ماہ کو

گلدستۂ حسینؑ ہیں اکبر سا گلبدن
قربان جس کے تن کی نزاکت پہ یاسمن
سنبل کو لائے پیچ میں وہ زلف پر شکن
غل تھا کہ تنگ تر کہیں غنچہ سے ہے دہن
مطلب کھلا ہوا ہے خط سبزہ رنگ کا
یہ حاشیہ لکھا ہے اسی متن تنگ کا

تھی گرچہ پیاس سے دل نازک کو بے کلی
لیکن شگفتہ تھا وہ گل گلشن علی
یوں مسکرائے بات شجاعت کی جب چلی
جیسے کھلی ہوئی ہے گل سرخ کی کلی
خوشبو مہک گئی چمن کائنات میں
بولے تو پھول جھڑنے لگے بات بات میں

کیا رو ہلال عید کا ابرو کے سامنے
بیجا ہے ذکر مشک کا گیسو کے سامنے
آئینہ دنگ آئینہ رو کے سامنے
پانی گلاب جسم کی خوشبو کے سامنے
مضموں صفات قد کا قیامت سے لڑ گیا
قامت کے آگے سرو خجالت سے گڑ گیا

عباس نامدار جوانوں میں لاجواب
قد سرو باغ حسن تو رخ مثل آفتاب
حمزہ کا زور جعفر طیار کا شباب
شبّر کا خلق شان و شکوہ ابوتراب
لڑنے کو فوج کیں سے بہادر تلا ہوا
سر پر نشان دیں کا پھریرا کھلا ہوا

چڑھ چڑھ کے مرکبوں پہ بڑھے جب وہ گلعذار
اس دم فرس پہ قبلۂ عالم ہوئے سوار
ہمہیز کی مگر نہ بڑھا واں سے راہوار
حضرت کے منہ کو تکتا تھا پھر پھر کے بار بار
کوہ الم گرا تھا دل دردناک پر
آنکھوں سے اس کے اشک ٹپکتے تھے خاک پر

آزردہ ہو کے اس سے یہ بولے شہ امم
تو ساتھ گر نہ دے تو پیادہ ہی جائیں ہم
بولا یہ کانپ کانپ کے وہ اسپ خوش قدم
قدموں کو میں نہ چھوڑوں گا جب تک ہے دم میں دم
میری طرف حضور نہ رک رک کے دیکھیے
مولا مرے قدم کی طرف جھک کے دیکھیے

جھک کر جو پشت زیں سے شہ دیں کی نظر
دیکھا سموں سے لپٹی ہے زینب برہنہ سر
کہتی ہے آنکھیں مل کے قدم پر وہ نوحہ گر
اے ذوالجناح دخترِ زہرا پہ رحم کر
پاؤں گی پھر نہ فاطمہ کے نورِ عین کو
لے جا نہ تو بہن سے چھڑا کر حسین کو

پچھلے سموں پہ رکھے ہے سر دوسری بہن
پکڑے شکار بند کو ہے بیوۂ حسن
روکے ہے راہ زوجۂ عباسِ صف شکن
گھونگٹ دھرے ہے یال پہ اک رات کی دلہن
صدمے سے تھرتھری ہے تنِ خوش خرام میں
ڈالے ہے ننھے ہاتھ سکینہ لگام میں

گردن سے لپٹی کہتی ہے بانوے نامدار
صدقے میں تیرے اے مرے آقا کے راہوار
کرتا ہے مجھکو رانڈ محمد کا یادگار
کام آکہ ہوں علی کی بہو میں جگر فگار
مرجاؤں گی میں ساتھ جو وارث کا چھٹ گیا
آگے قدم بڑھا تو مرا راج لٹ گیا

اترے قدم رکابوں سے حضرت نکال کر
ہاتھوں سے خود بہن کو اٹھایا سنبھال کر
رو کر کہا ابھی سے نہ زینب بحال کر
بولی وہ ہاتھ شاہ کی گردن میں ڈال کر
کچھ زور بے قراریٔ دل سے نہ چل سکا
بھائی میں کیا کروں نہ کلیجہ سنبھل سکا

فرمایا تم کو فاطمہ کی روح کی قسم
جاؤ ابھی تو آئینگے مقتل سے پھر کے ہم
بچوں کو ساتھ لے کے چلے پیٹتے حرم
رستے سے پھر کے بولی یہ زینب بچشم نم
تسکیں نہیں مرے دلِ پر اضطراب کو
گھوڑے پہ تم چڑھو میں سنبھالوں رکاب کو

عباس نے کہا کہ نہیں آپ کا یہ کام
خدمت کے واسطے ابھی حاضر ہے یہ غلام
تنہا ہمارے بعد جو رہ جائینگے امام
تب تھامی وہ رکاب شہنشاہِ تشنہ کام
حیدر نے دی صدا کہ ادھر دل حزیں بھی ہے
زہرا بھی ہے رکاب میں روح الامیں بھی ہے

روتے ہوئے فرس پہ چڑھے بادشاہِ دیں
تھے پشت زیں پہ شاہ کہ خاتم پہ تھا نگیں
رخسار آفتاب تو مہتاب تھی جبیں
کوسوں فروغ حسن سے روشن ہوئی زمیں
جن کے تنوں میں جان نہ تھی زندہ ہوگئے
ذرے زمیں پہ اختر تابندہ ہوگئے

میداں میں جب سواریِ شاہِ اُمم چلی — کس شان سے جلو میں سپاہِ حشم چلی
فتح و ظفر ادب سے قدم با قدم چلی — بدلی ہوا نسیمِ ریاضِ ارم چلی
سرتاجِ عرش تھا جو مکیں صدرِ زین پر — قدسی پروں کو فرش کیے تھے زمین پر

جوں جوں قدم بڑھاتا تھا سرور کا خوش خرام — بنتے تھے نقش سم سے زمیں پر مہِ تمام
تھا ارض کربلائے معلیٰ کا یہ کلام — گو فرش تھی پہ اب میں ہوئی عرشِ احتشام
ذرّوں کا اُس زمیں کے فلک پر دماغ تھا — ہر سنگ ریزہ رشکِ دہِ شب چراغ تھا

بچھی تھی اِک نور کی چادر جو دور دور — ہنستا تھا کہکشاں پہ یہ جادو کو تھا غرور
ہنستے تھے روئے مہر پہ ذرّوں میں تھا یہ نور — ہر سنگ ریزہ کہتا تھا میں ہوں چراغِ طور
تھا یہ زمیں کا قول کہ عنبر سرشت ہوں — کہتی تھی گرد نکہتِ باغِ بہشت ہوں

وہ صبح اور وہ جلوۂ خورشیدِ خاوری — وہ صاف صاف آئنۂ چرخِ اخضری
وہ نور اور وہ شانِ جوانانِ حیدری — راکب ہر اک ملک تھا تو مرکب ہر اک پری
صدقے سواریِ شہِ گردوں رکاب کے — گویا ستارے جاتے تھے ساتھ آفتاب کے

پہنچا جو اس حشم سے خدیوِ جہانِ دین — صف باندھ کر کھڑے ہوئے سب ناظرانِ دین
کھولا نشان مرتضوی نے نشانِ دین — غل پڑ گیا کہ آج دو بالا ہے شانِ دین
قدسی سب اُٹھ کھڑے ہوئے تعظیم کے لیے — طوبیٰ کا سر بھی جھک گیا تسلیم کے لیے

ظاہر میں گرچہ تھے رفقائے شاہ کے قلیل — پیشِ خدا مگر وہ حقیقت میں تھے جلیل
جرأت میں بے نظیر شجاعت میں بے عدیل — سرگرم جان دینے پہ سب صورتِ خلیل
فاقوں میں صبر و شکر سے دل اُن کے سیر تھے — جانباز تھے جری تھے مجاہد تھے شیر تھے

سر پر عمامے چاند سی پیشانیوں پہ نور — حاضر گلا کٹانے کو سب شاہ کے حضور
لب برگِ گل سے سوکھے ہوئے پیاس کا وفور — یکتا ہر اک مگر نہ تکبر نہ کچھ غرور
پیرو امام کے تھے نہ کیوں خوش طریق ہوں — آقا حسین سا ہو تو ایسے رفیق ہوں

ہر دم فروتنی کا لبوں پر کلام تھا
شکر خدا سے اُن کی زبانوں کو کام تھا
ایک ایک دل سے عاشق شاہِ انام تھا
آنکھوں میں نشۂ مئے حبِ امام تھا
ہر حال میں وہ لوگ رضا جوئے شاہ تھے
رُخ اُن کے مثل قبلہ نما سوئے شاہ تھے

ذی جاہ و ذی جلالت و ذی فہم و ذی شعور
شایق ریاض خلد کے مشتاق وصل حور
ہر شخص نشۂ مئے حبِ علیؑ میں چور
ذکر علی کے نور سے پیشانیوں پہ نور
ذرہ نہ مہر و ماہ میں اور اُن میں فرق تھا
اک اک جوان حُسن کے دریا میں غرق تھا

ناگاہ فوجِ شام میں بجنے لگا دُہل
تیغیں کھچیں چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
کڑکیں کمانیں آنے لگے ناوکِ اجل
شیروں کے تیوروں پہ پڑے اُس طرف بھی بل
تن تن کے ہونٹ چاب کے تھرا کے رہ گئے
تیروں کے زخم شاہ کو دکھلا کے رہ گئے

بولے یہ رنگ دیکھ کے شبیرِ خوش نہاد
ہاں اے مجاہدو رہِ حق میں کرو جہاد
جوں غنچہ کھل گئے وہ جواں ہو کے شاد شاد
سُرخی لبوں پہ آگئی پایا گُلِ مُراد
بڑھ بڑھ کے پیدلوں نے سواروں سے جنگ کی
ایک ایک تشنہ لب نے ہزاروں سے جنگ کی

جس غول پر جھپٹ گئے صورتِ اسد
بھاگے وہ لوگ چھوڑ کے دشتِ ستم کی حد
لاکھوں میں اُن کا وار کوئی کر سکا نہ رد
نعرہ ہر ایک ضرب پہ تھا یا علی مدد
دو کرتے تھے وہ مجمع قومِ جہول میں
گھوڑوں کو عرض میں تو سواروں کو طول میں

کس کس دلاوری سے وہ خاصانِ رب لڑے
اس شان سے کبھی نہ عجم نہ عرب لڑے
دریا کے سمت رُخ نہ کیا تشنہ لب لڑے
پیاسے تھے تیغ زن کے لیکن غضب لڑے
نے دست ہو گئے تو یہ جوہر دکھا گئے
لوہے کو مثلِ شیرِ درندہ چبا گئے

الحق تھے شیر بیشۂ ہیجا وہ صف شکن
مرنے کی یہ خوشی تھی کہ خنداں تھے زخمِ تن
کھا کھا کے تیر کہتے تھے وہ غیرتِ چمن
قربان بندہ پروریِ سرورِ زمن
غازی ستمگروں سے وغا کر کے مر گئے
حقِ نمک جو تھا وہ ادا کر کے مر گئے

جب واصلِ جناں ہوئے وہ خاصگانِ حق
برہم ہوئے نبی کے مرقع کے بھی ورق
فرزندِ فاطمہ کو نہایت ہوا قلق
صدمے سے ہو گیا رُخِ انور کا رنگ فق
چمکی جواں کی تیغ تو بجلی چمک گئی
شیروں کی آنکھ خوف کے مارے جھپک گئی

لڑکے ہوئے جو معرکہ آرائے کارزار
واں کے جواں نہ روک سکے نیچوں کے وار
پیدل نہ اُن کی ضرب سے بچتا تھا نہ سوار
کر دیتے تھے وہ ایک کو دو اور دو کو چار
چھوٹے سے نیچوں سے ستمگر بتنگ تھے
گہ سر پہ گہ کمر پہ کبھی زیرِ تنگ تھے

لشکر میں اہلِ ظلم کے غل تھا کہ الاماں
دو بجلیاں چمکتی ہیں بھاگے کوئی کہاں
ان سے کہیں پناہ نہیں زیرِ آسماں
یہ کس کے شیر ہیں کہ نہیں جن کو خوفِ جاں
حضرت پکارتے تھے کہ دو دن کے پیاسے ہیں
جس کا پسر ہوں میں یہ اسی کے نواسے ہیں

پامال کرکے فوج کو جب وہ ہوئے تمام
روشن کیا چراغِ حسنؑ نے تب اپنا نام
نکلا جہاد کرنے کو پھر بازوئے امام
ایسا لڑا کہ ڈوب گئی خوں میں فوجِ شام
روئے امام اُس کی جوانی کے واسطے
دریا پہ قتل ہو گیا پانی کے واسطے

رخصت ہوا پدر سے علی اکبرِ دلیر
لشکر کو سرکشوں کے کیا دم میں اس نے زیر
آخر ہجوم کرکے لیا ظالموں نے گھیر
برچھی جگر پہ چل گئی مارا گیا وہ شیر
صدمہ سے حال سبطِ نبی غیر ہو گیا
تا ظہر سب کا خاتمہ بالخیر ہو گیا

تنہا کھڑے تھے دل کو سنبھالے ہوئے حسین
ہلتا تھا چرخ کہتے تھے جب ہائے نورِ عین
خیمے کے در پہ بیبیاں روتی تھیں کرکے بین
چلاتی تھی یہ فاطمہ زہرا یہ شور و شین
صدمے سہوں کلیجے پہ کس کس کے داغ کے
افسوس پھول جھڑ گئے سب میرے باغ کے

راوی نے یہ لکھا ہے کہ اُس دم بحالِ زار
لائے حسین ہاتھوں پہ اک طفلِ شیرخوار
دن کو ہوا فرازِ مہ و مہر آشکار
مرجھا گیا تھا پیاس سے لیکن وہ گلعذار
تھا فرطِ غش سے ننھا سا منکا ڈھلا ہوا
باندھے ہوئے تھے مٹھیاں منہ تھا کھلا ہوا

چھوٹا سا ایک سبز عمامہ تھا زیب سر
ماتھا جھنڈولے بالوں میں ہالے میں جوں قمر
جُبتی بھویں وہ جن پہ تصدق دلِ پدر
آنکھیں تو نرگسی پہ نقاہت زیادہ تر
سایہ میں دامن خلفِ بوتراب کے
رُخسار تھے کہ پھول کھلے تھے گلاب کے

پھیلا ہوا وہ آنکھوں میں کاجل ادھر اُدھر
خشکیدہ ہونٹ موئے مژہ آنسوؤں سے تر
باچھوں سے تھا نمود جمے دودھ کا اثر
ہاتھوں میں نیلے ڈورے تھے ہیکل تھی سینہ پر
ننھے سے دل کو ماں سے بچھڑنے کا درد تھا
رن کی ہوائے گرم سے جسم اُس کا سرد تھا

مہکی ہوئی تھی دشت میں گل سے بدن کی بو
اِن گورے گورے گالوں میں تھی یاسمن کی بو
شہ سونگھتے تھے دودھ بھرے اُس دہن کی بو
گویا لبوں سے آتی تھی نہر لبن کی بو
آتا رمِ رگ پھول سے رُخ پر نمود سے تھے
ہچکی لگی ہوئی تھی مسوڑے کبود تھے

تھے لعل لب نگینۂ یاقوتِ احمری
رنگیں ہیں جن کے وصف میں باغ سخنوری
غنچہ کا مُنہ ہی کیا جو کرے اُن سے ہمسری
وہ خار ہے رگ گل بستان حیدری
تھی نازکی میں اس پہ خزاں مارے پیاس کے
تالو سے لگ گئی تھی زباں مارے پیاس کے

روشن گلا تھا شمع تجلی طورِ حسن
مثل ستارۂ سحری تھا وفورِ حسن
گھیرے ہوئے تھا ننھی سی ہنسلی کو نورِ حسن
ہوتا ہے جس طرح مہِ نو سے ظہورِ حسن
چھیدیں وہی گلا یہ لعینوں کے جی میں تھا
یاں کنٹھ بیٹھ جانے سے دم دُگدُھگی میں تھا

کُرتا بدن میں آتا تھا اس رنگ سے نظر
پڑتی ہے اوس پھولوں پہ جیسے دمِ سحر
سینہ تھا صاف صورت آئینہ جلوہ گر
گرمی سے ہو گیا تھا شلوکہ عرق میں تر
چھاتی میں دم بدم جو دم اُس کا اٹکتا تھا
گھبرا کے ننھے ہاتھوں کو بے دم پٹکتا تھا

صدمے سے پیاس کے رخِ معصوم تھا جو زرد
حضرت فلک کو دیکھتے تھے بھر کے آہ سرد
ہچکی جب اس کو آتی تھی اُٹھتا تھا دل میں درد
آنسو رواں تھے آنکھوں سے رخ پر جمی تھی گرد
پانی کی جستجو تھی شہِ خوش صفات کو
تکتے تھے چشم یاس سے نہرِ فرات کو

جاری یہ لب پہ تھا کہ نہ آیا تجھے حجاب
ای نہر مر گئے مرے بچے بغیر آب
دو دن سے خشک ہی چمنستانِ بوتراب
محشر میں دے گی ساقیِ کوثر کو کیا جواب
سیراب سب چرند و پرند اور پیاسے ہم
شکوہ ترا کرینگے رسولِ خدا سے ہم

یہ کہہ کے شامیوں کو صدا دی بچشمِ تر
کہنا ہی کچھ مجھے عمرِ سعد ہی کدھر
نکلا یہ سن کے فوج سے ظالم بکرّوفر
پہنے لباسِ فاخرہ باندھے ہوئے کمر
خادم تھے ساتھ ہاتھ میں عہدے لیے ہوئے
اور ایک شخص چتر کا سایہ کیے ہوئے

بولے دکھا کے بچے کو شاہِ فلک سریر
مرتا ہی پیاس سے یہ مرا کودکِ صغیر
پانی ملا ہی کل سے نہ ممکن ہوا ہی شیر
للہ اس غریب پہ کر رحم ای امیر
مہماں ہی کوئی آن کا ہونٹوں پہ جان ہی
اُس کا قصور کیا ہی کہ یہ بے زبان ہی

نالاں ہی تجھ سے روحِ رسولِ فلک اساس
اتنا بھی دل نہ سخت کر ای ناخدا شناس
موجود ہیں صراحیاں پانی کی تیرے پاس
اک گھونٹ دے اسے کہ ہی سولہ پہر کی پیاس
بچے پہ ظلم صاحبِ ایماں سے دور ہی
چھوٹے سے میہمان کی خاطر ضرور ہی

برپا ہی اہلبیتِ محمد میں شور و شین
در پہ پھوپھی بلکتی ہی ماں کر رہی ہی بین
آنکھیں پھرائے دیتا ہی اب تو یہ نورِ عین
لایا ہی اس عطش میں ترے پاس یہ حسین
تجکو قسم ہی روحِ رسالت مآب کی
ٹپکا دے اُس کے حلق میں اک بوند آب کی

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو شہنشاہِ بحر و بر
دل دشمنوں کے ہل گئے تھرا گئے جگر
رویا جھکا کے سر پسرِ سعد خیرہ سر
فولاد موم ہو گیا اللہ رے اثر
مضطر تمام فوج کے پیر و جواں ہوئے
آنکھوں سے مرکبوں کے بھی آنسو رواں ہوئے

بولے یہ ابنِ سعد سے سردارِ فوجِ شام
واللہ ای امیر یہ ہی رحم کا مقام
دیتے ہیں اُس کو آب جو کافر ہو تشنہ کام
یہ بیکس و غریب تو سید ہے اور امام
کچھ شرم بھی ہی شرطِ مسلماں کے واسطے
دے حکم آب اصغرِ ناداں کے واسطے

تب ابنِ سعد شمر سے کرنے لگا کلام
کہنے لگا بگڑ کے یہ وہ نطفۂ حرام
پیاسا کرینگے ذبح ہم اس نونہال کو
یہ کہہ کے ابنِ سعد کے کچھ کان میں کہا
آنسو بہا کے کہنے لگے شاہِ کربلا
خیر اب کچھ آرزو نہیں اس آب شت کی
فرما کے یہ حسین چلے سوئے خیمہ گاہ
تنہا کماں کشوں میں گھرا فاطمہ کا ماہ
چھایا ستم کا ابر شہِ نامدار پر
آئے جو ہر طرف سے شہِ بحر و بر پہ تیر
غل تھا چلیں حسین کے لختِ جگر پہ تیر
آنسو رواں تھے آنکھوں سے بچے کے حال پر
پیہم پکارتے تھے شہِ آسماں جناب
منہ پھیرتے تھے سب کوئی دیتا نہ تھا جواب
جلدی کماں میں جوڑ کے سرکش نے تیر کو
کتنا بچایا شہ نے اجل سے نہ بس چلا
آنسو بھر آئے آنکھوں میں منکا جو ہیں ڈھلا
جو حسرتیں تھیں دل میں قضا نے نکال دیں
اک آہ کر کے غش ہوئے سلطانِ بحر و بر
رونے لگے صغیر کی صورت کو دیکھ کر
چوما گلا چھدا ہوا اس نونہال کا

اصغر کو خود پلا دے تو پانی کا ایک جام
ہم کو نہیں ہے تابِ عتابِ امیرِ شام
پانی نہ دیں گے بانوئے بیکس کے لال کو
حضرت کے سامنے سے ہٹا تب وہ بے حیا
سمجھا ہیں تیرے مکر کو اے بانیِ جفا
لہرا رہی ہیں سامنے نہریں بہشت کی
گھوڑے بڑھا بڑھا کے ہوئی فوج سدِ راہ
جھپٹے اِدھر اُدھر پہ نہ پائی کہیں پناہ
تیروں کا مینہ برسنے لگا شیر خوار پر
تلوار سے قلم کیے روکے سپر پہ تیر
آنے دیا نہ شاہ نے لیکن پسر پہ تیر
مثلِ کماں جھکے ہوئے تھے اپنے لال پر
یہ کیا خطا ہے روحِ نبی سے کرو حجاب
نکلا پرے سے حرملۂ خانماں خراب
تاکا نگاہِ قہر سے حلقِ صغیر کو
کڑکی اُدھر کماں اِدھر چھد گیا گلا
آنکھوں سے شہ نے آنکھیں ملیں منہ سے منہ ملا
ننھی سی باہیں باپ کی گردن میں ڈال دیں
سینے میں فرطِ غم سے لہو ہو گیا جگر
منہ رکھ دیا کھلے ہوئے منہ پر بچشمِ تر
ملنے لگے جبیں پہ لہو اپنے لال کے

کھینچا جو شہ نے تیر تو بچہ دہل گیا
مردہ ہوئے حیات کا نقشہ بدل گیا
خوں جوش کھا کے زخم گلو سے ابل گیا
ہچکی کے ساتھ ہونٹ کھلے دم نکل گیا
حضرت نے سر کو پیٹ کے اس طرح آہ کی
تڑپی لحد میں روح رسالت پناہ کی

ای اہل بزم پیٹنے رونے کی ہی یہ جا
اولاد والو ہی یہ دم نالہ و بکا
کیا شاہ دیں پہ ظلم ہوئے وا مصیبتا
گودی میں مرگیا چھ مہینے کا دلربا
پھٹ جائے کیوں جگر نہ شہ خوش خصال کا
ماتم ادھر جواں کا ادھر خرد سال کا

غصے سے حرملہ سے کہا یوں پکار کر
نازاں ہی تیر حلق پہ بچے کے مار کر
مجھ سے نکل کے جنگ اب ہی نابکار کر
آتا ہوں ننھی لاش لحد میں اتار کر
سینے پہ میرے تیر لگاتا تو غم نہ تھا
بچہ مرا یہ ناقۂ صالح سے کم نہ تھا

یہ کہہ کے رو رہے تھے شہنشاہ بحر و بر
ناگہ پکاری ڈیوڑھی سے فضہ بچشم تر
یا شاہ اب نکلتی ہی بانو برہنہ سر
اصغر جو رو رہے ہوں تو لے آیئے ادھر
بہنیں ہیں نالے زار پھوپھی بے حواس ہی
مادر کی گود خالی ہی جھولا اداس ہی

چلائے منہ پھرا کے شہنشاہ مشرقین
اصغر تو کوچ کر گئے لائے کسے حسین
فضہ یہ شہر بانو سے کہہ دے یہ شور و شین
گھر میں بس اب نہ آئے گا زہرا کا نور عین
جن کی تھیں طلب ہی وہ سوئے جناں گئے
جلتے ہیں ہم بھی اب وہیں اصغر جہاں گئے

یہ کہہ کے ذوالفقار سے کھودی زمین میں
ہاتھوں سے کی سپرد لحد لاش نازنیں
تربت پہ منہ کو رکھ کے پکارے یہ شاہ دیں
اب سوؤ خوب چین سے ای میرے مہ جبیں
تم یہ نہ جانیو کہ ہمیں چھوڑے جاتے ہیں
ہم بھی تمھارے پاس کوئی دم میں آتے ہیں

یہ کہہ کے اٹھے واں سے بحسرت امام پاک
رخسار پر لگی تھی مزار پسر کی خاک
بازو سے خوں رواں تھا گریبان چاک چاک
اعدا پہ کی نظر صفت شیر خشمناک
دل دشمنوں کے خنجر ابرو سے کٹ گئے
الٹی جو آستیں تو پرے سب الٹ گئے

نعرہ کیا تو رعد نے گردوں پہ کی فغاں
کھینچی جو تیغ برق پکاری کہ الاماں
اٹھا جو ہاتھ کانپ گیا شیر آسماں
گردش جو دی تو سب تہ و بالا ہوا جہاں
طبقے زمیں کے روح امیں کے پروں پہ تھے
یاں سر پڑے تھے خاک پہ اور تن سروں پہ تھے

جس صف پہ کوند کر وہ گری سر اڑا دیئے
بازو کماں کشوں کے برابر اڑا دیئے
پھل برچھیوں کے پھول سپر پر اڑا دیئے
جو مرغ تیر ادھر سے اڑا پر اڑا دیئے
جاں سرکشوں کی جانب ملک عدم چلی
ایسی ہوا بھی گلشن عالم میں کم چلی

شمشیر شہ کے وصف میں لکھتا ہوں چند بند
جو ہر شناس بھی یہ کریں گے پسند بند
نیزہ کا جس نے باندھا بڑھا کر سمند بند
کاٹا علی کی تیغ نے گرتے ہی بند بند
کیا ضرب تھی کہ فتح کا دروازہ کھل گیا
اجزائے جسم نحس کا شیرازہ کھل گیا

بجلی سی کوند کر صف اعدا پہ جب گری
ہر سمت غل ہوا کہ وہ برق غضب گری
بیدم تھا جس پہ تیغ شہ تشنہ لب گری
کھلتا نہ تھا کب اٹھ گئی اور سر پہ کب گری
چل پھر سے اس کی فوج ستم دردناک تھی
گردوں پہ تھی کبھی تو کبھی زیر خاک تھی

دو لاکھ پر وہ تیغ برستی چلی گئی
ناگن کی طرح فوج کو ڈستی چلی گئی
بجلی سی دونوں باگوں پہ کستی چلی گئی
دم میں جلا کے خرمن ہستی چلی گئی
زخموں کو اس نے آتش سوزاں بنا دیا
ہر نخل قد کو سرو چراغاں بنا دیا

اس تیغ کی برش سے زبردست زیر تھے
روباہ بن گئے تھے وہ دل جن کے شیر تھے
گوشوں میں چھپتے پھرتے تھے جتنے دلیر تھے
تودے سے تھے سرکشوں کے کمانوں کے ڈھیر تھے
غل تھا کہ ای نبی کے نواسے پناہ دے
ای دو شبانہ روز کے پیاسے پناہ دے

آئی ندائے غیب کہ ای ابن مرتضا
معنی یہی ہیں جنگ کے شاباش مرحبا
کس کا یہ منہ ہے تجھ سے کوئی کرسکے دغا
وعدے پہ بہ چلنے کے مناسب ہے اب وفا
ہم منتقم ہیں ان سے نہ تو انتقام لے
ای صابروں کے فخر بس اب ہاتھ تھام لے

آوازِ غیب سنتے ہی ٹھہر گئے امام
کی ذوالفقار میاں میں اور روک لی لگام
گردن پھرا کے منہ کو لگا تکنے خوش خرام
فرمایا تجھ سے ہوتا ہے رخصت یہ تشنہ کام
رک جا کہ خاتمہ ہوا جنگ و جدال کا
اب سر چڑھے گا نیزے پہ زہرا کے لال کا

رکنا تھا بس کہ چلنے لگے برچھیوں کے وار
اک جسمِ نازنیں پہ چلے تیر دس ہزار
تیغوں سے ہاتھ کٹ گئے سر ہو گیا فگار
تیورا گیا وہ فاطمہ زہرا کا گلعذار
کھائی سناں جو غش میں دمِ ونا ک پر
کرسی نشین عرش گرا فرش خاک پر

پہونچی جو ضرب پھٹ گئے زخمِ تنِ حسین
سب خاک خون میں بھر گیا پیراہنِ حسین
سر خاک پہ پٹکنے لگا توسنِ حسین
سجدے کو سوے قبلہ جھکی گردنِ حسین
اعدا نے کائنات کا دفتر الٹ دیا
نیزوں سے لاشِ شہ کو زمیں پر الٹ دیا

بولا یہ فوج سے عمرِ سعد روسیاہ
ریتی پہ اب تو غش ہے محمد کا رشکِ ماہ
نکلے کہیں نہ خیمے سے زینب بانالہ و آہ
ہاں کاٹ لو سرِ پسرِ ضیغم الٰہ
راحت کے بعد فتح سرانجام کیجیو
زہرا کے گھر کو لوٹ کے آرام کیجیو

خولی علم کیے ہوئے شمشیرِ کیں بڑھا
بڑھتے ہی اس کے اپنے پرے سے حصین بڑھا
خنجر کمر سے کھینچ کے شمرِ لعیں بڑھا
شہ کی طرف چڑھائے ہوئے آستیں بڑھا
زینب نے دی دہائی تو منہ کو پھرا لیا
زانو سے شہ کا سینۂ زخمی دبا لیا

پھیرا گلوے خشک پہ خنجر جو ایک بار
آثارِ صبحِ حشر ہوئے رن میں آشکار
شہ رگ پہ جب پہنچ گئی تیغِ ستم کی دھار
چلائے ہاتھ اٹھا کے امامِ فلک وقار
بیکس ہوں تشنہ کام ہوں تیغوں سے چور ہوں
یارب گواہ رہیو کہ میں بے قصور ہوں

یارب بحقِ گوہرِ دندانِ مصطفا
یارب بحقِ خونِ سرِ شاہ مرتضا
یارب بحقِ حرمتِ زہرا و مجتبا
کچھ اور مانگتا نہیں اصغر کا خوں بہا
ہے تجھ سے التجا یہی مجھ دل ملول کی
امت کو بخش دے مرے نانا رسول کی

یہ کہتے تھے کہ حلق سے خنجر گزر گیا
خورشید آسمانِ شرف خوں میں بھر گیا
دُنیا سے بادشاہ اُمم کوچ کر گیا
چلائی فاطمہ کہ مرا شیر مر گیا
برپا ہو جب یہ حشر تو کیا دل کو کل پڑے
باہر سب اہلِ بیتِ محمدؐ نکل پڑے

زینب نے خیمہ گاہ سے باہر جو کی نظر
دیکھا اک آفتاب کو نیزے پہ جلوہ گر
لڑکی جو ساتھ تھی وہ پکاری بچشم تر
میں لُٹ گئی پھوپھی مرے بابا گئے کدھر
شہ ذبح ہو گئے نہ کسی کو خبر ہوئی
ہی ہی ذری سی عمر میں میں بے پدر ہوئی

بنتِ علی کی آنکھوں میں عالم ہوا سیاہ
ہاتھوں سے دِل پکڑ کے کہا وا محمدؐا
مُنہ پیٹ کے زمیں پہ گری پھر باشک و آہ
چلائی ہائے خانۂ زہرا ہوا تباہ
ہم سب کے چین اب تہِ افلاک اُٹھ گئے
ہی ہی جہان سے پنجتنِ پاک اُٹھ گئے

ہی ہی شہیدِ خنجرِ ظلم و جفا حسین
ہی ہی گلو بریدۂ راہِ خدا حسین
ہی ہی غریب و بیکس و بے آشنا حسین
ہی ہی ذبیحِ ماریہ و نینوا حسین
ہی ہی لہو بھری ہوئی زلفیں لٹکتی ہیں
ہی ہی رگوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں

لوٹا بلا کے گھر سے محمدؐ کی آل کو
پیاسا کیا شہید شہِ خوش خصال کو
ہی ہی دیا کفن بھی نہ زہرا کے لال کو
لوگو خبر کرو اسدِ ذوالجلال کو
دیکھیں بغور زخم تنِ پاش پاش کے
ٹکڑے اُٹھائیں آکے بیٹے کی لاش کے

بس اے انیس حشر ہے مجلس میں اب خموش
سر پیٹتے ہیں عاشقِ سرور بصد خروش
ہے ماتمِ حسین کا بزمِ عزا میں جوش
کیا مرثیہ پڑھا کہ کسی میں نہیں ہے ہوش
فرما رہے ہیں شبیرِ خدا مرحبا تجھے
دیتی ہے روحِ فاطمہ زہرا دعا تجھے

مرثیہ (۱۵)

ای شمع قلم روشنی طور دکھا دے
ای لوح تجلی رخ حور دکھا دے
ای بحر طبیعت گہر نور دکھا دے
ای شاہد معنی رخ مستور دکھا دے
بزم غم شبیر میں وہ جلوہ گری ہو
خورشید جہاں تاب چراغ سحری ہو

ای طبع رسا خلد کا گلزار دکھا دے
ای باغ سخن گلشن بے خار دکھا دے
ای شمع زباں لمعہ انوار دکھا دے
ای حسن بیاں خوبی گفتار دکھا دے
لرزاں ہی قدم خامۂ اعجاز رقم کا
ہاں تیغ زباں آج تو کر کام قلم کا

مانی کو بھی حیرت ہو وہ نقشہ نظر آئے
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آئے
اللہ کی قدرت کا تماشہ نظر آئے
سب بزم کو حیدر کا سراپا نظر آئے
مہتاب تو کیا ہی رخ خورشید بھی فق ہو
جو بند ہو تصویر تجلی کا ورق ہو

ہی رتبۂ مدح چمن فاطمہ عالی
ہاں باندھ لو گلدستۂ مضمون خیالی
ہر مصرع شاداب ہو اک پھولوں کی ڈالی
لفظوں کے بھی غنچے ہوں نزاکت سے نہ خالی
لبریز لطافت سے ہو رنگین سخن ایسا
رضواں بھی پکارے نہیں دیکھا چمن ایسا

خاموش ازباں دعوی بیجا نہیں اچھا
ہو جس میں تکبر سخن ایسا نہیں اچھا
بس بس یہ غرور اور یہ دعوی نہیں اچھا
آپ اپنی ثنا واہ یہ شیوا نہیں اچھا
کم مایہ کمال اپنا جتا دیتا ہی اکثر
جو ظرف کہ خالی ہی صدا دیتا ہی اکثر

خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زنہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو ہی بیکار
اعلی ہی اگر جنس تو کیا حاجت اظہار
خود مشک ہو خوشبو نہ کہ خوشبو کہے عطار
جو بد ہی سو بد ہی جو نکو ہی وہ نکو ہی
چھپنے کی نہیں آپ اگر عود میں بو ہی

انساں کے لیے عجز ہی لازم ہی بہرکیف
ہی خانۂ دنیا میں ہر اک پیر و جواں ضعیف

گر صاحبِ جوہر نہ چلے جھک کے تو صد حیف
خارج ہی اصالت سے وہ ہستی نہیں جو سیف

آفاق میں یوں فیضِ نگیں عام نہ ہوتا
ہوتا نہ فروتن تو کبھی نام نہ ہوتا

مطلع دوم

یارب مری فریاد میں تاثیر عطا کر
بلبل بھی پھڑک جائے وہ تقریر عطا کر

دولت کے عوض فقر کی جاگیر عطا کر
توفیقِ ثناخوانیِ شبیرؑ عطا کر

دعوے نہ سخن کا ہی نہ اعجاز بیاں ہوں
تو عالم و دانا ہی کہ میں ہیچمداں ہوں

ای باعثِ ایجادِ جہاں وقت مدد ہی
ای منتظمِ کون و مکاں وقت مدد ہی

ای خضرِ رہِ گم شدگاں وقت مدد ہی
ای دادرسِ پیر و جواں وقت مدد ہی

چلنا ہی دمِ تیغ دو دم پر کوئی دم کو
یوں ہاتھ پکڑ لے کہ نہ لغزش ہو قدم کو

ای قبلۂ کونین اعانت کی طلب ہی
ای ہادیِ دارین ہدایت کی طلب ہی

ای بحرِ عطا ہمت و رحمت کی طلب ہی
ای نورِ خدا نورِ بصیرت کی طلب ہی

مقبول ہی وہ تو جسے منظور کرے گا
اس ذرہ کو خورشید ترا نور کرے گا

ای ساقیِ کوثر مے فردوس عطا کر
ای عیسیِ دوراں مرضِ دل کی دوا کر

ای دستِ خدا قلبِ مکدّر کی صفا کر
ای نورِ حق آئینۂ خاطر کی جلا کر

مستی میں نہ فکرِ خرد و ہوش کروں میں
کیفیتِ دنیا کو فراموش کروں میں

اندیشۂ توصیفِ شہنشاہ امم ہے
زانو پہ سرِ فکر ہی سجدے میں قلم ہی

یہ راہ ہی باریک کہ لغزش میں قدم ہی
ای دستِ زبردستِ خدا وقتِ کرم ہی

خامہ سے نہ کچھ طبعِ خداداد سے ہوگا
یہ مرحلہ طی آپ کی امداد سے ہوگا

بلبل سے کبھی وصفِ گلِ تر نہیں ممکن
آئینہ سے اوصافِ سکندر نہیں ممکن

ذرّے سے ثنائے شہِ خاور نہیں ممکن
جبریل سے تعریفِ پیمبر نہیں ممکن

مقدور کسے شبیرِ الٰہی کی ثنا کا
ہو سکتا ہی بندے سے کہیں شکر خدا کا

ہی عرش جہاں فرش یہ کاشانہ ہی کس کا
جلتا ہی دلِ شمع یہ افسانہ ہی کس کا
روشن ہی جہاں جلوۂ نورِ ازلی ہی
مجلس کا ترے ہے نور خوشا محفلِ عالی
عاشق ہیں سب اسکے جو ہی کونین کا والی
شش جہتہ ہوں کیوں چار طرف جلوہ گری ہی
اللہ رے رتبہ یہ فلک ہی کہ زمیں ہی
جو دل ہی سو وابستہ لطف شہ دیں ہی
یہ اوج یہ رتبہ کسی محفل کو ملا ہی
فرماتے ہیں شیعوں کے یہ حق میں شہِ اکرم
بن جاتے ہیں اشک ان کے مرے زخموں کے مرہم
مرجاتا ہی کوئی تو بکا کرتا ہوں میں بھی
کیسا ہی گنہگار ہو مرے میرا عزادار
فرماتے ہیں بخشش کی دعا احمدِ مختار
گر نزع میں سختی ہو تو زہرا و نبی ہیں
کیوں مومنوں کیا فیض ہی کیا لطف و عطا ہی
گوہر ہیں یہ وہ جن کا خریدار خدا ہی
دنیا پہ نہ دولت پہ توجہ ہی نہ زر پر
کیا اشک عزادار کا رتبہ کوئی جانے
کی ہی نظرِ عین عنایت شہداے
یاں اس کا نہ عقدہ دل مضطر پہ کھلے گا

ہر سو ہی تجلّی یہ جلو خانہ ہی کس کا
سرگشتہ ہی مہتاب یہ پروانہ ہی کس کا
ہاں بزم معلاے حسین ابن علی ہی
حیدر کے محبوں سے کوئی جا نہیں خالی
اثنا عشری پنجتنی شیعہ غالی
یہ بزم عزا آج ستاروں سے بھری ہی
ہی عرش مکاں جس کا وہ آج اس میں مکیں ہی
مجلس ہی کہ گلدستۂ فردوسِ بریں ہی
ان پھولوں کے قربان عجب باغ کھلا ہی
یہ بزم عزا ہوتی ہی جس گھر میں فراہم
یہ لوگ ہیں سب میرے مصاحب مرے ہمدم
ان کے لیے بخشش کی دعا کرتا ہوں میں بھی
ہی اس کے گناہوں سے فزوں رحمتِ غفار
اللہ سے میں ہوتا ہوں بخشش کا طلبگار
اور قبر کی مشکل میں شہ یکساں اسکے علی ہیں
کیا مرتبۂ اشک ہی کیا اجرِ بکا ہی
جو کچھ ہی سو بس دوستی آلِ عبا ہی
زہرا کی نظر پڑتی ہی اشکوں کے گہر پر
یہ گنج گہر بخشتا ہی مردم کو خدا نے
دکھلائینگے کیا کیا ثمر ان اشکوں کے دانے
یا قبر پہ یا چشمۂ کوثر پہ کھلے گا

یاں اشک کا دانہ ہی تو واں دُرِّ ثمیں ہی
یاں آب ہی واں غازہ کشِ چہرۂ دیں ہی
یاں آنسوؤں کا تار ہی واں حبلِ متیں ہی
یاں قطرہ ہی واں خاتمِ جنت کا نگیں ہی
قطرہ ہی مگر بحر کو بھی گرد کرے گا
دوزخ کے شراروں کو یہی سرد کرے گا

جو لوگ ہیں باکی انھیں دوزخ سے نہیں باک
مُنہ اشکوں سے دھویا تو گناہوں سے ہو پاک
ہی دولتِ ایماں غمِ سبطِ شہِ لولاک
ہو جاتی ہی کیا بعدِ بکا طبع فرحناک
آنکھوں کی ضیا رُخ کی صفا دل کی جلا ہی
سب ایک طرف گلشنِ فردوس ملا ہی

مہلت جو اجل دے تو غنیمت اسے جانو
آمادہ ہو رونے پہ سعادت اسے جانو
آنسو نکل آئیں تو عبادت اسے جانو
ایذا بھی ہو مجلس میں تو راحت اسے جانو
فاقے کیے ہیں دھوپ میں لب تشنہ رہے ہیں
آقا نے تمھارے لیے کیا ظلم سہے ہیں

تکلیف کچھ ایسی نہیں سایہ ہی ہوا ہی
پانی ہی خنک مروحہ کش بادِ صبا ہی
کچھ گرمیِ عاشور کا بھی حال سُنا ہی
سر پیٹنے کا وقت کا ہی فریاد کی جا ہی
گزری ہی بیاباں میں وہ گرمی شہِ دیں پر
بھُن جاتا تھا دانہ بھی جو گرتا تھا زمیں پر

وہ گرم ہوا آہ وہ آندھی وہ بگولے
اُٹھے جو ترائی سے تو دم شبّر کا پھولے
دو گام چلے گر تو ہرن چوکڑی بھولے
کیا تاب ہی اس کی جو کوئی سنگ کو چھولے
خاک اُڑ کے جمی جاتی تھی زلفوں پہ قبا پر
اس دھوپ میں سایہ بھی نہ تھا نورِ خدا پر

حدّت تو یہ خورشید کی اور پیاس کا وہ حال
لب خشک تھے سونلا گیا تھا فاطمہ کا لال
سایہ نہ علَم کا تھا نہ عباس خوش اقبال
گہ رُخ پہ سپر روکتے تھے اور کبھی رومال
تھی دھوپ کڑی فاطمہ کے رشکِ چمن پر
تھی گرم زرہ جلتے تھے ہتھیار بدن پر

زلفیں وہ جنھیں سونگھتی تھی فاطمہ ہر شب
غیرت دہِ مشکِ ختن و عنبرِ اشہب
کہتے تھے جنھیں فاطمہ کا رشتۂ جاں سب
کیوں دل نہ پریشاں ہو وہ مٹی میں اٹیں جب
آہوں کا دھواں کیوں نہ اُٹھے کون و مکاں سے
فریاد کہ باندھا انھیں خولی نے سناں سے

وہ چاند سی پیشانی نورانی شبیر
اندھیر ہے اس پر بن اشعث کا لگا تیر
سجدے کریں محراب حرم کی ہے یہ توقیر
اُن ابرؤں پر ہائے چلی ظلم کی شمشیر
آہو کو ستاتے نہیں دیندار حرم میں
آنکھیں وہ لہو روتی تھیں فرزندوں کے غم میں

وہ ریش جو ہالہ تھی تو چہرہ مہ انور
فاقوں سے تھا یہ زرد وہ تھی آنسوؤں سے تر
وہ پھول سے رخسار وہ لعلِ لب اطہر
اس کے لیے تلواریں تھیں اس کے لیے پتھر
دنداں دہنِ پاک میں سب رشکِ گہر تھے
گزرے تھے کئی روز کہ دنداں بہ جگر تھے

وہ حلق جسے چومتے تھے احمد مختار
نیزہ اس کے لیے ہوتے تھے واں خنجر خونخوار
وہ دوش جو امت کا اٹھائے ہوئے تھا بار
لگتا تھا تبر اس پر کبھی اور کبھی تلوار
لڑنے کی نہ طاقت تھی شہ تشنہ گلو میں
ڈوبی ہوئی تھیں مچھلیاں بازو کی لہو میں

وہ شمع سرِ طور سی پر نور کلائی
اُس پر خطِ شمشیر دوہائی ہے دوہائی
مُنہ دیکھ لو صاف ایسی ہتھیلی میں صفائی
ہے سب پہ کھلی انگلیوں کی عقدہ کشائی
نسبت نہیں ناخن سے کبھی بدر کی ضو کو
ہفتہ میں دکھائے تو کوئی دس مہ نو کو

وہ سینۂ روشن کہ جو تھا مطلع انوار
گنجینۂ علم احدی مخزن اسرار
قرآن کو رکھ لیتے ہیں سر پر جو ہیں دیندار
کیا قہر ہے واں پانوں دھرے شمر ستمگار
سینے پہ نہ تھا اس کا قدم حشر بپا تھا
ہو جاتی جو دنیا تہ و بالا تو بجا تھا

عباس سے بھائی کا جو تھا صدمہ جاں کاہ
ٹکڑے تھا جگر ٹوٹ گئی تھی کمر شاہ
اس ضعف میں لغزش سے نہ وہ پانو تھے آگاہ
پایا تھا ثباتِ قدم پاک ید اللہ
سب خاک پہ ٹکڑے تو کلیجے کے پڑے تھے
لاکھوں سے لڑائی تھی یہ بشاش کھڑے تھے

منہ کر کے سوئے چرخ یہ فرماتے تھے ہر بار
عالم مری نیت سے ہے تو اے مرے مختار
گھر سے نہ علاقہ ہے نہ بچوں سے سروکار
ہر حال میں ہوں تجھ سے اعانت کا طلبگار
گو شاہِ زمن ہوں پہ ترے در کا گدا ہوں
محتاج ہوں بیکس ہوں غریب الغربا ہوں

کس کس ترے احساں کا کروں شکر زباں سے — ہے ناطقہ عاجز کہ زیادہ ہے بیاں سے
واقف نہیں کوئی ترے اسرار نہاں سے — دشوار ہے عالم کی صفت بے ہمہ داں سے
پیاس آج کے دن کی مجھے مرغوب ہے مولا — جو تیری مشیت ہے وہی خوب ہے مولا

ہر دم ہے ترا لطف مرے حال کے شامل — پیدا کیا واں وحی جہاں ہوتی تھی نازل
بخشا وہ مکاں رہنے کو اے خالق عادل — نے اذن ملک جس میں نہ ہو سکتے تھے داخل
یہ لطف و عنایت ہے تری کون سے گھر پر — جبریل و سرافیل کھڑے رہتے تھے در پر

نانا تو دیا اشرف ذریت آدم — بابا شہ مرداں سا دیا فخر دو عالم
ماں سیدہ کون و مکاں ثانی مریم — بھائی وہ کہ تو جس کی بزرگی سے ہے محرم
دنیا میں کسی اور کا رتبہ ہے کب ایسا — نام ایسا گھر ایسا نسب ایسا حسب ایسا

ماں طاہرہ جد طیب و پاکیزہ پدر پاک — رحمت سے تری کیوں نہ ہوا ایسوں کا پسر پاک
گلشن کی زمیں پاک شجر پاک ثمر پاک — گھر پاک جگہ پاک صدف پاک گہر پاک
پھولے وہ شجر جس کو ثمردار کرے تو — جس قطرے کو چاہے در شہوار کرے تو

بچپن میں محمد نے زباں اپنی چوسائی — اب تک کسی نعمت میں وہ لذت نہیں پائی
قرباں ہے احمد مختار کی جائی — جب دودھ چھٹا نعمت فردوس بھی کھائی
افلاک سے دن میں کئی بار آتے تھے جبریل — ڈوری مرے جھولے کی ہلا جاتے تھے جبریل

دم بھر کبھی تنہا نہ رہا آٹھ پہر میں — گہ دوش نبی پر کبھی آغوش پدر میں
ماں ساتھ مرے ہوتی تھیں جب تا تھا گھر میں — پتلی کی طرح رکھتے تھے سب مجکو نظر میں
اس رتبۂ اعلیٰ کا سزاوار میں کب تھا — مولا یہ تری چشم عنایت کا سبب تھا

تھا عید کو عریاں کہ عنایت ہوئی پوشاک — عمامہ و پیراہن و پاجامہ و ردا پاک
مرکب جو نہ تھا اونٹ بنے سید لولاک — بالا رہا سب سے مرا رتبۂ افلاک
یہ تخت سلیماں کو نہ یہ تاج ملا تھا — بچپن میں مجھے رتبۂ معراج ملا تھا

رجعت ہوئی خورشیدِ فلک کو پئے حیدر
یعنی نہ قضا ہوئی نمازِ شہِ صفدر

روزہ جو رکھا میں نے تو اے خالقِ اکبر
دن تھا یہ ہوئی رات چھپا مہرِ منوّر

منظور تھی خوردی میں نہ رنگی مرے سن کی
دن ہو گیا واں شب کا تو یاں شب ہوئی دن کی

کیا عمر تھی جب سر سے اُٹھا باپ کا سایا
دو بھائی تھے دو بہنیں تھیں اور وہیں پرایا

تھا تو جو نگہبان تو نہ اعدا نے ستایا
ماں باپ کا مرنا تری شفقت نے بھلایا

رحمت سے تری خلق کے مختار ہوئے ہم
دیکھی جو یتیمی تو درِ شہوار ہوئے ہم

دولت نے مجھے دی گوہرِ عزت نے مجھے بخشا
بابا کی طرح اوجِ شرافت نے مجھے بخشا

مسند نے مجھے دی تختِ امامت نے مجھے بخشا
ان سب کے سوا تاجِ شفاعت نے مجھے بخشا

اختر کو قمر قطرے کو گوہر کیا تو نے
ذرّہ تھا سو خورشیدِ منور کیا تو نے

انصار دیے وہ جو پیمبر نے نہ پائے
اصحاب وہ بخشے کہ جو حیدر نے نہ پائے

احباب وہ یکرنگ جو شبر نے نہ پائے
لوگ ایسے کسی صاحبِ لشکر نے نہ پائے

تیروں سے نہ تلواروں سے منہ پھرتا تھا اُن کا
خادم کے پسینے پہ لہو گرتا تھا اُن کا

فرزند وہ امداد کیا حورِ شمائل
تھی جن کی زیارت کے سبب روشنیِ دل

خورشید زمیں برجِ شرف ماہِ کامل
یہ بھی تری امداد تھی اے خالقِ عادل

دولت یہ نہ ملتی جو خداوند نہ دیتا
کیا کرتا اگر تو نے مجھے فرزند نہ دیتا

اکثر ترے بندے ہیں کہ جن کے نہیں اولاد
نے فاتحہ خواں کوئی نہ فرزند نہ احفاد

کہتے ہیں کہ غمگین ہیں کبھی اور کبھی شاد
بچے ہوئے اور مر گئے اور گھر ہوا برباد

مرتے ہوئے دیکھا ہے برابر کے پسر کو
اس داغ کی قدر آج ہوئی میرے جگر کو

سو مرتے جو فرزند تو لے صبر نہ ہوتا
خادم کبھی اس اجر کو ہاتھوں سے نہ کھوتا

دامن کو ترے خوف میں اشکوں سے بھگوتا
اکبر کو میں فرزند سمجھ کر نہیں روتا

یوں تو وہ کلیجہ تھا مرا اور مرا جی تھا
میں اس لیے روتا ہوں کہ ہمشکلِ نبی تھا

بچھڑا تھا کبھی مجھ سے نہ وہ گیسوؤں والا
پیری کی عصا تھا وہی اور گھر کا اُجالا
جب چاند سی چھاتی پہ لگا ظلم کا بھالا
تھا سینے میں خادم کا کلیجہ تہ و بالا
اشک آنکھوں سے تھمتے نہیں تفتیدہ جگر ہوں
تو رحم کر اے خالق اکبر کہ بشر ہوں

دریا پہ جو عباس نے جان اپنی گنوائی
خادم کی کمر ٹوٹ گئی مر گیا بھائی
باعث تھا یہ لاشے پہ جو رقت بہت آئی
مولا مجھے یاد آگئی بابا کی جدائی
صدمے سے نہ پھر ضبط کا یارا ہوا مجکو
پھر داغ ید اللہ دوبارا ہوا مجکو

تنہا ہوں نہیں اب کوئی مونس و ہمدم
موجود ہی تو سر پہ کچھ اس کا بھی نہیں غم
اب رنج نہ گھر کا ہی نہ اولاد کا ماتم
بہتر ہی گزر جائے تری یاد میں جو دم
وابستہ تسبیح رکھوں رشتۂ جاں کو
جب تک ہی دہن میں حرکت خشک زباں کو

گو روح کو راحت نہیں و قلب کو آرام
ہی تقویت جان و دل و روح ترا نام
کم ہی ترے سجدے میں ہوں گر سحر و شام
قاصر ہی زباں شکر میں اے خالق علام
آنکھیں تری جانب ہیں تو دل تیری طرف ہی
گر تو اسے مقبول کرے عین شرف ہی

نے پیاس کا شکوہ ہی نہ فاقہ کی شکایت
ہر طرح ہی راضی پسر شاہ ولایت
وہ بھی ترا انعام تھا یہ بھی ہی عنایت
الطاف کا پایاں ہی نہ بخشش کی نہایت
وہ کونسی دولت ہی جو موجود نہیں ہی
ہاں ایک شہادت ہی سو اب وہ بھی قریں ہی

ہر چند کہ ہی سخت بہت ذبح کی منزل
تو چاہے تو ہو جائے گی آسان یہ مشکل
زانو جو رکھے سینۂ مجروح پہ قاتل
وہ صبر عطا کیجو کہ تڑپے نہ مرا دل
سجدہ تہ شمشیر یہ ناشاد نہ بھولے
سب محو ہوں دل سے پہ تری یاد نہ بھولے

حضرت تو یہ کرتے تھے سخن صبر و رضا کے
بندھتے تھے اُدھر رن میں پرے اہل جفا کے
چلاتا تھا یوں شمر کمانداروں میں آکے
تاکے رہو سینہ کو امام دوسرا کے
یاں تک خلف شاہ نجف آنے نہ پائے
یہ شبیر ترائی کی طرف آنے نہ پائے

برچھے لیے ہاتھوں میں سوارانِ جفاکار
آلودۂ خوں برچھیاں تولے ہوئے خونخوار
لشکر کے جواں گرزِ گراں تولے ہوئے تھے

وہ غل عربی باجوں کا وہ بوق کے نالے
رستم کی نہ طاقت تھی جو واں آکے سنبھالے
پیدا تھی جلاجل سے اک افسوس کی آواز

رو رو کے یہ پُر درد صدا دیتی تھی شہنا
فانی ہے زمیں اس پہ ہمیشہ نہیں رہنا
دو روز کے پیاسے شہِ مظلوم کھڑے ہیں

چلے سے جو بدکیش ملانے لگے سوفار
فرمایا قسم ہے تمہیں اے قومِ ستمگار
انصاف سے کہدو کہ طلبگار ہوں جس کا

ہے کون گلِ سرسبدِ گلشنِ اسلام
آتی تھی کسے وحیِ الٰہی سحر و شام
جبریلِ امیں ہمدم و ہمراز ہے کس کا

برپا علمِ نظم و نسق کردیا کس نے
رنگِ رخِ کفّار کو فق کردیا کس نے
لب ہل گئے جب نخلِ دعا میں ثمر آیا

بخشا کسے اللہ نے معراج کا پایا
پڑتا تھا نہ اس خاک پہ کس شخص کا سایا
کس رُخ کو تجلّی صفتِ بدر عطا کی

بڑھ بڑھ کے صفِ جنگ میں چمکاتے تھے رہوار
تھی ڈھال پہ ڈھال اور تھی تلوار پہ تلوار
ہر صف میں علمدار نشاں کھولے ہوئے تھے

وہ شورِ دہل سر پہ جو گردوں کو اُٹھا لے
دب جائے اگر دیو بھی آواز بجالے
جاتی تھی کئی کوس تلک کوس کی آواز

اچھا نہیں سیّد کا لہو خاک پہ بہنا
درپے نہ ہو مظلوم کے مانو مرا کہنا
اس غم سے کلیجے میں مرے چھید پڑے ہیں

خود چھیڑ کے گھوڑے کو بڑھے سیّدِ ابرار
کس شخص کا دلبند ہوں میں بیکس و ناچار
جد کس کا ہے تم سب کلمہ پڑھتے ہو کس کا

آبادکنِ کعبۂ حق کاسرِ اصنام
جو نامِ خدا سے ہے بہم کس کا ہے وہ نام
قرآن جسے کہتے ہو اعجاز ہے کس کا

عالم کو سوئے کعبۂ حق کردیا کس نے
ہاں بدر کو انگشت سے شق کردیا کس نے
انگشتِ شہادت کو اُٹھا کر شجر آیا

سو مُردوں کو عیسیٰ کی طرح کس نے جلایا
جد کس کا ہے وہ سورۂ کوثر جسے آیا
دُنیا میں کسے حق نے شبِ قدر عطا کی

سب بولے کہ اس بات سے واقف ہے زمانہ
روشن ہے شب ماہ سے معراج کا جانا
وہ قبلۂ دیں باعث ایجادِ فلک ہے
شبیرؑ نے فرمایا کہ وہ کس کی ہے مادر
دنیا کا شرف زینت دیں عرش کا زیور
بھیجی ہے انھیں چادرِ تطہیر خدا نے
کہنے لگے بے شرم کہ ہے خاصۂ قیوم
سب جانتے ہیں ساکن شام و عرب و روم
زہرا کا پدر فخرِ رسولانِ سلف ہے
اس حجتِ باری نے یہ فرمایا پھر اک بار
کس کا ہے لقب شیرِ خدا حیدر کرار
ہر جنگ میں کفار پہ ور کون رہا ہے؟
آباد ہوئی کس کی عنایت سے رعایا
کس کے لیے اکملت لکم دینکم آیا
یکتائے جہاں کون ہے جرأت میں سخا میں
وہ کون ہے اللہ و نبی کو جو ہے پیارا
ہے انفسنا انفسکم کس سے اشارا
اعلیٰ کسے فرمایا علی کس کو کہا ہے
طاعت سے جو افضل ہے اطاعت وہ کس کی
پہونچا دے جو کوثر پہ شفاعت ہے وہ کس کی
انصاف کا اس وقت طلبگار ہوں تم سے

لاریب ہیں محبوب خدا آپ کے نانا
کافر ہے وہ اس بات کو جس نے نہیں مانا
آپ ان کے نواسے ہیں کچھ اس میں نہیں شک ہے
قرآں میں جسے حق نے کہا طاہر و اطہر
خاتونِ جہاں نورِ خدا بنتِ پیمبر
امت کے گنہ ڈھانپ دیئے جن کی ردا نے
وہ آپ کی مادر ہیں یہ کس کو نہیں معلوم
وہ سیدہ معصوم ہے اور آپ بھی معصوم
حوا کا نہ رتبہ ہے نہ مریم کا شرف ہے
من بعد نبی کون ہے کونین کا سردار
اللہ نے بھیجی ہے کسے عرش سے تلوار
محبوبِ الٰہی کی سپر کون رہا ہے؟
کس شاہ نے دینداروں کی بستی کو دکھایا
اتممت علیکم کا ملا ہے کسے پایا
وہ حصے ہے قرآنِ خدا کس کی ثنا میں
جو عرش کی زینت ہے وہ ہے کونسا تارا
اللہ نے کس گھر میں ستارے کو اتارا
اللہ نے قرآں میں ولی کس کو کہا ہے
پوچھے گا خدا جس کو محبت ہے وہ کس کی
جو اجرِ رسالت ہے مودت ہے وہ کس کی
ہے کون مراد آیۂ لا اسئلکم سے

جو والیِ کونین ہے وہ کون ولی ہے
قرآن میں کس کے لیے وہ نصِ جلی ہے
وہ کون ہے جو شاہ امامِ ازلی ہے
سب نے کہا برحق وہ علی ہے وہ علی ہے
برعکس ہیں جو لوگ وہی بانیِ شر ہیں
سب پر ہے یہ آئینہ کہ آپ اُن کے پسر ہیں

گردوں کی طرف دیکھ کے بولے شہِ بیکس
کافی ہے شہادت کو تری ذاتِ مقدس
یارب مجھے ان سے کوئی حجت نہیں بس
کرتے ہیں ستم دیدہ و دانستہ یہ ناکس
دکھ کونسا اور کونسی ایذا نہیں دیتے
مہماں ہوں اور پانی کا قطرا نہیں دیتے

جاہل نہیں سب ہیں مرے رتبے کے شناسا
خود اس کے مقر ہیں کہ نبی کا ہوں نواسا
اس نہر سے پانی نہیں دیتے ہیں ذرا سا
شاہد تجھے کرتا ہوں کہ دو دن سے ہوں پیاسا
ٹکڑے ہو بدن یا تہِ شمشیر گلا ہو
اس سب کے عوض حشر میں شیعوں کا بھلا ہو

سن کر یہ سخن رونے لگے فوج کے نے پیر
مظلوم کی فریاد نے کی سنگ میں تاثیر
بولا پسرِ سعد کہ یا حضرتِ شبیرؑ
تنہا ہوئے اب کیوں نہ کرو عجز کی تقریر
میداں سے ہٹاتے نہیں اس فوجِ گراں کو
ایسا ہے مرا رعب کہ لکنت ہے زباں کو

اس عجز کو مانے گا نہ یہ لشکرِ سفاک
پھر کیا کریں گر ہو پسرِ سیدِ لولاک
سو مل گئے ہیں خاک میں ایسے گہرِ پاک
حاکم ہیں کہ ہے دور ہمارا تو افلاک
ڈرتے نہیں گر شکوۂ بیداد کروگے
کیا ہوگا جو اللہ سے فریاد کروگے

عباس سے کہہ دو کہ مدد کرنے کو آئیں
جعفر کے پسر جوہرِ شمشیر دکھائیں
قاسم ہیں کدھر خون کے دریا جو بہائیں
اکبر سے کہو جنگ کریں برچھیاں کھائیں
اب آپ کی جرأت کا بھی وہ طور نہیں ہے
شاید کوئی زینب کا پسر اور نہیں ہے

بیدرد نے چھڑکا جو نمک زخمِ جگر پر
طاری ہوا غصہ شہِ مرداں کے پسر پر
سرخی سی نظر آنے لگی دیدۂ تر پر
کی تیز نظر قبضۂ شمشیر دو سر پر
شہ کی نظرِ غیظ نہ تھی قہرِ خدا تھا
شمشیرِ یداللہ جدا میان جدا تھا

خود تیغ علی شاہ کے اعجاز سے نکلی
فریاد دلِ فوجِ دغا باز سے نکلی
کس شان و تجمل سے کس انداز سے نکلی
پریوں کے بھی ہوش اُڑ گئے اس ناز سے نکلی
فانوس سے خود شمع تجلی نکل آئی
محمل سے تڑپتی ہوئی لیلی نکل آئی

تھیں تیغ کی دونوں جو زبانیں شرر افشاں
موسیٰ کا عصا کہتا تھا کوئی کوئی ثعباں
غل چار طرف تھا کہ زہے قدرتِ یزداں
ہیں ایک جگر دو مہِ نو دست و گریباں
شہباز اجل بازوؤں کو تولے ہوئے ہے
پر اوجِ سعادت کے ہما کھولے ہوئے ہے

نعرہ کیا ہاں ای پسرِ سعدِ جفا کار
لے دیکھ تو ان کانپتے ہاتوں کا کوئی وار
ہر چند کہ ہے عجز ہی بندے کو سزاوار
مجبور نہیں لختِ دلِ احمدِ مختار
شاید مرا رتبہ تجھے معلوم نہیں ہے
وہ کونسی شی ہے کہ جو محکوم نہیں ہے

حاکم ہوں میں سب خلقِ خدا ہے مرے تابع
ہیں بابِ اجابت ہوں دعا ہے مرے تابع
مختار قدر ہوں میں قضا ہے مرے تابع
آتش مری محکوم ہوا ہے مرے تابع
قبضہ ہے مرا خاک کے ہر گنجِ نہاں پر
جاری ہے مرا حکم رواں آبِ رواں پر

آتش کو جو دوں حکم ابھی سب کو جلا دے
ہستی کے چراغوں کو ہوا دم میں بجھا دے
پانی کا یہ طوفاں ہو کہ عالم کو ڈبا دے
ہل ہل کے زمیں خاک زمانے کی اُڑا دے
ہستی ہو نہ بستی نہ مکیں ہو نہ مکاں ہو
آثار اذا زلزلت الارض عیاں ہوں

ڈر رنج سے کچھ بیم نہ دہشت ہے بلا سے
مضطر ہوں نہ دکھ سے نہ ستم سے نہ بلا سے
خائف ہوں نہ جن سے نہ بشر سے نہ قضا سے
ہاں ایک جو ڈرتا ہوں تو ڈرتا ہوں خدا سے
کیا غم ہے اگر لاکھ سواروں کے پرے ہیں
روباہ کے لشکر سے کہیں شیر ڈرے ہیں

تو کیا ہے ترا رعب ہے کیا او سگِ ناپاک
ہیں بیشۂ حیدر کا ہوں اک شیرِ غضبناک
اُف کردوں تو جل کر ترا لشکر ہو یہ سب خاک
مشتاقِ اجل ہوں مجھے مرنے سے نہیں باک
باتوں میں کروں بند فصیحانِ جہاں کو
یہ پیاس سے لکنت ہے مری خشک زباں کو

نازاں نہ ہوا ہے بانیٔ ظلم و ستم و جور
تو آج جو حاکم ہے تو کل ہوگا کوئی اور
نمرود نہیں حشمت ضحاک نہیں ہے
قیصر کا وہ افسر ہے نہ وہ تاجِ کیاں ہے
آئینہ پئے روے سکندر نگراں ہے
ٹھکرا کے جو چلتا ہے ہر اک راہگزر میں
جامِ سرِ جمشید تہِ خاک ہے واژوں
نے تاج قباد آج ہے نے تختِ فریدوں
دانا تھے پہ کس طرح پھنسے دامِ اجل میں
مشہور ہے فرعونیوں کے غرق کا احوال
وہ باغ کہ زر جس پہ کیا صرف مہ و سال
لوٹا ہے وہ گلشن کہ نہ پھل پائے گا ظالم
کیا غم مجھے عباس علمدار نہیں گر
بہتر ہوا اس راہ میں گر مر گئے اکبر
جعفر بھی شریکِ الم و یاس ہیں میرے
پہچان تو میں کون ہوں او جاہلِ مطلق
نفریں وگر میں تو اُڑے خلق سے رونق
فریاد جو میرے دلِ صد چاک سے نکلے
فرما کے یہ جلوہ دیا تیغِ دو زباں کو
ہر نیزے نے اونچا کیا انگشتِ اماں کو
چڑھ سکتا ہے دنیا میں کوئی شیروں کے منہ پر

مٹ جاتا ہے اک گردشِ افلاک میں یہ دور
کیا ہو گئی کر دولتِ قاروں پہ ذرا غور
ڈھونڈو جو خزانے میں تو اب خاک نہیں ہے
نے قصرِ خورنق کا مکیں ہے نہ مکاں ہے
چینی کی صدا یہ ہے کہ فغفور کہاں ہے
سو بال شکستوں سے ہیں واں کاسۂ سر میں
کاؤس کی دولت ہے نہ گنجینۂ قاروں
دارا ہے نہ پرویز نہ خسرو ہے نہ گلگوں
گھر وحشیوں کے بن گئے کسریٰ کے محل میں
شداد کو کس طرح کیا مال نے پامال
دیکھا بھی نہ اس کو کہ اجل آگئی دنبال
اب تو بھی جہنم میں یوہیں جائے گا ظالم
چاہوں تو مدد کرنے کو آئیں ابھی حیدر
خود سینہ سپر ہونے کو حاضر ہیں پیمبر
تو دور نہ جان ان کو یہ سب پاس ہیں میرے
اونگلی سے قمر کو مرے نانا نے کیا شق
طبقے سے زمیں کی برکت سلب کرے حق
تا حشر نہ دانا کبھی اس خاک سے نکلے
عبرت ہوئی بجلی کے چمکنے سے جہاں کو
خود چھوڑ دیا سہم کے تیروں نے کماں کو
تیزی نہ رہی خوف سے شمشیروں کے منہ پر

اس شان سے لشکر پہ امامِ امم آئے — جیسے صفِ آہو پہ ہزبرِ اجم آئے
اتنا تو پکارے کہ خبردار ہم آئے — اک دم میں ستمگر تہِ تیغِ دو دم آئے
پل بندھ گئے لاشوں کے نہ اک پل ہوئی آخر — ثابت یہ ہوا کب صفِ اول ہوئی آخر

جب تیغِ علی قبلۂ عالم نے علم کی — اک برق سی میدانِ بلاخیز میں چمکی
اللہ ری برش سیفِ شہنشاہِ امم کی — اعدا کو نظر آنے لگی راہ عدم کی
گلرنگ لہو سے جو ہر اک جسم شفقی تھا — تھی دوپہر اور دامنِ صحرا شفقی تھا

شمشیرِ یداللہ نے نئی چال دکھائی — سرداروں کی صف فوج کو پامال دکھائی
ہر بار چمک برق کی تمثال دکھائی — سب خون سے مقتل کی زمیں لال دکھائی
جل جل کے بدن ناریوں کے سرد ہوئے تھے — ڈر ڈر کے سیہ کاروں کے منہ زرد ہوئے تھے

کٹ کٹ کے صفیں خاک پہ نے جاں نظر آئیں — جو برچھیاں یاں جمع تھیں وہ واں نظر آئیں
نے چلہ کمانیں سرِ میداں نظر آئیں — ساری سپریں خون سے افشاں نظر آئیں
چلاتے تھے وہ ہوش نہ تھا خوف سے جن کو — فریاد کہ شب خون گرا فوج پہ دن کو

خالی نہ کوئی وار گیا تیغِ دو سر کا — ہاتھ اڑ گئے گر پاؤں بچا کر کوئی سرکا
سینہ جو بچا اس سے کسی بانیِ شر کا — تھی عقدہ کشا کھول دیا بند کمر کا
تیغ اس نے سپر اس نے زرہ اس نے نہ چھوڑی — وہ انگلیوں میں ایک گرہ اس نے نہ چھوڑی

رہ رہ کے چمکتی تھی جو شمشیرِ قضا دم — غل ہوتا تھا پریوں میں کہ یا حافظِ عالم
فوجیں تھیں بنی جان کی سب درہم و برہم — مضطر تھا ملک کانپتا تھا عرشِ معظم
جب برق چمکتی تھی سرک جاتے تھے جبریل — یا شیرِ خدا کہہ کے جھجک جاتے تھے جبریل

ناگاہ محمدؐ کی صدا آئی کہ شبیرؑ — اب عصر کا ہے وقت کرو میان میں شمشیر
یہ سنتے ہی بس تھم گیا وہ تابعِ تقدیر — تلوار کا تھمنا تھا کہ چھاتی پہ لگا تیر
تھا دھیان غلاموں کا جو اس خاصۂ حق کو — بس روکا خود لئے ہوئے دنیا کے ورق کو

ع ۔ [illegible] ۱۲

حضرت پہ جھکے اہلِ ستم چار طرف سے | نیزے ہوئے بیکس پہ علم چار طرف سے
پڑنے لگی شمشیر دو دم چار طرف سے | بس گھر گیا اک کشتۂ غم چار طرف سے
زخموں میں سرتا بقدم ہو گئے شبیر | برچھی جو لگی پشت پہ خم ہو گئے شبیر

جھکتا تھا کہ تیغوں کے برابر سے چلے وار | قدموں سے رکابیں بھی جدا ہو گئیں اک بار
جب گرنے لگا خاک پہ وہ بیکس و ناچار | زہرا کی صدا آئی کہ یا حیدر کرّار
گھیرا ہی لعینوں نے اکیلا اسے پا کر | گرتا ہے مرا لال مدد کیجیے آ کر

گھوڑے نے جو دیکھا کہ سنبھلتے نہیں سرور | بس بیٹھ گیا ٹیک کے گھٹنوں کو زمیں پر
زخموں سے جو تھا چور تنِ سبطِ پیمبرؐ | غش ہو گئے رہوار سے ریتی پہ اتر کر
افراط جراحت سے بدن رشکِ چمن تھا | سب فوج کے حربے تھے اور اک شاہ کا تن تھا

دس سو تو کماں دار تھے اک سینۂ شبیرؑ | برچھی کا جہاں زخم تھا لگتا تھا وہیں تیر
یا شاہِ نجف کہتے تھے جب پڑتی تھی شمشیر | چلاتی تھی دروازے سے یہ زینبِ دلگیر
تم کھاتے ہو تلواریں ہوئی جاتی ہوں بھائی | اب سینہ سپر ہونے کو میں آتی ہوں بھائی

اس وقت بھی شہ ہاتھ سے کرتے تھے اشارا | ہٹ جاؤ بہن گھر سے نکلیو نہ خدارا
رتبہ ہے فزوں مریم و حوا سے تمہارا | دم تن میں ہے جب تک نہیں یہ مجھکو گوارا
للہ نہ اس دم تنِ صد پاش پہ آنا | سر تن سے اتر لے تو مری لاش پہ آنا

تھی اندوں ڈیوڑھی پہ عجب گریہ و زاری | سر کھولے ہوئے روتی تھیں واں بیبیاں ساری
کہتی تھی سکینہ کہ پھوپھی جان میں واری | مجھکو تو دکھا دو مرے بابا کی سواری
یاں چھوڑ کے ہم سب کو چلے جائیں گے بابا | کیوں روتی ہو کیا گھر میں نہ اب آئینگے بابا

ڈیوڑھی سے ہٹو تن سے نکلتا ہے مرا دم | میں جاؤں گی واں رن میں جہاں ہیں شہِ عالم
کہتی تھی اسے تھامے ہوئے زینبِ پُر غم | اصغر کی طرح تیر نہ ماریں تمھیں ظالم
واں چلتی ہے تلوار کہاں جاؤ گی بی بی | بابا کو بس اب حشر کے دن پاؤ گی بی بی

ناموس نبی میں تو قیامت یہ تھی برپا
سر کھولے ہوئے بیٹھی تھی دختر زہرا

راوی نے یہ لکھا ہے کہ میں دیکھتا ہوں کیا
روتا ہوا اک طفل حسیں خیمے سے نکلا

آنکھیں کہیں آہو کی بھی آنکھوں سے بڑی تھیں
منہ چاند سا تھا ہنسلیاں گردن میں پڑی تھیں

چہرے پہ بھلی لگتی تھی کیا زلف مسلسل
ظاہر تھا کہ گھیرے ہوئے ہے چاند کو بادل

تھا طوق گلو رشک ہلال شب اول
ہاتھوں میں کڑے کان میں دُر سینے پہ ہیکل

کرتے کا عجب رنگ تھا اس گل سے بدن پر
معلوم یہ ہوتا تھا کہ شبنم ہے چمن پر

ماں ڈیوڑھی کے پردے کو اٹھا کر یہ پکاری
میں بھی نکل آتی ہوں کہاں جاتے ہو واری

پھر آؤ کہ بے تاب ہوں میں دکھ کی ماری
بیوہ ہوں کرو رحم غریبی پہ ہماری

کہنا مرا مانو نہ ارادہ کرو رن کا
میں واسطہ دیتی ہوں تمھیں روح حسنؑ کا

وہ کہتا تھا اماں ہمیں قسمیں نہ دلاؤ
ہم گھر میں نہ اب آئینگے تم خیمے میں جاؤ

قاسم کی طرح داغ ہمارا بھی اٹھاؤ
ماں کہتی تھی اک بات تو سن لو ادھر آؤ

لاکھوں میں کہاں جاتے ہو اس آن اکیلے
وہ کہتا تھا ہیں میرے چچا جان اکیلے

میداں میں چچا قتل ہوں ہم خیمے میں آئیں
جیتے رہیں بعد ان کے تو منہ کس کو دکھائیں

ہم سائے میں ہیں دھوپ میں وہ برچھیاں کھائیں
نینوں میں نہ عموؑ کی سپر ہونے کو جائیں

بس صبر کرو قید ہوں کیا خیمے میں آکے
فردوس میں اب جاوینگے ہمراہ چچا کے

چلاتی تھی رو رو کے یہ بیوہ جگر افگار
صدقے میں ارادے کے ترے اے مرد دلدار

کس طرح لڑو گے نہ سپر پاس نہ تلوار
پھر اتنا سن جنگ کے قابل نہیں زنہار

وہ کہتا تھا قربان شہنشاہ امم ہیں
کیا ہم علی اصغر سے بھی عمر میں کم ہیں

دروازے پہ خیمے کے تڑپتی رہی مادر
جنگاہ میں جا پہونچا وہ لخت دل شبر

بند آنکھیں تھیں اور جھومتے تھے سبط پیمبر
لپٹا پسر فاطمہ زہرا سے وہ دلبر

کہتا تھا کہ سب خوں سے بدن لال ہوا ہے
اے میرے چچا جان یہ کیا حال ہوا ہے

میں تھامے ہوں یا شاہ ذرا غش سے سنبھلیے
کیوں آپ جھکے جاتے ہیں زانو کو بدلیے
زخموں کا لہو چہرۂ انور پہ نہ ملیے
سر ننگے نکلتی ہیں پھوپھی خیمے میں چلیے
سب روتے ہیں اس وقت نہیں ہوش کسی کو
پیٹی ہیں پہ سینہ کہ غش آیا ہے چچی کو

فرمانے لگے کھول کے آنکھیں شہ ذی جاہ
کیوں گھر سے نکل آئے یہ کیا تم نے کیا آہ
ان تیغوں سے اے لال بچائے تمھیں اللہ
لو خیمے میں اب جاؤ کہ عمو ہے سر راہ
کٹتا ہی گلا تیغ ستم سے کوئی دم میں
گھر میں تمھیں لے چلنے کی طاقت نہیں ہم میں

یہ کہتے تھے حضرت کہ بڑھا ایک جفا کار
چاہا کہ قریب آن کے حضرت پہ کرے وار
ہاتھ اُس نے سر شہ پہ سپر کر دیے اک بار
بچے کے کہاں ہاتھ کہاں ظلم کی تلوار
ریتی پہ وہ ننھے سے گرے ہاتھ جو کٹ کر
غش ہو گیا شبیر کی گردن سے لپٹ کر

گودی میں اسے لیکے پکارے شہ دلگیر
صدقے ترے ان دونوں کٹے ہاتھوں کے شبیر
گودی میں تڑپتا تھا کہ گردن میں لگا تیر
چلایا کہ قربان علی اصغر نے شبیر
لپٹا جو تڑپ کر وہ شہ تشنہ گلو سے
تر ہو گئیں سب ہنسلیاں گردن کی لہو سے

مُنہ زرد ہوا جان نکلنے لگی تن سے
خوں ہچکیوں کے ساتھ اُگلتا تھا دہن سے
جس وقت سفر کر گیا ہستی کے چمن سے
رونے کی صدا آنے لگی قبر حسن سے
فردوس سے زہرا بصد افغاں نکل آئی
خیمے سے ادھر خاک بسر ماں نکل آئی

بیٹھے تھے سوئے قبلہ دو زانو شہ بے پر
جھکتے تھے کبھی غش میں اُٹھاتے تھے کبھی سر
تھے ذکر خدا میں کہ لگا تیر دہن پر
یاقوت بنے ڈوب کے خوں میں لب اطہر
بہہ آیا لہو تا بہ زنخدان مبارک
ٹھنڈے ہوئے دو گوہر دندان مُبارک

نیزے کا بن وہب نے پہلو پہ کیا وار
کاندھے پہ چلی ساتھ زرارہ کی بھی تلوار
ناوک بن کاہل کا کلیجے کے ہوا پار
بازو میں در آیا تبر خولی خونخوار
تلوار سے وقفہ نہ ملا چند نفس کا
دم رُک گیا نیزہ جو لگا ابن انس کا

لکھا ہی کہ جب مر گیا لخت دل شبّرؑ
اک سیّدہ نکلی در خیمے سے کھلے سر
چلائے لعیں خوف سے ہاتھ آنکھوں پہ دھر کے
اس بھیڑ میں آ کر وہ ضعیفہ یہ پکاری
گھوڑا تو ہی کوتل کدھر اتری ہی سواری
مر جاؤں گی حضرت کو جو پانے کی نہیں میں
اس وقت شہِ دیں نے سنی زاری خواہر
فرمایا اشارے سے کہ ای شمرِ ستمگر
آخر تو سفر ہونا ہی اس دارِ محن سے
منہ پھیر لیا شمر نے خنجر کو ہٹا کے
تڑپاتی ہو بھائی کو بہن بلوے میں آ کے
اُٹھ سکتے نہیں جسم پہ تلواریں پڑی ہیں
دوڑی یہ صدا سن کے یداللہ کی جائی
پر ہائے بہن بھائی تلک آنے نہ پائی
قاتل کو نہ گردن کو نہ شمشیر کو دیکھا
سر دیکھ کے بھائی کا وہ بیکس یہ پکاری
خنجر سے یہ گردن کی رگیں کٹ گئیں ساری
آفت میں پھنسی آل رسولِ عربیؐ کی
بھیّا مرا کوئی نہیں تم خوب ہو آگاہ
ڈھارس تھی بڑی آپ کی ای سرور ذیجاہ
چلتے ہوئے کچھ مجھ سے نہ فرما گئے بھائی

بارہ ستم ایجاد بڑھے کھینچ کے خنجر
مقنع تھا نہ برقع تھا نہ مونہ پے تھے نہ چادر
تو فاطمہ آتی ہیں بچانے کو پسر کے
ای سبطِ نبی ابن علی عاشقِ باری
بھیّا بہن آئی ہی زیارت کو تمھاری
لے آپ کے دیکھے ہوئے جانے کی نہیں ہیں
جس وقت کہ تھا حلق مبارک تہِ خنجر
زینب نکل آئی ہی ٹھہر جا ابھی دم بھر
دو باتیں تو کر لینے دے بھائی کو بہن سے
دی شمر نے یہ زینب کو صدا ہاتھ اٹھا کے
دیکھو گی کسے ہم تو ہیں پنجے میں قضا کے
گھبراؤ نہ اماں مرے پہلو میں کھڑی ہیں
چلائی کہ دیدار تو میں دیکھ لوں بھائی
یاں ہو گئی سیّد کے سر و تن میں جدائی
پہونچی تو سناں پر سر شبیر کو دیکھا
دکھ پائی بہن آپ کی مظلومی کے واری
تم مر گئے پوچھے گا خبر کون ہماری
اب جائیں کہاں بیٹیاں زہراؑ و علیؑ کی
احمد ہیں نہ زہرا نہ حسن ہیں نہ یداللہ
چھوڑا مجھے جنگل میں یہ کیا قہر کیا آہ
بہنا کو نجف تک بھی نہ پہونچا گئے بھائی

ای میرے شہید ای مرے ماں جائے برادر
کس سے ترا لاشہ بہن اٹھوائے برادر
کس طرح مرے دل کو قرار آئے برادر
پانی بھی نہ قاتل نے دیا ہائے برادر
انساں پہ ستم یوں کبھی انساں نہیں کرتا
حیواں کو بھی پیاسا کوئی بیجاں نہیں کرتا

خاموش انیس اب کہ ہی دل سینے میں بے چین
لکھے نہیں جاتے ہیں جو زینب نے کیے بین
اب حق سے دعا مانگ کہ اے خالق کونین
حاسد ہیں بہت دل کو عطا کر مرے تو چین
ناحق ہی عداوت انھیں اس ہیچمداں سے
نے تیغ کٹے جاتے ہیں شمشیر زباں سے

رباعی

ایک ایک قدم لغزش مستانہ ہی
گلزار بہشت اپنا میخانہ ہی
سرمست ہیں حب ساقی کوثر سے
آنکھیں شیشے ہیں قلب پیمانہ ہی

رباعی

خاموشی میں یاں لذت گویائی ہی
آنکھیں جو ہیں بند عین بینائی ہی
نہ دوست کا جھگڑا ہی نہ دشمن کا فساد
مرقد بھی عجب گوشۂ تنہائی ہی

رباعی

ہشیار کہ وقت ساز و برگ آیا ہی
ہنگام یخ و برف و تگرگ آیا ہی
محتاج عصا ہوئے تو پیری نے کہا
چلیے اب چوبدار مرگ آیا ہی

مرثیہ ۱۶

جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہِ گردوں رکاب نے
مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اٹھو فریضۂ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمد کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا
گذری شبِ فراق دن آیا وصال کا
ہم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام
لکھے خدا نماز گزاروں میں اس کا نام
سب ہیں وحیدِ عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس
اک اک نے زیبِ جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس
باندھے عمامے آئے امامِ زماں کے پاس
رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوئے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوئے

سوکھے لبوں پہ حمدِ الٰہی رخوں پہ نور
خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض حق شناس اولو العزم ذی شعور
خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور
کانوں کو حسنِ صوت سے حظ بر ملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

ساونت بردبار فلک مرتبت دلیر
عالی منش سبا میں سلیماں وغا میں شیر
گردانِ دہر ان کی زبردستیوں سے زیر
فاقے سے تین دن کے مگر زندگی سے سیر
دنیا کو ہیچ و پوچ سراپا سمجھتے تھے
دریا دلی سے بحر کو قطرہ سمجھتے تھے

تقریر میں وہ رمز و کنایے کہ لاجواب
نکتہ بھی منہ سے گر کوئی نکلا تو انتخاب
گویا دہن کتابِ بلاغت کا ایک باب
سوکھی زباں شہدِ فصاحت سے کامیاب
لہجوں پہ شاعرانِ عرب تھے مرے ہوئے
پستے لبوں کے وہ کہ نمک سے بھرے ہوئے

لب پر ہنسی گلوں سے زیادہ شگفتہ رو
پیدا تنوں سے پیرہنِ یوسفی کی بو
غلماں کے دل میں جن کی غلامی کی آرزو
پرہیزگار و زاہد و ابرار و نیک خو
پتھر میں ایسے لال صدف میں گہر نہیں
حوروں کا قول تھا کہ ملک ہیں بشر نہیں

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب
پر تھی رخوں پہ خاکِ تیمم سے طرفہ آب
باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب
ہوتے ہیں خاکسار غلامِ ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہو گئی
مٹی سے آئنوں میں جلا اور ہو گئی

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزانِ خوش خصال
جن میں کئی تھے حضرتِ خیر النسا کے لال
قاسم سا گلبدن علی اکبر سا خوش جمال
اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نونہال
سب کے رخوں کا نور سپہرِ بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا غنچہ زمیں پہ تھا

وہ صبح اور وہ چھاؤں ستاروں کی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوئے اوجِ طور
پیدا گلوں سے قدرتِ اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خوانِ طیور
گلشن خجل تھے وادیِ مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزۂ صحرا کی وہ لہک
شرمائے جس سے اطلسِ زنگاریِ فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگِ گل پہ قطرۂ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہرِ یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

قربان صنعتِ قلمِ آفریدگار
تھی ہر ورق پہ صنعتِ ترصیع آشکار
عاجز ہے فکرتِ شعرائے ہنر شعار
ان صنعتوں کو پائے کہاں عقلِ سادہ کار
عالم تھا محوِ قدرتِ ربِّ عباد پر
مینا کیا تھا وادیِ مینو سواد پر

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوشنوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سُرخ پوش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
اُٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
سبحان ربّنا کی صدا تھی علی العموم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح

چیونٹی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار
یا حی یا قدیر کی تھی ہر طرف پُکار
طائر ہوا میں مست ہرن سبزہ زار میں

کانٹوں میں اک طرف تھے ریاض نبی کے پھول
دنیا کی زیب زینتِ کاشانۂ بتول
ماہ عزا کے عشرہ اول میں لٹ گیا

اللہ رے خزاں کے دن اس باغ کی بہار
دولھا بنے ہوئے تھے اجل تھی گلوں کا ہار
راہیں تمام جسم کی خوشبو سے بس گئیں

وہ دشت اور وہ خیمۂ زنگار گوں کی شان
بیچوبہ سپہر بنے جس کا سائباں
اللہ کے حبیب کے پیارے اسی میں تھے

دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے

پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

کوکو کا شور نالۂ حق سرہو کی دھوم
جاری تھے وہ جو ان کی عبادت کے تھے رسوم
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

ای دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
تسبیح تھی کہیں کہیں تہلیلِ کردگار
جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

خوشبو سے جن کی خلد تھا جنگل کا عرض و طول
وہ باغ تھا لگا گئے تھے خود جسے رسول
وہ باغیوں کے ہاتھ سے جنگل میں لُٹ گیا

پھولے سماتے تھے نہ محمد کے گلعذار
جاگے وہ ساری رات کے وہ نیند کا خمار
جب مسکرائے پھولوں کی کلیاں مہک گئیں

گویا زمیں پہ نصب تھا اک تازہ آسماں
بیت العتیق دیں کا مدینہ جہاں کی جان
سب عرش کبریا کے ستارے اسی میں تھے

گردوں پہ ناز کرتی تھی اس دشت کی زمیں
پروے تھے رشک پردہ چشمان حورعیں
دیکھا جو نور شمسۂ کیواں جناب پر
ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں
سجادے بچھ گئے عقب شاہ انس و جاں
ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
محو ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
اعجاز تھا کہ دلبر شبیر کی صدا
ناموس شاہ روتے تھے خیمے میں زار زار
زینب بلائیں لیکے یہ کہتی تھی بار بار
کرتے ہیں یوں ثنا و صفت ذوالجلال کی
یہ حسن صوت اور یہ قرأت یہ شد و مد
گویا ہے لحن حضرت داؤد با خرد
شعبے صدا میں پنکھڑیاں جیسے پھول میں
میری طرف سے کوئی بلائیں تو لینے جائے
وہ خوش بیاں کہ جس کی طلاقت دلوں کو بھائے
غربت میں پڑ گئی ہے مصیبت حسین پر
صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامت الصلوٰۃ
وہ نور کی صفیں وہ مصلی ملک صفات
جلوہ تھا تا بہ عرش معلےٰ حسین کا

کہتا تھا آسمان وہم چرخ ہفتمیں
تاروں سے تھا فلک اسی خرمن کا خوشہ چیں
کیا کیا ہنسی ہے صبح گل آفتاب پر
تشریف جانماز پہ لائے شہ زماں
صوت حسن سے اکبر مہرو نے دی اذاں
گویا صدا رسول کی کانوں میں آگئی
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
پانی سے منہ نکالے تھے دریا کے جانور
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا
چپکی کھڑی تھی صحن میں بانوئے نامدار
صدقے نمازیوں کے موذن کے میں نثار
لوگو اذاں سنو مرے یوسف جمال کی
حقا کہ افصح الفصحا ہے انہیں کا جد
یارب رکھ اس صدا کو زمانے میں تا ابد
بلبل چہک رہا ہے ریاض رسول میں
عین الکمال سے تجھے بچے خدا بچائے
دو دو دن ایک بوند بھی پانی کی وہ نہ پائے
فاقہ یہ تیسرا ہے مرے نور عین پر
قائم ہوئی نماز اٹھے شاہ کائنات
قدموں سے جن کے ملتی تھی آنکھیں رہ نجات
مصحف کی لوح تھی کہ مصلےٰ حسین کا

قرآں کھلا ہوا کہ جماعت کی تھی نماز
بسم اللہ آگے جیسے ہو یوں تھے شہِ حجاز
سطریں تھیں یا صفیں عقبِ شاہِ سرفراز
کرتی تھی خود نماز بھی ان کی ادا پہ ناز
صدقے سحر بیاض پہ بین السطور کی
سب آیتیں تھیں مصحفِ ناطق کے نور کی

اُمیدِ مغفرت ہے خدائے علیم سے
غیر از کرم کچھ اور نہ ہوگا کریم سے
لیکن ڈگیں نہ پاؤں رہِ مستقیم سے
پہلے اشارہ ہے یہ الف لام میم سے
حبل المتیں یہی ہے نجات ان کے ہاتھ ہے
قرآں کا اور آلِ محمدؐ کا ساتھ ہے

باہم مکبّروں کی صدائیں وہ دلپسند
کرّوبیانِ عرش تھے سب جن سے بہرہ مند
ایماں کا نور چہروں پہ تھا چاند سے دوچند
خوفِ خدا سے کانپتے تھے سب کے بند بند
خم گردنیں تھیں سب کی خضوع و خشوع میں
سجدوں میں چاند تھے مہِ نو تھے رکوع میں

اک صف میں سب محمدؐ و حیدرؑ کے رشتہ دار
اٹھارہ نوجواں ہیں اگر کیجیے شمار
پر سب جگر فگار و حق آگاہ و خاکسار
پیرو امامِ پاک کے دانائے روزگار
تسبیح ہر طرف تہِ افلاک انھیں کی ہے
جس پر درود پڑھتے ہیں خاک انھیں کی ہے

دُنیا سے اٹھ گیا وہ قیام اور وہ قعود
ان کے لیے تھی بندگیِ واجب الوجود
وہ عجز وہ طولِ رکوع اور وہ سجود
طاعت میں نیست جانتے تھے اپنی ہست و بود
طاقت نہ چلنے پھرنے کی تھی ہاتھ پاؤں میں
گر گر کے سجدے کرگئے تیغوں کی چھاؤں میں

ہاتھ ان کے جب قنوت میں اُٹھے سوئے خدا
خود ہوگئے فلک پہ اجابت کے باب وا
تھرائے آسمان ہلا عرشِ کبریا
شہپر تھے دونوں ہاتھ پئے طائرِ دعا
وہ خاکسار محوِ تضرع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

فارغ ہوئے نماز سے جب قبلۂ انام
آئے مصلّے کو جوانانِ تشنہ کام
چومے کسی نے دستِ شہنشاہِ خاص و عام
آنکھیں ملیں قدم پہ کسی نے باحترام
کیا دل تھے کیا سپاہِ رشید و سعید تھی
باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی

سجدے میں شکر کے کوئی تھا مرد باخدا | پڑھتا تھا کوئی حزن سے قرآں کوئی دعا
نعتِ نبی کہیں تھی کہیں حمدِ کبریا | مولاؑ اُٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے التجا
فاقوں پہ تشنہ کامی و غربت پہ رحم کر | یارب مسافروں کی جماعت پہ رحم کر

زاری تھی التجا تھی مناجات تھی اِدھر | واں صف کشی و ظلم و تعدی و شور و شر
کہتا تھا ابن سعد یہ جا جا کے نہر پر | گھاٹوں سے ہوشیار ترائی سے باخبر
دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسینؑ کو | ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسینؑ کو

بیٹھے تھے جا نماز پہ شاہِ فلک سریر | ناگہ قریب آکے گرے تین چار تیر
دیکھا ہر اک نے مُڑ کے سوئے لشکرِ شریر | عباسؑ اُٹھے تول کے شمشیرِ بے نظیر
پروانہ تھے سراجِ امامت کے نور پر | روکی سپر حضور کرامت ظہور پر

اکبر سے مُڑ کے کہنے لگے سرورِ زماں | تم جا کے کہدو خیمے میں اے پدر کی جاں
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکرِ گراں | بچوں کو لیکے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ تلف نہ ہو | ڈر ہے مجھے کہ گردنِ اصغر ہدف نہ ہو

کہتے تھے یہ پسر سے شہِ آسماں سریر | فضّہ پکاری ڈر سے کہ اے خلق کے امیر
ہے ہے علی کی بیٹیاں کس جا ہوں گوشہ گیر | اصغر کے گاہوارے تک آ کر گرے ہیں تیر
گرمی میں ساری رات تو گھٹ گھٹ کے روئے ہیں | بچے ابھی تو سرد ہوا پا کے سوئے ہیں

باقر کہیں پڑا ہے سکینہ کہیں ہے غش | گرمی کی فصل یہ تب و تاب اور یہ عطش
رو رو کے سو گئے ہیں صغیران ماہوش | بچوں کو لیکے یاں سے کہاں جائیں فاقہ کش
یہ کس خطا پہ تیر پیا پے برستے ہیں | ٹھنڈی ہوا کے واسطے بچے ترستے ہیں

اُٹھے یہ شور سن کے امامِ فلک وقار | ڈیوڑھی تک آئے ڈھالوں کو روکے رفیق یار
فرمایا مُڑ کے چلتے ہیں اب بہرِ کردگار | کمریں کسو جہاد پہ منگواؤ راہوار
دیکھو فضا بہشت کی دل باغ باغ ہو | امت کے کام سے کہیں جلدی فراغ ہو

فرما کے یہ حرم میں گئے شاہ بحر و بر
جوشن پہن کے حضرتِ عباس نامور
پرتو سے رخ کے برق چمکتی تھی خاک پر
شوکت میں رشکِ تاجِ سلیماں تھا خودِ سر
وستانے دونوں فتح کا مسکن ظفر کا گھر
جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو
خیمے میں جا کے شہ نے یہ دیکھا حرم کا حال
زینب کی یہ دعا ہے کہ اے ربِّ ذوالجلال
بانوے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
آفت میں ہے مسافرِ صحرائے کربلا
غربت میں کھنگئی جو لڑائی تو ہوگا کیا
فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں
سر پر ہیں اب علی نہ رسولِ فلک وقار
اماں کے بعد روئی حسن کو میں سوگوار
تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے
بولے قریب جا کے شہِ آسماں جناب
مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب
موقع بہن نہیں ابھی فریاد و آہ کا
معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس
سر پر رکھا عمامۂ سردارِ حق شناس
بر میں درست چست تھا جامہ رسول کا

ہونے لگیں صفوں میں کمر بندیاں اِدھر
دروازے پر ٹہلنے لگے مثلِ شیر نر
تلوار ہاتھ میں تھی سپر دوشِ پاک پر
کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر
وہ رعب الاماں وہ تہور کہ الحذر
پھر کس طرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
بچ جائے اس فساد سے خیر النسا کا لال
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے
بیکس پہ یہ چڑھائی ہے سید پہ یہ جفا
ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا
یارب ترے رسول کی ہم آلِ پاک ہیں
گھر لٹ گیا گزر گئیں خاتونِ روزگار
دنیا میں اب حسین ہے ان سب کا یادگار
کچھ اس پہ بن گئی تو یہ مجمع تباہ ہے
مضطر نہ ہو دعائیں ہیں تم سب کی مستجاب
خود جا کے میں دکھاتا ہوں ان کو رہِ صواب
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا
کشتی میں لائیں زینب اسے شاہ دیں کے پاس
پہنی قبائے پاک رسولِ فلک اساس
رومال فاطمہ کا عمامہ رسول کا

شملے کے دو سرے جو پڑے تھے بصد وقار ... ثابت یہ تھا کہ دوش پہ گیسو پڑے ہیں چار
بل کھا رہا تھا زلفِ سمن بو کا تار تار ... جس کے ہر اک مو پہ خطا و ختن نثار
مشک و عبیر و عود اگر ہیں تو ہیچ ہیں ... سنبل کی اصل کیا ہے گیسو کے پیچ میں

کپڑوں سے آ رہی تھی رسولِ زمن کی بو ... دولھا نے سونگھی ہو گی نہ ایسی دلھن کی بو
حیدر کی فاطمہ کی حسین و حسن کی بو ... پھیلی ہوئی تھی چار طرف پنجتن کی بو
لٹتا تھا عطر وادیِ عنبر سرشت میں ... گل جھومتے تھے باغ میں رضواں بہشت میں

پوشاک سب پہن چکے جس دم شہِ زمن ... لیکر بلائیں بھائی کی رونے لگی بہن
چلائی ہائے آج نہیں حیدر و حسنؑ ... اماں کہاں سے لائے تھیں اب یہ لیے وطن
رخصت ہے اب رسول کے یوسف جمال کی ... صدقے گئی بلائیں تو لو اپنے لال کی

صندوق اسلحہ کے جو کھلوائے شاہ نے ... بیٹا منہ اپنا زینبِ عصمت پناہ نے
پہنی زرہ امامِ فلک بارگاہ نے ... بازو پہ جوشنین پڑھے عز و جاہ نے
جوہر بدن کے حسن سے سارے چمک گئے ... حلقے تھے جتنے اتنے ستارے چمک گئے

یاد آ گئے علی نظر آئی جو ذوالفقار ... قبضے کو چوم کر شہِ دیں روئے زار زار
تولی جو لیکے ہاتھ میں شمشیرِ آبدار ... شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار
فتح و ظفر قریب ہو نصرت قریب ہو ... زیب اس کی تجھ کو ضرب عدو کو نصیب ہو

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے ... پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ہلال نے
دستانے پہنے سرورِ قدسی خصال نے ... معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے
رتبہ بلند تھا کہ سعادت نشان تھی ... ساری سپر میں مہرِ نبوت کی شان تھی

ہتھیار ادھر لگا چکے آقائے خاص و عام ... تیار ادھر ہوا علمِ سیدِ انام
کھولے سروں کو گرد تھیں سیدانیاں تمام ... روتی تھی تھامے چوبِ علم خواہرِ امام
تیغیں کمر میں دوش پہ شملے پڑے ہوئے ... زینب کے لال زیرِ علم آ کھڑے ہوئے

گردانے دامنوں کو قبا کے وہ گلعذار
مرفق تک آستینوں کو اُلٹے بصد وقار
جعفر کا رعب و دبدبۂ شیرِ کردگار
بوٗا سے اُن کے قد پہ نمودار و نامدار
آنکھیں ملیں علم کے پھریرے کو چوم کے
رایت کے گرد پھرنے لگے جھوم جھوم کے

گہ ماں کو دیکھتے تھے گہ جانبِ علم
نعرہ کبھی یہ تھا کہ نثارِ شہِ امم
کرتے تھے دونوں بھائی کبھی مشورے بہم
آہستہ پوچھتے کبھی ماں سے وہ ذی حشم
کیا قصد ہے علی ولی کے نشان کا
امّاں کسے ملے گا علم نانا جان کا

کچھ مشورہ کریں جو شہنشاہِ خوش خصال
ہم بھی محق ہیں آپ کو اس کا ہے خیال
پاس ادب سے عرض کی ہم کو نہیں مجال
اس کا بھی خوف ہے کہ نہ ہو آپ کو ملال
آقا کے ہم غلام ہیں اور جاں نثار ہیں
عزت طلب ہیں نام کے اُمیدوار ہیں

نے مثل تھے رسول کے لشکر کے سب جواں
لیکن ہمارے جد کو نبی نے دیا نشاں
خیبر میں دیکھتا رہا منہ لشکرِ گراں
پایا علم علی نے مگر وقتِ امتحاں
طاقت میں کچھ کمی نہیں گو بھوکے پیاسے ہیں
پوتے انھیں کے ہم ہیں انھیں کے نواسے ہیں

زینب نے تب کہا کہ تمھیں اس سے کیا ہے کام
کیا دخل مجکو مالک و مختار ہیں امام
دیکھو نہ کیجو بے ادبانہ کوئی کلام
بگڑوں گی میں جو لوگے عَلَم کا زباں سے نام
لو جاؤ بس کھڑے ہو الگ ہاتھ جوڑ کے
کیوں آئے ہو یہاں علی اکبر کو چھوڑ کے

سر کو ہٹو بڑھو نہ کھڑے ہو علم کے پاس
ایسا نہ ہو کہ دیکھ لیں شاہِ فلک اساس
کھوتے ہو اور آئے ہوئے تم مرے حواس
بس قابلِ قبول نہیں ہے یہ التماس
رونے لگو گے تم جو بُرا یا بھلا کہوں
اِس ضد کو بچپنے کے سوا اور کیا کہوں

عمریں قلیل اور ہوسِ منصبِ جلیل
اچھا نکالو قد کے بھی بڑھنے کی کچھ سبیل
ماں صدقے جائے گرچہ یہ ہمت کی ہے دلیل
ہاں اپنے ہم سنوں میں تمھارا نہیں عدیل
لازم ہے سوچے غور کرے پیش و پس کرے
جو ہو سکے نہ کیوں بشر اس کی ہوس کرے

اِن ننھے ہاتھوں ہاتھوں سے اُٹھے گا یہ علم
نکلیں تنوں سے سبطِ نبی کے قدم پہ دم
رخصت طلب اگر ہو تو یہ میرا کام ہی
پھر تم کو کیا بزرگ تھے گر فخرِ روزگار
جوہر وہ ہیں جو تیغ کرے آپ آشکار
تم کیوں کہو کہ لال خدا کے ولی کے ہیں
کیا کچھ علم سے جعفرِ طیار کا تھا نام
بگڑی لڑائیوں میں بن آئے انھیں سے کام
بیجاں ہوئے تو نخلِ وغا نے ثمر دیئے
لشکر نے تین روز ہزیمت اُٹھائی جب
مرحب کو قتل کر کے بڑھا جب وہ شیرِ رب
اکھڑا وہ یوں گراں تھا جو در سنگ سخت سے
نرغے میں تین دن سے ہی مشکلکشا کا لال
پوچھا نہ یہ کہ کھولے ہیں کیوں تم نے سر کے بال
غمخوار تم مرے ہو نہ عاشق امام کے
ہاتھوں کو جوڑ جوڑ کے بولے وہ لالہ فام
واللہ کیا مجال جو اب لیں علم کا نام
فوجیں بھگا کے گنج شہیداں میں سوئینگے
بس کہہ کے یہ ہٹے جو سعادت نشاں پسر
دیتے ہو اپنے مرنے کی پیارو مجھے خبر
کیا صدقے جاؤں ماں کی نصیحت بُری لگی

چھوٹے قدوں میں سب سے سنوں میں سبھوں سے کم
عہدہ یہی ہی بس یہی منصب یہی حشم
ماں صدقے جائے آج تو مرنے میں نام ہی
زیبا نہیں ہی وصفِ اضافی پہ افتخار
دکھلا دو آج حیدر و جعفر کی کارزار
فوجیں پکاریں خود کہ نواسے علی کے ہیں
یہ بھی تھی اک عطائے رسولِ فلک مقام
جب کھینچتے تھے تیغ تو ہلتا تھا روم و شام
ہاتھوں کے بدلے حق نے جواہر پر دیئے
بخشا علم رسولِ خدا نے علی کو تب
در بند کر کے قلعہ کا بھاگی سپاہ سب
جس طرح توڑ لے کوئی پتّا درخت سے
اماں کا باغ ہوتا ہی جنگل میں پائمال
میں لُٹ رہی ہوں اور تمھیں منصب کا ہی خیال
معلوم ہو گیا مجھے طالب ہو نام کے
غصّے کو آپ تھام لیں اے خواہرِ امام
کھل جائے گا لڑینگے جو یہ باوفا غلام
تب قدر ہو گی آپ کو جب ہم نہ ہوئینگے
چھاتی بھر آئی ماں نے کہا تھام کر جگر
ٹھہرو ذرا بلائیں تو لے لے یہ نوحہ گر
بچو یہ کیا کہا کہ جگر پر چھُری لگی

زینب کے پاس آ کے یہ بولے شہِ زمن
کیوں تم نے دونوں بیٹوں کی باتیں سنیں بہن
شیروں کے شیر عاقل و جرار و صف شکن
زینب وحیدِ عصر ہیں دونوں یہ گلبدن
یوں دیکھنے کو سب میں بزرگوں کے طور ہیں
یہ تو رہی ان کے اور ارادے ہی اور ہیں

نو دس برس کے سن میں یہ جرأت یہ ولولے
بچے کسی نے دیکھے ہیں ایسے بھی من چلے
اقبال کیونکر ان کے نہ قدموں سے منھ ملے
کس گود میں بڑے ہوئے کس دودھ سے پلے
بے شک یہ ورثہ دارِ جنابِ امیر ہیں
پر کیا کہوں کہ دونوں کی عمریں صغیر ہیں

بس جس کو تم کہو اسے دیں فوج کا علم
کی عرض جو صلاح شہِ آسماں حشم
فرمایا جب سے اٹھ گئیں زہرائے باکرم
اس دن سے تم کو ماں کی جگہ جانتے ہیں ہم
مالک ہو تم بزرگ کوئی ہو کہ خرد ہو
جس کو کہو اسی کو یہ عہدہ سپرد ہو

بولیں بہن کہ آپ بھی تو لیں کسی کا نام
ہے کس طرف توجہ سردارِ خاص و عام
گر مجھ سے پوچھتے ہیں شہِ آسماں مقام
قرآں کے بعد ہے تو علی ہی کا کچھ کلام
شوکت میں قد میں شان میں ہمسر کوئی نہیں
عباسِ نامدار سے بہتر کوئی نہیں

عاشق غلام خادم دیرینہ جاں نثار
فرزند بھائی زینتِ پہلو وفا شعار
جرار یادگارِ پدر فخرِ روزگار
راحت رساں مطیع و نمودار و نامدار
صفدر ہے شیر دل ہے بہادر ہے نیک ہے
ہمشکل سیکڑوں میں ہزاروں میں ایک ہے

آنکھوں میں اشک بھر کے یہ بولے شہِ زمن
ہاں تھی یہی علی کی وصیت بھی اے بہن
اچھا بلائیں آپ کدھر ہے وہ صف شکن
اکبر چچا کے پاس گئے سن کے یہ سخن
کی عرض انتظار ہے شاہِ غیور کو
چلیے پھوپھی نے یاد کیا ہے حضور کو

عباس آئے ہاتھوں کو جوڑے حضورِ شاہ
جاؤ بہن کے پاس یہ بولا وہ دیں پناہ
زینب وہیں علم لیے آئیں بہ عز و جاہ
بولے نشاں کو لے کے شہِ عرش بارگاہ
ان کی خوشی وہ ہے جو رضا پنجتن کی ہے
لو بھائی لو علم یہ عنایت بہن کی ہے

رکھکر علم پہ ہاتھ جھکا وہ فلک وقار
ہمشیر کے قدم پہ ملا منہ بہ افتخار
زینب بلائیں لیکے یہ بولیں کہ میں نثار
عباس فاطمہ کی کمائی سے ہوشیار
ہو جائے آج صلح کی صورت تو کل چلو
ان آفتوں سے بھائی کو لیکر نکل چلو

کی عرض میرے جسم پہ جب وقت تک ہو سر
ممکن نہیں ہے یہ کہ بڑھے فوج بد گہر
تیغیں کھنچیں جو لاکھ تو سینہ کروں سپر
دیکھیں اٹھا کے آنکھ یہ کیا تاب کیا جگر
ساونت ہیں پسر اسد ذوالجلال کے
گر شیر ہو تو پھینکدیں آنکھیں نکال کے

منہ کر کے سوئے قبر علی پھر کیا خطاب
ذرّے کو آج کر دیا مولا نے آفتاب
یہ عرض خاکسار کی ہے بس یا ابو تراب
آقا کے آگے ہیں ہم شہادت سے کامیاب
سر تن سے ابن فاطمہ کے روبرو گرے
شبیر کے پسینے پہ میرا لہو گرے

یہ سن کے آئی زوجۂ عباس نامور
شوہر کی سمت پہلے کنکھیوں سے کی نظر
لیں سبط مصطفیٰ کی بلائیں بچشم تر
زینب کے گرد پھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
فیض آپ کا ہے اور تصدق امام کا
عزت بڑھی کنیز کی رتبہ غلام کا

سر کو لگا کے چھاتی سے زینب نے یہ کہا
تو اپنی مانگ کوکھ سے ٹھنڈی رہے سدا
کی عرض مجھ سی لاکھ کنیزیں ہوں تو فدا
بانوئے نامور کو سہاگن رکھے خدا
بچے جییں ترقی اقبال و جاہ ہو
سایہ میں آپ کے علی اکبر کا بیاہ ہو

قسمت وطن میں خیر سے پھر شہ کو لیکے جائے
یثرب میں شہرہ ہو کہ سفر سے حسین آئے
ام البنین جاہ و حشم سے پسر کو پائے
جلدی شب عروسی اکبر خدا دکھائے
مہندی تمہارا لال ملے ہاتھ پاؤں میں
لاؤ دلھن کو بیاہ کے تاروں کی چھاؤں میں

ناگاہ آکے بالی سکینہ نے یہ کہا
کیسا ہے یہ ہجوم کدھر ہیں مرے چچا
عہدہ علم کا ان کو مبارک کرے خدا
لوگو مجھے بلائیں تو لینے دو اک ذرا
شوکت خدا بڑھائے مرے عمو جان کی
میں بھی تو دیکھوں شان علی کے نشان کی

عباس مسکرا کے پکارے کہ آؤ آؤ
بولے لپٹ کے وہ کہ مری مشک لیتے جاؤ
تحفہ کوئی نہ دیجیے نہ انعام دیجیے

باتوں پہ اس کی روتی تھیں سیدانیاں تمام
انبوہ ہے بڑھی چلی آتی ہے فوجِ شام
عباس اب علم لیے باہر نکلتے ہیں

ڈیوڑھی پہ خادمانِ محل کی ہوئی پکار
خلعت پہن رہے ہیں علمدارِ نامدار
بھائی بڑا ہے سر پہ تو سایہ ہے باپ کا

ناگہ بڑھے علم لیے عباسِ باوفا
حضرت نے ہاتھ اٹھا کے یہ اک ایک سے کہا
صبح شبِ فراق ہے پیاروں کو دیکھ لو

شہ کے قدم پہ زینبِ نالاں و حزیں گری
کلثوم تھرتھرا کے برُوئے زمیں گری
اُجڑا چمن ہر اک گلِ تازہ نکل گیا

دیکھی جو شانِ حضرتِ عباسِ عرش جاہ
نکلا حرم سرا سے دو عالم کا بادشاہ
رہ رہ کے اشک بہتے تھے روئے جناب سے

مولا چڑھے فرس پہ محمد کی شان سے
نکلا یہ جن و انس و ملک کی زبان سے
سارا چلن خرام میں کبکِ دری کا ہے

عمو نثار پیاس سے کیا حال ہے بتاؤ
اب تو علم ملا تمھیں پانی مجھے پلاؤ
قربان جاؤں پانی کا اک جام دیجیے

کی عرض آ کے ابنِ حسن نے کہ یا امام
فرمایا آپ نے کہ نہیں ذکر کا مقام
ٹھہرو بہن سے مل کے گلے ہم بھی چلتے ہیں

آتے ہیں اب حضور خبردار ہوشیار
نذریں خوشی کی دینے کو حاضر ہوں جاں نثار
عہدہ جوان بیٹے نے پایا ہے باپ کا

دوڑے سب اہلِ بیت کھلے سر برہنہ پا
لو الوداع اے حرمِ پاک مصطفیٰ
سب مل کے ڈوبتے ہوئے تاروں کو دیکھ لو

بانو پچھاڑیں کھا کے پسر کے قریں گری
باقر کہیں گرا تو سکینہ کہیں گری
نکلا علم کہ گھر سے جنازہ نکل گیا

آگے بڑھی علم کے پس از تہنیت سپاہ
نشتر بدل تھی بنتِ علی کی فغان و آہ
شبنم ٹپک رہی تھی گلِ آفتاب سے

ترکش لگا یا ہرنے پہ کس آن بان سے
اترا ہے پھر زمیں پہ براق آسمان سے
گھونگھٹ نئی دولھن کا ہے چہرہ پری کا ہے

غصے میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے
گردن میں ڈالیں ہاتھ یہ پریوں کو شوق ہے

تھم کر ہوا چلی فرسِ خوش قدم بڑھا
گھوڑوں کی لیں سواروں نے باگیں علم بڑھا
پھولوں کو لیکے بادِ بہاری پہونچ گئی

پنجہ ادھر چمکتا تھا اور آفتاب ادھر
زرریزیِ علم پہ ٹھہرتی نہ تھی نظر
تھے دو طرف جو دو علم اس ارتفاع کے

اللہ ری سپاہ خدا کی شکوہ و شاں
کمریں کسے علم کے تلے ہاشمی جواں
ایک ایک دودمانِ علی کا چراغ تھا

لڑکے وہ سات آٹھ سہی قد سمن عذار
حیدر کا رعب نرگسی آنکھوں سے آشکار
تیروں کی سمت چاند سے سینے تنے ہوئے

غرفوں سے حوریں دیکھ کے کرتی تھیں یہ کلام
دیکھو درود پڑھ کے سوئے لشکر امام
رایت لیے وہ لال خدا کے ولی کا ہے

دنیا سے اٹھ گئے تھے جو پیغمبر زماں
کیونکر سوئے زمیں نہ جھکے پیرِ آسماں
سب خوبیوں کا خاتمہ بس اس حسین پہ ہے

جو بن میں جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
بالا دوی میں اس کو ہما پر بھی فوق ہے

جوں جوں وہ سوئے دشت بڑھا اور دم بڑھا
رایت بڑھا کہ سرو ریاضِ ارم بڑھا
بستانِ کربلا میں سواری پہونچ گئی

اس کی ضیا تھی خاک پہ ضو اس کی عرش پر
دولھا کا رخ تھا سونے کے سہرے میں جلوہ گر
الجھے ہوئے تھے تار خطوطِ شعاع کے

بجھنے لگے جنود ضلالت کے بھی نشاں
دنیا کی زیب دین کی عزت جہاں کی جاں
جس کو بہشت پر تھا تفوق وہ باغ تھا

گیسو کسی کے چہرے پہ دو اور کسی کے چار
کھیلیں جو برچھیوں سے کریں شیر کا شکار
آئے تھے عید گاہ میں دولھا بنے ہوئے

دنیا کا باغ بھی ہے عجب پر فضا مقام
ہمشکلِ مصطفیٰ ہے یہی عرش احتشام
اب تک جہاں میں ساتھ نبی و علی کا ہے

ہم جانتے تھے حسن سے خالی ہے سب جہاں
پیدا کیا ہے حق نے عجب حسن کا جواں
محبوب حق ہیں عرش پہ سایہ زمیں پہ ہے

ناگاہ تیر اُدھر سے چلے جانبِ امام
نکلے ادھر سے شہ کے رفیقانِ تشنہ کام
گھوڑا بڑھا کے اپنی حجت بھی کی تمام
بے سر ہوئے پروں میں سرانِ سپاہ شام
بالا کبھی تھی تیغ کبھی زیرِ تنگ تھی
اک اک کی جنگ مالک اشتر کی جنگ تھی

نکلے پئے جہاد عزیزانِ شاہ دیں
روباہ کی صفوں پہ چلے شیرِ خشمگیں
نعرے کیے کہ خوف سے ہلنے لگی زمیں
کھینچی جو تیغ بھول گئے صف کشی لعیں
بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کے
کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل ٹپ ڈُب کے

اللہ رے علی کے نواسوں کی کارزار
شانہ کٹا کسی نے جو روکا سپر پہ وار
دونوں کے نیمچے تھے کہ چلتی تھی ذوالفقار
گنتی تھی زخمیوں کی نہ کشتوں کا کچھ شمار
اتنے سوار قتل کیے تھوڑی دیر میں
دونوں کے گھوڑے چھپ گئے لاشوں کے ڈھیر میں

وہ چھوٹے چھوٹے ہاتھ وہ گوری کلائیاں
ڈر ڈر کے کاٹتے تھے کماں کش کنائیاں
آفت کی پھرتیاں تھیں غضب کی صفائیاں
فوجوں میں تھیں نبی و علی کی دہائیاں
شوکت ۱؎ ہوہو تھی جنابِ امیر کی
طاقت دکھا دی شیروں نے زینب کے شیر کی

کس حسن سے حسن کا جوانِ حسیں لڑا
دو دن کی بھوک پیاس میں وہ مہ جبیں لڑا
گھر گھر کے صورتِ اسدِ خشمگیں لڑا
سہرا اُلٹ کے یوں کوئی دولہا نہیں لڑا
جلوے دکھا دیے اسدِ کردگار کے
مقتل میں سوئے ارزق شامی کو مار کے

چمکی جو تیغ حضرت عباس عرش جاہ
ڈھالوں میں چھپ گیا پسرِ سعد روسیاہ
روح الامیں پکارے کہ اللہ کی پناہ
کشتوں سے بند ہو گئی امن و اماں کی راہ
جھپٹا جو شیر شوق میں دریا کی سیر کے
لے لی ترائی تیغوں کی موجوں میں پیر کے

نے سر ہوئے موکلِ سرچشمۂ فرات
دریا میں گر کے ڈوب گئے کتنے بدصفات
ہل چل میں مثلِ موج صفوں کو نہ تھا ثبات
گویا حباب ہو گئے تھے نقطۂ حیات
عباس بھر کے مشک کو یوں تشنہ لب لڑے
جس طرح نہرواں میں امیرِ عرب لڑے

۱؎ ہو بہو بمعنی بالکل مثل ۱۲

آفت تھی حرب و ضرب علی اکبر دلیر
غصے میں جھپٹے صید پہ جیسے گرسنہ شیر
سب سربلند پست تھے بردست سب تھے زیر
جنگل میں چار سمت ہوئے زخمیوں کے ڈھیر
سر ان کے اترے تن سے جو تھے رن چڑھے ہوئے
عباس سے بھی جنگ میں کچھ تھے بڑھے ہوئے

تلواریں برسیں صبح سے نصف النہار تک
ہلتی رہی زمین لرزتے رہے فلک
کانپا کیے پروں کو سمیٹے ہوئے ملک
نعرے نہ پھر وہ تھے نہ وہ تیغوں کی تھی چمک
ڈھالوں کا دور برچھیوں کا اوج ہوگیا
ہنگام ظہر خاتمۂ فوج ہوگیا

لاشے سبھوں کے سبط نبی خود اٹھا کے لائے
قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے
فرماتے تھے بچھڑ گئے سب ہم سے ہائے ہائے
اتنے پہاڑ گر پڑیں جس پر وہ خم نہ ہو
گر سو برس جیوں تو یہ مجمع بہم نہ ہو

لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امام
ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبی کی قبا تمام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام
برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
اعدا کسی شہید کا جب نام لیتے تھے
تھرا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

پوچھو اسی سے جس کے جگر پر ہوں اتنے داغ
اک عمر کا ریاض تھا جس پر لٹا وہ باغ
فرصت نہ اب بکا سے نہ ماتم سے انفراغ
جو گھر کی روشنی تھے وہ گل ہوگئے چراغ
پڑتی تھی دھوپ سب کے تن پاش پاش پر
چادر بھی اک نہ تھی علی اکبر کی لاش پر

مقتل سے آئے خیمے کے در پر شہ زمن
پر شدت عطش سے نہ تھی طاقت سخن
پردے پہ ہاتھ رکھ کے پکارے بصد محن
اصغر کو گاہوارے سے لے آؤ اے بہن
پھر ایک بار اس مہ انور کو دیکھ لیں
اکبر کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں

خیمے سے دوڑی آل پیمبر برہنہ سر
اصغر کو لائیں ہاتھوں پہ بانوئے نوحہ گر
بچے کو لے کے بیٹھ گئے آپ خاک پر
منہ سے ملے جو ہونٹھ تو چونکا وہ سیمبر
غم کی چھری چلی جگر چاک چاک پر
بہلا لیا حسین نے زانوئے پاک پر

بچے سے ملتفت تھے شہِ آسماں سریر
تھا اس طرف کمیں میں بنِ کاہل شریر
مارا جو تین پھال کا اس بے حیا نے تیر
بس دفعتاً نشانہ ہوئی گردنِ صغیر
تڑپا جو شیر خوار تو حضرت نے آہ کی
معصوم ذبح ہو گیا گودی میں شاہ کی

جس دم تڑپ کے مر گیا وہ طفلِ شیر خوار
چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بحالِ زار
بچے کو دفن کر کے پکارا وہ ذی وقار
اے خاکِ پاک حرمتِ مہماں نگاہ دار
دامن میں رکھ اسے جو محبت علیؑ کی ہے
دولت ہے فاطمہ کی امانت نبی کی ہے

پہلے پہل چھٹا ہے یہ ماں کی کنار سے
واقف نہیں ہے قبر کی شبہائے تار سے
اے قبر ہوشیار مرے گلعذار سے
گردن چھدی ہوئی ہے بچانا فشار سے
سیّد ہے لال حضرت خیر النسا کا ہے
معصوم ہے شہید ہے بندہ خدا کا ہے

یہ کہہ کے آئے فوج پہ تولے ہوئے حسام
آنکھیں لہو تھیں رونے سے چہرہ تھا سُرخ فام
زیبِ بدن کیے تھے بصد عزّ و احتشام
پیراہنِ مطہرِ پیغمبرِ انام
حمزہ کی ڈھال تیغ شہِ لافتا کی تھی
بر میں زرہ جناب رسول خدا کی تھی

رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں راہوار
جرار بُردبار سبک رو وفا شعار
کیا خوشنما تھا زین طلاکار و نقرہ کار
اکسیر تھا قدم کا جسے مل گیا غبار
خوش خو تھا خانہ زاد تھا دُلدل نژاد تھا
شبیر بھی سخی تھے فرس بھی جواد تھا

گرمی کا روزِ جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثلِ شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لوں کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سُرخ تھی اور زرد آسماں
آبِ خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لوں وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثالِ شب
خود نہرِ علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اُڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے چارپایہ نہ اُٹھتے تھے تابہ شام
مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام
پتھر پگھل کے رہ گئے تھے مثلِ مومِ خام
سُرخی اُڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اُترا تھا سائے کی چاہ سے

آبِ رواں سے منہ نہ اُٹھاتے تھے جانور
جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر اِدھر اُدھر
مردُم تھی سات پردوں کے اندر عرق میں تر
خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر چشم سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخِ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثلِ چہرۂ مدقوق زرد تھے

شبیر اُٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منہ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدّر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں
انگارہ تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخِ موج تک آئی کباب تھی

آئینۂ فلک کو نہ تھی تاب و تب کی تاب
چھپنے کو برق چاہتی تھی دامنِ سحاب
سب سے سوا تھا گرم مزاجوں کو اضطراب
کافورِ صبح ڈھونڈھتا پھرتا تھا آفتاب
بھڑکی تھی آگ گنبدِ چرخِ اثیر میں
بادل چھپے تھے سب کُرۂ زمہریر میں

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہِ امم
نے دامنِ رسول تھا نے سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اُٹھتے تھے دم بدم
اودے تھے لب زبان میں کانٹے کمر میں خم
نے آب تیسرا تھا جو دن میہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو

گھوڑوں کو لپٹ کرتے تھے سیراب سب سوار
پیتے تھے آبِ نہر پرند آکے بے شمار
پانی کا دام و دد کو پلانا ثواب تھا
سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر
کرتے تھے آب پاش مکرر زمیں کو تر
وہ دھوپ دشت کی وہ جلال آفتاب کا

کہتا تھا ابن سعد کہ ای آسماں جناب
فرماتے تھے حسین کہ او خانماں خراب
فاسق ہے پاس کچھ تجھے اسلام کا نہیں
کہدوں تو خوان لیکے خود آئیں ابھی خلیل
کیا جام آب کا تو مجھے دے گا او ذلیل
جس پھول پر پڑے ترا سایہ وہ بو نہ دے

کوثر کا نام لوں تو ابھی جام لیکے آئے
روح الامیں زمیں پہ مرا نام لیکے آئے
چاہوں جو انقلاب تو دنیا تمام ہو
فرما کے یہ نگاہ جو کی سوئے ذوالفقار
مظلوم پر صفوں سے چلے تیر بے شمار
نیزے اٹھا کے جنگ پہ اسوار تل گئے

وہ دھوم طبل جنگ کی وہ بوق کا خروش
تھرائی یوں زمیں کہ اڑے آسماں کے ہوش
ڈھالیں بڑھیں یوں سروں پہ سواران شوم کے

آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار
سقے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار
اک ابن فاطمہ کے لیے قحطِ آب تھا
خادم کئی تھے مروحہ جنباں ادھر ادھر
فرزندِ فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر
سنولا گیا تھا رنگِ مبارک جناب کا

بیعت جو کیجیے ابھی تو حاضر ہے جام آب
دریا کو خاک جانتے ہیں ابنِ بوتراب
آبِ بقا ہو یہ تو مرے کام کا نہیں
چاہوں تو سلسبیل کو دم میں کروں سبیل
بے آبرو خسیس ستمگر دنی بخیل
کھلوائے فصد تو تو کبھی رگ لہو نہ دے

کوثر ہمیں رسول کا احکام لیکے آئے
لشکر ملک کا فتح کا پیغام لیکے آئے
الٹے زمیں یوں کہ نہ کوفہ نہ شام ہو
تھرا کے پچھلے پاؤں ہٹا وہ ستم شعار
آوازِ کوسِ حرب ہوئی آسماں کے پار
کالے نشان فوج سیہ رو کے کھل گئے

کر ہو گئے تھے شور سے کروبیوں کے گوش
نیزے ہلا کے نکلے سواران درع پوش
صحرا میں جیسے آئی گھٹا جھوم جھوم کے

جب رن میں تیغ تول کے سلطانِ دیں بڑھے
مانندِ شیرِ نر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروسِ مصاف کو
کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
آئے حسین یوں کہ عقاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوئے سحاب آئے جس طرح
یوں تیغ تیز کوند گئی اس گروہ پر
گرمی میں برق تیغ جو چمکی شرر اڑے
پرکالۂ سپر جو ادھر اور ادھر اڑے
ظاہر نشان اسم عزیمت اثر ہوئے
جس پر چلی وہ تیغ دوپارا کیا اسے
واں تھی جدھر اجل نے اشارا کیا اسے
نے زیں تھا نہ فرس تھا نہ اسوار زین پر
آئی چمک کے غول پہ جب سر گرا گئی
ایک ایک قصرِ تن کو زمیں پر گرا گئی
آ پہونچا اس کے گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا
اس آب پر یہ شعلہ فشانی خدا کی شان
خاموش اور تیز زبانی خدا کی شان
لہرائی جب اتر گیا دریا چڑھا ہوا

گیتی کے تھامنے کو روح الامیں بڑھے
گویا علی الٹتے ہوئے آستیں بڑھے
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو
جیسے کنارِ شوق سے ہو خوبرو جدا
سینے سے دم جدا رگِ جاں سے لہو جدا
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلی نکل پڑی
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر
جھونکا چلا ہوا کا جوشن سے تو سر اڑے
روح الامیں نے صاف یہ جانا کہ پر اڑے
جن پر علی لکھا تھا وہی پر سپر ہوئے
کھنچتے ہی چار ٹکڑے دوبارا کیا اسے
سختی بھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے
کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمین پر
دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی
سیل آئی زور شور سے جب گھر گرا گئی
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہ گیا
پانی میں آگ آگ میں پانی خدا کی شان
استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
نزول تھا ذوالفقار کا پانی بڑھا ہوا

قلب و جناح میمنہ و میسرا تباہ — گردن کشانِ امتِ خیرالوریٰ تباہ
جنباں زمیں صفیں نہ و بالا پرا تباہ — نے جان جسم روح مسافر سرا تباہ
بازار بند ہو گئے جھنڈے اکھڑ گئے — فوجیں ہوئیں تباہ محلے اجڑ گئے

اللہ ری تیزی و برش اس شعلہ رنگ کی — چمکی سوار پر تو خبر لائی تنگ کی
پیاسی فقط لہو کی طلبگار جنگ کی — حاجت نہ سان کی تھی اسے اور نہ سنگ کی
خوں سے فلک کو لاشوں سے مقتل کو بھرتی تھی — سو بار رن میں چرخ پہ چڑھتی اترتی تھی

تیغِ خزاں تھی گلشنِ ہستی سے کیا اسے — گھر جس کا خود اجڑ گیا بستی سے کیا اسے
وہ حق نما تھی کفر پرستی سے کیا اسے — جو آپ سربلند ہو پستی سے کیا اسے
کہتے ہیں راستی جسے وہ خم کے ساتھ ہے — تیزی زباں کے ساتھ ہے برش دم کے ساتھ ہے

سینے پہ چل گئی تو کلیجہ لہو ہوا — گویا جگر میں موت کا ناخن فرو ہوا
چمکی تو الاماں کا غل چار سو اٹھا — جو اس کے منہ پہ آگیا لے آبرو ہوا
رکتا تھا ایک وار نہ دس سے نہ پانچ سے — چہرے سیاہ ہو گئے تھے اس کی آنچ سے

بجھ بجھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی — چمکی تو اس طرف ادھر آئی وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی — اس نے کہا یہاں وہ پکارا وہاں چلی
منہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی — سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی

دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوتے تھے جاں سے ہاتھ — گردن سے سر الگ تھا جدا تھے نشاں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ — جب کٹ کے گر پڑیں تو پھر آئیں کہاں سے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہ تھے منہ چھپانے کو — ہاں پاؤں رہ گئے تھے فقط بھاگ جانے کو

اللہ رے خوف تیغِ شہِ کائنات کا — زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا
دریا میں حال یہ تھا ہر اک بدصفات کا — چارہ فرار کا تھا نہ یارا ثبات کا
غل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر — بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر

ہر چند مچھلیاں تھیں زرہ پوش سر بسر
بھاگی تھی موج چھوڑ کے گرداب کی سپر
دریا نہ تھمتا خوف سے اس برق تاب کے
آیا خدا کا قہر جدھر سن سے آ گئی
دو کر کے خود زین پہ جوشن سے آ گئی
بجلی گری جو خاک پہ تیغ جناب کی
بس بس کے کشاکش سے کماندار مر گئے
گوشے کٹے کمانوں کے تیروں کے پر گئے
دہشت سے ہوش اڑ گئے تھے مکر و وہم کے
تیر افگنی کا جن کی ہر اک شہر میں تھا شور
تاریک شب میں جن کا نشانہ تھا پائے مور
ہوش اڑ گئے تھے فوجِ ضلالت نشان کے
صف پر صفیں پروں پہ پرے پیش و پس گرے
اٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
ٹوٹے پرے شکست بنائے ستم ہوئی
غصے تھا شیر شرزۂ صحرائے کربلا
تیغ علی تھی معرکہ آرائے کربلا
بستی بسی تھی مردوں کی قریے اجاڑ تھے
غازی نے رکھ لیا تھا جو شمشیر کے تلے
چلے سمٹ کے جاتے تھے زہ گیر کے تلے
اس تیغ بے دریغ کا جلوہ کہاں نہ تھا

منہ کھولے چھپتی پھرتی تھیں لیکن ادھر ادھر
تھے تہ نشیں نہنگ مگر آب تھے جگر
لیکن پڑے تھے پاؤں میں چھالے حباب کے
کانوں میں الاماں کی صدا رن سے آ گئی
کھینچی ہوئی زمین پہ توسن سے آ گئی
آئی صدا زمین سے یا بوتراب کی
چلے تو سب چڑھے رہے بازو اتر گئے
مقتل میں ہو سکا نہ گزارا گزر گئے
سوفار کھول دیتے تھے منہ سہم سہم کے
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا ان کو سوائے گور
لشکر میں خوفِ جاں نے آنکھیں کو دیا تھا کور
پیکاں میں زہ کو رکھتے تھے سوفار جان کے
اسوار پر سوار فرس پر فرس گرے
مخبر پہ پیک پیک پہ مر کر عسس گرے
دنیا میں اس طرح کی بھی افتاد کم ہوئی
چھوڑے تھا گرگ منزل ماوائے کربلا
خالی نہ تھی سروں سے کہیں جائے کربلا
لاشوں کی تھی زمین سروں کے پہاڑ تھے
تھی طرفہ کشمکش فلکِ پیر کے تلے
چھپتی تھی سر جھکائے کماں تیر کے تلے
سہمے تھے سب پہ گوشۂ امن و اماں نہ تھا

چاروں طرف کمانِ کیانی کی وہ ترنگ
وہ شور و ہنہنانا فرسِ ابلق و سمند کا
پھنکتا تھا دشتِ کین کوئی دل تھا نہ چین سے
سقے پکارتے تھے یہ مشکیں لیے اُدھر
پیاسا جو ہو وہ پانی سے ٹھنڈا کرے جگر
کیا آگ لگ گئی تھی جہانِ خراب کو

گرمی میں پیاس تھی کہ پھنکا جاتا تھا جگر
آنکھوں میں ٹیس اُٹھی جو پڑی دھوپ پر نظر
کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
سیراب چھپتے پھرتے تھے پیاسے کی جنگ سے
چمکی جو فرق پر تو نکل آئی تنگ سے
خالق نے منہ دیا تھا عجب آب و تاب کا

سہمے ہوئے تھے یوں کہ کسی کو نہ تھی خبر
مردم کی کشمکش سے کمانوں کو تھا یہ ڈر
ترکش سے کھینچے تیر کوئی یہ جگر نہ تھا
گھوڑے کی وہ تڑپ وہ چمک تیغِ تیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
آری جو ہو گئیں تھیں وہ سب ذوالفقار سے

اللہ ری لڑائی میں شوکت جناب کی
سوکھے تھے لب کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی
ہوتا تھا غل جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں

رہ رہ کے ابرِ شام سے تھی بارشِ خدنگ
وہ لوں وہ آفتاب کی تابندگی وہ جنگ
اس دن کی تاب و تب کوئی پوچھے حسین سے
بازارِ جنگ گرم ہے ڈھلتی ہے دوپہر
مشکوں پہ دوڑ دوڑ کے گرتے تھے اہلِ شر
پیتے تھے سب حسین ترستے تھے آب کو

اُف اُف کبھی کہا کبھی چہرے پہ لی سپر
جھپٹے کبھی اِدھر کبھی حملہ کیا اُدھر
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر
چلتی تھی ایک تیغِ علی لاکھ رنگ سے
رکتی تھی نے سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے
خود اس کے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

پیکاں کدھر ہے تیر کا سوفار ہے کدھر
گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں زمیں میں جھکا کے سر
جس نے کہ سر پہ ہاتھ رکھا تن پہ سر نہ تھا
سو سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی
تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی
تیغوں نے منہ پھرا لیے تھے کارزار سے

سونلائے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی
تصویر ذوالجناح پہ تھی بوتراب کی
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

پھر تو یہ غل ہوا کہ دہائی حسینؑ کی
اللہ کا غضب تھا لڑائی حسین کی
دریا حسین کا ہے ترائی حسینؑ کی
دُنیا حسین کی ہے خدائی حسین کی
بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوح کا
اب رحم واسطہ علی اکبر کی روح کا

اکبر کا نام سن کے جگر پر لگی سناں
آنسو بھر آئے روک لی رہوار کی عناں
مڑ کر پکارے لاش پسر کو شہ زماں
تم نے نہ دیکھی جنگ پدر ای پدر کی جاں
قسمیں تمھاری روح کی یہ لوگ دیتے ہیں
لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

چلایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابن سعد
ای وا فضیحتا یہ ہزیمت ظفر کے بعد
زیبا دلاوروں کو نہیں ہے خلافِ وعد
اک پہلواں یہ سنتے ہی گرجا مثال رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پر
ای ابن سعد لکھ لے ظفر میرے نام پر

بالا قد و کلفت[۱] و تنومند و خیرہ سر
رو بیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیام مرگ کے ترکش اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعتِ بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پہ پہاڑ تھا

ساتھ اُس کے اور اسی قد و قامت کا ایک یل
آنکھیں کبود رنگ سیہ ابرووں پہ بل
بدکار و بد شعار و ستمگار و پر دغل
جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لیے کسے ہوئے کمریں ستیز پر
نازاں وہ ضرب گرز پہ یہ تیغ تیز پر

کھینچ جائے شکل حرب وہ تدبیر چاہیے
دشمن بھی سب مقر ہوں وہ تقریر چاہیے
تیزی زباں میں صورتِ شمشیر چاہیے
فولاد کا قلم دم تحریر چاہیے
نقشہ کھینچے گا صاف صف کارزار کا
پانی دوات چاہتی ہے ذوالفقار کا

لشکر میں اضطراب تھا فوجوں میں کھلبلی
ساونت تلے جو اس ہراساں دھنی بلی
ڈر تھا کہ لو حسین بڑھے تیغ اب چلی
غل تھا ادھر ہیں مرحب و عنتر ادھر علی
کون آج سربلند ہو اور کون پست ہو
کس کی ظفر ہو دیکھیے کس کی شکست ہو

۱؎ کلفت بمعنی تنومند

آواز دی یہ ہاتفِ غیبی نے تب کہ ہاں
اُٹھی علی کی تیغِ دودم چاٹ کر زباں
واں سے وہ شور بخت بڑھا نعرہ مار کے
لشکر کے سب جواں تھے لڑائی میں جی لڑائے
ڈھالیں لڑیں سپاہ کی یا ابر گڑگڑائے
ماری جو ٹاپ ڈر کے ہٹے ہر لعیں کے پاؤں
نیزہ ہلا کے شاہ پر آیا وہ خود پسند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا جب وہ بہرہ مند
وہ تیر کٹ گئے جو دراتے تھے سنگ میں
ظالم اُٹھا کے گرز کو آیا جناب پر
مارا جو ہاتھ پاؤں جما کر رکاب پر
بد ہاتھ میں شکست ظفر نیک ہاتھ میں
کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نابکار
واں اُس نے بائیں ہاتھ میں لی تیغِ آبدار
قربان تیغ تیز شہِ نامدار کے
پھر دوسرے پہ گرز اُٹھا کر پکارے شاہ
سرشار تھا شرابِ تکبر سے روسیاہ
غل تھا اسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
آتا تھا وہ کہ اسپ شہِ دیں پلٹ پڑا
تیغہ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا
پیوند صدرِ زیں جسد و فرق ہو گیا

بسم اللہ ای امیرِ عرب کے سرورِ جاں
بیٹھے درست ہو کے فرس پر شہِ زماں
پانی بھر آیا منہ میں ادھر ذوالفقار کے
وہ بد نظر تھا آنکھوں میں آنکھیں ادھر گڑے
غصّے میں آ کے گھوڑے نے بھی دانت کرکرائے
ماہی پہ ڈگمگا گئے گاؤ زمیں کے پاؤں
مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
چلّہ ادھر کھنچا کہ چلی تیغ سربلند
گوشے نہ تھے کماں میں نہ پیکاں خدنگ میں
طاری ہوا غضب خلفِ بوتراب پر
بجلی گری شقی کے سرِ پُر عتاب پر
ہاتھ اُڑ کے جا پڑا کسی ہاتھ ایک ہاتھ میں
تیغے سے پر اجل کے کہاں جا سکے شکار
یاں سر سے آئی پشت کے مہروں پہ ذوالفقار
دو ٹکڑے تھے سوار کے دو راہوار کے
کیوں ضربِ ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ
جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئے تھی راہ
لو دوسرا شکار چلا منہ میں شیر کے
ثابت ہوا کہ شیرِ گرسنہ جھپٹ پڑا
ضربت پڑی کہ گنبدِ دوّار پھٹ پڑا
گھوڑا زمیں میں سینے تلک غرق ہو گیا

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر
سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن سے ڈھانپ کے

آئی صدائے غیب کہ شبیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا
غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس اب نہ کر وغا کی ہوس ای حسین بس
گرمی سے ہانپتا ہی فرس ای حسین بس

پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں ازدہام میں
لبیک کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں
پھر سرکشوں نے تیر ملائے کمان میں
بیکس حسین ظلم شعاروں میں گھر گئے
سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر
پہلو کے پار برچھیاں سینے کے پار تیر

یوں تھے خدنگ ظل الٰہی کے جسم پر
چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسین پر
یہ دکھ نبی کے گود کے پالے حسین پر
تیر ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
لاکھوں میں ایک بیکس و دلگیر ہائے ہائے
بھالے وہ اور وہ پہلوئے شبیر ہائے ہائے
غصے میں تھے جو فوج کے سرکش بھرے ہوئے

شیروں سے وحشتگ گ سے بن اٹھے دردوں سے در
اڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور
سیمرغ نے گرا دیئے پر کانپ کانپ کے

اس ہاتھ کے لیے تھی یہ شمشیر مرحبا
دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا
بس خاتمہ جہاد کا ہی تیری ذات پر
دم لے ہوا میں چند نفس ای حسین بس
وقت نماز عصر ہی بس ای حسین بس

اب اہتمام چاہیئے امت کے کام میں
پلٹی سپاہ آئی قیامت جہان میں
پھر کھل گئے اپٹ کے پھریرے نشان میں
مولا تمھارے لاکھ سواروں میں گھر گئے
چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر
پڑتے تھے دس جو کھینچتے تھے تن سے چار تیر

جس طرح خار ہوتے ہیں ساہی کے جسم پر
ٹوٹے ہوئے تھے برچھیوں کے پھل حسین پر
قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسین پر
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا
فرزند فاطمہ کی یہ توقیر ہائے ہائے
وہ زہر میں بجھائے ہوئے تیر ہائے ہائے
خالی کیے حسین پہ ترکش بھرے ہوئے

وہ گرد تھے جو بھاگتے پھرتے تھے وقت جنگ
صدمے سے زرد ہو گیا سبطِ نبی کا رنگ
تھاما گلا جناب نے ماتھے کو چھوڑ کے
کھا ہی تین پھال کا تھا ناوک ستم
کھینچی چھری گلے کی طرف سے بچشم نم
اُبلا جو خوں نکلتا ہوا دم ٹھہر گیا
دشمن تھا تشنہ کا اعور سلمی عدوے دیں
ماری جگر پہ ابن انس نے سنان کیں
گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی
کہتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہی غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہی غضب
قرآن رحلِ زیں سے سرِ فرش گر پڑا
گر کر کبھی اُٹھے کبھی کھا زمیں پہ سر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر
اُٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا
اس وقت کون حق محبت کرے ادا
اُنیس سو ہیں زخم تن چاک چاک پر
پردہ اُلٹ کے بنتِ علی نکلی ننگے سر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر
اماں قدم اب اُٹھتے نہیں تشنہ کام کے

اک سنگ دل نے پاس سے مارا جبیں پہ سنگ
ماتھے پہ ہاتھ تھا کہ گلے پر لگا خدنگ
نکلا وہ تیر حلقِ مبارک کو توڑ کے
منہ کھل گیا اُلٹ گئی گردن کا جو دم
بھالیں نکالیں پشت کی جانب سے ہو کے خم
چُلّو رکھا جو زخم کے نیچے تو بھر گیا
سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں
بھالا گڑو کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں
تھرا گئی ضریح رسالت پناہ کی
نکلی رکاب پائے مطہر سے ہی غضب
غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہی غضب
دیوارِ کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا
اُگلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
کروٹ کبھی تڑپ کے اِدھر لی کبھی اُدھر
تیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بل گرے
اُمّت نے مجھکو لوٹ لیا وا محمدا
ہے ہے یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا
زینب نکل حسن تڑپتا ہے خاک پر
لرزاں قدم خمیدہ کمر غرق خوں جگر
ای کربلا بتا ترا مہمان ہے کدھر
پہونچا دو لاش پر مری بازو کو تھام کے

اس وقت سب جہان مری آنکھوں میں ہے سیاہ
لوگو خدا کے واسطے مجھکو بتاؤ راہ
سیّد کدھر ہے پیاسی اماں کدھر ہیں آہ
کس سمت ہے نبی کے نواسے کی قتل گاہ
شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے
یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

کس نے صدا یہ دی کہ بہن اس طرف نہ آؤ
بس اب سفر قریب ہے للہ گھر میں جاؤ
اب ڈوبتی ہے آلِ رسولِ خدا کی ناؤ
یا مرتضیٰ غریبوں کے بیٹے کو تم بچاؤ
اب چھوڑیو نہ دشتِ بلا میں حسینؑ کو
یا فاطمہ چھپا لو ردا میں حسینؑ کو

بنتِ علی تو پیٹتی پھرتی تھی ننگے سر
کٹتا تھا نورِ چشمِ علی کا گلا ادھر
زینب کو منع کرتے تھے ہر چند اہلِ شر
لیکن وہ دوڑی جاتی تھی بھائی کی لاش پر
پہونچی جو قتل گاہ میں اس روک ٹوک پر
دیکھا سرِ حسین کو نیزے کی نوک پر

نیزے کے نیچے جا کے پکاری وہ سوگوار
سیّد تری لہو بھری صورت کے میں نثار
ہے ہے گلے پہ چل گئی بھیّا چھری کی دھار
بھولے بہن کو اے اسدِ حق کی یادگار
صدقے گئی لٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں
جنبش لبوں کو ہے ابھی یادِ الٰہ میں

بھیّا سلام کرتی ہے خواہر جواب دو
چلّا رہی ہے دخترِ حیدر جواب دو
سوکھی زباں سے بہرِ پیمبر جواب دو
کیوں کر جیے گی زینبِ مضطر جواب دو
جز مرگ دردِ ہجر کا چارا نہیں کوئی
میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی

بھیا میں اب کہاں سے تمھیں لاؤں کیا کروں
کیا کہہ کے اپنے دل کو میں سمجھاؤں کیا کروں
کس کی دہائی دوں کسے چلاؤں کیا کروں
بستی پرائی ہے میں کدھر جاؤں کیا کروں
دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزا خانہ ہو گیا

ہے ہے تمھارے آگے نہ خواہر گزر گئی
بھیّا بتاؤ کیا تہِ خنجر گذر گئی
آئی صدا نہ پوچھو جو ہم پر گذر گئی
صد شکر جو گزر گئی بہتر گذر گئی
سر کٹ گیا ہمیں تو الم سے فراغ ہے
گر ہے تو بس تمھاری جدائی کا داغ ہے

گھر لوٹنے کو آئے گی اب فوج نابکار
کہیو نہ کچھ زباں سے بجز شکر کردگار
خیمے میں جبکہ آگ لگا دیں ستم شعار
رہیو مری یتیم سکینہ سے ہوشیار
بیزار ہو وہ خستہ جگر اپنی جان سے
باندھے نہ کوئی اس کا گلا ریسمان سے

بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم کو یادگار رہینگے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند ہیں سلطاں پسند بند
یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے میں خزاں کی بہار ہے

رُباعی

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے
پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے
غافل تجھے دُنیا سے سفر کرنا ہے

رُباعی

کس طرح کرے نہ ایک عالم افسوس
جی بھر کے کیا نہ شہ کا ماتم افسوس
کیا جلد گزر گئے یہ دس دن غم کے
یوں ماہ جو ہو گیا محرّم افسوس

رُباعی

قاسم کو عدو نے خوں میں جب لال کیا
شبیرؑ نے یہ کہہ کے عجب حال کیا
تابوت پہ جس کے باپ کے مارے تیر
گھوڑوں کے سموں سے اس کو پامال کیا

مرثیہ ١٧

جب خاتمہ بخیر ہوا فوج شاہ کا
گھر لُٹ گیا جنابِ رسالت پناہ کا
بھائی نہ وہ رفیق نہ وہ نورِ عین تھے

ڈیوڑھی وہ صبح تک تھے دو دستہ جہاں سوار
وہ لوں وہ دوپہر کی تپش اور وہ غبار
آفت تھی بیکسی تھی مصیبت تھی یاس تھی

وہ گھر کہ جس میں لاتے تھے جبریل وحیِ رب
نہوڑائے سر کھڑے تھے شہنشاہِ تشنہ لب
لب پیاس سے کبود تھے رخسار زرد تھے

فرماتے تھے کہ واہ یہ تاخیر اے اجل
اب مجکو اک برس کے برابر ہے ایک پل
اک جا چھری گلوں پہ جو چلتی تو خوب تھا

اُٹھتا نہیں حسین سے اب بارِ زندگی
جیتے رہیں وہ جو ہیں طلبگارِ زندگی
عبرت کی جا ہے خاک میں رنگِ چمن ملے

کی خوب سیر باغِ جہاں خوب پھل ملے
ممکن نہیں کہ خلق میں چین ایک پل ملے
جنت میں پیاس تشنہ دہانوں کو لے گئی

کوثر پہ قافلہ گیا پیاسی سپاہ کا
خاک اُڑ رہی تھی حال یہ تھا بارگاہ کا
دو بہنیں رونے والیاں تھیں اک حسین تھے

خادم ہے واں کوئی نہ کوئی ہے رفیق و یار
پردہ ہوا سے سر کو پٹکتا تھا بار بار
نے فوج بادشاہ تھا ڈیوڑھی اُداس تھی

واں تیر فوجِ ظلم سے آتے تھے ہے غضب
تر تھا جواں پسر کے لہو سے لباس سب
مولا کی ایک جان تھی اور لاکھ درد تھے

اکبر کے بعد کونسا تھا زیست کا محل
موت آئے اب یہ ہے شجرِ زندگی کا پھل
یہ جان اُن کے ساتھ نکلتی تو خوب تھا

اے موت اب گرا کہیں دیوارِ زندگی
اب دق ہے اپنی جان سے بیمارِ زندگی
زندہ ہو باپ اور نہ پسر کو کفن ملے

ہو عید اب گلے سے جو تیغِ اجل ملے
دنیا میں آج اُن کو نہ پایا جو کل ملے
افسوس خوب چن کے جوانوں کو لے گئی

ہے ہے کہاں وہ گوہرِ بحرِ شرف گئے
جو میرے پاس رہتے تھے وہ کس طرف گئے
قاسم سدھارے شبّر کے خلف گئے
سارے مرے چنے ہوئے دُرِّ نجف گئے
کیا تفرقہ یہ لشکرِ شاہی میں پڑ گیا
میں قافلے سے چھٹ کے تباہی میں پڑ گیا

ہم سب کے بعد خلق سے جانے کو رہ گئے
سر پیٹنے کو خاک اُڑانے کو رہ گئے
پیری میں آہ ٹھوکریں کھانے کو رہ گئے
اس نوجواں کا داغ اُٹھانے کو رہ گئے
بیٹا کہاں خبر جو دمِ انتقال لے
اتنا نہیں جو گرتے ہوئے کو سنبھال لے

فرما کے یہ جو گھر میں گئے شاہِ خوش خصال
محبوبِ حق کی آل کا دیکھا عجیب حال
بیٹھے ہوئے ہیں سب صفِ ماتم پہ کھولے بال
برپا ہے شورِ ماتمِ فرزندِ خوش جمال
بانو قریبِ مرگ ہے زینب ہلاک ہے
سینے تو سب کبود ہیں بالوں پہ خاک ہے

بہنیں پکارتی تھیں کہ بیرن ترے نثار
اب تک تو گھر میں آتے تھے مقتل سے چند بار
بھیّا سنگھا دو نکہتِ گیسوئے مشکبار
اُس بھینی بھینی بو کے لیے دل ہے بے قرار
آئے نہ عمّو جان کا پُرسا بھی دینے کو
کیا نے کہے چلے گئے صغرا کے لینے کو

شہ نے کہا بہشت میں ہیں اکبرِ حسیں
صغرا کہاں ہماری ہے اُن کو خبر نہیں
رخصت کرو حسین کو اے زینبِ حزیں
خیمے تک آ نہ جائے کہیں فوجِ اہلِ کیں
لا دو رسولِ پاک کا رختِ کہن ہمیں
پہنا دو اپنے ہاتھ سے زینب کفن ہمیں

بیخود تھی غم میں نورِ نظر کے وہ دلفگار
سمجھی نہ کچھ کہ کون یہ روتا ہے زار زار
جب یہ سنا کھڑا ہے محمد کا یادگار
ماتم کی صف پہ گر پڑی اُٹھ کر وہ سوگوار
رو کر کہا نہ پاؤں نہ قابو میں ہاتھ ہیں
کیوں صاحبو کہو علی اکبر بھی ساتھ ہیں

بے خوں جبیں پھٹے ہوئے کپڑے بدن پہ خاک
چادر سیاہ ایک گریباں ہزار چاک
سر بھی جگر بھی سینۂ پرخوں بھی دردناک
بیکس بہن کے حال پہ روئے امامِ پاک
فرمایا آئیں کیا کہ سناں دل پہ کھائے ہیں
ہم اُن کی لاش چھوڑ کے رخصت کو آئے ہیں

میں کیا ہوں ایک عبد نحیف و ضعیف و زار
قدرت نہ زندگی کی نہ مرنے پہ اختیار
حاضر ہوں جب بلائے کہ حاکم ہے کردگار
ہے اُس کی ذات راحم و غفار و پردہ دار
منظور پرورش ہے جو سب کی کریم کو
رانڈوں کو بھولتا ہے نہ طفل یتیم کو

جو معرضِ فنا میں ہوں کیا اُن کا آسرا
میں ہوں تو کیا ہوں مالک و مختار ہے خدا
اُٹھ جائیں بھائی بھانجے یا ہوں پسر جدا
صابر اسی سے صبر کی کرتے ہیں التجا
وہ قید میں نہ گھر کی تباہی پہ روتے ہیں
روتے ہیں گر تو خوفِ الٰہی میں روتے ہیں

وہ کہتے تھے کہ جان نکل لے تو جائیے
خنجر اجل کا حلق پہ چل لے تو جائیے
مضطر ہے دل بہن کا سنبھل لے تو جائیے
اچھا ذرا سکینہ بہل لے تو جائیے
بالوں پہ خاک اُڑا لوں منہ اشکوں سے دھو تو لوں
ماں جائے بھائی میں تجھے جی بھر کے رو تو لوں

بولی قدم پہ گر کے یہ بانوئے خوش خصال
اے جانِ فاطمہ خلفِ شیر ذوالجلال
فرمائیے تو ساتھ چلے یہ شکستہ حال
رُخ پر نقاب ڈال کے بکھرا کے سر کے بال
عزت اب اس کنیز کی ہے ہاتھ آپ کے
پردہ مرا رہے جو مروں ساتھ آپ کے

مجدھار میں ہے ناؤ طلاطم ہے آشکار
موجیں ستم کی آتی ہیں طوفاں میں بار بار
اے ناخدائے کشتی امت ترے نثار
بیکس کا ڈوبتا ہوا بیڑا لگا دے پار
رحم اب کہ بیقرار ہے بسمل کا وقت ہے
حلال مشکلات یہ مشکل کا وقت ہے

بانو کے اضطراب پہ روئے شہِ اُمم
فرمایا ناگوار ہے صاحب تمہارا غم
بانو اسیر و بیکس و بے آشنا ہیں ہم
یاور نہ بھائی بند نہ لشکر نہ وہ علم
موت اپنی خود طلب نہ کرے وہ تو کیا کرے
جس کا کوئی نہ ہو نہ مرے وہ تو کیا کرے

لازم ہے تم کو صبر یہ ہے صبر کا مقام
مالک کی ہے اسی میں خوشی اور یہی میں نام
یاں گھر لٹے کہ قید میں جانا ہو سوئے شام
ہر دم رہے زبان کو شکر خدا سے کام
دیں پہ تمھارا ساتھ تم ان سب کے ساتھ ہو
میرا یہی ہے ساتھ کہ زینب کے ساتھ ہو

یہ کہہ کے نکلے خیمے سے شبیرؑ دلفگار
دیکھا کھڑا ہے ڈیوڑھی پہ اسپ وفا شعار
گردن پہ ہاتھ پھیر کے بولا وہ نامدار
طاقت نہ ہو تو جائے پیادہ ترا سوار
یہ گردش فلک یہ جفائے زمانہ ہے
تو بھی تو تین روز سے بے آب و دانہ ہے

مُنہ رکھ کے شہ کے بازو پہ بولا وہ باوفا
اے شہسوار دوش محمد ترے فدا
کچھ حق نہ دانہ خوری کا مجھ سے ہوا ادا
فاقہ ہو جب کہ آپ کو مولا تو میں ہوں کیا
حیواں ہوں پر نہ ترک رفاقت کروں گا میں
جیتا ہوں گر تو آپ کے آگے مروں گا میں

پھیلا کے دونوں ہاتھ جھکا وہ سوئے زمیں
گھوڑے پہ جلوہ گر ہوا حیدر کا نازنیں
پرنور ہو گیا رُخ انور سے صدر زیں
مرکب پہ تھے حسین کہ خاتم پہ تھا نگیں
شور درود غرب سے تا شرق ہو گیا
بیٹھے جونہی کہ آپ فرس برق ہو گیا

بوئے بہشت لے کے نسیم سحر چلی
آگے فرس کے فتح تو پیچھے ظفر چلی
خود سر پہ چتر بن کے ضیائے قمر چلی
گھوڑا چلا کہ فتح کی گویا خبر چلی
غرفوں سے حوریں دیکھتی تھیں شہسوار کو
پریاں طبق لیے تھیں سروں پر نثار کو

ہاتوں پہ زر ہیں سب گل خودرو لیے ہوئے
دوڑی صبا بہشت کی خوشبو لیے ہوئے
تیغ و سپر جو ہیں شہ خوشخو لیے ہوئے
غل ہے کہ ہاں نجات کا پہلو لیے ہوئے
شبیر تو امام ہے ابن امام ہے
گر غیظ آگیا تو یہ دُنیا تمام ہے

بجلی کی ضو دکھاتی ہے رُخ کی چمک اُدھر
خود عرش اُس طرف نگراں تھا فلک اُدھر
ڈر سے سما ادھر تھا ہراساں سمک اُدھر
جنات اُس طرف تھے صف آرا ملک اُدھر
کچھ کہکشاں سے بڑھ گئی تھی شان راہ کی
غل تھا سواری جاتی ہے شاہوں کے شاہ کی

جھکتے تھے جب صفوف ملائک پئے سلام
ہنس کر جواب دیتے تھے مولائے خاص و عام
جن ہوتے تھے جو خم پئے تسلیم و احترام
رکھتے تھے سر پہ ہاتھ امامِ فلک مقام
مطلب یہ صاف تھا کہ مدد ناگوار ہے
میرا یہ سر امانت پروردگار ہے

شرمندہ ہے جبیں مبیں سے قمر کا نور
پیدا ہوا ہے زلف سے شب کی سحر کا نور
صلِ علیٰ یہ نور ہے خیر البشر کا نور
پروانہ روشنی پہ ہے جس کی نظر کا نور
دیکھو نشانِ سجدہ جبینِ جناب پر
غنچہ ہے نیلوفر کا گل آفتاب پر

کیا خوشنما ہیں چہرے پہ گیسو کو دیکھیے
شب اور آفتاب کے پہلو کو دیکھیے
دو راتیں اک سحر رخ نیکو کو دیکھیے
جنگل تمام بس گیا خوشبو کو دیکھیے
چہرے کی ضو سے دشت پر آشوب عرش ہے
ساری زمیں پہ عنبر سارا کا فرش ہے

ابرو ہے یا کھنچی ہوئی حیدر کی ذو الفقار
یہ مو بھرے ہوئے نہیں جوہر میں آشکار
قرباں کماں ہلالِ فلک مرتبت نثار
آنکھوں پہ جن کی جا ہے یہ ایسی ہیں ذی وقار
پیوستہ منکسر ہیں وہ جو ارجمند ہیں
اُتنی فروتنی بھی ہے جتنی بلند ہیں

آنکھوں کو کہیے عین تو عینِ خطا ہے یہ
پردے نہ کیوں ہوں سات کہ نورِ خدا ہے یہ
سب کو ہے چشم داشت کہ عینِ عطا ہے یہ
بیمار خود پہ سب کے مرض کی دوا ہے یہ
سرخوش ہے جام ان کی جو الفت کا پی گیا
دیکھا نگاہِ لطف سے جس کو وہ جی گیا

احساں بھی حیا بھی مروت بھی قہر بھی
خود موت بھی حیات بھی امرت بھی زہر بھی
بینا بھی نکتہ سنج بھی دانائے دہر بھی
تسنیم بھی بہشت بھی کوثر کی نہر بھی
سر شرم سے جھکائے ہے نرگس ریاض میں
جنت سواد ہیں ید بیضا بیاض میں

آہو شکار و تیر و کماں دار و شیر گیر
ہشیار و خوش نگاہ و سخن سنج و دلپذیر
خونریز و جاں فریب و دلاویز و بے نظیر
قبضے میں ابروؤں کے کمانیں مژہ کے تیر
جس سادہ دل کو ان کی سیاہی کی یاد ہو
ناخواندہ بھی اگر ہو تو روشن سواد ہو

ذرہ نواز و زہد نما صاحبِ امتیاز
طناز و سرمگیں و گراں خواب و سرفراز
حق بین و پاکباز و خدا بین و بے نیاز
بیدار و داغ دادہ و خونبار و غم طراز
گرد اس کے پھر یہ کعبۂ ایماں کا طوف ہے
بس اے انیس بس نظرِ بد کا خوف ہے

اللہ رے رعب شیر ہرن مو ہو گئے ہیں سب
خود دل شکستہ قلعہ شکن ہو گئے ہیں سب

آملج خوف تیر فگن ہو گئے ہیں سب
خم صورت کماں ہمہ تن ہو گئے ہیں سب

آنکھیں ملائیں کب یہ شریروں کی تاب ہے
کس دل کو اس نگاہ کے تیروں کی تاب ہے

شیر خدا کے شیر سے کیونکر ہو چار آنکھ
وہ گربہ چشم اور یہ آہو شکار آنکھ

خورشید فاطمہ سے ملائیں ہزار آنکھ
عاجز ہے جھپکی جاتی ہے بے اختیار آنکھ

گھورے کوئی تو حاصل عین الکمال لے
خود اس کی آنکھ پنجۂ مژگاں نکال لے

گر کوئی شوخ چشم و جفا جو نظر لگائے
یوں پہونچے چشم زخم کہ ظالم نہ تاب لائے

عین الکمال کی سر میداں سزا وہ پائے
انگشت بن کے موئے مژہ چشم میں در آئے

بینا کہیں کہ کھوئی بصیرت بصیر نے
مردم کہیں کہ عین خطا کی شریر نے

کیا نور ہے رخ خلف بو تراب پر
ہے یہ عرق کہ عطر کے قطرے گلاب پر

کچھ تیرگی سی آگئی ہے آب آفتاب پر
سونا چڑھا ہو پھر ورق آفتاب پر

آئے جلال میں نہ جلالت حضور کی
تشبیہ ہے خدا و محمدؐ کے نور کی

کیوں منہ کو پھیرتا ہے خجل ہو کے آفتاب
شرمندہ ہو گا اپنی چمک کھو کے آفتاب

آنکھیں ملے اٹھا ہے اگر سو کے آفتاب
لازم ہے آئے سامنے منہ دھو کے آفتاب

گر چاہتا ہے عرش سے سر اس کا جا ملے
کہدو کہ ارض پاک کے ذروں میں آملے

درج دہن پہ لعل و عقیق یمن نثار
غنچے نثار پھول تصدق چمن نثار

حسن بیاں پہ طوطی شکر شکن نثار
شور نمک پہ شاعر شیریں سخن نثار

فقروں میں لطف باتوں میں لذت بھری ہوئی
قرآن کی طرح ہے فصاحت بھری ہوئی

توبہ تنافر کلمات اور یہ دہن
جملے صحیح شستہ و رفتہ ہر اک سخن

پھولا ہوا فصاحت الفاظ کا چمن
تقریر وہ سمجھ لیں جسے صاف مرد و زن

معنی کا بھی یہ حال ہے حسن قبول سے
خوشبو سحر کو جیسے نکلتی ہے پھول سے

لفظوں میں یوں ہے معنیِ روشن کی آب و تاب
جس طرح عکس آئینہ میں جام میں گلاب
مضموں میں تناسبِ الفاظِ لاجواب
تصحیح بھی فصیح کنائے بھی انتخاب
یاں منتہی وہ سب ہیں جو علم و کمال ہیں
صل علیٰ یہ مصحفِ ناطق کے لال ہیں

دنداں کواکبِ فلکِ عزّ و شانِ حُسن
گر ہیں تو بس یہی ہیں نہاں ہیں جانِ حسن
خالق نے موتیوں سے بھرا ہے دہانِ حسن
خود لال ہے صفات ہیں جن کی بیانِ حسن
کوسوں ضیا ہے وادیِ مینو سرشت میں
گویا چمک رہے ہیں ستارے بہشت میں

بتیس ۳۲ دُرِ وہ لعبتِ محبوبِ کردگار
اختر چمک سے جن کی خجل برق شرمسار
براق و درفشان و ضیا بار و آبدار
بھولا ہیں ان بھوں سے ہے ان کا فزون وقار
ہیرے نہیں نجومِ سعادت اثر نہیں
یہ شبّر فاطمہ کے ہیں قطرے گہر نہیں

وہ ریش پاک اور وہ چہرے کی آب و تاب
نکلا ہے چیر کر شبِ یلدا کو آفتاب
کچھ جا بجا جو کھل گیا ہے ریش کا خضاب
رخصت ہے دل رہے ہیں گلے پیری و شباب
تا وقتِ عصر اور زمانِ حیات ہے
اب زندگی میں کوئی نہ دن ہے نہ رات ہے

سینے کا آئینہ ہے کہ نورِ خدا کا گھر
یا وہ مدینہ علم کا حیدر ہے جس کا در
اس صدر میں بھرے ہوئے ہیں راز کے گہر
آئندہ و گذشتہ کی سب ہے انھیں خبر
پنہاں جو دل میں ہے اسے پہچانتے ہیں یہ
جو بے زباں ہیں اُن کی زباں جانتے ہیں یہ

ذکرِ گلو جو ہے تو گلے میں رکا ہے دم
حوروں کی گردنیں ہیں اسی جا ادب سے خم
لیتے ہوں بوسے جن کے رسولِ فلک حشم
افسوس اُس گلے پہ چلا خنجرِ ستم
سوکھی رگیں گلوئے مبارک کی کٹ گئیں
افلاک گر پڑے نہ زمینیں اُلٹ گئیں

پیہم زباں دکھا کے کہا آب آب آب
ای وا محمدا نہ کسی نے دیا جواب
قطرے سے بھی زبان نہ ہوئی آہ کامیاب
آخر تڑپ کے رہ گیا وہ آسماں جناب
جلتی زمیں پہ لاشِ شہِ نیک خو رہی
گردن گلے سے کٹنے پہ بھی قبلہ رو رہی

وہ سر رکھا خدا نے شفاعت کا جس پہ تاج
گردن وہ وہ بزم لم یزلی کا جو ہی سراج

وہ صدر جسکے علم کی عالم کو احتیاج
وہ ہاتھ جسکے خیر و عطا کا ہوا رواج

دشمن تو لاکھ اور اکیلے حضور تھے
سارے یہ عضو ظلم کی تیغوں سے چور تھے

وہ پاؤں معرکہ سے کبھی جو نہیں ہٹے
وہ کیا ہٹیں ہٹے تو صف فوج کیں سے ہٹے

دشوار ہی یہ امر کہ رکن رکیں سے ہٹے
سر کیں نہ آسمان ہٹے یا زمیں سے ہٹے

مسکن سے منہ پہاڑ کبھی موڑتے نہیں
ثابت قدم جو ہیں وہ جگہ چھوڑتے نہیں

گھر کا خدا کے رکن رکیں ہی کہاں ہٹے
نقش اس قدم کا نقش نگیں ہی کہاں ہٹے

یہ لنگر سفینۂ دیں ہی کہاں سے ہٹے
یہ قطب آسمان و زمیں ہی کہاں ہٹے

زور اس سے آسماں کا بھی چلتا نہیں کبھی
نقطہ ہی دایرے سے نکلتا نہیں کبھی

اس دبدبے سے لشکر پیماں شکن میں آئے
جیسے شکار کھیلنے کو شیر بن میں آئے

یا بلبل اشتیاق میں گل کے چمن میں آئے
غل پڑ گیا ہٹو اسداللہ رن میں آئے

اگلی صفیں الٹ گئیں یوں پچھلی فوج پر
طوفاں میں موج گرتی ہی جس طرح موج پر

بھڑکے فرس پرے ہوئے ابتر علم ہٹے
بڑھتے ہوئے جو بانی ظلم و ستم ہٹے

نامی نشان چھوڑ کے ثابت قدم ہٹے
دریا ہٹا کہ فوج کے بادل بہم ہٹے

بھاگڑ میں خاک اڑ کے جو سوئے فلک گئی
لشکر میں غل ہوا کہ زمیں بھی سرک گئی

سب چلے ہیں خیموں سے سراسر چھٹے ہوئے
افسر سے فوج فوج سے افسر چھٹے ہوئے

خالی ہیں مورچال تو سنگر چھٹے ہوئے
غربت میں یاد کرتے ہیں سب گھر چھٹے ہوئے

تلوار اگر کھنچے تو خدا کی پناہ ہی
دیکھو یہ سب کرشمۂ تیغ نگاہ ہی

اہل چل کو دیکھ کر یہ پکارا وہ حق شناس
اے اہل شام اک متنفس سے یہ ہراس

سب مر گئے امید کسی کی ہی اب نہ آس
اک میں ہوں اور حسرت و اندوہ و درد و یاس

ماتم میں اپنی فکر نہ لڑکوں کا ہوش ہی
خنجر سے کاٹ لو کہ یہ سر بار دوش ہی

کیوں بھاگتے ہو بیکس و تنہا کی جنگ کیا   جب ہم گیا ہو دل تو وغا کی امنگ کیا
نے دست و پا دکھائے لڑائی کا ڈھنگ کیا   طاقت ہو گر تو شیر ہی پھر کیا پلنگ کیا
پر خیر کیا ہیں تم سے عوض لوں عناد کا   لڑ لو نکا کچھ کہ حکم ہی مجھکو جہاد کا
یہ سن کے پھر جائے پرے فوج شام نے   کالے نشان کھل گئے لشکر کے سامنے
چھوڑا ادھر نیام علی کی حسام نے   جلوہ دیا عروس ظفر کو امام نے
گھونگھٹ ہٹا تو برق سی چمکی لڑائی میں   نقد حیات لینے لگی رونمائی میں

گھوڑا جو پھاند کر صف اول سے مل گیا   تھا صاعقہ کہ شام کے بادل سے مل گیا
وہ پیپلا جو فوج کے اس دل سے مل گیا   نے برگ و بر ہوئے یہ ثمر پھل سے مل گیا
پھرتے ہوئے سروں پہ نہ سر تھے نہ ہاتھ تھے   گویا چھری لیئے ملک الموت ساتھ تھے
وہ تیغ تیز جب صف ثانی سے مل گئی   خفت ہر اک کو اس کی گرانی سے مل گئی
لذت چھری کی تیز زبانی سے مل گئی   دریا کی باڑھ گھاٹ کے پانی سے مل گئی
چمکی جو سر پہ برق تو نے فرق ہو گئے   دریا میں خوں کی تا بکمر غرق ہو گئے

کھا کھا گئی صفوں کو جدھر آئی ذوالفقار   گہ چھپ گئی تو گاہ نظر آئی ذوالفقار
سر پر چمک کے تا بہ کمر آئی ذوالفقار   زیں کاٹ کر زمیں پہ اتر آئی ذوالفقار
یوں صبر پنجتن میں گرفتار ہو گئے   اک جوش میں سوار و فرس چار ہو گئے
وہ منہ کہ الحذر وہ روانی کہ الاماں   وہ گھاٹ الحفیظ وہ پانی کہ الاماں
وہ دم وہ خم وہ تیز زبانی کہ الاماں   وہ دل شکن وہ دشمن جانی کہ الاماں
ناز اس کے سب کو بھائے کرشمے بھلے لگے   چھوڑے نہ نے لہو پیے جس کے گلے لگے

تھی دست گاہ خاص اسے قتل عام میں   نے دم ہوا جو آگیا جوہر کے دام میں
کس کس ادا سے چلتی تھی وہ فوج شام میں   دونوں زبانیں ایک سی تھیں اپنے کام میں
کیا بس چلے کسی کا ہوا جب بری چلے   چلتی تھی یوں گلوں پہ کہ جیسے چھری چلے

جوہر میں فرد تھی یہ زبانیں ملی تھیں زوج
وہ شور اس کے آب کا وہ جوہروں کی موج
پستی میں تھی کبھی کبھی جاتی تھی سوئے اوج
بجلی غضب کی کوند رہی تھی میان فوج
کرتی تھی کار تیغ چمک ذوالفقار کی
پرتو میں تیزیاں تھیں سروہی کی وار کی

وہ فوج کا ہجوم وہ گرمی وہ لوٹ وہ بن
دریا پہ شیر ہانپتے تھے دشت میں ہرن
بھڑکی تھی آگ جل رہے تھے ناریوں کے تن
مثل صدف تھے زخم بھی کھولے ہوئے دہن
ڈوبا تھا وہ پسینے میں جو سینہ زور تھا
فوجوں میں ذوالفقار کے پانی کا شور تھا

اتری صفیں تھیں کینہ وروں کی ادھر اُدھر
جانیں ہوا تھیں فتنہ گروں کی ادھر اُدھر
چھائی تھی اک گھٹا سپروں کی ادھر اُدھر
بوچھار تھی زمیں پہ سروں کی ادھر اُدھر
غل تھا اتر رہی گھاٹ ہیں دریا کی باڑھ کا
برسا ہے نصف تپ کے مہینا اساڑھ کا

کاٹا سر اس کا اُس کا جگر چاک کر دیا
بجلی کو اور آگ نے چالاک کر دیا
جس پر گری جلا کے اُسے خاک کر دیا
قصہ جو دین و کفر میں تھا پاک کر دیا
شرما کے شرک و کفر نے سر کو فرو کیا
اسلام شاد تھا کہ مجھے سرخرو کیا

اللہ رے جنگ میں شہ ذیقدر کی شکوہ
جس جا قدم جمے نہ ہٹے پھر مثال کوہ
قہر خدا تھی برہمی طبع حق پژوہ
بے خوف جاں نہ تھا کوئی مجمع کوئی گروہ
حملوں میں ساری شان خدا کے ولی کی ہے
فوجوں میں شور تھا یہ لڑائی علی کی ہے

ساعد سے کچھ بلند جو کر لی تھی آستیں
فانوس سے بڑھا ہوا تھا نور شمع دیں
نعرے نہ کہیے گونجتا تھا شیر خشمگیں
جنبش میں آسمان تزلزل میں تھی زمیں
دست علی سے تھے ہاتھ حسین دلیر کے
قبضے میں انگلیاں تھیں کہ ناخن تھے شیر کے

وہ آستیں چڑھی ہوئی ساعد وہ صاف صاف
اُگلی ہوئی تھی میان سے شمشیر خوش غلاف
ضربت کا شور قاف سے پہونچا تھا تا بقاف
وہ تہلکہ وہ زلزلہ وادی مصاف
ڈر تھا کہ پاؤں گاو کا ہی سے ہٹ نہ جائے
دہشت زمیں کو تھی کہ زمانہ الٹ نہ جائے

زور آوران روئے زمیں کس طرح بڑھیں
تلوار کیسی آنکھ اُٹھا کر اگر ڈرائیں
وہ انگلیاں کہ باب میں خیبر کے جو درائیں
زہرے ہوں آب سامنے سو شیر بھی گر آئیں
اے توبہ جانور ہے اسد گو دلیر ہے
آنکھیں یہ اُس کی ہیں کہ جو حیدر کا شیر ہے

غصے میں سب کھڑے ہوئے ہیں ریش کے جو بال
نقطے عیاں ہیں سورۂ والشمس پر کہ خال
زیر و زبر ہیں صاف پئے مصحف جمال
سرخی کے مد کہ آنکھوں کے ڈورے ہیں لال لال
وہ خط وہ رنگ چہرۂ تاباں کھلا ہوا
دیکھو دھرا ہے رحل پہ قرآں کھلا ہوا

کیا مدح ہو حسین کی جنگ و جدال کی
وہ آوجا و اشہب ضیغم خصال کی
تصویر بن گئی تھی علی کے جلال کی
روندا جو یہ پرا تو وہ صف پائمال کی
اُن اُبلی انکھڑیوں کے اشارے غضب کے تھے
چل پھر تھی قہر کی تو طرارے غضب کے تھے

حیرت میں یکہ تاز تھے سب شام و روم کے
سیر اُس کی دیکھتے تھے شناسا نجوم کے
پھرتی تھی برق گرد قدم چوم چوم کے
پھرتا تھا اُس ہجوم میں کیا جھوم جھوم کے
حیراں سیاہ گوش تو چیتے خموش تھے
شیروں میں جان تھی نہ چکاروں میں ہوش تھے

جم کر ادھر اڑا اُدھر اُترا وہ جا پڑا
جب اُس پہ رو میں سایۂ زلف دوتا پڑا
نکلا اُدھر صفوں سے وہ پلٹا یہ آ پڑا
سمجھا کہ تازیانۂ موج ہوا پڑا
تسمہ ہر اک جو باگ کا تھا ناگ ہو گیا
آنکھیں اُبل پڑیں یہ مزاج آگ ہو گیا

گرما کے سب رگوں میں لہو دوڑنے لگا
اُٹھنے لگے زمین پہ جم جم کے دست و پا
فر فر کی دونوں نتھنوں سے آنے لگی صدا
غصہ کہ مجھ تک آ کے کدھر رہ گئی ہوا
نزدیک تھا کہ پھاند کے ندی کے پار ہو
روکے وہی حسین سا جو شہسوار ہو

آہو کی آنکھ شیر کی چتون غضب کی چال
گردن کے خم کو دیکھ کے ہو سرنگوں ہلال
وہ بال تھے کہ حور نے بکھرا دیے تھے بال
پوچھے کوئی سوار سے شائستگی کا حال
اُڑ کر زمیں تلک کبھی گرد قدم گئی
جب بس کہا چمکتی ہوئی برق تھم گئی

خوش خو و خوش خرام و خوش اندام و خوش لگام
جانباز و شوخ چشم و سبک رو خجستہ گام
غازی تھا سرفراز تھا عالی دماغ تھا
چالاکیاں بھی غیظ بھی غربت بھی جنگ بھی
بر میں اسد بھی بحر وغا میں نہنگ بھی
ہے آگ کا مزاج تو سرعت ہوا کی ہے
وہ ساز اور وہ زین مرصع کی زیب زین
کلغی سے سر کی صاف عیاں فر فرقدین
دعوے کہ میں براق کی توقیر لیے ہوں
وہ چھوٹی چھوٹی کا چھیاں گول گول سم
طاؤس کی طرح جو وغا میں چنور تھی دم
پھرنا تجھے نصیب ہو راہ ثواب میں
وہ گشت اور وہ اس کے طرارے وہ آؤ جاؤ
گھونگھٹ میں دیکھ پائے اگر چال کا بناؤ
دعوے غلط خرام میں کبک دری کا ہے
کوتہ ہے وہ تدرو ہے کیا اس کی چال کیا
کیا پائے عقل شاطر وہم و خیال کیا
دیکھی نہیں کسی نے یہ چھل بل سمند میں
پیکاں ہیں دو کنوتیاں ہنگام دار و گیر
رو ہیں وہ نرم جلد وہ باریک بے نظیر
ایسی سبکروی نہیں دیکھی شہاب میں

خوش رو و خوش جمال و وفا فہم و تیز گام
گل پوش و تیز ہوش و سمن گوش و سرخ فام
گویا ہوا کی دوش پہ اک زندہ باغ تھا
بالا دوی براق کی دلدل کا ڈھنگ بھی
گھوڑا بھی شیر نر بھی ہرن بھی پلنگ بھی
اضداد اتنے جمع ہیں قدرت خدا کی ہے
اس میں ہوا میں ارض و سما کا تھا فرق و بین
سینے میں دل قوی تھا کہ ہیں پشت پر حسین
ناز اس پہ ہے کہ بار امامت اٹھائے ہوں
سرعت وہ تھی کہ عقل تھی یونانیوں کی گم
آئی تھی آسمان سے ندا مد ظلہم
قائم یہ دونوں پاؤں ہیں سر رکاب میں
پانی پہ گر حباب تو آب رواں میں ناؤ
دولہا کے دل میں پھر رہے کچھ دلھن کے چاؤ
اس باد پا کے سائے میں جلوہ پری کا ہے
طاؤس کیا ہما ئے سعادت خصال کیا
اس کے قدم کی گرد کو پہونچے مجال کیا
پارا بھرا ہوا ہے ہر اک جوڑ بند میں
حلقے سے یوں نکلتا ہے جیسے کمان سے تیر
چینی پرند جس کے مقابل نہ ہے حریر
دوڑے تو فرق آئے نہ مخمل کی خواب میں

ہرچند تیز رو ہی بہت ادہم قلم
پر اُس کی شوخیوں کو یہ کیونکر کرے رقم

کچھ کچھ مداد کی بھی روانی ہوئی ہی کم
دوڑا بہت تو ذہن کا بھی بھر گیا ہی دم

تازی کوئی ہو بات تو لطفِ کلام ہی
بس اے قلم ٹھہر تری تگ کی تمام ہی

گھوڑے سے بھی بڑھی ہوئی تھی تیغ آبگوں
جب ہاتھ اُٹھا تو قبضے سے ٹپکا زمیں پہ خوں

اُلٹی ہوئی صفوں میں نشاں سب تھے سرنگوں
دہشت سے زرد تھا ابنِ سعدِ سیہ دروں

اک شور تھا جو لہر ہی اس کی وہ ناگ ہی
گھوڑے بھگاؤ تیغ کے پانی میں آگ ہی

سر کاٹ کر جو تیغِ علی ولی پھری
دل پر خفی پھری تو جگر پر جلی پھری

تھی شاخِ نخلِ فتح کہ پھولی پھلی پھری
کس کس ہنر سے رن میں گلوں پر چلی پھری

بگڑا نہ پھر بناؤ وہ جب سے سجی گئی
قامت سے راستی وادا سے کجی گئی

دہشت سے اُس کی سخت جگر کانپتے تھے سب
پتا ہوئے تھے برگِ شجر کانپتے تھے سب

قدسی وہاں سے دور تھے پر کانپتے تھے سب
دریا میں تھے نہنگ مگر کانپتے تھے سب

ساتوں طبق جو ہلتے تھے خوف و دہشت سے
گاوِ زمیں لپٹتی تھی ماہی کی پشت سے

نے سر تھے وہ سوار جو بڑھتے تھے خیل خیل
پر تیغِ مرتضےٰ کو نہ اصلا تھا خیف و میل

جو ہر چمک دکھاتے تھے سب صورتِ سہیل
آتی تھی شور سے سوے دریا لہو کی سیل

آفت بپا تھی خانۂ تن سب خراب تھے
موجیں تھیں دست و پا کی سروں کے حباب تھے

اک شور تھا کہ آئی ہی آفت جہان پر
انساں زمیں پہ دق تھے ملک آسمان پر

ہونٹوں پہ دم اجل کی حرارت زبان پر
دہشت سے آبنی تھی جنوں کی بھی جان پر

پریوں میں شور تھا کہ اجل سر پہ آئی ہی
جلد آئیے جناب سلیماں دہائی ہی

تلوار رن میں گر کسی سرہنگ سے چلی
ظالم کا دم نکل گیا اس ڈھنگ سے چلی

جس پر چلی وہ تیغ نئے رنگ سے چلی
سر پر سوار کے جو پڑی تنگ سے چلی

مدت کا تال میل تھا برسوں کا ساتھ تھا
جیسی وہ ذوالفقار تھی ویسا ہی ہاتھ تھا

فاصر تھے اُن کے عزم جو تھے بانیِ فساد — رشتے تھے قطع اُٹھ گیا تھا اُنس و اتحاد
ہر دم اشارہ کرتی تھی تیغِ ظفر نہاد — سب مجھ کو سرگزشتِ جہادِ علی ہے یاد
ٹکڑے کیا ہے عمر سے نامی نہنگ کو — جھیلے ہوئے ہوں خیبر و خندق کی جنگ کو

جس غول کی طرف وہ سلیماں حشم پھرا — تلوار کا نہ مُنھ نہ فرس کا قدم پھرا
چمکی اُدھر ادھر رخِ اہلِ ستم پھرا — جس صف پہ آئی سطرِ غلط پر قلم پھرا
صحت پہ حرف آگیا مجبور ہوگئے — سر تن سے مثلِ نقطۂ شک دور ہوگئے

وہ ہاتھ کی صفائیاں وہ تیغ کی چمک — ہلتے تھے دل سما سے تزلزل تھا تا سمک
وہ آب و تاب گھاٹ کی وہ باڑھ کی دمک — تھا آبِ شورِ تیغ ہر اک زخم پر نمک
مُنہ اپنے زخم کھولے تھے لطفِ غذا یہ تھا — بسمل بھی ہونٹ چاٹ رہے تھے مزا یہ تھا

رکتی نہ تھی وغا میں کسی درعہ پوش سے — گرتی تھی تیغ ہاتھ سے اور ڈھال دوش سے
کچھ ہو سکا نہ رن میں کسی سرفروش سے — خود حرز بن گئی تھی وہ جوہر کے جوش سے
غل تھا چلی ہے جس پہ وہ دامِ اجل میں ہے — بھاگو دعائے سیفی اسی کی عمل میں ہے

اللہ رے رعب نعرۂ مولائے خوش خصال — لرزاں تھیں برچھیاں قدمِ پیر کے مثال
لپٹی ہوئی تھیں پشت سے ڈھالوں کا تھا یہ حال — تیغوں کے جوہروں سے کھڑے ہوگئے تھے بال
گوشوں کو ڈھونڈھتی تھیں کمانیں مصاف میں — خنجر بھی منہ چھپائے ہوئے تھے غلاف میں

افتادہ تھے زمیں پہ نشانہائے سربلند — لاشوں سے راہ امن و اماں ہوگئی تھی بند
تھرّاتے تھے جو ڈر سے لعینوں کے بند بند — پرچم علم کے کرتے تھے اعدا پہ ریشخند
جب سہم کر قدر انداز روتے تھے — سوفار کے ہنسی سے نہ لب بند ہوتے تھے

ہر دم چمک دمک تھی زیادہ برش مزید — لوہے کو اس کے مان گیا لشکرِ یزید
اس فوج میں بپا تھی جو تھی دہشتِ شدید — نازل اسی کے شان میں ہے سورۂ حدید
سفاک تھی ادا پی ہوئی تھی بدیع تھی — جو عرشِ ذوالجلال سے اتری وہ تیغ تھی

گہ سر پہ گاہ سینے پہ گاہے گلو پہ تھی
دریا پہ تھی نہ اُس کی نظر آبجو پہ تھی
کانوں سروں کو در پئے قتلِ عدو رہوں
کاری جواں سپاہ کے ناکارہ ہوگئے
ٹکڑے کٹی کمانوں کے آوارہ ہوگئے
سر کی وہ جب کہ برچھیوں سے پھل گرا لیے
گر طبع میں کسی کی روانی ہوئی تو کیا
بالفرض قوتِ ہمدانی ہوئی تو کیا
فقروں کا ذوالفقار کے مطلب ادا نہ ہو
پھرتا ہی پتلیوں کے اشاروں پہ راہوار
قربان اس جلال کے اس عزم کے نثار
انگشت مصطفےٰ ہی اُدھر بدر اس طرف
دارالامان کعبۂ نصرت تھی وہ سپر
لاریب فیہ سایۂ رحمت تھی وہ سپر
پرتو فگن تھی یوں کبھی روئے جناب پر
آفت تھی ہر پرے میں لڑائی تھی ہر طرف
روحوں کی قالبوں سے جدائی تھی ہر طرف
دانتوں میں خس پکڑ کے عدو گڑگڑاتے تھے
غل تھا کہ ای نبی کے نواسے اماں اماں
اب روک لے یہ ہاتھ و غا سے اماں اماں
یاں سے خطا اُدھر سے ہمیشہ خطا ہوئی

جوہر کا تھا خیال نگہ آبرو پہ تھی
ہاں تھی اگر تو جنگ میں رغبت ہو پہ تھی
مطلب یہ تھا کہ معرکہ میں سرخرو رہوں
پانچوں حواس سبعۂ سیارہ ہوگئے
پیکان تیر غنچۂ رصد پارہ ہوگئے
خنجر تو کیا تھے تیغوں نے بھی منہ پھرا لیے
کیا کہہ سکے گا تیز زبانی ہوئی تو کیا
مثلِ انیس سحر بیانی ہوئی تو کیا
کٹ جائے ساری عمر تو اُس کی ثنا نہ ہو
اس صف کے بیچ میں ہی کبھی اُس پرے کے پا
اِک ہاتھ میں ہی تیغ سپر اک میں استوار
شمس الضحےٰ اُدھر ہی شب قدر اس طرف
پشت و پناہِ شاہ ولایت تھی وہ سپر
حقا سوادِ اعظم شوکت تھی وہ سپر
آجائے جیسے ابرِ سیہ آفتاب پر
تلوار سے صفوں کی صفائی تھی ہر طرف
پیغمبر خدا کی دوہائی تھی ہر طرف
شقے علم کے ان کی چادر ہلاتے تھے
گرمی میں تین روز کے پیاسے اماں اماں
سید بچا لے قہرِ خدا سے اماں اماں
سمجھے کو ہم نے تیر سے مارا خطا ہوئی

نکلا سپاہ شام سے بل کھاکے ایک گیو
عفریت جس کے ڈر سے کرے دشت میں غریو
بل ابروؤں پہ زخم بدن پر پڑے ہوئے
قامت میں عمرو زور میں مرحب قوی میں دیو
اقلیم مکر و مملکت خدع کا خدیو
اکثر لڑائیوں میں عرب کی لڑے ہوئے

سر میں غرور دل میں بدی طبع میں فساد
شبیر خدا سے بغض دلی آل سے عناد
پیرو تھا شمر کا تو ثنا خوان یزید کا
بدکار و بدمزاج و سلح شور و بدنہاد
کچھ درد دیں نہ رحم نہ ایماں نہ اعتقاد
مرتد مرید خاص تھا دیو مرید کا

غصے میں ابن سعد سے بولا وہ روسیاہ
خود بھاگ گر بتاتا ہے تو بھاگنے کی راہ
کشتی پہ ہو رئیس تو بیشک دغا کریں
نامرد سمجھا اور یہ سالاری سپاہ
فوجوں کا کیا قصور ہے لشکر کا کیا گناہ
سردار پیشہ ہی نہ کرے گر تو کیا کریں

اس سے یہ ڈر جو غم سے ہو خود مرگ کے قریب
محتاج و فاقہ کش وطن آوارہ و غریب
دانا سوائے اشک فشانی ملا نہیں
تنہا نہ کوئی بھائی ہے جس کا نہ اب حبیب
بیکس عزیز مردہ جفا کش بلا نصیب
غربت میں تین روز سے پانی ملا نہیں

بازو شکستہ چھید جگر میں کمر میں خم
اک جان لاکھ تیر پہ تلواریں ایک دم
طاقت نہ قلب میں ہے نہ ہاتوں میں دم ہے
بیٹی کے رانڈ ہونے کا ماتم پسر کا غم
ابتک گرا نہیں یہ تھمے کس طرح قدم
پھر اس پہ الاماں کا ہزاروں میں شور ہے

اس اضطراب میں پسر سعد نے کہا
دعوائے مقابلہ کا اگر ہے تجھے تو جا
قبضے میں اس کے زور خدا کے ولی کا ہے
لشکر کے پاؤں اٹھ گئے میرا قصور کیا
فرزند مرتضیٰ سے کچھ آسان نہیں وغا
تو ہی پناہ مانگ کہ بیٹا علی کا ہے

مغرور نے کہا کہ میں جاتا ہوں دیکھ تو
حیدر کے دل کا خون بہاتا ہوں دیکھ تو
کیا بات ہے شکست ابھی دے کے آؤں گا
میداں میں رستمی جو دکھاتا ہوں دیکھ تو
سر کاٹ کر حسین کا لاتا ہوں دیکھ تو
حمزہ کی ڈھال تیغ علی لیکے آؤں گا

ڈھالا شقی نے باندھ کے کھولا کمند کو
نیچا کیا وہیں سے سنانِ بلند کو
قبضے میں رکھ کے دستِ تعدی پسند کو
کوڑا کیا مثالِ تہمتن سمند کو
بڑھتے ہی اک غریو اٹھا اُس سپاہ سے
مرحب چلا نبرد کو شیرِ اللہ سے

کڑکا کے اپنے گھوڑوں کو گرد آ گئے سوار
تھا بیچ میں وہ اور حسینِ فلک وقار
فخریہ شعر پڑھ کے پکارا وہ نابکار
بسم اللہ اے نبیرۂ محبوبِ کردگار
افراسیاب و رستمِ میدانِ جنگ ہوں
شبیرِ خدا ہیں آپ تو میں بھی پلنگ ہوں

چھپتے تھے اژدہے مری وحشت سے غار میں
تمساح و شیرِ شرزہ جبال و بحار میں
رستم کو باندھ لیتا ہوں میں کارزار میں
سہراب میں یہ زور نہ اسفندیار میں
پھینکا ہے میں نے سامنے برنا و پیر کے
ڈھالوں کو روئیوں کی طرح چیر چیر کے

گیتی کے چار دانگ میں برپا ہے میرا شور
پنجے سے میں نے توڑ دیے سرکشوں کے زور
بہرام ڈر سے کانپ رہا ہے میانِ گور
سیمرغ و فیل دہ پرِ پشہ یہ پاے مور
یاں زال کی نہ کچھ ہے حقیقت نہ گیو کی
تسمے سے باندھ لاتا ہوں گردن کو دیو کی

فرمایا آپ نے یہ تعلی ہے کیا ضرور
چپ رہ کہ تجھ کو پست نہ کر دے ترا غرور
آپ اپنی مدح واہ رے کم ظرف بے شعور
تیرا نہیں یہ فہم غلط بیں کا ہے قصور
دعوے کوئی درست نہیں بے دلیل کے
جوہر کھنچے پہ کھلتے ہیں تیغِ اصیل کے

خوش بو کا اپنی گل نے کیا ہے کبھی بیاں
شیریں ہوں میں شکر کبھی کرتی ہے یہ عیاں
کھلتی ہے آپ مشک کی بو وقتِ امتحاں
کیسا جھکا ہے اتنی بلندی پہ آسماں
سایہ بڑا ہے تجھ سے بگولہ دراز ہے
البتہ خاکسار جو ہے سرفراز ہے

پیدا کیا ہے ایک سے بہتر خدا نے ایک
دارِ فنا میں کوئی جو بد ہے تو کوئی نیک
مانا کہ تو شجاع ہے سب سے فزوں لیک
یہ سر عزیز ہے نہ سرک جا قدم نہ ٹیک
گر پیل ہے تو آگے سلیماں کے مور ہے
اس دستِ رعشہ دار میں حیدر کا زور ہے

جعلی ہے سب یہ لاف وگزاف دروغ گو
او ہرزہ کار جھوٹ نہ بک آبرو نہ کھو
روکے ہیں جس نے فوج کے ریلے ہمیں ہیں وہ
ہم اپنی جراتوں کے گواہوں کو گر بلائیں
خود اپنے پر کٹے ہوے روح الامیں دکھائیں
پتھر پہ جوف نیزۂ حیدر کو دیکھ لے
حملہ کیا یہ سنتے ہی ظلمت نے نور پر
آئی چمک کے تیغ جو اس پرغرور پر
قربان دست تیغ شہ ارجمند کے
خاطی بڑھا کمان کیانی میں رکھ کے تیر
دہنی طرف اڑا جو سمند فلک سریر
جوہر عجیب قطع کے اس کی زباں میں تھے
کعبہ ادھر تھا جلوہ نما اور ادھر کنشت
نیزے کی ڈانڈ پہ جو رکھا اس نے دست زشت
ششدر رہی وہ فوج جو محو نظارہ تھی
پھر گرز گاو سر کو اٹھایا شریر نے
روکی وہ ضرب ڈھال پہ اس قلعہ گیر نے
ظالم کے ہوش سر سے اڑے کچھ نہ بن پڑی
دہنے میں لیکے تیغ کے ساتھ آپ نے سپر
گویا در آئی ناخن گیرائے شیر نر
عاجز تھا ہر طرح وہ حسین دلیر سے

افسانہ جانتے ہیں اسے ہیں شجاع جو
مشہور ہے کہ ایک پہ بھاری ہیں ان میں دو
لڑتے ہیں لاکھ سے جو اکیلے ہمیں ہیں وہ
قرآن لیکے عرش سے قدسی زمیں پہ آئیں
بزدل جو ہیں وہ شیروں کی نظروں میں کیا سمائیں
کھل جائے گا ابھی در خیبر کو دیکھ لے
پھینکی کمند آنکھ بچا کر حضور پر
گویا کہ برق کوند گئی کوہ طور پر
کٹ کر اسی پہ جا پڑے حلقے کمند کے
چلے کو کھینچ لایا بنا گوش تک شریر
حلقے کے بیچ میں تھی زہے تیغ بے نظیر
چلہ نہ تیر میں تھا نہ گوشے کماں میں تھے
دوزخ تھا اس لعین کی طرف اس طرف بہشت
چمکی نئے طریق سے تیغ قضا سرشت
راہیں بھی سب تھیں قطع سناں بھی دو پارہ تھی
لی ہاتھ میں سپر شہ گردوں سریر نے
گویا دکھایا زور جناب امیر نے
ہاں ہاتھ کج ہوا نہ جبیں پر شکن پڑی
جھٹکا دیا جو گرز کو بائیں سے تھام کر
دست لعیں سے چھوٹ گیا گرز گاو سر
یہ گاو زوریاں کہیں چلتی ہیں شیر سے

فرمایا خود سری نے تجھے کر دیا ہی کور — دیکھا ہمارے بازوے زخمی کا تو نے زور
قوت وہ دے تو فیل کو پامال کر دے مور — بیجا تھا یہ غرور یہ نخوت یہ زور و شور
انکار تیغ برق تجلی نہ کیجیو — توبہ کر اب کلام تعلی نہ کیجیو

مغرور نے حسام کو کھینچا مثال سام — منہ کھولے اژدہے کی طرح رہ گیا تمام
میدانیوں میں غل تھا کہ ہی روز ننگ و نام — ہاں اب اڑادے جان کو ای پہلوان شام
گو بن کے چند بار لڑائی بگڑ گئی — سکہ ہی پھر ترا جو کوئی ضرب پڑ گئی

ای شہسوار ملک سخن صفدری دکھا — گیتی کو زلزلہ ہو وہ زور آوری دکھا
جمعیت سپاہ کی پھر ابتری دکھا — ہاں زور و شور معرکہ حیدری دکھا
کٹ جائیں رنگ سینۂ اعدا فگار ہوں — پڑھنے میں دونوں لب جو کھلیں ذوالفقار ہوں

گھوڑا ہو واں جہاں نہ رسائی ہوا کی ہو — جو نکلے منہ سے لفظ وہ قدرت خدا کی ہو
مصرع ہر ایک تیغ شہ لافتا کی ہو — جو چوٹ ہو بدھی ہوئی مشکل کشا کی ہو
نقشا ہو صاف تیغ علی کی صفائی کا — دکھلا دوں ہر ورق میں مرقع لڑائی کا

یوں کوند کوند کر صف اعدا پہ آ جائے — ہر استخواں کو مثل ہما تیغ کھائے جائے
جب تک کہ دم ہی خون کا دریا بہائے جائے — نے جوہروں کو جوہر ذاتی دکھائے جائے
غل ہو نزاع اٹھ گئی فتنہ فرو ہوا — ٹکڑے گریں زمیں پہ تو جانے کہ دو ہوا

ای تیغ آبدار زباں اور تیز ہو — سر گرم کشت و خون و قتال و ستیز ہو
دریا لہو کا وادی ہنگامہ خیز ہو — لگ جائے آگ دشت میں یوں شعلہ ریز ہو
کوثر علی سے پاؤں گا حلہ بتول سے — ہاں جنگ فتح کر کے صلہ لوں رسول سے

جب حکم ہو کہ مانگ لے کیا مانگتا ہی تو — گر کر کہوں قدم پہ کہ دنیا میں آبرو
ارشاد اگر ہوا و رہبی کوئی ہی آرزو — اس دم کروں یہ عرض کہ یا شاہ نیکخو
سب کچھ ہی اختیار شہ مشرقین ہیں — مسکن جناں میں قبر جوار حسین میں

مرحب اُدھر ہے شبیر کا فرزند اس طرف
عمر اُس طرف ہے نبی کا جگر بند اس طرف
اُس سمت ہے غلام خداوند اس طرف
کلمے غرور کے ہیں اُدھر پند اس طرف
ناصر کہاں عزیزوں کی لاشیں بھی وہیں
تلوار ہے سپر ہے فرس ہے حضور ہیں

گھوڑے کو اُس نے گشت پہ ڈالا دُور دُور
کس غیظ سے ہلانے لگا سیف بے شعور
سن سن ہوا یہ ہاتھ لگا کر وہ پر غرور
ایناں بتا رہا تھا وہیں سے سوئے حضور
جب اُس کے ساتھ کے سفہا غل مچاتے تھے
رہ رہ کے قبلۂ دو جہاں مسکراتے تھے

تعریف بے محل نے بڑھایا جو اُس کا دل
گھوڑا اُڑا کے آگیا حضرت کے متصل
دونوں طرف سے چلنے لگے وار جاں گسل
تیغوں کی برق و شرق سے بجلی ہوئی خجل
عبرت ہوئی کہ خون شجاعوں کے گھٹ گئے
ڈھالوں کے پرزے اُڑ گئے دستانے کٹ گئے

ٹوٹی وہ تیغ ادھر یہ چمک کر اُدھر گئی
پستی سے یہ پھری تو وہ بالائے سر گئی
بجلی سی کوند کر یہ بڑھی وہ ٹھہر گئی
ندی تھی ایک دم میں چڑھی اور اُتر گئی
آنچ اس کے تیوروں کو شقی کے جلاتی تھی
اُس تیغ کی ہوا بھی یہاں پر نہ آتی تھی

سیماب تھی ہوا تھی چھلاوا تھی راہوار
اُس کو نہ چین تھا نہ اسے ایک جا قرار
قربان ذوالجناح شہنشاہِ نامدار
جاتا تھا یوں حریف کے گھوڑے پہ بار بار
جس طرح جائے شیر گرسنہ غزال پر
ہر بار تھیں کلائیاں گھوڑے کے یال پر

ملتی ہوئی کنوتیاں لال آنکھیں منہ میں کف
بجلی سا اس طرف تھا کبھی گاہ اُس طرف
حیراں تھی اس کی تیز روی پر اُدھر کی صف
نتھنوں سے تھی نفس کی صدا یا شہِ نجف
ظالم سے معرکہ جو پڑا تھا لڑائی کا
مطلب یہ تھا کہ وقت ہے مشکل کشائی کا

گھوڑا کبھی نہ پھول کی جس پر چھڑی پڑی
کھولی گرہ وہ تیغ نے جب پھلجھڑی پڑی
ضرب اُس کی جو پڑی وہ زرہ پر کڑی پڑی
فوجوں میں شور تھا کہ لڑائی بڑی پڑی
قوت علی کی ہاتھ میں ہے اس دلیر کے
کیونکر بچائیں صید کو پنجے سے شیر کے

تلوار ادھر جھک کے چلی آنکھ ادھر لڑی — پتلی سے پتلی اور نظر سے نظر لڑی
آری تھی وہ جو تیغ سے تیغِ دو سر لڑی — آپ اس قدر بڑھی کہ سپر سے سپر لڑی
ظالم کے سر پہ تیغ کا قبضہ جو پھر پڑا — جھچکا تو خود فرقِ ستم گر سے گر پڑا

بولے یہ مسکرا کے حسین فلک حشم — تھا وار سرسری سرو گردن کو کر نہ خم
جھک کر اٹھالے خود جو ہے سرزنش کا غم — سر جنگ ہو چلی نہ اٹھانا بس اب قدم
آجم کے لڑکہ ہم بھی تو دیکھیں ہنر ترا — بھاگا تو پاؤں گھوڑے کے ہوں گے نہ سر ترا

کھینچی جو اس نے باگ سمٹنے لگا سمند — سمجھے امام پاک کہ بھاگا یہ خود پسند
گر یوں نکل گیا تو کہینگے یہ ہوشمند — کس فکر میں تھے شاہ عدو گیر و صید بند
نے زخم کھائے صاف جفا جو نکل گیا — پنجے میں آکے شیر کے آہو نکل گیا

مغفر اٹھا کے تیغ سے بولے امام دیں — لے جنگ سر ہی فرق پہ رکھ خودِ آہنیں
شہ کی طرف اٹھا کے بصد غیظ تیغ کیں — مغفر کو بائیں ہاتھ سے لینے لگا لعیں
دیتے ہی خود دست مبارک جو مڑ گیا — مغفر تو ہاتھ میں رہا سر تن سے اڑ گیا

پستی میں آئی بڑھ کے جو وہ تیغ پر شرر — گھوڑے کے پاؤں کٹ گئے مثل خیار تر
اسوار جو کھڑے تھے وہ بھاگے ادھر ادھر — پھر پھر کے اضطراب میں کہتے تھے اہل شر
بھاگو جلا نہ دے کہیں آنچ اس کی دھار کی — بجلی چھپا کیے ہوئے ہے چمک ذوالفقار کی

فاقے میں دیر تک جو لڑے شاہ تشنہ کام — غرق عرق تھے کانپ رہا تھا بدن تمام
ہاتوں سے چھوڑ دی تھی جو رہوار کی لگام — آنکھیں تھیں بند ہانپتا تھا اسپ تیز گام
غش میں سوارِ دوشِ نبی کا یہ حال تھا — نے تھامے خود فرس سے اترنا محال تھا

دیکھا جو یہ کہ بھاگ گئے رن سے حیلہ ساز — تلوار رکھ کے میان میں بولے شہ حجاز
مہلت ہے اے حسین پڑھو عصر کی نماز — یہ آخری ہے بندگی رب بے نیاز
فکر نجات امت خیر البشر کرو — سوکھی زباں کو ذکر الٰہی میں تر کرو

ناگاہ سوئے لاشِ پسر جا پڑی نظر
چلائے دل کو تھام کے سلطانِ بحر و بر
اکبر اٹھو کہ گھوڑے سے گرتا ہے اب پدر
سوتے ہو تم دھرے ہوئے رخسار خاک پر
بھولے پدر کو نیند میں قربان آپ کے
آؤ نماز عصر پڑھو ساتھ باپ کے

سب بیٹے ہو تم امام کے پوتے امام کے
کام آؤ مرتے دم پدرِ تشنہ کام کے
آتے ہیں پھر پلٹ کے پرے فوجِ شام کے
اٹھلا دو قبلہ رو مرے ہاتوں کو تھام کے
جاتی رہی نماز بھی اعدا جو پھر پڑیں
رعشہ ہے خود فرس سے جو اتریں تو گر پڑیں

عباس نامدار ترائی سے اٹھ کے آؤ
دکھتا ہے قلب جل رہے ہیں سب جگر کے گھاؤ
چھڑکو مری زرہ پہ جو پانی کہیں سے پاؤ
چلتے ہوئے عدم کے مسافر سے مل تو جاؤ
ہم سب کے کام آئے ہیں بیٹھے ہیں روئے ہیں
بارہ پہر ہوئے کہ نہ لیٹے نہ سوئے ہیں

کیا باوفا یہ سرد ترائی ہے اب اٹھو
ہم جاں بلب ہیں ختم لڑائی ہے اب اٹھو
نرغے میں فوجِ ظلم کے بھائی ہے اب اٹھو
عباس دھوپ چہرے پہ آئی ہے اب اٹھو
غفلت کی تم کو نیند ہے شبیر کیا کرے
میری طرح کسی کو نہ بیکس خدا کرے

تم جب سے چھوٹے ساعد و بازو میں درد ہے
گردن میں سر میں آنکھ میں ابرو میں درد ہے
دل میں کمر میں سینے میں پہلو میں درد ہے
رگ رگ میں کیا ہر ایک بن مو میں درد ہے
ہر مرتبہ لڑے ہیں لہو میں نہائے ہیں
پیری میں نوجوانوں کے لاشے اٹھائے ہیں

چلایا فوج کو پسرِ سعدِ نابکار
لو رکھ لی میان میں شہ والا نے ذوالفقار
پلٹے پرے سواروں کے لیکر رسالہ دار
دو غول باندھے آئے کماندار دس ہزار
تیر افگنوں میں تیغوں میں بھالوں میں گھر گئے
تنہا حسین برچھیوں والوں میں گھر گئے

فریاد ہے وہ فوج کا دل اور اک حسین
وہ بے شمار تیغوں کے پھل اور اک حسین
وہ تیر جانستاں وہ جدل اور اک حسین
وہ سیکڑوں پیام اجل اور اک حسین
فوجوں میں شام کی مہِ تاباں گھرا ہوا
بیکس بھی وہ کہ جس سے زمانہ پھرا ہوا

ڈوبے ہوئے تھے خون میں گیسو حسین کے
آنکھوں پہ کٹ کے آپڑے ابرو حسین کے

زخمی ہیں دونوں ساعد و بازو حسین کے
تیروں نے چھان ڈالے تھے پہلو حسین کے

تیغیں ادھر ہی ہوئیں جو برابر سے چل گئیں
غش آگیا قدم سے رکابیں نکل گئیں

سبطؐ کے مرتبے کو نجانا ہزار حیف
تیروں سے صدر پاک کو چھانا ہزار حیف

شانے تھے ناوکوں کا نشانا ہزار حیف
مظلوم کو وہ برچھیاں کھانا ہزار حیف

ٹوٹے تھے سب رسول کے پیارے حسین پر
کیا وقت پڑ گیا تھا تمھارے حسین پر

گرتے ہیں آپ کون سنبھالے کوئی نہیں
سینے سے کون تیر نکالے کوئی نہیں

بیجان پڑے ہیں گود کے پالے کوئی نہیں
سب مر چکے ہیں چاہنے والے کوئی نہیں

بیکس ہیں اور سامنا فوجِ عدو کا ہے
منہ جس کا دیکھتے ہیں وہ پیاسا لہو کا ہے

کیونکر کہوں کہ عرشِ خدا خاک پر گرا
خیر النسا کا ماہ لقا خاک پر گرا

سرتاجِ بادشاہ و گدا خاک پر گرا
زیں سے الٹ کے راہ نما خاک پر گرا

وہ دو ہزار زخم تنِ چاک چاک پر
کیا گزری ہوگی جبکہ گرے ہونگے خاک پر

ٹکڑے جدا ہیں حال یہ ہے تن کا ہے غضب
اب مرحلہ ہے خنجر و گردن کا ہے غضب

پانی کا واں ہے کام کہ آہن کا ہے غضب
لو سامنا ہے شمر سے دشمن کا ہے غضب

اس کے شریکِ ذبح میں بارہ شریر ہیں
یاں اک گلا ہے جس پہ کئی زخمِ تیر ہیں

فضہ نے جا کے خیمے میں رانڈوں کو دی خبر
ہے ہے مرے شہزادہ کا کٹتا ہے تن سے سر

بستر سے اٹھ کے گر پڑے سجادِ نوحہ گر
خیمے سے نکلیں بیبیاں بچوں کو چھوڑ کر

گر گر کے دوڑتی تھیں کہ مل لوں حسین سے
ہلتا تھا عرش حضرتِ زینب کے بین سے

مانند آفتاب لرزتا تھا جسمِ پاک
جائیں کدھر وہ فوج وہ صحرائے ہولناک

سر پر عصا یہ پاؤں میں موزے ردا پہ خاک
لٹکے ہوئے تھے دونوں طرف پیرہن کے چاک

عابد کا نورِ عین ردا تھامے ساتھ تھا
اک ہاتھ میں یتیم سکینہ کا ہاتھ تھا

چلاتی تھی ارے مرا بھائی ہی کس طرف
لوٹی ہوئی علی کی کمائی ہی کس طرف
دریا کدھر ہی خوں کا ترائی ہی کس طرف
سونے کی جا حسین نے پائی ہی کس طرف
رستا دے ای زمین کہ فلک کی ستائی ہوں
میں اپنے پیارے بھائی سے ملنے کو آئی ہوں

ریتی پہ مصطفےٰ کے جگر کا لہو گرا
ای آسماں زمین پہ ابتک نہ تو گرا
سید گرا امام گرا نیک خو گرا
وہ کعبۂ زمین و زماں قبلہ رو گرا
تاب اُٹھنے بیٹھنے کی کہاں ہاتھ پاؤں میں
شاید نماز پڑھتے ہیں تیغوں کی چھاؤں میں

میں سیدہ ہوں رحم مری بیکسی پہ کھاؤ
ای اہل قریہ بنت نبی کی مدد کو آؤ
دنیا میں تم خوشی رہو عقبیٰ میں چین پاؤ
سید کدھر ہی خون میں غلطاں مجھے بتاؤ
یاں لٹ گئے فلک نے یہ دُکھ ہم پہ ڈالے ہیں
ای بھائیو مدینے کے ہم رہنے والے ہیں

آتی تھی جس میں وحی وہ گھر ہی ہمارا گھر
علم نبی کے شہر کا در ہی ہمارا گھر
تاروں میں برج شمس و قمر ہی ہمارا گھر
تیغ عذاب حق کی سپر ہی ہمارا گھر
عالم ہی بر خلاف وطن ہم سے چھٹ گیا
ہی ہی وہی بھرا ہوا گھر آج لٹ گیا

بے خانماں ہی تشنہ دہن ہی غریب ہی
بیکس ہی داغ دیدہ ہی آفت نصیب ہی
اب دوست ہی کوئی نہ کوئی اب حبیب ہی
اپنے وطن سے دور ہی تم سے قریب ہی
تم سب کو پاس چاہیے اس ذی وقار کا
خادم ہی ہی تمھارے نبی کے مزار کا

ای قبر مصطفےٰ کے مجاور ترے نثار
ای بیکس و غریب و مسافر ترے نثار
ای تشنہ کام و صابر و شاکر ترے نثار
ای دین حق کے حامی و ناصر ترے نثار
آئے تھے کربلا میں شہادت کے واسطے
اک دن میں گھر لٹا دیا اُمت کے واسطے

صدقے میں تیری لاش کے ای گلبدن حسین
ای تشنہ لب حسین غریب الوطن حسین
ای جان بلب حسین امام زمن حسین
ای فاقہ کش حسین اسیر محن حسین
پیاسے گلے سے خنجر شمر لعیں ملا
پانی بھی مرتے وقت ملا یا نہیں ملا

شہ کے کراہنے کی جو آنے لگی صدا ۔۔۔ دوڑی اُدھر نبی کی نواسی برہنہ پا
دیکھا بہن نے بھائی کا کٹتے ہوئے گلا ۔۔۔ غم سے کلیجہ پھٹ گیا زہرا کی جائی کا
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے گری بنتِ مرتضیٰ ۔۔۔ اس نے تو دیکھا نیزے پہ سر اپنے بھائی کا
بس ہے انیس قلب و جگر کو نہیں قرار ۔۔۔ آگے نہ لکھ مصیبتِ شبیرِ نامدار
یہ بزم اور یہ آج کا پڑھنا ہے یادگار ۔۔۔ رعشہ ہے دست و پا میں لرزتا ہے جسمِ زار
وہ یوں پڑھے جسے نہ ہو طاقت کلام کی ۔۔۔ تائید ہے حسین علیہ السلام کی

رُباعی

شمعوں کی طرح دلوں کو جلتے دیکھا ۔۔۔ آہوں کا دھواں منہ سے نکلتے دیکھا
افسوس کہ میداں میں بنی قاسم نے ۔۔۔ دیکھا جسے اس کو ہاتھ ملتے دیکھا

رُباعی

کس غم میں یہ لذت ہے جو اس غم میں ہے ۔۔۔ سینے کو سرورِ شہ کے ماتم میں ہے
ہر چشم یہ کہتی ہے دکھا کر دُرِ اشک ۔۔۔ رونے کا مزا ماہِ محرم میں ہے

مرثیہ (۱۸)

کیا زخم ہے وہ زخم کہ مرہم نہیں جس کا
کیا درد ہے جز دل کوئی محرم نہیں جس کا
کیا داغ ہے جلنا کوئی دم کم نہیں جس کا
کیا غم ہے کہ آخر کبھی ماتم نہیں جس کا
کس داغ میں صدمہ ہے فراق تن و جاں کا
وہ داغ ضعیفی میں ہے فرزند جواں کا

جب باغ جہاں اکبر ذی جاہ سے چھوٹا
پیری میں برابر کا پسر شاہ سے چھوٹا
فرزند جواں ابن ید اللہ سے چھوٹا
کیا اختر خورشید لقا ماہ سے چھوٹا
تصویر غم و درد سراپا ہوئے شبیر
ناموس میں ماتم تھا کہ تنہا ہوئے شبیر

ہے ہے علی اکبر کا اُدھر شور تھا گھر میں
اندھیر تھی دنیا شہ والا کی نظر میں
فرماتے تھے سوزش ہے عجب داغ پسر میں
اُٹھتا ہے دھواں آگ بھڑکتی ہے جگر میں
پیغام اجل اکبر ناشاد کا غم ہے
عاجز ہے بشر جس سے وہ اولاد کا غم ہے

اُس گیسوؤں والے کے بچھڑ جانے نے مارا
افسوس بڑھا ضعف گھٹا زور ہمارا
دنیا میں محمد کا یہ ماتم ہے دوبارا
عالم سے عجب جان جہاں آج سدھارا
چادر بھی نہیں لاشۂ فرزند حسیں پر
کس عرش کے تارے کو سلا آئے زمیں پر

پیری پہ مری رحم کر اے خالق ذوالمنن
طے جلد ہو اب مرحلۂ خنجر و گردن
قتل علی اکبر کی خوشی کرتے ہیں دشمن
تجھ پر مرے اندوہ کا سب حال ہے روشن
مظلوم ہوں مجبور ہوں مجروح جگر ہوں
تو صبر عطا کر مجھے یارب کہ بشر ہوں

پھر لاشۂ اکبر نظر آئے تو نہ روؤں
برچھی جو کلیجے میں در آئے تو نہ روؤں
دل درد محبت سے بھر آئے تو نہ روؤں
سو بار جو منہ تک جگر آئے تو نہ روؤں
شکوہ نہ زباں سے غم اولاد میں نکلے
دم تن سے جو نکلے تو تری یاد میں نکلے

اک عمر کی دولت تھی جسے ہاتھ سے کھویا
ہر وقت رہا میں تری خوشنودی کا جویا
پالا جسے گودی میں وہ یوں خاک پہ سویا
میں لاش پہ بھی خوف سے تیرے نہیں رویا
قسمت نے جوانوں کو سبکدوش کیا ہے
مجھکو تو اجل نے بھی فراموش کیا ہے

اس حال سے روتے ہوئے داخل ہوئے گھر میں
تر تھی تنِ انور کی قبا خونِ پسر میں
سوزش دلِ پُرداغ میں ہے درد جگر میں
خم آگیا تھا بارِ مصیبت سے کمر میں
پنہاں تھا جو فرزندِ جگربند نگہ سے
موتی رُخِ انور پہ ٹپکتے تھے مژہ سے

بانو سے کہا روکے خوشا حال تمھارا
صرفِ رہِ معبود ہوا مال تمھارا
مقبول ہوئی نذر یہ اقبال تمھارا
سجدے کرو پروان چڑھا لال تمھارا
دل خوں ہے کلیجے میں سناں کھا کے بھرے ہیں
ہم اُس کی امانت اُسے پہونچا کے چلے ہیں

جیتے تھے تو آخر علی اکبر کبھی مرتے
گر بیاہ بھی ہوتا تو زمانے سے گزرتے
سینے سے کلیجے کو جدا ہم جو نہ کرتے
بگڑے ہوئے اُمت کے نہ پھر کام سنورتے
گر حلق سے اُس شیر کے شمشیر نہ ملتی
یہ اجر نہ ہاتھ آتا یہ توقیر نہ ملتی

اکبر نے تو جاں اپنی جوانی میں گنوائی
تھی کونسی ایذا جو نہ اُس لال نے پائی
افسوس کہ پیری میں ہمیں موت نہ آئی
تلوار نہ سر پر نہ سناں سینے پہ کھائی
غم کھائینگے خونِ دلِ مجروح پئینگے
کیا زور ہے جب تک وہ جلائے گا جئینگے

دستور ہے مرتا ہے پدر آگے پسر کے
پہلے وہ اُٹھے تھامنے والے تھے جو گھر کے
اب کون اُٹھائے گا جنازے کو پدر کے
افسوس لحد بھی نہ ملے گی ہمیں مر کے
سر نیزے پہ اور دشت میں تن ہوگا ہمارا
خاک اُڑ کے پڑے گی بے کفن ہوگا ہمارا

زینب سے کہا رختِ کہن لاؤ تو پہنیں
ملبوس شہنشاہِ زمن لاؤ تو پہنیں
موت آگئی اب سر پہ کفن لاؤ تو پہنیں
کپڑے جو پھٹے ہوں وہ بہن لاؤ تو پہنیں
سرکٹ کے جو تن وادیٔ پُرخار میں رہ جائے
شاید یہی پوشاک تنِ زار میں رہ جائے

اللہ نے بچپن میں مرے ناز اٹھائے — طفلی میں کسی نے شرف ایسے نہیں پائے
عریاں تھا کہ جبریل امیں عرش سے آئے — فردوس کے حلّے مرے پہنانے کو لائے
بیکس ہوں دل افگار ہوں آوارہ وطن ہوں — میں ہوں وہی شبیر کہ محتاج کفن ہوں

ناشاد بہن پاؤں پہ گر کر یہ پکاری — ماں جائے برادر تری غربت کے میں واری
بن بھائی کی ہوتی ہے یہ اللہ کی پیاری — گھر لٹ گیا کیونکر نہ کروں گریہ و زاری
رونے کو بہن تک بھی کھلے سر نہ گئی ہیں — خالی یہ بھرا گھر ہوا اور مر نہ گئی میں

بچپن تھا کہ اماں سے ہوئی پہلے جدائی — نانا کے لیئے ماتمی صف میں نے بچھائی
روتی تھی پدر کو کہ سفر کر گئے بھائی — یثرب بھی چھٹا دیس سے پردیس میں آئی
غم دیکھوں بڑے بھائی کا ماں باپ کو روؤں — قسمت میں یہ لکھا تھا کہ میں آپ کو روؤں

فرمایا کہ دنیا میں نہیں موت سے چارا — رہ جاتے ہیں ماں باپ بچھڑ جاتا ہے پیارا
ہجر علی اکبر تھا کسی کو بھی گوارا — وہ مر گئے اور کچھ نہ چلا زور ہمارا
دیکھا جسے آباد وہ گھر خاک بھی دیکھو — اب خاتمہ پنجتن پاک بھی دیکھو

کس کس کی نہ دولت پہ زوال آگیا زینب — پابند رضا تھا تو شرف پا گیا زینب
دنیا سے گیا جو تن تنہا گیا زینب — کھلنا نہیں وہ پھول جو مرجھا گیا زینب
جو منزل ہستی سے گیا پھر نہیں ملتا — یہ راہ وہ ہے جس کا مسافر نہیں ملتا

میں کون ہوں اک تشنہ لب و بیکس و محتاج — بندہ تھا خدا کا سو ہوا ہوں میں طلب آج
وہ کیا ہوئے جو لوگ تھے کونین کے سرتاج — نہ حیدر کرار ہیں نہ صاحب معراج
کچھ پیٹنے رونے سے نہ ہاتھ آئے گا زینب — آیا ہے جو اس دہر میں وہ جائے گا زینب

کس طرح وہ بیکس نہ اجل کا ہو طلبگار — ناصر نہ ہو جس کا کوئی دنیا میں نہ غمخوار
اک جان حزیں لاکھ مصیبت میں گرفتار — اکبر ہیں نہ قاسم ہیں نہ عباس علمدار
کوشش ہے کہ سجدہ تہ شمشیر ادا ہو — تنہائی کا مرنا ہے خدا جانیے کیا ہو

قاتل جو چھری خشک گلے پر مرے پھیرے
کٹنے میں رگوں کے یہ سخن لب پہ ہو میرے
بہنوں کی نہ ہو فکر نہ بچوں کی خبر ہو

فرما کے یہ ہتھیار سجے آپ نے تن پر
احمد کی قبا آپ نے پہنی جو کفن پر
اللہ ری خوشبو تنِ محبوب خدا کی

وہ پھول سے رخسار گلابی وہ عمامہ
وہ زرد عبا نور کی وہ نور کا جامہ
کپڑے تنِ گلرنگ کی خوشبو سے بسے تھے

شمشیرِ ید اللہ لگائی جو کمر سے
سمجھاتے ہوئے سب کو چلے آپ جو گھر سے
اُس غل میں جدا شہ سے نہ ہوتی تھی سکینہ

شہ کہتے تھے بی بی ہمیں رو کر نہ رلاؤ
وہ کہتی تھی ہمراہ مجھے لیلو تو جاؤ
نیند آئے گی جب آپ کی بو پاؤنگی بابا

فرمایا نکلتی ہیں سیدانیاں باہر
وہ کہتی تھی سوئینگے کہاں پھر علی اصغر
شب ہووے گی اور دشت میں ہم ہونگے بی بی

وہ کہتی تھی بس دیکھ لیا آپ کا بھی پیار
اچھا نہ اگر کیجئے جلد آنے کا اقرار
کیسی ہیں یہ باتیں مرا دل روتا ہے بابا

خالص یہ ہے نیت کوئی تدبیر نہ گھیرے
قربان حسین ابن علی نام پہ تیرے
اس صبر سے سر دوں کہ مہم عشق کی سر ہو

غل پڑ گیا شاہِ شہدا چڑھتے ہیں تن پر
پیدا ہوا اک جلوۂ نو رختِ کہن پر
پھولوں کی مہک آگئی کلیوں سے قبا کی

تعریف میں خود جس کی سرافگندہ ہے خامہ
برسوں جو لکھیں ختم نہ ہو مدح کا نامہ
ٹوپی کرامت کی شفاعت پہ کسے تھے

سر پیٹ کے زینب نے ردا پھینکدی سر سے
بچوں کی طرف تکتے تھے حسرت کی نظر سے
پھیلائے ہوئے ہاتھوں کو روتی تھی سکینہ

پھر پیار کریں ہم تمھیں منھ آگے تو لاؤ
میں کیا کروں میداں میں اگر جا کے نہ آؤ
میں رات کو مقتل میں چلی آؤنگی بابا

چھاتی پہ سلائینگی تمھیں بات کو مادر
فرماتے تھے بس ضد نہ کرو صدقے میں تم پر
اصغر مرے ساتھ آج وہیں سوئینگے بی بی

میں آپ سے بولوں گی نہ اب یا شہِ ابرار
مر جائے گی اس شب کو تڑپ کر یہ دلِ افگار
گھر چھوٹ کے جنگل میں کوئی سوتا ہے بابا

اصغر بھی ساتھ آپ کے اب تک نہیں سوئے — بہلا لیا اماں نے اگر چونک کے روئے
شفقت تھی مجھی پر کہ یہ نے چین نہ ہوئے — یہ پیار ہو جس پر اسے یوں ہاتھ سے کھوئے
جیتے رہیں فرزند کہ سب سخت جگر ہیں — میں آپ کی بیٹی ہوں وہ اماں کے پسر ہیں

شہ کہتے تھے صدمہ دلِ مضطر پہ ہے بی بی — ہفتم سے تباہی ہے سب گھر پہ ہے بی بی
اعدا کی یورش سبطِ پیمبر پہ ہے بی بی — جس نے تمھیں پیدا کیا وہ سر پہ ہے بی بی
چھوٹے نہ وہ جو صبر کا جادہ ہے سکینہ — ماں باپ سے پیار اُس کا زیادہ ہے سکینہ

لو روؤ نہ اب صبر کرو باپ کی جانی — کچھ دیتی ہو عباس کو پیغام زبانی
اودے ہیں لبِ لعل یہ ہے تشنہ دہانی — ملتا ہے تو بی بی کے لیے لاتے ہیں پانی
محبوب الٰہی کے نواسے ہیں سکینہ — ہم بھی تو کئی روز کے پیاسے ہیں سکینہ

دنیا ہے یہ شادی ہے کبھی اور کبھی آلام — راحت کی کبھی صبح مصیبت کی کبھی شام
یکساں نہیں ہوتا کبھی آغاز کا انجام — وہ دن گئے کرتی تھیں جو اس چھاتی پہ آرام
ضد کرکے نہ اب رات کو رویا کرو بی بی — جب ہم نہ ہوں تم خاک پہ سویا کرو بی بی

سمجھا کے چلے آپ سکینہ کو غش آیا — غل تھا کہ اُٹھا سر سے شہنشاہ کا سایا
ڈیوڑھی سے جو نکلا اسداللہ کا جایا — رہوارِ سبک سیر کو روتا ہوا پایا
کس عالمِ تنہائی میں سیّد کا سفر تھا — بھائی نہ بھتیجا نہ ملازم نہ پسر تھا

سائے کی طرح جو نہ جدا ہوتی تھی دم بھر — وہ رات کی جاگی ہوئی سوتی ہے زمیں پر
گردوں کی طرف دیکھ کے فرماتے تھے سرور — تو سر پہ ہے تنہا نہیں فرزند پیمبر
کچھ کام نہ اس بیکس و ناشاد سے ہوگا — جو ہوگا وہ مولا تری امداد سے ہوگا

فرما کے یہ مولا جو قریبِ فرس آئے — نصرت کو صفیں باندھے ملک پیش و پس آئے
فریاد کناں جن بھی مثال جرس آئے — جنگل سے ہٹے پانچ جو دستے تو وہیں آئے
ڈھالیں لیے سب ہاتھوں کو قبضوں پہ دھرے تھے — لشکر سے جنوں کے بھی کئی دشت بھرے تھے

تھی قوم نبی جان بھی سرداری کو حاضر
فوجوں کے طلاے تھے خبرداری کو حاضر
لشکر تھا فرشتوں کا جگرداری کو حاضر
جبریل تھے خود غاشیہ برداری کو حاضر
تو لے ہوئے نیزوں کو لڑائی پہ تلے تھے
رہوار تو ابلق تھے علم سبز کھلے تھے

اصرار کیا سب نے پہ حضرت نے نہ مانا
جز حق مددِ غیر کو رد کرتے ہیں دانا
وہ شاہ کہ جس کے یدِ قدرت میں زمانا
کون آیا گیا کون یہ مطلق بھی نہ جانا
بندہ وہی بندہ ہے جو راضی ہو رضا پر
اوروں سے اسے کیا جسے تکیہ ہو خدا پر

کی عرض ملائک نے کہ یا سیّد ابرار
ہم آپ کے نانا کی مدد کرتے تھے ہر بار
فرمایا وہ خواہاں تھے کہ مغلوب ہوں کفّار
میں اپنی شہادت کا خدا سے ہوں طلبگار
جان آج ہماری کسی صورت نہ بچے گی
بالفرض بچا میں تو پھر امت نہ بچے گی

زعفر نے یہ کی عرض بصد اشک فشانی
ہو حکم تو لے آؤں ابھی نہر سے پانی
کچھ کام تو لے ای اسداللہ کے جانی
فرمایا کہ مطلق نہیں اب تشنہ دہانی
دریا جو خود آئے گا تو لب تر نہ کرونگا
احمد کا نواسا ہوں تو پیاسا ہی مرونگا

جس وقت فلک پر ہو عیاں ماہ محرم
ہر تعزیہ خانے میں بپا ہو میرا ماتم
جو بیبیاں ہیں روئیں گھروں میں مجھے باہم
مردوں میں یہ ہو شور کہ ہے ہے شہ عالم
سب پیر و جواں روئیں یہ انجام ہو میرا
مظلوم حسین ابن علی نام ہو میرا

دنیا میں مرے گا جو کسی شخص کا بھائی
یاد آئے گی عباس کی اور میری جدائی
جان اپنی بھتیجے نے کسی کے جو گنوائی
روئے گا کہ قاسم نے سناں سینہ پہ کھائی
اولاد کا ماتم جسے ناشاد کرے گا
اکبر کے جواں مرنے کو وہ یاد کرے گا

دس روز شب و روز ہو غل ہائے حسینا
صدقے ترے ای فاطمہ کے جائے حسینا
زخم تبر و تیر و سناں کھائے حسینا
سب پانی پئیں اور نہ تو پائے حسینا
جب پانی پئیں اشک فشانی کو نہ بھولیں
بچے بھی میری تشنہ دہانی کو نہ بھولیں

زینب نے پکارا میرے ماں جائے برادر
ناشاد بہن لینے رکاب آئے برادر
اب کوئی مددگار نہیں ہائے برادر
صدقے ہو بہن گر کہیں پھر پائے برادر
غش آئے گا دو گام پیادہ جو بڑھو گے
اس ضعف میں رہوار پہ کس طرح چڑھو گے

حضرت نے صدا دی کہ نہ خواہر نہ نکلنا
جب تک کہ میں زندہ رہوں باہر نہ نکلنا
للہ بہن کھولے ہوئے سر نہ نکلنا
سر کھول کے کیا اوڑھ کے چادر نہ نکلنا
کیا تم نے کہا دل میرا تھرا گیا زینب
بھائی کی مناجات میں فرق آگیا زینب

رخصت ہوئے روتے ہوئے سارے ملک و جن
گھوڑے پہ چڑھا تھم کے وہ کونین کا محسن
آفت کا وہ تھا وقت قیامت کا وہ تھا دن
سایہ نہ کسی جا تھا نہ پانی کہیں ممکن
عباس کے حلے جو لعیں دیکھ چکے تھے
دریا بھی نظر بند تھا یوں گھاٹ رکے تھے

وہ دوپہر اس دشت کی وہ دن کا وہ ڈھلنا
وہ گرم زرہ اور وہ ہتھیاروں کا جلنا
وہ گرد کا مقتل میں تیغوں کا وہ چلنا
وہ بن میں پہاڑوں سے شراروں کا نکلنا
گرمی سے فرس میں بھی نہ وہ تیز تگی تھی
پیاسے تھے حسین آگ زمانے کو لگی تھی

فوجوں کے برابر جو شہ بحر و بر آئے
اللہ ری تمازت کہ پسینے میں تر آئے
غصے میں جو ہلتے ہوئے ابرو نظر آئے
غل تھا کہ علی تول کے تیغ دو سر آئے
حسن خم ابرو تھا دوبالا مہ نو سے
چہرے میں زیادہ تھی ضیا مہر کی ضو سے

چہرہ وہ کہ رضواں تو دکھائے چمن ایسے
جنت کے گلستاں میں نہیں ہیں گلبدن ایسے
لب بند ہوئے جاتے ہیں شیریں دہن ایسے
ہر شور جہاں میں نمک ایسا سخن ایسے
قرآں نہ اترا آتا تو قرأت بھی نہ ہوتی
یہ خلق نہ ہوتے تو فصاحت بھی نہ ہوتی

منظور نظر گیسوئے رخسارۂ تاباں
ظلمت کی سحر گیسوئے رخسارۂ تاباں
ہالے میں قمر گیسوئے رخسارۂ تاباں
مشک و گل تر گیسوئے رخسارۂ تاباں
دیکھے نہ کبھی نور سحر دیکھ کے ان کو
دو راتوں میں دو چاند نظر آتے ہیں دن کو

آئینہ کا کیا منہ جو جبیں سے ہو مقابل
مہتاب کہوں گر تو وہ ناقص ہے یہ کامل
چہرے پہ کلف صاف یہ ہے عیب میں داخل
خورشید بھی اصلاً نہیں تشبیہ کے قابل
ہمسر ہوں وہ کیونکر کوئی نسبت نہیں جن کو
یہ رات کو پیشانی سے محبوب وہ دن کو

آراستہ لشکر ہے اُدھر ملتے ہیں بھالے
قبضوں پہ ہیں چالاک جواں ہاتھوں کو ڈالے
بدکیش ہیں واں تیروں کو ترکش سے نکالے
فوجوں پہ تو فوجیں ہیں رسالے پہ رسالے
خنجر وہ کلیجے پہ جو زہر کے پھرے ہیں
شاہِ شہدا قلعۂ آہن میں گھرے ہیں

تلواریں لیے دشمن جاں ایک طرف ہیں
گھوڑے پہ شہِ کون و مکاں ایک طرف ہیں
تیر ایک طرف گرزِ گراں ایک طرف ہیں
آپ ایک طرف لاکھ جواں ایک طرف ہیں
سر کٹنے کا دھڑکا نہیں وسواس نہیں ہے
فوجوں سے وغا اور کوئی پاس نہیں ہے

بے سایہ جو ہے لاشۂ ہم شکل پیمبر
بکسے ہوئے ہیں دھوپ میں زخم تن انور
واحسرت و دردا کہ نہیں لاش پہ چادر
سوتے ہیں لبِ نہر علمدارِ دلاور
تنہا جو وہ ساونت ہزاروں سے لڑا ہے
مارا ہوا اک شیر ترائی میں پڑا ہے

فرماتے ہیں گرمی کی بس اب مجکو نہیں تاب
میں تین شب و روز سے جنگل میں ہوں بے آب
مرجھائے ہیں سب باغِ علی کے گل شاداب
کیونکر وہ جیے جس سے بچھڑ جائیں یہ احباب
صابر ہوں میں ایسا ہی غش آ نہیں جاتا
ان پھولوں کو اس دھوپ میں دیکھا نہیں جاتا

اتنی مجھے مہلت دو کہ قبریں تو بناؤں
سیدانیوں سے بہرِ کفن چادریں لاؤں
اس خاک میں ان چاند کے ٹکڑوں کو چھپاؤں
یہ دفن ہوں میں قبر نہ پاؤں تو نہ پاؤں
قطرہ کوئی اس نہر سے پیاسے کو نہ دینا
مٹی بھی محمد کے نواسے کو نہ دینا

کیا اُن سے عداوت جو گئے دارِ فنا سے
کوتاہ ہیں چلنے سے قدم ہاتھ وغا سے
مطلب انھیں دریا سے نہ کچھ سرد ہوا سے
رحم اُن کا طریقہ ہے جو ڈرتے ہیں خدا سے
مہماں بنے لڑتے بھی تو یہ سب حق پہ لڑے ہیں
آخر یہ بشر ہیں کہ جو بے گور پڑے ہیں

مرتا ہے مسافر کبھی بستی میں کوئی گر
قرآں کوئی پڑھتا ہے کہ یہ بیکس تھا بچارا پر
غم کرتے ہیں سب فاتحہ خوانی میں سوم کو
اس میں کئی بچے تھے کہ نکلے تھے نہ گھر سے
افتادہ ہیں اس دھوپ میں یہ تین پہر سے
نرغہ ہے کہ تلواروں میں دم لے نہیں سکتا
یہ سن کے پکارا پسرِ سعد بد افعال
اکبر ہو کہ ہوں قاسم و عباس خوش اقبال
سینوں پہ گل زخم ابھی اور کھلیں گے
حضرت نے کہا دور ہوا و ظالم مردود
یہ وہ ہیں کہ زہرا و نبی جن سے ہیں خوشنود
قبروں میں بھی جنت کے چمن ان کو ملیں گے
میں دیر سے آمادہ ہوں تلوار کو تولے
ماروں انھیں پھوٹیں کہیں کچھ دل کے پھپولے
آرام سفر کر گیا راحت نہیں باقی
یہ فوج ہے کیا آگ کا دریا ہو تو جھیلیں
الٹیں صفتِ کاہ اگر کوہ کو ریلیں
چاہیں تو زمیں کے ابھی ساتوں طبق الٹیں
کہتے ہیں جسے اہل زمیں گنبد گرداں
ہم آج ہیں عالم میں قضا فہم و قدرداں
کس امر میں تقلیدِ محمد نہیں کرتے

سب لوگ اسے غسل و کفن دیتے ہیں مل کر
لے آتا ہے تربت پہ کوئی پھولوں کی چادر
سید ہیں یہ اور شرم نہیں آتی ہے تم کو
نازک ہیں صباحت میں زیادہ گل تر سے
پوچھے کوئی یہ درد والم میرے جگر سے
زندہ ہوں میں اور ان کو کفن دے نہیں سکتا
کیسا کفن اور کیسی لحد فاطمہ کے لال
ہم گھوڑوں کی ٹاپوں سے کرینگے انھیں پامال
سجاد کو ٹکڑے بھی نہ لاشوں کے ملیں گے
اللہ شہیدوں کی حفاظت کو ہے موجود
ہر لاش کو گھیرے ہوئے ہے رحمتِ معبود
فردوس کے حلوں کے کفن ان کو ملیں گے
کہہ دے کہ علم فوج صفیں باندھ کے کھولے
سر تن سے اڑا دوں کوئی اب مجھ سے جو بولے
بڑھتا ہوں کہ بس اب کوئی حجت نہیں باقی
کیا ڈر ہے انھیں بچپن میں جو تلواروں سے کھیلیں
کوفہ تو ہے کیا شام کو اور روم کو لے لیں
یوں الٹیں کہ جس طرح ہوا سے ورق الٹیں
نُہ وسقے میں اک جزو کتابِ شہ مرداں
حق بین و حق آگاہ و سخن سنج و ہنرداں
فاقوں میں سوال فقرا رد نہیں کرتے

اللہ نے کونین کی شاہی ہمیں دی ہے
امداد رسولوں کی میرے باپ نے کی ہے
مجھ میں بھی وہی دل وہی شوکت ہی جی ہے
سر بر سے ہیں جب تیغِ علی میان سے لی ہے
سر تن سے کٹے جب تو مہم جنگ کی سر ہے
مر جائے یہ عزت یہ بہادر کی ظفر ہے

ہم دولتِ دنیا کبھی گھر میں نہیں رکھتے
توقیر زر و مال نظر میں نہیں رکھتے
رکھتے ہیں قدم خیبر میں شر میں نہیں کھٹتے
کچھ اور بجز تیغ کمر میں نہیں رکھتے
نذرِ رہِ معبود تن و سر ہے ہمارا
زیور ہے یہی اور یہی زر ہے ہمارا

شہر اس کی تپ و تاب سے ویرانے ہوئے ہیں
جب چلے ہے یہ دیو بھی دیوانے ہوئے ہیں
منھ وہ ہے کہ تلواروں میں دندانے ہوئے ہیں
لوہا وہ کہ جبریل جسے مانے ہوئے ہیں
کر دیتی ہے شب دشمنِ ایماں کے دلوں کو
چڑھ آتی ہے تپ اس کے شراروں سے جنوں کو

بربادسی تیغ سے سر کٹے ہوئے ہیں
جاں بر جو ہوئے بھاگ کے یا ہٹ کے ہوئے ہیں
عاجز ہے زرہ خود بھی سر پٹکے ہوئے ہیں
اب تک پرِ جبریل میں لٹکے ہوئے ہیں
باعث یہ نہ ہوتا تو پھر آرام نہ لیتے
تھا خاتمہ گر ہاتھ علی تھام نہ لیتے

مشہورِ جہاں عمرو علی کی ہے لڑائی
زور اس کا کہ یہ دیو نے قوت نہیں پائی
خندق کے اِدھر آتے ہی تلوار جو کھائی
گویا کہ تھی مہینوں سے تن و سر میں جدائی
لاشہ کا اِدھر ڈھیر سرِ نحس اُدھر تھا
خندق کو جو دیکھا تو لہو تا بہ کمر تھا

کب میان سے شمشیر دو سر لی نہیں ہم نے
لڑنے میں کبھی منہ پہ سپر لی نہیں ہم نے
جب تک کہ زمیں خون سے بھر لی نہیں ہم نے
کچھ اپنے سر و تن کی خبر لی نہیں ہم نے
شمشیر و سپر بعدِ ظفر کھولتے ہیں ہم
جب صاف ہو میداں تو کمر کھولتے ہیں ہم

پیغام قضا تیغ ید اللہ کو جانو
ہمتائے علی فاطمہ کے ماہ کو جانو
بینائی ہو تو کوہِ گراں کاہ کو جانو
عاجز نہ کبھی بندۂ اللہ کو جانو
انگشت سے حلقے کو مروڑا ہے علی نے
خیبر کا در اک ہاتھ سے توڑا ہے علی نے

اللہ رے زورِ یدِ پاکیزۂ و طاہر
آثار اذا زلزلت الارض تھے ظاہر
کھاتے تھے سدا نانِ جویں خلق ہی ماہر
کچھ زر نہ سماتا تھا نظر میں نہ جواہر
اسبابِ شہنشاہ دو عالم یہی بس تھا
قرآن تھا یہ تلوار تھی بس ایک فرس تھا

بھاتا تھا شریکِ فقرا شاہ کو ہونا
بھولا نہیں راتوں کو مناجات میں رونا
ہے یاد نہیں بوریے پر راتوں کو سونا
بستر تھا وہی دن کا وہی شب کا بچھونا
اک ریزۂ زر خانۂ حیدر سے نہ نکلا
دُنیا سے اُٹھے جب تو کفن گھر سے نہ نکلا

پانی بھی ملک کوثر و تسنیم کا لائے
جبریلِ امیں عرش سے روتے ہوئے آئے
پیوند پہ پیوند جو ملبوس میں پائے
سر پیٹ کے ہم بھائیوں نے اشک بہائے
جو کچھ تھا وہ قبل اپنے شہنشاہ نے بھیجا
کافور نبی نے کفن اللہ نے بھیجا

اللہ ہی عالم کہ وہی حال ہے میرا
ریتی پہ پڑا ہے جو زر و مال ہے میرا
یہ گوہر و یاقوت ہے یہ لعل ہے میرا
اس دشت میں جو مال ہے پامال ہے میرا
آرام پس از رنج و محن بھی نہ ملے گا
مجھکو تو کئی روز کفن بھی نہ ملے گا

ہم اپنے جو لشکر کے پرے تم کو دکھائیں
تم کیا ہو نبی جان کی جانیں ابھی جائیں
جرار کبھی تاب ٹھہرنے کی نہ لائیں
مرجائیں ہزاروں تو ہزاروں کو غش آئیں
منظور ملائک کی جو امداد کروں میں
اک اپنے لیے لاکھوں کو برباد کروں میں

میں نے تو بھرے گھر کو تمھارے لیے چھوڑا
دربارِ پیمبر کو تمھارے لیے چھوڑا
اُس قبرِ منور کو تمھارے لیے چھوڑا
بیماری میں دختر کو تمھارے لیے چھوڑا
نہ ماں کے نہ پہلو میں بڑے بھائی کے جا ہو
قسمت میں یہ تھا سب سے مری قبر جدا ہو

سچ ہے سخنِ حق میں عجب ہوتی ہے تاثیر
تھرّائے جگر رونے لگے فوج کے پیر
مولا نے سنبھل کر جو رکھی دوش پہ شمشیر
ہنس کر پسرِ سعد پکارا کہ چلیں تیر
اک حشر بپا ہوگا جو یہ شیر لڑے گا
سر خاک پہ لوٹیں گے بڑا کھیت پڑے گا

نقارۂ رزمی پہ پڑی چوب یکایک
تھرانے لگا دشت پر آشوب یکایک
تلواریں کھنچیں زہر میں سرڈوب یکایک
لشکر سے بڑھے فوج کے سرکوب یکایک
رحم آیا نہ اعدا کو ولی ابن ولی پر
نرغہ ہوا مظلوم حسین ابن علی پر

غل طبل کا قرنا کی وہ آواز ڈرانی
زہرے جسے سن سن کے ہوئے جاتے تھے پانی
کالے وہ علم شام کے لشکر کی نشانی
وہ تیر جگردوز کمانیں وہ کیانی
اک تیر سے مرجانے میں عرصہ نہیں کھنچتا
رستم سے بھی جن کا کبھی چلہ نہیں کھنچتا

تلوار ادھر سید ابرار نے کھینچی
یا تیغ دو سر حیدرِ کرار نے کھینچی
تصویر اجل برق شرربار نے کھینچی
گردن طرفِ غار ہر اک مار نے کھینچی
گھبرا گئی صدمہ یہ ہوا گاوِ زمیں پر
سر رکھ دیے جھک جھک کے پہاڑوں نے زمیں پر

آثار نمایاں ہوئے خالق کے غضب کے
شیروں نے ترائی سے کنارا کیا دب کے
چونک اٹھے وہ سوتے تھے جو جاگے ہوئے شب کے
دل ہل گئے رنگ اڑ گئے کفارِ عرب کے
سردار قدم گاڑے تھے ہر چند زمیں پر
گر گر گئے کھل کھل کے کمر بند زمیں پر

نعرہ کیا بڑھ کر شہِ دیں نے کہ خبردار
لشکر سے کہا شمرِ لعیں نے کہ خبردار
صیحہ کیا جبریل امیں نے کہ خبردار
ماہی سے کہا گاوِ زمیں نے کہ خبردار
گیتی نہیں پھر گر یہ زد و کشت رہے گی
شانے ہیں مری ہونگی نہ تری پشت رہے گی

جنگل میں پہاڑوں کے جگر خوف سے کانپے
گرنے لگے پتے یہ شجر خوف سے کانپے
گھڑیال تھے پانی میں مگر خوف سے کانپے
تھے دور اولی اجنحہ پر خوف سے کانپے
گو قوتِ پروازِ خدا داد تھی ان کو
رہ داد پر روح امیں یاد تھی ان کو

چلاتے تھے ہر صف میں نقیبانِ جفاکیش
ہاں غازیو اس وقت بڑی جنگ ہے درپیش
فرزند علی ہے یہ جگر خستہ و دل ریش
سر کرتے ہیں سر دے کے مہم کو ظفر اندیش
کوشش کی گھڑی جان لڑا دینے کا دن ہے
صفین کے کشتوں کے عوض لینے کا دن ہے

مولائے امم لشکر پر کید پر آئے
انبوہ عناد و حسد و کید پر آئے
گہ عمر پہ آئے تو کبھی زید پر آئے
یوں آئے کہ جس طرح اسد صید پر آئے
ہل چل تھی کہ طوفان میں جہاز آتا ہے جیسے
تیغ آتی تھی کنجشک پہ باز آتا ہے جیسے

سر گرنے لگے جسم سے چلنے لگی تلوار
چار آئینے میں جا کے نکلنے لگی تلوار
افعی کی طرح زہر اگلنے لگی تلوار
پی پی کے لہو رنگ بدلنے لگی تلوار
پانی نے اثر زہر ہلاہل کا دکھایا
ہر ضرب میں جلوہ حق و باطل کا دکھایا

ہر غول میں غل تھا یہ لڑائی بھی نئی ہے
انبار سر و تن میں صفائی بھی نئی ہے
سر تن سے اترتے ہیں چڑھائی بھی نئی ہے
یہ گھاٹ نیا ہے یہ ترائی بھی نئی ہے
چھپنے کی جگہ دامن صحرا میں نہیں ہے
یہ باڑھ غضب کی کسی دریا میں نہیں ہے

تلواریں جو عاری ہیں تو نے آب سنانیں
بیکار کمیں میں ہیں کمینوں کی کمانیں
اک منہ میں اسے حق نے جو دو دی ہیں زبانیں
اس رزم کو جو سیف زباں ہوں وہی جانیں
مطلب تھا کہ اب دین کو کامل یہ کرے گی
دو شرک کو اور کفر کو باطل یہ کرے گی

بربادی ہوئی کفر کے لشکر کی اسی سے
گردن نہ بچی عمر سے خود سر کی اسی سے
کچھ چل نہ سکی مرحب و عنتر کی اسی سے
چولیں ہوئیں ڈھیلی در خیبر کی اسی سے
میدان ہر اک معرکہ میں ہاتھ ہے اس کے
قبضے کی طرح فتح و ظفر ساتھ ہے اس کے

جو سایۂ شمشیر ظفریاب میں آیا
ماہی کی طرح موت کے قلاب میں آیا
فی الفور خلل زیست کے اسباب میں آیا
جو آ گیا کاوے میں وہ گرداب میں آیا
کچھ مطلب دل ہاتھ بھی مارے سے نہ نکلا
دریا بھی دم تیغ کے دھارے سے نہ نکلا

جب مثل سموم آ کے نکل جاتی تھی سن سے
پتوں کی طرح خاک پہ سر گرتے تھے تن سے
جو شیر تھے میداں کے ہرن ہو گئے رن سے
وحشی بھی چلے جاتے تھے بھاگے ہوئے بن سے
افعی نہ فقط ڈر کے دراڑوں میں چھپے تھے
دبکے ہوئے درندے بھی پہاڑوں میں چھپے تھے

اللہ ری مولا کی ہزاروں سے لڑائی
فوجوں سے وغا ظلم شعاروں سے لڑائی
پرخاش پیادوں سے سواروں سے لڑائی
لشکر کی حدیں چار ہیں چاروں سے لڑائی
انبوہ میں سرگرم زد و کشت کہیں تھے
جو صف سے بڑھا تیغ بکف آپ وہیں تھے

مقتل میں کوئی خاک پہ دم توڑ رہا تھا
باغی کوئی ہستی کا چمن چھوڑ رہا تھا
ہٹ ہٹ کے کوئی دستِ ادب جوڑ رہا تھا
گھوڑے کی اُدھر باگ کوئی موڑ رہا تھا
تلوار کے سائے سے ڈرے جاتے تھے اعدا
بھاگڑ تھی کہ پس پس کے مرے جاتے تھے اعدا

لاشیں تھیں وہیں اک لاش پہ سر گرتے تھے سر پر
پاؤں پہ کبھی ہاتھ تو سینے تھے کمر پر
چار آئینے شانوں پہ کٹے تیر تبر پر
خنجر تھے انھیں کے جو پھرے اُن کے جگر پر
بے چلّے کماں گرز گراں مشت کے نیچے
تیغیں تہ گردن سپریں پشت کے نیچے

سیدھے جو نشاں تھے انھیں کیا تیغ نے اُلٹا
اس صف کو بچھا کر وہ پرا تیغ نے اُلٹا
لشکر کا ورق وقتِ وغا تیغ نے اُلٹا
گردن بھی الگ تھی جو گلا تیغ نے اُلٹا
جو صاحبِ دفتر تھا وہ مقتل سے ہٹا تھا
جس فرد کے چہرے پہ نظر کی وہ جدا تھا

چلاتے تھے گرگرکے یہ جن بیر علم کے
جانوں کو بچاؤ کہیں پھر تیغ نہ چمکے
جل جاتے ہیں سایہ سے ہی برقِ دو دم کے
رن پٹتا ہی لڑتے ہیں جب کھیت میں جم کے
ہیں سیف خدا عرش سے تیغ اُتری ہے اُن کو
جائیں وہی ان شیروں سے ہو سامنا جن کو

غالب کوئی ان پر کسی صورت نہیں رہتا
قایم قدمِ صاحبِ جرات نہیں رہتا
نے سر ہی جو پابندِ اطاعت نہیں رہتا
کلمہ نہ پڑھے جو وہ سلامت نہیں رہتا
حملوں سے یہ ہونٹوں پہ اگر جان نہ لاتے
کافر تھے وہ جن جو وہاں ایمان نہ لاتے

شیرِ اسدِ قلعہ شکن گونج رہا تھا
جنبش تھی پہاڑوں کو یہ رن گونج رہا تھا
قرنا سے اِدھر چرخِ کہن گونج رہا تھا
نعروں سے اِدھر ظلم کا بن گونج رہا تھا
غل تھا کہ لہو خوف سے گھٹ جانے کا دن ہے
بھاگو یہی گیتی کے اُلٹ جانے کا دن ہے

کیا تیغ کی تعریف کرے کوئی زباں سے
جن مانگیں اماں جان کی جس آفت جاں سے
واں قطع سخن خوب جو باہر ہو بیاں سے
دھوئے ہوئے گوہر ہیں زباں لائے کہاں سے
یوں تیغ کبھی عرش سے اتری ہے کسی کو
ہدیہ وہ خدا نے جسے بھیجا تھا علی کو

سر کاٹ کیا فرق پہ جس حال میں پہونچی
چہرے پہ جو گھوڑے کے پری بال میں پہونچی
مچھلی تھی کہ جوشن کے کبھی جال میں پہونچی
پنجے کے اڑانے کے لیے ڈھال میں پہونچی
سمجھا یہ ہر اک برق گری دشمن دیں پر
پنجہ تو سپر میں تھا کلائی تھی زمیں پر

اعضائے سواران تن و مند جدا تھے
نیزے تھے تو کیا جسم کے سب بند جدا تھے
بیٹوں سے جدا باپ سے فرزند جدا تھے
کیا وصل ہی پیوند سے پیوند جدا تھے
تنہا نہ سر اہل ستم کاٹ دیئے تھے
تلوار نے رشتے بھی باہم کاٹ دیئے تھے

ہاتھ اٹھتا تھا جب تا بہ فلک جاتی تھی بجلی
گرتی تھی سر دل پر تو کڑک جاتی تھی بجلی
جب بڑھتی تھی تلوار سرک جاتی تھی بجلی
اس پار سے اس پار چمک جاتی تھی بجلی
گرجے ہیں پہ اس طرح مسلسل نہیں گرجے
نعرے ہیں کہ ایسے کبھی بادل نہیں گرجے

شمشیر عدوکش کی ہوا کے وہ تھپیڑے
ڈوبے ہوئے تھے خون میں اس فوج کے بیڑے
گھوڑے کو بڑھانے کے لیے کیا کوئی چھیڑے
بوچھار سروں کی وہ لہو کے وہ ڈریڑے
ساون نہیں برسا ہے کہ بھادوں نہیں برسا
مینہ برسا ہے ہر سال مگر یوں نہیں برسا

ڈھالوں کی گھٹا کا وہ ادھر جھوم کے آنا
تلوار کی بجلی کا چمکتے ہوئے جانا
جنگل کی سیاہی تھی کہ تیرہ تھا زمانا
دریا کا کنارا تھا کہ جیحوں کا دہانا
یوں سیل کبھی جانب صحرا نہیں آتی
ایسی کبھی برسات میں بھیّا نہیں آتی

سب تھے سپر انداختہ تلوار کے آگے
دو چار کے پیچھے تھے تو دو چار کے آگے
یوں موت تھی اس صاعقہ کردار کے آگے
جس طرح پیادہ چلے اسوار کے آگے
غل تھا وہ ہٹیں کھبت سے جو آگے بڑھے ہیں
سر نذر کرو آپ لڑائی پہ چڑھے ہیں

تلواریں ہزاروں ہیں یہ نایاب یہی ہے
بازوئے درِ نصرت کا یہی باب یہی ہے
بجلی جسے کہتے ہیں وہ بیتاب یہی ہے
ہے باڑھ پہ دریا ہمہ تن آب یہی ہے
اس تال کو اس میل کو اس ساتھ کو دیکھو
تلوار کو کیا دیکھتے ہو ہاتھ کو دیکھو

ایسا ہی لڑائی کا چلن ہاتھ میں کس کے
ہے زورِ شہ قلعہ شکن ہاتھ میں کس کے
دیکھا ہے بنے ساختہ بن ہاتھ میں کس کے
یہ کاٹ یہ گردش ہے یہ کن ہاتھ میں کس کے
تلوار تو کیا انگلیاں دو تیغِ دو سر ہیں
ہاتھوں کی لکیریں نہیں تعویذِ ظفر ہیں

بجھ بجھ گئے بجلی سی چمک کر جدھر آئی
جل جل گئے شعلہ سی لپک کر جدھر آئی
کٹ کٹ گئے سینے سے سرک کر جدھر آئی
مر مر گئے مقتل میں لچک کر جدھر آئی
آفت تھی قیامت تھی چھلاوہ تھی پری تھی
جوہر نہ کہو موتیوں سے مانگ بھری تھی

سہمے ہوئے تھے مارِ سیہ کنڈلیاں مارے
ہرنوں میں تھے جو شیر تو چیتوں میں چکارے
غل تھا کہ جلا دینگے جہاں کو یہ شرارے
دنیا کی تباہی کے یہ انداز ہیں سارے
تلوار کے پانی سے یہ آتش زدگی ہے
مسکن سے چلو آگ بیاباں میں لگی ہے

ڈوبا تھا کوئی اور کوئی خون میں تر تھا
ہر نخلِ قد اس معرکہ میں زیر و زبر تھا
ڈھالیں تھیں نہ ساعد تھے نہ بازو تھے نہ سر تھا
پتی تھی نہ شاخیں نہ شجر تھا نہ ثمر تھا
یوں باغ کی رونق کبھی جاتے نہیں دیکھی
ایسی بھی خزاں آج تک آنے نہیں دیکھی

جو برچھیاں بے پھل تھیں خجالت سے گڑی تھیں
عاری تھیں وہ تلواروں سے تیغیں جو لڑی تھیں
تھیں کند سنانیں بھی جو نیزے میں گڑی تھیں
جوشن پہ بھی ایسی کبھی کڑیاں نہ پڑی تھیں
ریتی پہ کٹی ڈھالوں کا پشتارہ ہوا تھا
ہر پارۂ چار آئینہ صد پارہ ہوا تھا

ٹکڑے ہیں کمانیں قدر انداز کریں کیا
آفت کا نشانہ ہے فسوں ساز کریں کیا
نے تیر ہیں ترکش کا دہن باز کریں کیا
اڑ جائیں پرِ تیر تو پرواز کریں کیا
چلّے بھی تو گوشوں کی طرح ساتھ نہیں ہیں
جس پاس کماں رہ گئی ہے ہاتھ نہیں ہیں

رحم ایک جگہ ہے تو عتاب ایک جگہ ہے
اِک جا ہے ظفر فتح کا باب ایک جگہ ہے
برق ایک جگہ ہے تو سحاب ایک جگہ ہے
حیرت کی ہے جا آتش و آب ایک جگہ ہے
وہ نار جسے خون کی روانی نہ بجھائے
یہ آگ وہی ہے جسے پانی نہ بجھائے

جس فرق پہ یہ صاعقہ کردار گری ہے
سر تن سے گرا ہاتھ سے تلوار گری ہے
اک بار کہیں برقِ شرربار گری ہے
سو بار یہ اُٹھی ہے تو سو بار گری ہے
ٹالے یہ بلا سر سے جو کوئی تو قدم لیں
اتنی بھی تو مہلت نہیں ملتی ہے کہ دم لیں

مولا سا کوئی سائفِ سیاف نہیں ہے
صف کونسی ایسی ہے کہ جو صاف نہیں ہے
دنیا میں عدالت نہیں انصاف نہیں ہے
ایسا تو کوئی قاف سے تا قاف نہیں ہے
دکھلا گئے جوہر تھے جو خالق کے ولی کے
نہ قبل لڑا یوں نہ کوئی بعد علی کے

اللہ ری لڑائی ہیں سبکتازیٔ شبدیز
شہباز بھی ہے قائل جانبازیٔ شبدیز
وہ سینہ وہ گردن وہ سرافرازیٔ شبدیز
وہ آنکھ وہ چہرہ وہ خوش اندازیٔ شبدیز
جس طرح فرو رہتی ہے مایوس کی گردن
گردن سے یونہیں جھکتی ہے طاؤس کی گردن

آہو جو کہوں اس کو تو آہو ہے چکارا
ساتھ اُس کے ہما کو نہیں پرواز کا یارا
وہ نعل وہ ہر کیل وہ سم معرکہ آرا
پتلی وہ پری سمجھے جسے آنکھ کا تارا
دیکھی ہے سموں میں کسی گھوڑے کے یہ ضو بھی
اک جا ہیں ستارے بھی قمر بھی مہِ نو بھی

اللہ ری جانداریٔ شبدیز وغا میں
تلوار کے چلنے سے بھی تھا تیز وغا میں
دل کا تھا اشارا اُسے مہمیز وغا میں
ہر نعل تھا شمشیر شرر ریز وغا میں
ہاتھ اُس کے جدھر آئے اجل پا گئی اُس کو
اک ٹاپ پڑی جس پہ زمیں کھا گئی اُس کو

تلوار کے مانند نہ بھرتا تھا دم اُس کا
گردن وہ مہِ نو سی وہ منکے کا خم اُس کا
دریا سے روانی میں فزوں تر قدم اُس کا
کس طرح لکھے وصفِ کمیت قلم اُس کا
دوڑاؤں کہاں تک فرسِ ذہنِ رسا کو
کہدو کسی شاعر نے جو باندھا ہو ہوا کو

غل تھا کہ چھلاوے میں یہ چھل بل نہیں دیکھی — پھرتی ہوئی یوں آج تلک کل نہیں دیکھی
باریک یہ جلد اور یہ ہیکل نہیں دیکھی — ایسی تو کبھی خواب میں مخمل نہیں دیکھی
نازک ہی کہ مہمیز کی طاقت نہیں رکھتا — ابریشم پشمینہ یہ ملاحت نہیں رکھتا

جو رگ ہی عوض خوں کے وہ غیرت سے بھری ہی — جلدی جو ہی سب جلد بھی جودت سے بھری ہی
شعلے کی طرح طبع شرارت سے بھری ہی — اُبلی ہوئی ہر آنکھ شجاعت سے بھری ہی
اُڑ جاتا تھا برچھوں میں محل جست کا پا کر — تلواروں کے پنجے سے نکل جاتا تھا آ کر

جس جا پہ پھرے برق کی وہاں جلوہ گری کیا — چلنے میں ہوا کیا ہی نسیم سحری کیا
یہاں اوجِ سعادت کا ہما کیا ہی پری کیا — طاؤس ہی کیا نسر ہی کیا کبکِ دری کیا
راکب جو ذرا چھیڑ دے اُس برق شیم کو — سائے کو نہ وہ پائے نہ یہ گردِ قدم کو

اُس صف کو اُلٹ کر ادھر آیا اُدھر آیا — فوجوں کو پلٹ کر ادھر آیا اُدھر آیا
جوں شبپر جھپٹ کر ادھر آیا اُدھر آیا — بجلی سا سمٹ کر ادھر آیا اُدھر آیا
تھمتا ہی چھلاوا بھی مگر یہ نہیں تھمتا — طایر بھی ٹھہر جاتا ہی پر یہ نہیں تھمتا

پامال نہ ہوں پھول جو گلزار پہ دوڑے — سم تر نہ ہوں گر قلزمِ زخار پہ دوڑے
اِس طرح رگِ ابرِ گہربار پہ دوڑے — جس طرح کہ نغمہ کی صدا تار پہ دوڑے
اغراق ہی یہاں کچھ نہ تعلّی شعرا کی — کافی ہی یہ تعریف کہ قدرت ہی خدا کی

اک ظالمِ شامی سپہ شوم سے نکلا — غدار بڑے ٹھاٹھ بڑی دھوم سے نکلا
لڑنے کے لیے خاصۂ قیوم سے نکلا — کشتوں کا عوض لینے کو معصوم سے نکلا
دو بھائی بھی اُس کے شہ والا سے لڑے تھے — سر اُن کے کہیں جسم کہیں رن میں پڑے تھے

غصے سے غضب سرخ تھیں خونخوار کی آنکھیں — بجلی سے جھپکتی تھیں نہ غدار کی آنکھیں
دیکھی جو نہ تھیں حیدرِ کرّار کی آنکھیں — مست مئے نخوت تھیں جفاکار کی آنکھیں
سر کاٹیے سردار کا سودا تھا یہ سر میں — غرہ کہ تہمتن نہ سماتا تھا نظر میں

سر طبلکِ معکوس جبیں حد سے فزوں تنگ — غدّار و سلحشور و جفا پیشہ و سرہنگ
کہنے کو بشر پر قد و قامت کا نیا ڈھنگ — حیراں شبِ ظلمات ہو یہ تیرگیِ رنگ
پہلے سے یہ کالا تھا منہ اُس دشمنِ رب کا — بن جائے تو اکس سے آئینہ حلب کا
لال آنکھیں وہ ظالم کی وہ مُنہ قبر سے کالا — شب ایک طرف دن کو ڈرے دیکھنے والا
قد دیو کے قامت سے بلندی میں دوبالا — دانتوں کی کبودی دہنِ مار کا چھالا
شیر اُس کی صدا اُن کے لرز جاتے تھے بن میں — فاسد تھی ہوا ان کی یہ بدبو تھی بدن میں

وہ ڈھال کہ جو سینۂ رستم کو چھپالے — تلوار کا مُنہ ایسا کہ فولاد کو کھالے
نیزہ وہ کہ مرحب کو جو مرکب سے اُٹھالے — گرز ایسا کہ عنتر جسے مشکل سے سنبھالے
کج طبع کا سر جائے پہ کینے کو نہ چھوڑے — خنجر وہ کہ سالم کبھی سینے کو نہ چھوڑے
مولا نے کہا اپنے ارادے کی خبر دے — آنکھوں سے اُٹھا نشۂ پندار کے پردے
بو جاتے ہیں اُس تخم کو دانا جو ثمر دے — غرّہ یہ ترا تجھکو کہیں پست نہ کر دے
دنیا میں نہیں کچھ عملِ نیک سے بہتر — پیدا کیا اللہ نے ایک ایک سے بہتر

لڑنا ہے تو بڑھ عصر کا ہنگام قریں ہے — اب سجدۂ معبود کی مشتاق جبیں ہے
لشکر ہے ترے ساتھ ادھر کوئی نہیں ہے — عباس سا غازی ہے نہ اکبر سا حسیں ہے
فاقہ ہے جدا پیاس جدا ضعف جدا ہے — اب میں ہوں یہ تلوار ہے اور سر پہ خدا ہے
یہ سنتے ہی سفاک نے بھالے کو سنبھالا — تلوار کو چمکا کے بڑھے سیّدِ والا
آ پہونچا تھا سینے کے قریں ظلم کا بھالا — فرزندِ یداللہ نے عجب ہاتھ نکالا
کیا جانیے بجلی تھی کہ تیغِ دو زباں تھی — نہ ہاتھ میں بھالا تھا نہ بھالے میں سناں تھی

حضرت نے کہا حول سے دم اس کا جو پھولا — کافی تھا ترے قتل کو اک تیغ کا ہولا
سنتے تھے کہ نیزے میں تجھے ہے ید طولا — جو بند کہ تھے یاد انھیں خوف سے بھولا
نہ ہاتھ میں طاقت تھی نہ نیزے میں تگاں تھی — نیزہ تھا کہ تنکا تھا قلم تھا کہ سناں تھی

جھنجلا کے کہا اُس نے کہ یا شاہ سرفراز
سرہنگ نہ مجھسا ہے نہ سرکش نہ سرانداز
طاقت پہ مجھے فخر تھا تیرے پہ مجھے ناز
کیا جانیئے یہ سحر تھا یا آپ کا اعجاز
چمکی تھی کہاں تیغ کدھر چل کے پھری تھی
مجھ پر کبھی اس طرح کی بجلی نہ گری تھی

حضرت نے کہا سحر نہ جان اس کو ستمگر
اعجاز دکھائیں تو نہ ہو تو نہ یہ لشکر
ہیں سیف خدا کوئی ہما سا نہیں ہمسر
ان ہاتھوں میں شمشیر دو دستی کے ہیں جوہر
ہر وقت یہاں ورد زباں نادعلی ہے
بجلی نہیں یہ ضرب ہے ایجاد علی ہے

ظالم نے اُدھر گرز گراں سر کو اُٹھایا
ثابت یہ ہوا دیو نے لنگر کو اُٹھایا
نہ ہاتھ میں لی ڈھال نہ جمدھر کو اُٹھایا
مولا نے فقط تیغ دو پیکر کو اُٹھایا
اُڑتے ہوئے دیکھا جو ہوا میں تبروں کو
سمٹا لیا تھرا کے فرشتوں نے پروں کو

شبیر قریب آگئے گھوڑے کو ڈپٹ کے
شبدیز اُدھر سے ادھر آتا تھا پلٹ کے
ہر چند بچاتا رہا ضربت کو وہ ہٹ کے
پرکالہ گرز اڑنے لگے تیغ سے کٹ کے
باقی تھا جو کچھ گرز وہ دو ہو گیا آخر
فتنہ جو اُٹھا تھا وہ فرو ہو گیا آخر

اے سیفِ ید اللہ صفائی مجھے دکھلا
خیبر میں جو گزری وہ لڑائی مجھے دکھلا
دریائے شجاعت کی ترائی مجھے دکھلا
اے دستِ خدا عقدہ کشائی مجھے دکھلا
ہاں فتح کا اور تیرا سدا ساتھ رہا ہے
ہر جنگ میں میدان ترے ہاتھ رہا ہے

یا شبّر خدا سیف دو دم دیجیئے مجھکو
یا شاہِ نجف طبل و علم دیجیئے مجھکو
سر بر نہ ہو لشکر وہ حشم دیجیئے مجھکو
میداں جو نہ چھوڑے وہ قلم دیجیئے مجھکو
نیزے سپہ شام کے ہٹتے نظر آئیں
سب فوج کے چہرے ابھی گھٹتے نظر آئیں

کوثر کا بھرا جام پلا دیجیئے مولا
بالائے ولا اور ولا دیجیئے مولا
پھر غنچۂ خاطر کو کھلا دیجیئے مولا
شمشیر فصاحت کو جلا دیجیئے مولا
میں وہ نہیں یا خلق میں انصاف نہیں ہے
مدت سے جو چپ ہوں تو زباں صاف نہیں ہے

گو پیر ہوں پر زورِ جوانی ہے ابھی تک
سوکھے ہوئے دریا میں روانی ہے ابھی تک
دنداں نہیں پر تیز زبانی ہے ابھی تک
قبضے میں وہ تیغِ صفہانی ہے ابھی تک
جوہر ہیں وہی باڑھ وہی گھاٹ وہی ہے
کہنہ تو ہے شمشیر مگر کاٹ وہی ہے

اس گھر کے وغا کرنے کا سب ڈھنگ دکھا دے
جس طرح علی لڑتے تھے وہ جنگ دکھا دے
تلوار کی بجلی کو تہِ تنگ دکھا دے
راکب کو بھی مرکب کو بھی جو رنگ دکھا دے
ٹھہرے نہ کہیں رن سے جو مرکوب کے نکلے
دو تین وجب خاک میں پھل ڈوب کے نکلے

لو غور سے چلتی ہوئی صمصام کو دیکھو
بے رونقیِ ظالمِ ناکام کو دیکھو
تیغ و سپرِ شاہِ خوش انجام کو دیکھو
اعجاز ہے اک جا سحر و شام کو دیکھو
قرباں رُخِ تابانِ شہِ جن و بشر کے
خورشید میں بیچ میں ہے شام و سحر کے

منہ سُرخ ہے سب خاطرِ اقدس ہے جو برہم
رخساروں پہ بل کھا رہے ہیں گیسوئے پرخم
ابرو میں ہے چلتی ہوئی تلوار کا عالم
پتلی کا یہ ہے رعب کہ تھراتے ہیں ضیغم
لو دیکھ لو اس صاحبِ شمشیر کی آنکھیں
غصے میں نہ دیکھی ہوں اگر شبر کی آنکھیں

دبتا ہے سرکتا ہے سمٹتا ہے وہ ظالم
گھوڑے کے قریب آ کے پلٹتا ہے وہ ظالم
بڑھ آتے ہیں جب آپ تو ہٹتا ہے وہ ظالم
رد ہوتا ہے جب وار تو کٹتا ہے وہ ظالم
شمشیر کلیجے پہ چھری پھیرے ہوئے ہے
بھاگے تو کدھر جائے اجل گھیرے ہوئے ہے

غل تھا کبھی دیکھی نہیں رد و بدل ایسی
چلتی نہیں تلوار کبھی بر محل ایسی
اب ہو گی زمانے میں نہ جنگ و جدل ایسی
ہاتھ ایسا زبردست تو برقِ اجل ایسی
بل جسم میں کس ہاتھ میں تلوار میں جب ہے
سو سر کا جو دشمن ہو تو اک وار سے بس ہے

جب چلتی ہے سن سے شرر اڑتے ہیں ہوا میں
ذرے بھی ادھر سے ادھر اڑتے ہیں ہوا میں
کاٹے ہوئے نیزوں کے پر اڑتے ہیں ہوا میں
پرکالۂ قرصِ سپر اڑتے ہیں ہوا میں
کچھ شبہ و تشکیک غلط اس پہ نہیں ہے
اس ڈھال کے سو ٹکڑے ہیں خطا اس پہ نہیں ہے

تلوار چمک کر ادھر آئی جو اُدھر سے
برسی تو زرہ گر گئی خود اُڑ گیا سر سے
چھرے سے چلم کھل گئی زنجیر کمر سے
پہلو سے سپر میں کٹی کلائی پہ سپر سے
دُنیا سے اسے رشتۂ تقدیر نے کھویا
دستانوں کو بھی ہاتھ سے نے پیے کھویا

مولا کی طبیعت جو ذرا جوش پر آئی
تلوار اجل بن کے زرہ پوش پر آئی
گہ فرق پہ چمکی تو کبھی دوش پر آئی
آفت کمر و صدر و تن و توش پر آئی
جانے کی جہاں سے خبر آتی ہے کسی کو
گرتی ہوئی بجلی نظر آتی ہے کسی کو

سر پر جو پڑی تیغ جبیں سے اُتر آئی
کیا ذکر جبیں صدر لعیں سے اُتر آئی
بڑھ کر کمرِ دشمنِ دیں سے اُتر آئی
کیا بند کمر خانۂ زیں سے اُتر آئی
خوں بھی نہ تنِ توسنِ چالاک سے نکلا
بجلی سا چمکتا ہوا اچھل خاک سے نکلا

تکبیر کا نعرہ جو کیا آپ نے تن کے
صاف آئی صدا بیچ سے یہ چرخِ کہن کے
ای لختِ جگر بادشہ قلعہ شکن کے
لڑتے ہیں یونہیں فوج سے جو شیر ہیں بن کے
تو صبر میں ایوب خوش انجام ہے شبیر
اب سجدے میں جھک عصر کا ہنگام ہے شبیر

سُن کر یہ صدا آپ نے تلوار کو روکا
تلوار کو کیا برقِ شرربار کو روکا
نے چین تھا پر اسپ وفادار کو روکا
گردوں کی طرف دیکھ کے رہوار کو روکا
فرمایا کہ جینے سے دل اب تنگ ہے گھوڑے
تھم جا کہ بس اب خاتمۂ جنگ ہے گھوڑے

اب سینے کو وقفِ تبر و تیر کرینگے
اب طاعتِ معبود کی تدبیر کرینگے
اب عصر کی نیت میں نہ تاخیر کرینگے
اب سجدۂ باری تہِ شمشیر کرینگے
ایذا ہو کہ دُکھ سہل ہے سب راہ خدا میں
سر دے کے بس اب جائینگے درگاہِ خدا میں

عاشق کو نہیں دوریِ معشوق گوارا
سر جلد کٹا دو یہ ہی خالق کا اشارا
مشتاقِ اجل ہے اسد اللہ کا پیارا
اب خنجر نے آب ہے اور حلق ہمارا
طالب ہوں رضا مندیِ ربِ دوسرا کا
صد شکر کہ وقت آ گیا وعدے کی وفا کا

یہ کہہ کے رکھی میان میں شبیرؑ نے تلوار
بجلی جو تھمی ہونے لگی تیروں کی بوچھار
مجروح ہوا صدر بھی زخمی ہوا سر بھی
کیوں چرخ یہ حال اس کا جو ہو خلق کا والی
در ناوکِ دل دوز وہ جسمِ شہِ عالی
طاری ہے غشی دل کو سنبھالا نہیں جاتا

مظلوم مسافر پہ یہ بیداد صد افسوس
ٹوٹے ہوئے ہیں پیاسے پہ جلاد صد افسوس
جز نیزہ و تیغ و تبر آتا نہیں کوئی
بیجاں ہیں رہوار پہ آقائے خوش اوقات
سر پیٹتے ہیں اہل حرم لٹتے ہیں سادات
حالِ شہِ آوارہ وطن دیکھ رہی تھی

لو خاک پہ گھوڑے سے گرے سبطِ پیمبر
سر پیٹتی مقتل کو چلی زینبِ مضطر
سر ننگے نجف سے شہِ مرداں نکل آئے
چلائے ملائک کہ قیامت ہوئی برپا
آندھی ہوئی اک غرب کی جانب سے ہویدا
تیرہ ہوا دن اڑنے لگی خاک جہاں میں

اُس حشر میں احمد کی نواسی کا یہ تھا حال
چلاتی تھی سر پیٹ کے ای فاطمہ کے لال
کیا کیا بے مجھے صدمہ یہ جدائی نہیں دیتی

حکم شہِ والا سے کھڑا ہو گیا رہوار
ڈولا کہ کے نرغے میں گھرے سیدِ ابرار
چلنے لگیں تیغیں بھی سنانیں بھی تبر بھی
اک چاند پہ اُمڈی یہ گھٹا ظلم کی کالی
حلقہ کوئی جوشن کا نہیں تیر سے خالی
اک تیر بھی سینے سے نکالا نہیں جاتا

اک جان ہزاروں ستم ایجاد صد افسوس
شہ کی کوئی سنتا نہیں فریاد صد افسوس
فرزند محمد کو بچاتا نہیں کوئی
بند آنکھیں ہیں خوں بہتا ہے کی جاتی نہیں بات
حامی نہیں کوئی کوئی پرساں نہیں ہیہات
تلواروں میں بھائی کو بہن دیکھ رہی تھی

تھرائی زمیں ہلنے لگا عرش منور
یاں شمرِ ستمگار بڑھا کھینچ کے خنجر
مرقد سے نبی چاک گریباں نکل آئے
گھبرا کے درختوں سے اڑے طایرِ صحرا
تھرانے لگے کوہ اُبلنے لگے دریا
غل ہائے حسینا کا اُٹھا کون و مکاں میں

گرتی تھی کبھی اُٹھتی تھی کھولے ہوئے بال
ہے ہے تمھیں تلواروں میں گھیرے ہیں بد افعال
لاش آپ کی زینب کو دکھائی نہیں دیتی

بھیا نہ مجھے رستہ نہیں ملتا کدھر آؤں — کیونکر تمھیں جلادوں کے پنجے سے چھڑاؤں
بھیا تمھیں اس بھیڑ میں کس طرح سے پاؤں — سب قتل ہوئے بہر مدد کس کو بلاؤں
کہا ہی کہ جو نانا کی سواری نہیں آئی — بھیا نہ مجھے آواز تمھاری نہیں آئی

میں کس کو پکاروں کہ ترس پیاسے پہ کھاؤ — لی جن سے زمیں مول انھیں لوگوں کو بلاؤ
اے اہل زراعت تمھیں امداد کو آؤ — لٹتی ہوئی کھیتی کو محمد کی بچاؤ
کام آؤ غریبوں کے تو احساں ہے تمھارا — یہ بے وطن اس دشت میں مہماں ہے تمھارا

شہ نے جو سنی زاری زینب تہ خنجر — گھبرا کے صدا دی کہ ادھر آؤ نہ خواہر
کیا قہر ہے تم رن میں چلی آئیں کھلے سر — مشغول ہے امت کی دعا میں یہ برادر
مطلوب رضا مندی معبود ہے زینب — تنہا نہیں اللہ تو موجود ہے زینب

کس طرح اٹھیں سینۂ زخمی پہ ہے جلاد — نانا مجھے گودی میں لیے کرتے ہیں فریاد
اماں مرے پہلو میں ہیں اے زینب ناشاد — روتے ہیں بڑے بھائی بھی یہ دیکھ کے بیداد
گریاں و حزیں خاصۂ قیوم کھڑے ہیں — بابا بھی سرہانے مرے مغموم کھڑے ہیں

یہ سنتے ہی دوڑی طرف لاش وہ مضطر — چلائی کہ ہمشیر بھی آتی ہے برادر
لاشے پہ نہ پہونچی تھی کہ برپا ہوا محشر — دیکھا کہ لیے جاتا ہے قاتل سر سرور
سب تیر اسی طرح سے سینے میں گڑے ہیں — اور جلتی زمیں پر شہ دلگیر پڑے ہیں

ہاں پیٹ کے سر روئیں وہ جو اہل عزا ہیں — یاں احمد مختار بھی سرگرم بکا ہیں
مقتل میں کھلے سر حرم شبیر خدا ہیں — خاک اڑتی ہے جنباں طبق ارض و سما ہیں
سر کٹ چکا لخت دل زہرا و علی کا — اب لٹتا ہے ملبوس کہن سبط نبی کا

عمامۂ حضرت لیے جاتا ہے کوئی آہ — بھاگا ہے کوئی لے کے عبائے شہ ذی جاہ
ہاتھوں سے قبا کھینچ رہا ہے کوئی گمراہ — عریاں ہے زمیں پر تن فرزند ید اللہ
اب لشکر کیں لاش کو پامال کرے گا — بعد اس کے ستم لاش پہ جمال کرے گا

خاموش انیس آ گئے نہیں طاقتِ تحریر
عالم جسے رو رہا ہی وہ مظلوم ہی شبیر
خالق سے دعا مانگ کہ اے مالکِ تقدیر
دکھلا دے مجھے آنکھوں سے مزارِ شہِ دلگیر
محسوب ہوں زوارِ امام دوسرا میں
مر جاؤں تو مدفن ہو جوارِ شہدا میں

سلام

مرا رازِ دل آشکارا نہیں
وہ دریا ہوں جس کا کنارا نہیں
وہ گل ہوں جدا سب سے ہی جس کا رنگ
وہ بو ہوں کہ جو آشکارا نہیں
وہ پانی ہوں شیریں نہیں جس میں شور
وہ آتش ہوں جس میں شرارا نہیں
بہت زال دنیا نے دیں بازیاں
میں وہ نوجواں ہوں کہ ہارا نہیں
فقیروں کی مجلس ہی سب سے جدا
امیروں کا یاں تک گزارا نہیں
قطعہ
سکندر کی خاطر بھی ہی سدِ باب
جو دارا بھی ہو تو مدارا نہیں
گئے پہنے نعلین داں مصطفےٰ
فرشتے کا جس جا گذارا نہیں
جہنم سے ہم نے قراروں کو کیا
جو آتش پہ ٹھہرے وہ پارا نہیں
پھرے دوست جب ہو گئی قبر بند
کھلا اب کہ کوئی ہمارا نہیں
گرے ڈگمگا کر زمیں پر حسین
فرس سے کسی نے اتارا نہیں
ترے صبر کے میں فدا یا حسین
چھری کے تلے دم بھی مارا نہیں
کسی نے تری طرح سے اے انیس
عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

مرثیہ ۱۹

میر صاحب کی اولاد میں منجھلے صاحبزادے میر عسکری اپنے خاندانی فن کی طرف متوجہ نہ تھے اور کئی پشت سے یہی ذریعہ معاش تھا میر صاحب نے یہ مرثیہ اُن کو کہہ دیا رئیس اُن کا تخلص رکھ کر مقطع میں بھی رئیس کا نام ڈال دیا مقصود یہ تھا کہ اس سے اُن کو بھی مرثیہ کہنے کا شوق پیدا ہوگا اور یہی ذریعہ معاش ہو جائیگا لیکن میر عسکری صاحب اس فن سے مناسبت نہ رکھتے تھے آخر کو یہ مرثیہ خود میر صاحب کے نام سے مجلسوں میں پڑھا جانے لگا اور حقیقت میں ایک لفظ بھی اس میں میر عسکری کا نہیں ہی۔

نمک خوان تکلم ہی فصاحت میری ناطقے بند ہیں سُن سُن کے بلاغت میری
رنگ اُڑتے ہیں وہ رنگیں ہی عبارت میری شور جس کا ہی وہ دریا ہی طبیعت میری
عمر گذری ہی اسی دشت کی سیاحی میں پانچویں پشت ہی شبیر کی مداحی میں

ایک قطرے کو جو دوں بسط تو قلزم کر دوں بحرِ مواجِ فصاحت کا تلاطم کر دوں
ماہ کو مہر کروں ذرہ کو انجم کر دوں گنگ کو ماہرِ اندازِ تکلم کر دوں
درد سر ہوتا ہی بے رنگ فریاد کریں بلبلیں مجھ سے گلستاں کا سبق یاد کریں

اس ثنا خواں کے بزرگوں میں ہی کیا مداح جد اعلیٰ سا نہ ہوگا کوئی اعلیٰ مداح
باپ مداح کا مداح ہی دادا مداح عمِ ذیقدر ثنا خوانوں میں یکتا مداح
جو عنایات الہٰی سے ہوا نیک ہوا نام بڑھتا گیا جب ایک کے بعد ایک ہوا

طبع ہر ایک کی موزوں قدِ زیبا موزوں
صورت سروِ ازل سے ہیں سراپا موزوں
نثر بے سجع نہیں نظمِ معلّیٰ موزوں
کہیں سکتا نہیں آ سکتا کجا ناموزوں
تول لے عقل کے میزان میں جو فہمیدہ ہے
بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے

خلق میں مثلِ خلیق اور تھا خوشگو کوئی کب
نام لے دھوئے زباں کوثر و تسنیم سے جب
بلبلِ گلشنِ زہرا و علی عاشقِ رب
متبعِ مرثیہ گوئی میں ہوئے جن کے سب
ہو اگر ذہن میں جودت ہے کہ موزونی ہے
اس احاطے سے جو باہر ہے وہ بیرونی ہے

بھائی خوش فکرت و خوش لہجہ و پاکیزہ خصال
جن کا سینہ گہرِ علم سے ہے مالا مال
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ سلاست یہ کمال
معجزہ گر اسے کہیے نہ تو ہے سحرِ حلال
اپنے موقع پہ جسے دیکھیے لاثانی ہے
لطفِ حضرت کا یہ ہے رحمتِ یزدانی ہے

کیوں نہ ہو بندۂ موروثیِ مولا ہوں میں
قلزمِ رحمتِ معبود کا قطرہ ہوں میں
جس میں کھوں دُر و مرجان وہ دریا ہوں میں
مدح خوانِ پسرِ حضرتِ زہرا ہوں میں
وصفِ جوہر کا کروں یا صفتِ ذات کروں
اپنے رتبہ پہ نہ کیوں آپ مباہات کروں

مبتدی ہوں مجھے توقیر عطا کر یارب
شوقِ مداحیِ شبیر عطا کر یارب
سلکِ گوہر ہو وہ تقریر عطا کر یارب
نظم میں رونے کی تاثیر عطا کر یارب
جد و آبا کے سوا اور کی تقلید نہ ہو
لفظ مغلق نہ ہو گنجلک نہ ہو تعقید نہ ہو

وہ مرقع ہو کہ دیکھیں اسے گر اہلِ شعور
ہر ورق میں کہیں سایہ نظر آئے کہیں نور
غل ہو یہ ہے کشش موقلم طرۂ حور
ایک ایک حرف میں ہو صنعتِ صانع کا ظہور
کوئی ناظر جو یہ نایاب لکیریں سمجھے
نقش ارژنگ کو کاواک لکیریں سمجھے

قلزمِ فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ
شمعِ تصویر پہ گرنے لگیں آ آ کے پتنگ
صاف حیرت زدہ مانی ہو تو بہزاد ہو دنگ
خوں برستا نظر آئے جو دکھا دوں صفِ جنگ
رزم ایسی ہو کہ دل سب کے پھڑک جائیں ابھی
بجلیاں تیغوں کی آنکھوں میں چمک جائیں ابھی

روزمرہ شرفا کا ہو سلاست ہو وہی
لب و لہجہ وہی سارا ہو متانت ہو وہی
سامعیں جلد سمجھ لیں جسے صنعت ہو وہی
یعنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی
لفظ بھی چست ہو مضمون بھی عالی ہووے
مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے
سرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے
زیب ہے خال سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
داند آنکس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

بزم کا رنگ جدا رزم کا میداں ہے جدا
یہ چمن اور ہے زخموں کا گلستاں ہے جدا
فہم کامل ہو تو ہر نامہ کا عنواں ہے جدا
مختصر پڑھ کے رلا دینے کا ساماں ہے جدا
دبدبہ بھی ہو مصائب بھی ہوں توصیف بھی ہو
دل بھی محظوظ ہوں رقت بھی ہو تعریف بھی ہو

مطلع

ماجرا صبح شہادت کا بیاں کرتا ہوں
رنج و اندوہ مصیبت کا بیاں کرتا ہوں
تشنہ کاموں کی عبادت کا بیاں کرتا ہوں
جاں نثاروں کی اطاعت کا بیاں کرتا ہوں
جن کا ہمتا نہیں ایک ایک مصاحب ایسا
ایسے بندے نہ کبھی ہونگے نہ صاحب ایسا

صبح صادق کا ہوا چرخ پہ جس وقت ظہور
زمزمہ کرنے لگے یادِ الٰہی میں طیور
مثل خورشید برآمد ہوئے خیمے سے حضور
یک بیک پھیل گیا چار طرف دشت میں نور
شش جہت میں رخ مولا سے ظہورِ حق تھا
صبح کا ذکر ہے کیا چاند کا چہرہ فق تھا

ٹھنڈی ٹھنڈی وہ ہوائیں وہ بیابانِ سحر
دمبدم جھومتے تھے وجد کے عالم میں شجر
اوس نے فرشِ زمرد پہ بچھائے تھے گہر
لوٹی جاتی تھی لہکتے ہوئے سبزے پہ نظر
دشت سے جھوم کے جب بادِ صبا آتی تھی
صاف غنچوں کے چٹکنے کی صدا آتی تھی

بلبلوں کی وہ صدائیں وہ گلوں کی خوشبو
دل کو الجھاتے تھے سنبل کے وہ پرخم گیسو
قمریاں کہتی تھیں شمشاد پہ یا ہو یا ہو
فاختہ کی یہ صدا سرو پہ تھی کوکو کو
وقت تسبیح کا تھا عشق کا دم بھرتے تھے
اپنے معبود کی سب حمد و ثنا کرتے تھے

آئے سجادۂ طاعت پہ امامِ دوجہاں
اُس طرف طبل بجے یہاں ہوئی لشکر میں اذاں
وہ مصلی کہ زباں جن کی حدیث و قرآں
وہ نمازی کہ جو ایماں کے تنِ پاک کی جاں
زاہد ایسے تھے کہ ممتاز تھے ابراروں میں
عابد ایسے تھے کہ سجدے کیے تلواروں میں

عرشِ اعظم کو ہلاتی تھیں دعائیں اُن کی
وجد کرتے تھے ملک سن کے صدائیں اُن کی
وہ عمامے وہ قبائیں وہ عبائیں اُن کی
حوریں لیتی تھیں بصد شوق بلائیں اُن کی
ذکرِ خالق میں لب اُن کے جو ہلے جاتے تھے
غنچے فردوس کے شادی سے کھلے جاتے تھے

کیا جوانانِ خوش اطوار تھے سبحان اللہ
کیا رفیقانِ وفادار تھے سبحان اللہ
صفدر و غازی و جرّار تھے سبحان اللہ
زاہد و عابد و ابرار تھے سبحان اللہ
زن و فرزند سے فرقت ہوئی مسکن چھوڑا
مگر احمد کے نواسے کا نہ دامن چھوڑا

اللہ اللہ عجب فوج عجب غازی تھے
عجب اسوار تھے نے مثل عجب تازی تھے
لائقِ مدح و سزاوارِ سرافرازی تھے
گو بہت کم تھے پہ آمادۂ جانبازی تھے
پیاس ایسی تھی کہ آ گئی جان ہونٹوں پر
صابر ایسے تھے کہ پھیری نہ زباں ہونٹوں پر

زہد میں حضرت سلماں کے برابر تھا کوئی
دولتِ فقر و قناعت میں اباذر تھا کوئی
صدقِ گفتار میں عمار کا ہمسر تھا کوئی
حمزۂ عصر کوئی مالک اشتر تھا کوئی
ہونگے ایسے ہی محمد کے جو شیدا ہونگے
پھر جہاد ایسا نہ ہوگا نہ وہ پیدا ہونگے

گو مصیبت میں تلاطم میں تباہی میں رہے
سر کٹے پاؤں مگر راہِ الٰہی میں رہے
یوں سرافراز وہ سب لشکرِ شاہی میں رہے
جس طرح تیغِ دودم دستِ سپاہی میں رہے
اس مصیبت میں نہ پایا کبھی شاکی اُن کو
آبروِ ساقیِ کوثر نے عطا کی اُن کو

وہ تخشع وہ تضرع وہ قیام اور وہ قعود
وہ تذلل وہ دعائیں وہ رکوع اور وہ سجود
یادِ حق دل میں تو سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ درود
یہ دعا خالقِ اکبر سے کہ اے ربِّ ودود
یوں لٹیں ہم کہ نہ آل اور نہ اولاد رہے
مگر احمد کے نواسے کا گھر آباد رہے

موم فولاد ہوا آوازوں میں وہ سوز و گداز
اپنے معبود سے سجدوں میں عجب راز و نیاز
سر تو سجادوں پہ تھے عرش معلیٰ پہ نماز
شیر دل منتخب دہر وحید و ممتاز
چاند شرمندہ ہو چہرے متجلی ایسے
نہ امام ایسا ہوا پھر نہ مصلی ایسے

جب فریضہ کو ادا کر چکے وہ خوش کردار
کس کے کمروں کو لپٹ کر بشوق لگائے ہتھیار
جلوہ فرما ہوئے گھوڑے پہ شہ عرش وقار
علم فوج کو عباس نے کھولا اک بار
دشت میں نکہت فردوس بریں آنے لگی
عرش تک اس کے پھریرے کی ہوا جانے لگی

لہر وہ سبز پھریرے کی وہ پنجے کی چمک
شرم سے ابر میں چھپ جاتا ہے خورشید فلک
کہتے تھے صل علیٰ عرش پہ اٹھا اٹھ کے ملک
دنگ تھے سب سماں سے تھا سما تا بہ سمک
کہیے پستی اسے جو اوج ہما نے دیکھا
وہ سماں پھر نہ کبھی ارض و سما نے دیکھا

اس طرح جب علم دلبر زہرا جائے
کس سے پھر معرکۂ رزم میں ٹھہرا جائے
سانپ دشمن کی نہ کیوں چھاتی پہ لہرا جائے
لہریں تا بہ فلک جس کا پھریرا جائے
رفع شر کو علم خیر بشر آیا تھا
سورۂ نصر پئے فتح و ظفر آیا تھا

وہ علمدار کہ جو شیر الٰہی کا خلف
گوہر بحر وفا نیر دیں در نجف
فخر حمزہ سے نمودار تھا جعفر کا شرف
کس طرح چاند کہوں چاند میں ہے عیب کلف
کس نے پایا وہ جو تھا جاہ و حشم ان کے لیے
یہ علم کے لیے تھے اور علم ان کے لیے

سرو شرمائے قد اس طرح کا قامت ایسی
اسد اللہ کی تصویر تھے صورت ایسی
شیر نعروں سے دہل جاتے تھے صولت ایسی
جا کے پانی نہ پیا نہر میں ہمت ایسی
جان جب تک تھی اطاعت میں رہے بھائی کی
تھے علمدار مگر بچوں کی سقائی کی

وہ بہشتی نے کہا جس کو وفا کہتے ہیں
سب انہیں عاشق شاہ شہدا کہتے ہیں
جو بہادر ہیں وہ شمشیر خدا کہتے ہیں
ان کو قبلہ تو انہیں قبلہ نما کہتے ہیں
عشق سردار و علمدار کا افسانہ ہے
وہ چراغ رہ دیں ہے تو یہ پروانہ ہے

اک طرف اکبر مہرو سا جوانِ نایاب
کچھ جو بچپن تھا تو کچھ آمدِ ایامِ شباب
روشنی چہرے پہ ایسی کہ خجل ہو مہتاب
آنکھیں ایسی کہ رہا نرگسِ شہلا کو حجاب
جس نے ان گیسوؤں میں رخ کی ضیا کو دیکھا
شبِ معراج میں محبوبِ خدا کو دیکھا

اے خوشا حسنِ رخِ یوسفِ کنعانِ حسن
راحتِ روحِ حسین ابن علی جانِ حسن
جسم میں زورِ علی طبع میں احسانِ حسن
ہمہ تن خلق حسن حسن شانِ حسن
تن پہ کرتی تھی نزاکت سے گرانی پوشاک
کیا بھلی لگتی تھی بچپن میں شہانی پوشاک

اللہ اللہ اسد اللہ کے نواسوں کا جلال
چاند سے چہروں پہ بل کھائے ہوئے زلفوں کے بال
نیمچے کاندھوں پہ رکھے ہوئے مانندِ ہلال
گرچہ بچپن تھا پہ رستم کو سمجھتے تھے وہ زال
صف سے گھوڑوں کو بڑھا کر جو پلٹ جاتے تھے
مورچے لشکرِ کفار کے ہٹ جاتے تھے

آستینوں کو چڑھائے ہوئے آمادۂ جنگ
وہی سارا اسد اللہ کا نقشہ وہی ڈھنگ
سرخ چہرے تھے کہ شیروں کا یہی ہوتا ہے رنگ
ولولہ صف کے الٹنے کا لڑائی کی امنگ
جسم پر تیر چلیں نیزۂ خونخوار چلے
شوق اس کا تھا کہ جلدی کہیں تلوار چلے

یک بیک طبل بجا فوج کے گرجے بادل
کوہ تھرّائے زمیں ہل گئی گونجا جنگل
پھول ڈھالوں کے چمکنے لگے تلواروں کے پھل
مرنے والوں کو نظر آنے لگی شکلِ اجل
واں کے چاؤش بڑھانے لگے دل لشکر کا
فوجِ اسلام میں نعرہ ہوا یا حیدر کا

شور میدانیوں میں تھا کہ دلیرو نکلو
نیزہ بازی کرو رہواروں کو پھیرو نکلو
نہر قابو میں ہے اب پیاسوں کو گھیرو نکلو
غازیو صف سے بڑھو غول سے شیرو نکلو
رستمو دادِ وغا دو کہ یہ دن داد کا ہے
سامنا حیدرِ کرار کی اولاد کا ہے

شور سادات میں تھا یا شہِ مرداں مدد دے
کعبۂ دیں مدد دے قبلۂ ایماں مدد دے
قوتِ بازوئے پیغمبرِ ذیشاں مدد دے
دمِ تائید ہے اے فخرِ سلیماں مدد دے
تیسرا فاقہ ہے طاقت میں کمی ہے مولا
طلب قوتِ ثابت قدمی ہے مولا

پیاس میں حرف نہ شکوے کا زباں پر لائیں
سینہ صاف پہ فاقوں میں سنانیں کھائیں
دل نہ تڑپے جو دمِ نزع نہ پانی پائیں
تیرے فرزند کی تائید کریں مرجائیں
لاشے مقتل میں یوں لاشِ شہِ دلگیر کے پاس
سر ہو نیزے پہ سرِ حضرت شبیر کے پاس

مطلع

سامنے بڑھ کے یکایک صفِ کفار آئی
جھوم کر تیرہ گھٹا تاروں پہ یکبار آئی
روز روشن کے چھپانے کو شبِ تار آئی
تشنہ کاموں کی طرف تیروں کی بوچھار آئی
ہنس کے منہ بھائی کا شاہِ شہداء نے دیکھا
اپنے آقا کو بحسرت رفقا نے دیکھا

عرض عباس نے کی جوش ہے جراروں کو
تیر سب کھاتے ہیں تولے ہوئے تلواروں کو
میہمانوں کا نہیں پاس ستمگاروں کو
مصلحت ہو تو رضا دیجیے غمخواروں کو
روسیاہوں کو ہٹا دیں کہ بڑھے آتے ہیں
ہم جو خاموش ہیں وہ منہ پہ چڑھے آتے ہیں

شہ نے فرمایا مجھے خود ہی شہادت منظور
نہ لڑائی کی ہوس ہے نہ شجاعت کا غرور
ان سے منظور نہ تھی جنگ کہ اب ہوں مجبور
خیر لڑ لو کہ ستاتے ہیں یہ بے جرم و قصور
ذبح کرنے کے لیے لشکرِ ناری آئے
کہیں جلدی میرے سر دینے کی باری آئے

حکم پاتا تھا کہ شیروں نے اڑائے تازی
مثل شہباز گیا ایک کے بعد اک غازی
واہ رے حرب خوشا ضرب کہ ہے جاں بازی
اڑ گیا ہاتھ بڑھا جو پئے دست اندازی
تن و سر لوٹتے ریتی پہ نظر آتے تھے
ایک حملے میں قدم فوج کے اٹھ جاتے تھے

جس پہ غصہ میں گئے صید پہ شہباز گرا
یہ کماں کٹ کے گری وہ قدر انداز گرا
جب گرا خاک پہ گھوڑے سے تو ممتاز گرا
نہ اٹھا پھر کبھی جو تفرقہ پرداز گرا
ہاتھ منہ کٹ گئے سر اڑ گئے جی چھوٹ گئے
مورچے ڈھ گئے پامال پرے ٹوٹ گئے

مطلع

بعد غیروں کے عزیزوں نے کیا عزم نبرد
سر کو نہیوڑا کے بھرا سبطِ نبی نے دمِ سرد
ہوک اٹھتی کبھی سینے میں تو دل میں کبھی درد
سرخ ہوتا تھا کبھی چاند سا چہرہ کبھی زرد
کوئی گل رو تو کوئی سروِ سہی بالا تھا
وہ بچھڑنے لگے گودی میں جنھیں پالا تھا

زلفوں والا تھا کوئی کوئی مرادوں والا　　کوئی بھائی کا پسر کوئی بہن کا پالا
چاند سا منہ جو کسی کا تھا تو گیسو ہالا　　کوئی قامت میں بہت کم کوئی قد میں بالا
نوجواں کو نسا خوشرو و خوش انداز نہ تھا　　کتنے ایسے تھے کہ سبزہ ابھی آغاز نہ تھا

ہاتھ وہ بچوں کے اور چھوٹی سی وہ تلواریں　　موم کر دیتی تھیں فولاد کو جن کی دھاریں
آب ہو شیر کا زہرہ جسے وہ للکاریں　　بجلیاں کوند رہی ہیں کسے نیزہ ماریں
کس بشاشت سے ہزاروں پہ دلیر آتے ہیں　　بچے آئینے ہیں بپھرے ہوئے شیر آتے ہیں

یہی ہنگامہ رہا صبح سے تا وقتِ زوال　　لاش پر لاش گری بھر گیا میدانِ قتال
مورچے سب تہ و بالا تھے پرے سب پامال　　سرخرو خلق سے اٹھے اسد اللہ کے لال
کھیت ایسے بھی کسی فوج میں کم پڑتے ہیں　　جو لڑا سب یہی سمجھے کہ علی لڑتے ہیں

قاسم و اکبر و عباس کا اللہ رے جہاد　　الاماں کا تھا کہیں شور کہیں تھی فریاد
غل ہر اک ضرب پہ تھا اب ہوئی بنیا برباد　　دے گئے خلق میں مردانگی و حرب کی داد
گو وہ دنیا میں نہیں عرش مقام ان کے ہیں　　آج تک عالمِ ایجاد میں نام ان کے ہیں

مطلع

دوپہر میں وہ چمن بادِ خزاں نے لوٹا　　پتا پتا ہوا تاراج تو بوٹا بوٹا
باپ بیٹے سے چھٹا بھائی سے بھائی چھوٹا　　ابنِ زہرا کی کمر جھک گئی بازو ٹوٹا
پھر نہ یاور نہ وہ جانباز نہ وہ شیدا تھے　　ظہر کے وقت حسین ابن علی تنہا تھے

ساتھ جو جو کہ بہادر تھے وطن سے آئے　　سامنے سوتے تھے ریتی پہ سنانیں کھائے
دھوپ میں پیاس سے مثلِ گلِ تر مرجھائے　　مر گئے پر نہ غریبوں نے کفن تک پائے
دھوپ پڑتی تھی یہ دن چرخ نے دکھلایا تھا　　نہ تو چادر تھی کسی لاش پہ نہ سایا تھا

صاحبِ فوج پہ طاری تھا عجب رنج و ملال　　زرد تھا رنگ تو آنکھیں تھیں لہو رونے سے لال
کبھی بھائی کا الم تھا کبھی بیٹے کا خیال　　کبھی دھڑکا تھا کہ لاشیں نہ کہیں ہوں پامال
کبھی بڑھتے تھے وغا کو کبھی رک جاتے تھے　　سیدھے ہوتے تھے کبھی اور کبھی جھک جاتے تھے

بڑھ کے چلاتے تھے بیدرد کہ آپ آئیں
جوہر تیغ شہنشاہ نجف دکھلائیں
مرنے والے نہیں جیتے جو سناں ہیں کھائیں
کاٹ لیں آپ کا سر تن سے تو فرصت پائیں
پسر سعد سے وعدہ ہے صلہ لینے کا
حکم ہے خیمۂ اقدس کے جلا دینے کا

شہ نے فرمایا کہ سر کاٹ لو حاضر ہوں میں
نہ تو لڑنے میں نہ مرجانے میں قاصر ہوں میں
فوج بھی اب نہیں نے یاور و ناصر ہیں
شہر و صحرا ابھی تمھارا ہی مسافر ہوں میں
لوٹ لو پھونک دو تاراج کرو بہتر ہے
کلمہ گو ہو یہ تمھارے ہی نبی کا گھر ہے

کئی سیدانیاں خیمے میں ہیں پردے والی
جن کا رتبہ ہے زمانہ میں ہر ایک پر عالی
اب نہ وارث ہے کوئی سر پہ نہ کوئی والی
ان کو دیکھو کوئی رہ جائے جو خیمہ خالی
یہ نبی زادیاں بے پردہ نہ ہوئیں جس میں
ایک گوشہ ہو کہ سب بیٹھ کے روئیں جس میں

سن کے ان باتوں کا اعدا نے دیا جو کہ جواب
گر لکھوں ان کو تو ہو جائے جگر سنگ کا آب
قلب تھرا گیا ہرگز نہ رہی ضبط کی تاب
دیکھ کر رہ گئے گردوں کو شہ عرش جناب
اشک خالی اُسے کرتے ہیں جو دل بھر آئے
آپ رونے کے لیے خیمے کے در پر آئے

تھم کے چلائے کہ اے زینب و ام کلثوم
تم سے رخصت کو پھر آیا ہے حسین مظلوم
اب مرے قتل کے درپے ہے یہ سب لشکر شوم
ہاں جگا دو اُسے غش ہو جو سکینہ معصوم
نہیں ملتا جو زمانہ سے گزر جاتا ہے
کہدو عابد سے کہ مرنے کو پدر جاتا ہے

یہ صدا سن کے حرم خیمے سے مضطر دوڑے
شہ کی آواز پہ سب بیکس و بے پر دوڑے
گر پڑیں سر سے ردائیں تو کھلے سر دوڑے
بچے روتے ہوئے ماؤں کے برابر دوڑے
رو کے چلائی سکینہ شہ والا آؤ
میں تمھیں ڈھونڈھتی تھی دیر سے بابا آؤ

آؤ اچھے مرے بابا میں تمھارے واری
دیکھو تم بن ہیں گلے تک مرے آنسو جاری
آج یہ کیا ہے کہ بھولے مری خاطرداری
ہاتھ پھیلا کے کہا میری بیٹی پیاری
منھ چھپانے کی ہے کیا وجہ نہ شرماؤ تم
اب میں پانی بھی نہ مانگوں گی چلے آؤ تم

دیکھ کر پردے سے کہنے لگی یہ زینبِ زار
ابنِ زہرا تری مظلومی و غربت کے نثار

آؤ چادر سے کروں پاک میں چہرے کا غبار
شہ نے فرمایا بہن مر گئے سب مونس و یار

تم نے پالا تھا جسے ہم اُسے رو آئے ہیں
علی اکبر سے جگر بند کو کھو آئے ہیں

مُنھ دکھائیں کسے سب سے ہے ندامت زینب
گھر میں آنے کی نہیں بھائی کو مہلت زینب

کھینچ لائی ہے سکینہ کی محبت زینب
بھائی جاتا ہے دکھا دو ہمیں صورت زینب

نہ تو سر کھولو نہ منھ پیٹو نہ فریاد کرو
بھول جاؤ ہمیں اللہ کو اب یاد کرو

صبر سے خوش ہے خدا اے مری غمخوار بہن
سہل ہو جاتا ہے جو امر ہو دشوار بہن

اپنی ماں کا ہے طریقہ تمھیں درکار بہن
پھر میں کہتا ہوں سکینہ سے خبردار بہن

ناز پرور ہے مرے بعد الم اس پہ نہ ہو
بندے کانوں سے اُتارو کہ ستم اس پہ نہ ہو

کہیو عابد سے یہ پیغام میرا بعدِ سلام
غش تھے تم پھر گئے دروازے تلک آ کے امام

قید میں پھنس کے نہ گھبرائیو تم اے گلفام
کاٹیو صبر و رضا سے سفرِ کوفہ و شام

ناؤ منجدھار میں ہے شورِ تلاطم جانو
ناخدا جاتا ہے گھر جانے بس اب تم جانو

کہہ کے یہ باگ پھرائی طرف لشکرِ شام
پڑ گیا خیمۂ ناموسِ نبی میں کہرام

رن میں گھوڑے کو اڑاتے ہوئے آئے جو امام
رعب سے فوج کے دل ہل گئے کانپے اندام

سر جھکے اُن کے جو کامل تھے زباں دانی میں
اُڑ گئے ہوش فصیحوں کے رجز خوانی میں

تھا یہ نعرہ کہ محمد کا نواسا ہوں میں
مجھکو پہچانو کہ خالق کا شناسا ہوں میں

زخمی ہونے سے نہ مرنے سے ہراسا ہوں میں
تیسرا دن ہے یہ گرمی میں کہ پیاسا ہوں میں

چین کیا چیز ہے آرام کسے کہتے ہیں
اس پہ شکوہ نہیں کچھ صبر اسے کہتے ہیں

اُس کا پیارا ہوں جو ہے ساقیِ حوضِ کوثر
اُس کا بیٹا ہوں جو ہے فاتحِ بابِ خیبر

اُس کا فرزند ہوں کی جس نے مہم بدر کی سر
اُس کا دلبر ہوں میں دی جس کو نبی نے دختر

صاحبِ تخت ہوئے تیغ ملی تاج ملا
دوشِ احمد پہ انھیں رتبۂ معراج ملا

وہ علی حق نے جسے عرش سے بھیجی شمشیر
وہ علی جس کا دو عالم میں نہیں کوئی نظیر
وہ علی جو ہوا احمد کا وصی روزِ غدیر
وہ علی جس کی رسولوں سے سوا ہے توقیر
وہ علی سب سے زیادہ ہے عبادت جس کی
وہ علی گھر میں خدا کے ہے ولادت جس کی

بے وطن ہوں نہ مسافر کو ستاؤ للہ
قتل کیوں کرتے ہو تم کونسا ہے میرا گناہ
اب کوئی ساتھ نہ یاور ہے نہ لشکر سپاہ
تم کو لازم ہے غریبوں پہ ترحم کی نگاہ
ہاتھ آئیگا نہ انعام نہ زر پاؤ گے
یاد رکھو میرا سر کاٹ کے پچھتاؤ گے

نہ ابھی ختم ہوئی تھی یہ مسلسل تقریر
حجت اللہ کے فرزند پہ چلنے لگے تیر
جھوم کر تیغ کے قبضہ کو پکارے شبیر
لو خبردار چمکتی ہے علی کی شمشیر
پسرِ فاتحِ صفین و حنین آتا ہے
لو صفیں باندھ کے روکو تو حسین آتا ہے

کھنچی تیغِ دو سر فوج پہ آفت آئی
لو ہلا قائمۂ عرش قیامت آئی
فتح تسلیم کو آداب کو نصرت آئی
فخر سے غاشیہ برداری کو شوکت آئی
چوم لوں پاؤں جلال اس تگ و دو میں آیا
ہاتھ جوڑے ہوئے اقبال جلو میں آیا

آپ سنبھلے جو ہوئے رخش نے بدلے تیور
دونوں آنکھیں ابل آئیں کہ ڈرے بانیٔ شر
تھوتھنی مل گئی سینے سے کیا دم کو چنور
مثلِ طاؤس اڑا گاہ ادھر گاہ اُدھر
دمبدم گرد نسیمِ سحری پھرتی تھی
جھوم کر پھرتا تھا گویا کہ پری پھرتی تھی

ابرِ ڈھالوں کا اُٹھا تیغِ دو پیکر چمکی
برق چھپتی ہے یہ چمکی تو برابر چمکی
سوئے پستی کبھی کوندی کبھی سر پر چمکی
کبھی انبوہ کے اندر کبھی باہر چمکی
جس طرف آئی وہ ناگن اُسے ڈستے دیکھا
مینہ سروں کا صفِ دشمن میں برستے دیکھا

دھار ایسی کہ رواں ہوتا ہے دھارا جیسے
گھاٹ وہ گھاٹ کہ دریا کا کنارا جیسے
چمک ایسی کہ حسینوں کا اشارا جیسے
روشنی وہ کہ گرے ٹوٹ کے تارا جیسے
کوندنا برق کا شمشیر کی ضو میں دیکھا
کبھی ایسا نہیں دم خم مہِ نو میں دیکھا

اک اشارے میں ابرکوئی وتھا کوئی چار
نہ پیادہ کوئی بچتا تھا سلامت نہ سوار
برق گرتی تھی کہ چلتی تھی صفوں پہ تلوار
غضب اللہ علیہم کے عیاں تھے آثار
موت ہر غول کو برباد کیے جاتی تھی
آگ گھیرے ہوئے دوزخ میں لیے جاتی تھی

تیغیں عاری ہوئیں ڈھالوں کے اڑے پرکالے
بند سب بھول گئے خوف سے نیزوں والے
جو بڑھے ہاتھ سر دست قلم کر ڈالے
تیغ کہتی تھی یہ سب ہیں مرے دیکھے بھالے
صف پہ صف باندھ کے نیزوں کو عبث تولے ہیں
ایسے عقدے مرے ناخن نے بہت کھولے ہیں

جب کبھی جائزہ فوج ستم لیتی ہوں
موت سے رحم نہ کرنے کی قسم لیتی ہوں
دو زبانوں سے سدا کار قلم لیتی ہوں
چہرے کٹ جاتے ہیں لشکر کے تو دم لیتی ہوں
ہر طرف ہو کے عدم کے سفری ہوتے ہیں
طبلقیں کٹتی ہیں چہرے نظری ہوتے ہیں

وہ برش اور وہ چمک اور وہ صفائی اس کی
کسی تلوار نے تیزی نہیں پائی اس کی
اس کا بازو جو اڑا یا تو کلائی اس کی
جس کی گردن سے وہ گزری چل آئی اس کی
صورت مرگ کسی نے بھی نہ آتے دیکھا
سر پہ چمکی تو کمر سے اسے جاتے دیکھا

کبھی ڈھالوں پہ گری اور کبھی تلواروں پر
پیدلوں پر کبھی آئی کبھی سواروں پر
کبھی ترکش پہ رکھا منھ کبھی سوفاروں پر
کبھی سر کاٹ کے آ پہونچی کمانداروں پر
گر کے اس غول سے اٹھی تو اس انبوہ میں تھی
کبھی دریا میں کبھی رن میں کبھی کوہ میں تھی

کبھی چہرہ کبھی شانہ کبھی پیکر کاٹا
کبھی در آئی گلے میں تو کبھی سر کاٹا
کبھی مغفر کبھی جوشن کبھی بکتر کاٹا
طول میں راکب و مرکب کو برابر کاٹا
برش تیغ کا غل قاف سے تا قاف رہا
پی گئی خون ہزاروں کا یہ منھ صاف رہا

نہ رکی خود پہ وہ اور نہ سر پر ٹھہری
نہ کسی تیغ پہ دم بھر نہ سپر پر ٹھہری
نہ جبیں پر نہ گلے پر نہ جگر پر ٹھہری
کاٹ کر زیں کو نہ گھوڑے کی کمر پر ٹھہری
جان گھبرا کے تن دشمن دیں سے نکلی
ہاتھ بھر ڈوب کے تلوار زمیں سے نکلی

کٹ گئی تیغ تلے جب صفِ دشمن آئی
یک بیک فصلِ فراقِ سر و گردن آئی
بگڑی اس طرح لڑائی کہ نہ کچھ بن آئی
تیغ کیا آئی کہ اڑتی ہوئی ناگن آئی
غل تھا بھاگو کہ یہ ہنگام ٹھہرنے کا نہیں
زہر اس کا جو چڑھے گا تو اترنے کا نہیں

وہ چمک اس کی سروں کا وہ برسنا ہر سو
گھاٹ سے تیغ کے اک حشر بپا تھا لبِ جو
آب میں صورتِ آتش تھی جلا دینے کی خو
اور دم بڑھتا تھا پیتی تھی جو اعدا کا لہو
کبھی جوشن تو کبھی صدر کشادہ کاٹا
جب چلی ضربت سابق سے زیادہ کاٹا

تنِ تنہا شہِ دیں لاکھ سواروں سے لڑے
نے سپر برچھیوں والوں کی قطاروں سے لڑے
صورتِ شیرِ خدا ظلم شعاروں سے لڑے
دو سے اک لڑ نہیں سکتا یہ ہزاروں سے لڑے
گر ہو غالب تو ہزاروں پہ وہی غالب ہو
جو دل و جانِ علی ابن ابی طالب ہو

تیسرے فاقہ میں جنگ یہ حملے یہ جدال
پیاس وہ پیاس کہ نیلم تھے سراسر لبِ لال
دھوپ وہ دھوپ کہ سوکھے ہوئے تھے تازہ نہال
لو وہ لو جس کی حرارت سے پگھلتے ہیں جبال
سنگریزوں میں تب و تاب ہے انگاروں کی
سر پہ یا دھوپ تھی یا چھاؤں تھی تلواروں کی

تیر سے بچتے کبھی جنگل میں ترائی میں کبھی
ڈھال کو چہرے پہ روکا نہ لڑائی میں کبھی
تیغِ حیدر نے کمی کی نہ صفائی میں کبھی
فرق آیا نہ سر و تن کی جدائی میں کبھی
کبھی ابرو کا بھی ایسا نہ اشارا دیکھا
جس پہ اک بار چلی اس کو دوپارا دیکھا

آنکھ وہ آنکھ کہ شیروں کی جلالت جس میں
رخش وہ رخش کہ سب برق کی سرعت جس میں
تیغ وہ تیغ عیاں موت کی صورت جس میں
ہاتھ وہ ہاتھ یداللہ کی طاقت جس میں
روک لے وار جگر کیا کسی بے پیر کا ہے
زور وہ جس میں اثر فاطمہ کے شیر کا ہے

جنگ میں پیاس کا صدمہ شہِ دیں سے پوچھو
تنِ تنہا کی وغا لشکرِ کیں سے پوچھو
زلزلہ دشت پر آفت کا زمیں سے پوچھو
ضربِ شمشیرِ دو سر روحِ امیں سے پوچھو
باپ اس فوج میں تنہا پسر اِس لشکر میں
کربلا میں یہ تلاطم ہوا یا خیبر میں

اسد اللہ کے صدقے شہ والا کے نثار — وہی حملے تھے وہی زور وہی تھی تلوار
فتح حیدر نے کیا جنگ میں خیبر کا حصار — مورچے فوج کے حضرت نے بھی توڑے کئی بار
کیوں نہ ہوں حمد مرسل کے نواسے تھے حسین — فرق اتنا تھا کہ دو روز کے پیاسے تھے حسین

ہر طرف فوج میں غل تھا کہ دہائی مولا — ہم نے دیکھی تیرے ہاتھوں کی صفائی مولا
الاماں خوب سزا جنگ کی پائی مولا — آپ کرتے ہیں بروں سے بھی بھلائی مولا
ہاتھ ہم باندھتے ہیں چھینئے شمشیروں کو — بخشئے امتِ نااہل کی تقصیروں کو

آئی ہاتف کی یہ آواز کہ ای عرش مقام — یہ وغا تیسرے فاقہ میں بشر کا نہیں کام
ای محمد کے جگر بند امام ابن امام — لوحِ محفوظ پہ مرقوم ہے صابر تیرا نام
اب نہیں حکم لعینوں سے وغا کرنے کا — ہاں یہی وقت ہے وعدے کے وفا کرنے کا

آج ہے آٹھ بہشتوں کی نئی تیاری — نخل سرسبز ہیں فردوس میں نہریں جاری
سب سے حوریں ہیں مکلل بجواہر ساری — خانۂ دوست میں ہے دوست کی مہمانداری
پیشوائی کو رسول الثقلین آتے ہیں — عرش تک شور یہی ہے کہ حسین آتے ہیں

تھم گئے سن کے یہ آواز شہ جن و بشر — روک کر تیغ کو فرمایا کہ حاضر ہے یہ سر
عید ہو جلد اگر ذبح کریں بانی شر — شمر ظالم ہے کدھر کھینچکے آئے خنجر
ہے وہ عاشق جو فدا ہونے کو موجود رہے — بس مری فتح یہی ہے کہ وہ خوشنود رہے

کہہ کے یہ میان میں مولا نے رکھی تیغ دودم — ہاتھ اٹھا کر یہ اشارہ کیا گھوڑے سے کہ تھم
رہ گیا سر کو ہلا کر فرسِ تیز قدم — چار جانب سے مسافر پہ چلے تیر ستم
نیزے یوں گرد تھے جیسے گلِ پُرخاروں میں — چھپ گئے سبطِ نبی ظلم کی تلواروں میں

پہلے تیروں سے کمانداروں نے چھاتی چھانی — نیزے پہلو پہ لگاتے تھے ستم کے بانی
سر پہ تلواریں چلیں زخمی ہوئی پیشانی — خوں سے تر ہو گیا حضرت کا رخ نورانی
جسم سب چور تھا پرزے تھے زرہ جامے کے — پیچ کٹ کٹ کے کھلے جاتے تھے عمامے کے

برچھیاں مارتے تھے گھاٹ پہ جو تھے پہرے

ایک ہزار اور کئی سو زخم تھے تن پر گہرے

خوں میں ڈوبا ہوا وہ مصحفِ رخ سارا تھا

ہاتھ سے باگ جدا تھی تو رکابوں سے قدم

بہتے تھے پہلوؤں سے خوں کے دریرے پیہم

مارے تلواروں کے مہلت تھی نہ دم لینے کی

دشت سے آتی تھی زہرا کی صدا ہائے حسین

در سے چلّاتی تھی زینب مرے ماں جائے حسین

فاطمہ رو رہی ہے ہاتھوں سے پہلو تھامے

ہائے سیّد تیرا تن اور ستم کے بھالے

اُس پہ یہ ظلم دکھوں سے جسے زہرا پالے

کون فریاد سُنے بے سر و سامانوں کی

نہ رہا جب کہ ٹھہرنے کا فرس پر یارا

غش سے کچھ دیر میں چونکا جو علی کا پیارا

واں تو نیزے کی انی پشت سے باہر نکلی

کھینچ کر سینے سے نیزہ جو بڑھا دشمنِ دیں

تیز کرتا ہوا خنجر کو بڑھا شمرِ لعیں

کیا کہوں تیغ کو کس طرح گلے پر رکھا

ڈھانپ کر ہاتھوں سے مُنہ بنتِ علی چلّائی

ضرب اول تھی کہ تکبیر کی آواز آئی

اُٹھ کے دوڑی تھی کہ ہنگامۂ محشر دیکھا

کس طرف جائے کہاں تیغوں میں بیکس ٹھہرے

دیکھنے والوں کے ہو جاتے تھے پانی زہرے

جزو ہر اک تنِ شبیر کا سی پارا تھا

غش میں سیدھے کبھی ہوتے تھے فرس پر کبھی خم

کوئی بیکس کا مددگار نہ تھا ہائے ستم

کوششیں ہوتی تھیں کعبہ کے گرا دینے کی

میرے بیکس مرے بے بس مرے دکھ پائے حسین

کون تیغوں سے بچا کر تجھے لے آئے حسین

حکم گر ہو تو بہن دوڑ کے بازو تھامے

کس کو چلّاؤں کہ جیتے نہیں مرنے والے

کون سر سے ترے تلواروں کی آفت ٹالے

یاں تو بستی بھی نہیں کوئی مسلمانوں کی

گر پڑا خاک پہ وہ عرشِ خدا کا تارا

نیزہ سینے پہ سناں ابنِ انس نے مارا

یاں بہن خیمہ کی ڈیوڑھی سے کھلے سر نکلی

جھک کے حضرت نے رکھی خاک پہ سجدے میں جبیں

آسماں ہل گئے تھرّا گئی مقتل کی زمیں

پاؤں قرآں پہ رکھا حلق پہ خنجر رکھا

ذبح ہوتے ہو میرے سامنے ہے ہے بھائی

گر پڑی خاک پہ غش کھا کے علی کی جائی

منہ جو کھولا تو سرِ شہ کو سناں پر دیکھا

روکے چلائی کہ ہے ہے مرے مظلوم حسین
کچھ مجھے آنکھوں سے ہوتا نہیں معلوم حسین
مڑ کے دیکھو کہ مصیبت میں پڑی ہوں بھائی
بس انیس آگے نہ لکھ زینب ناشاد کے بین
قبر میں بھی نہ ملا احمد مختار کو چین
کتنے گھر شاہ کے مر جانے سے برباد ہوئے

فوج اعدا میں ترے قتل کی ہے دھوم حسین
ہائے میں رہ گئی دیدار سے محروم حسین
ننگے سر بلوۂ اعدا میں کھڑی ہوں بھائی
قتل ہو جانے پہ بھی دھوپ میں ہے لاش حسین
گھر جلا قید ہوئی آل رسول الثقلین
لٹ گئے یوں کہ نہ سادات پھر آباد ہوئے

رباعی

ہر دم غم سبط شہ لولاک کیا
جب نام لیا چشم کو نمناک کیا
تر ہو گیا رومال تو پھاڑا دامن
پایا نہ گریباں تو جگر چاک کیا

مرثیہ ۲

نکلی جو رن میں تیغِ حسینی غلاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشتِ مصاف سے
اُڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے
طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

لرزہ تھا تحت و فوق و جنوب و شمال میں
مضطر تھے شش جہت کے مکیں ایک حال میں
سکان غرب و شرق تھے بیم و زوال میں
غل تھا کہ گھر گئے غضبِ ذوالجلال میں
شہ کا غضب نمونۂ قہرِ الٰہ تھا
تلوار کیا علم تھی کہ عالم تباہ تھا

راحت میں جن و انس و ملک کے خلل پڑے
کھا کھا کے جوش خاک سے چشمے اُبل پڑے
قلزم میں ڈر کے مردمِ آبی اُچھل پڑے
بیلِ الم سے غولِ جنوں کے نکل پڑے
اُلٹی زمیں سبھوں کے دلوں پر یہ بن گئی
پریوں کے ہوش اُڑ گئے جانوں پہ بن گئی

اُٹھا جو الحفیظ کا روحانیوں میں شور
چلائے گرگ شیر و غزالان و مار و مور
مُردے دہل کے چونک پڑے سب میانِ گور
ہے بازوئے حسین میں دستِ خدا کا زور
اُلٹے ہیں مثلِ شیرِ خدا آستیں کو
اے کردگارِ عرش بچا لے زمین کو

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغِ شررفشاں
غار اژدروں سے چھٹ گئے شیروں سے نیستاں
تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
برپا تھا بر و بحر میں اک شورِ الاماں
مانند موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

تاریک تھا چکاروں کی آنکھوں میں سب جہان
بن سے سیاہ گوش بھی بھاگے دبا کے کان
مضطر تھے شیر و گرگ نکالے ہوئے زبان
غل تھا یہ دام و دو میں کیونکر بچے گی جان
تیغِ علی علم تھی جو دشتِ قتال میں
چیتوں نے منہ چھپا کے تھے گینڈوں کی ڈھال میں

گھڑیال زیرِ آب تھے مضطر ادھر اُدھر
تھی مچھلیوں کے چہروں پہ گرداب کی سپر
گھر چھٹ گئے تھے جانوروں کے بہ رنگ تھے

غل تھا کہ ضربِ تیغِ علی سے خدا بچائے
قہرِ خدا سے بچ کے کوئی کس طرف کو جائے
فولاد ہو کہ سنگ یہ منہ موڑتی نہیں

اعدا پہ جبکہ تیغِ شہِ لافتا چلی
غل پڑ گیا کہ صرصرِ قہرِ خدا چلی
غل تھا غضبِ حسین کا قہرِ الٰہی

تھرا رہے تھے شیر زہے ہیبتِ حسین
فاقوں میں کم ہوئی تھی نہ کچھ طاقتِ حسین
سوکھی ہوئی زباں پہ کسی کا گلا نہ تھا

فاقوں سے رنگ زرد تو لب پیاس سے کبود
کرتا تھا نورِ حق جو سوئے آسماں صعود
تھم جاتے تھے حسین جو تلوار تول کر

وہ ماہ رخ پہ ہالۂ گیسوئے تابدار
تھا فاطمہ کا رشتۂ جاں ان کا تار تار
گیسو نہ تھے رخِ خلفِ بوتراب پر

سر لوحِ مصحفِ رخِ پرنور ہی جبیں
مرآتِ نورِ حق کا قمر آسمانِ دیں
چھڑکاؤ تھا گلاب کا اُس سرزمین پر

جا گہ پناہ کی کہیں ملتی نہ تھی مگر
بری میانِ بحر تھے بحری میانِ بر
خشکی میں تھے نہنگ تری میں پلنگ تھے

یہ برق دیکھیے کسے پھونکے کسے جلائے
بچ جائے آج وہ جو دوبارہ حیات پائے
نے دو کیے کسی کو کبھی چھوڑتی نہیں

بجتی ہوئی برش سے جلو میں قضا چلی
اک دم میں سر تنوں سے اڑے یہ ہوا چلی
بادِ فنا سے گلشنِ ہستی تباہ ہے

گیتی کو زلزلہ تھا زہے شوکتِ حسین
اک قدرتِ خدا تھی خوشا قدرتِ حسین
سولہ پہر ہوئے تھے کہ پانی ملا نہ تھا

چہرے سے تھا جلالِ جہاں آفریں نمود
تسبیح پڑھ رہے تھے ملک اور بشر درود
حوریں بلائیں لیتی تھیں غرفوں کو کھول کر

خوشبو پہ جس کی عنبرِ سارا بھی تھا نثار
قرباں ہر ایک تار پہ سو نافۂ تتار
تھی جدولِ سیہ ورقِ آفتاب پر

آئینہ کی طرح سے نہ جس میں شکن نہ چیں
قطرے عرق کے رشکِ دُرِ گوہرِ ثمیں
گرتے تھے ٹوٹ ٹوٹ کے اختر زمین پر

وہ اوجِ ذوالفقار وہ جُٹی بھووں کا بل
ہلتے تھے غیظ سے جو وہ ابروئے بے بدل
اک نخل قد دکھاتا تھا تیغوں کے تین پھل
گویا پروں کو تولتا تھا طائرِ اجل
پلکوں کے تیر سب کے کلیجوں کے پار تھے
کھینچی تھی یاں کمان ادھر اعدا شکار تھے

آنکھیں وہ نرگسی کہ غزال آنکھ کو چرائے
پنجہ سے اس مژہ کے وغا میں خدا بچائے
ہنگامِ غیظ شیر یہ چتون کہاں سے لائے
زہرہ ہے آب آب جگر کیوں نہ تھرتھرائے
سمجھو نہ دور آنکھ ملانے کی دیر ہے
پتلی ہے چشم میں کہ ترائی میں شیر ہے

ابرو میں نون حسن تو چشمِ حسیں ہے صاد
گو یہ جدا جدا ہیں پہ ہے عین اتحاد
محرابِ کعبہ وہ ہے تو یہ قبلۂ مراد
دیکھے عدو جو کور نہو چشمِ اعتقاد
لاریب نورِ چشمِ نبی و علی یہ ہے
نقشِ جلی ہوا کہ خدا کا ولی یہ ہے

رخسار ہیں وہ گل جنھیں خوفِ خزاں نہیں
ہے ماہیِ محیطِ فصاحت زباں نہیں
ٹکڑے ہیں لعل کے لبِ شیریں بیاں نہیں
یہ فرطِ نازکی ہے کہ گویا دہاں نہیں
باتوں میں بند ہیں فصحا کائنات کے
صدقے ہیں بات بات پہ کوزے نبات کے

سوکھے لبوں پہ لعل بدخشاں نثار ہیں
تابندگی پہ اخترِ تاباں نثار ہیں
دانتوں کے نور پہ دُرِ غلطاں نثار ہیں
یہ آب ہے کہ قطرۂ نیساں نثار ہیں
ایسے گہر نہیں کہیں بحرِ عمیق میں
گویا چمک رہے ہیں ستارے عقیق میں

وہ لعل لب وہ روئے مطہر وہ ریشِ شاہ
کیا خوشنما ہے گرد قمر ہالۂ سیاہ
ہیں ایک جا ہلالِ شبِ قدر و نورِ ماہ
ہے صبح و شام ایک جگہ کیجیے نگاہ
ہے رتبۂ رخِ شہِ ذیشاں کھلا ہوا
دیکھو دھرا ہے رحل پہ قرآں کھلا ہوا

مدحِ گلوئے پاک کوئی کیا کرے بھلا
محبوبِ کبریا نے سدا جس پہ منہ ملا
حیرت ہے کیوں الٹ نہ گیا دشتِ کربلا
خنجر سے کٹ گئیں وہ رگیں اور وہ گلا
بجھتا فروغ جس نے یہ ایماں کے طور کو
سر کاٹ کر بجھا دیا اس شمع نور کو

وہ دوش پاک بادشہ آسماں وقار
ہے کل کے عاصیوں کی شفاعت کا جس پہ بار
بازو وہ ہیں کہ بازوئے دیں جن سے استوار
ساعد سے زور دست ید اللہ آشکار
سب پر کھلی ہے عقدہ کشائی حضور کی
روشن ہے انگلیوں سے کہ ہیں شمع نور کی

ہر دم اٹھا کے ہاتھ یہ فرماتے ہیں سخن
عالم میں خمسۂ نجبا ہیں شہ زمن
کیوں جانتے ہو کون ہیں دنیا میں پنجتن
ہیں اور نبی و فاطمہ و حیدر و حسن
وہ رکن جب سے اٹھ گئے رنج و بلا میں ہوں
اب میں فقط خمس آل عبا میں ہوں

اعضا میں کیوں نہ ہاتھ کا ہو مرتبہ بلند
دست کرم وہ ہے کہ خدا کو بھی ہے پسند
ہے پنجتن کی ذات سے سب خلق بہرہ مند
پانچ انگلیوں میں ہاتھ کے ہیں چار وہ جو بند
عقدے یہ ان سے کھلتے ہیں جو ذی شعور ہیں
چودہ بزرگ خلق میں خالق کے نور ہیں

ہے طور نور ذات خدا سینۂ حسین
صاف آئنہ ہے اک دل بے کینۂ حسین
اسرار حق ہے گوہر گنجینۂ حسین
روح الامیں ہے خادم دیرینۂ حسین
سینہ نہیں سفینۂ طوفان نوح ہے
ایماں کی سجدہ گاہ ہے قرآں کی لوح ہے

آئینۂ حلب سے فزوں تر صفا میں ہے
یہ ضو نہ بدر میں ہے نہ شمس الضحیٰ میں ہے
ہاں دل میں ہے وہ ضو جو کلام خدا میں ہے
قرآں غلاف میں ہے کہ سینہ قبا میں ہے
کیا قہر ہے کسی نے نہ پاس ادب کیا
زانو اسی پہ شمر نے رکھا غضب کیا

سینے پہ وہ پسینے کے قطروں کی آب و تاب
غرق عرق تھا شرم کے مارے جہاں گلاب
ہے گو کہ تین روز سے فاقے سے وہ جناب
پر نور ہے شکم صفت قرص آفتاب
پھولوں کی بوئے خوش سے ہیں کپڑے بسے ہوئے
امت کی مغفرت پہ کمر ہیں کسے ہوئے

بازو ہے تیر ظلم سے زخمی کمر ہے خم
طاقت جواب دیتی ہے مولا کو دم بدم
پر واہ رے ثبات کہ اٹھتے نہیں قدم
تیغ شہ نجف ہے اسی ہاتھ میں علم
آنکھیں ہیں سرخ بحر شجاعت ہے جوش پر
شملہ چھٹا ہوا ہے عمامے کا دوش پر

اللہ رے نبی کی عبا و قبا کا نور
پردے میں جس کے جلوہ نما ہے خدا کا نور
زہرا و حیدر و حسن و مجتبےٰ کا نور
ہے شش جہت میں خامس آل عبا کا نور
حیراں لباس نور پہ سب حلہ پوش ہیں
ادریس ہیں حواس نہ موسیٰ ہیں ہوش میں

بالائے دوش حضرت حمزہ کی ہے وہ ڈھال
زیبا ہے کہیئے گر رخ فتح و ظفر کا خال
پھول اس کے وہ کہ تیغ کا پھل جس سے پائمال
شب میں عیاں ہیں چار ستارے نواک ہلال
اس کو عروج کیوں نہ ملے قتل گاہ میں
پشت پناہ خلق ہے جس کی پناہ میں

وہ آہنی کلہ وہ زرہ جامۂ حضور
جس کی ہر اک کڑی سے نکلتا تھا چھن کے نور
حلقے وہ جن کو دیکھ کے شرمائے چشم حور
قندیل آہنی میں فروزاں ہے شمع طور
جوشن نہ تھا تن شہ گردوں وقار میں
تارے چمکتے تھے شب تاریک و تار میں

شانے پہ کس شکوہ سے ہے حلقۂ کماں
ہے جس کے ڈر سے قوس قزح چرخ پر طپاں
پیغام موت کا ہے ہر اک تیر جاں ستاں
ہر دم صدا یہ ہے لب سوفار سے کہ ہاں
سرکش کہاں ہیں لشکر کج عقل و فہم کے
گوشوں میں چھپتے پھرتے ہیں کیوں سہم سہم کے

دستانہ ہے کہ قبضۂ سیف قضا ہے یہ
شمشیر ہے زبان دہن اژدہا ہے یہ
ہمدست آستین شہ لافتا ہے یہ
ثابت ہوا کہ پنجۂ شیر خدا ہے یہ
دست خدا کے لال جری ہیں دلیر ہیں
اس ہاتھ سے جہاں کے زبردست زیر ہیں

نیزہ ہے رشک افعی گیسوئے دلستاں
سینے کو جس کے ڈر سے چراتا ہے آسماں
کالی وہ ڈانڈ اور وہ چمکتی ہوئی سناں
غل تھا کہ اژدہا ہے نکالے ہوئے زباں
لشکر جو دیو کا ہو تو دم میں ہلاک ہو
اس کی ہوا لگے تو بدن جل کے خاک ہو

اس شان سے ہیں رن میں اکیلے امام دیں
اور واں پرے جمائے ہیں میداں میں اہل کیں
خنجر کہیں ہیں تیر کہیں برچھیاں کہیں
اللہ ری کشمکش نظر آتی نہیں زمیں
لشکر بڑھے ہیں شاہ پہ یوں شام و روم کے
آتی ہے جس طرح سے گھٹا جھوم جھوم کے

تیغوں کی اس گھٹا میں چمکتی ہیں بجلیاں
باجوں کے زور شور میں ہے رعد کی فغاں
چھائے ہوئے ہیں شہ پہ زرہ پوش بے شماں
لوہے کی ہے زمیں تو ڈھالوں کا آسماں
چاروں طرف سے نرغۂ فوجِ کثیر ہے
ابرِ کرم پہ بارشِ بارانِ تیر ہے

ٹھہری ہے صف جمائے ہوئے اس طرح سے فوج
طوفاں میں جوش کھا کے اٹھے جس طرح سے موج
ہر مرد کی کمر میں ہیں تلواریں زوج زوج
ڈھالوں کا دور دور ہے نیزوں کا اوج اوج
آفت جنابِ فاطمہ کے گھر پہ آتی ہے
ٹاپوں سے مرکبوں کے زمیں تھرتھراتی ہے

ہر صف میں برچھیاں بھی ہزاروں لچکتی ہیں
نوکیں وہ تیز ہیں کہ دلوں میں کھٹکتی ہیں
نیزے تلے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں
سنگیں دلوں نے ہاتھوں میں پتھر اٹھائے ہیں
تیغوں کے ساتھ گرزِ گراں سر اٹھائے ہیں

گھوڑوں سے گونجتا ہے وہ سب وادیِ نبرد
گردوں میں مثلِ شیشۂ ساعت بھری ہے گرد
ہے چرخِ چار میں پہ رخِ آفتاب زرد
ڈر ہے گرے زمیں پہ نہ مینائے لاجورد
گرمی ہجومِ فوج سے دو چند ہو گئی
خاک اس قدر اڑی کہ ہوا بند ہو گئی

دستے وہ مصر و زنگ کے وہ فوج روم و شام
دن دوپہر وہ دشت کی گرمی وہ اژدہام
تیغیں برہنہ ہو گئیں تھیں چھوڑ کر نیام
مانند شمع جل رہی تھیں برچھیاں تمام
تلواریں منہ چھپائے تھیں سائے میں ڈھال کے
خنجر بھی رہ گئے تھے زبانیں نکال کے

لو چل رہی تھی رن میں کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں کے رنگ ہو گئے تھے دھوپ میں سیاہ
برچھی کے پھل پہ ہوتا تھا شعلے کا اشتباہ
گلخن بنی ہوئی تھی ہر اک آہنی کلاہ
گویا کہ قوس میں تھا گزر آفتاب کا
عالم تھا ہر خدنگ پہ تیرِ شہاب کا

سر پر لگائے تھا پسرِ سعد چترِ زر
تھے دو غلام مروحہ جنباں ادھر ادھر
تنہا تھا دھوپ میں اسد اللہ کا پسر
نے سایۂ علم تھا نہ عباسِ نامور
لگتی تھی کچھ بدن کو ہوا آہِ سرد سے
گیسو اٹے ہوئے تھے بیاباں کی گرد سے

پنکھا

جنگل سے آرہی تھی یہ آواز بار بار
کیا آج تجھ پہ بن گئی ای میرے گلعذار
تو دھوپ میں کھڑا ہے مرا دل ہے بے قرار
سایہ تو کرلے رخ پہ عبا کا یہ ماں نثار
عالم سیاہ ہے مری چشم پر آب میں
سونلا گیا ہے چاند مرا آفتاب میں

مادر سے رو کے کہتے ہیں سلطان کربلا
کافی ہے آج سر پہ مرے سایۂ خدا
منصف ہوں آپ فرق پہ سایہ کروں میں کیا
سوتے ہیں آفتاب میں سب میرے مہ لقا
پڑتی ہے خاک اُڑ کے تن پاش پاش پہ
اماں ردا نہیں علی اکبر کی لاش پر

کرتے ہیں ماں کی روح سے حضرت تو یہ کلام
ہمت سے بڑھی چلی آئی ہے فوج شام
کہتے ہیں مسکرا کے امام فلک مقام
کس سے لڑینگے کیوں ہے یہ کوشش یہ اژدہام
فاقوں سے حال غیر ہے محتاج آب ہوں
میں آپ ہی مسافر پا در رکاب ہوں

اللہ کیا ہجوم ہے کیا شور گیر و دار
اک جسم زار اور یہ نیزے کئی ہزار
اک سینہ اور یہ ناوک بیداد بے شمار
میرے لیے تو پیاس ہی خود تیغ آبدار
ان برچھیوں سے کس کو زمیں پر گرائینگے
سو خنجر اک گلے پہ یہ کیونکر پھرائینگے

لشکر یہ ہے کہ قہر کا دریا ہے موج زن
میں اک ضعیف و تشنہ و مظلوم و بے وطن
اکبر نہ ہیں جلو میں نہ لخت دل حسن
واحسرتا کہ مرگئے عباس صف شکن
دیکھیں پسر پہ نرغۂ فوج کثیر کو
لاؤں کہاں سے آج جناب امیر کو

آئی قریب سے یہ صدا ای شہ نجف
تجھسا پسر دیا مجھے حق نے زہے شرف
مصروف ہے ثنا میں تری قدسیوں کی صف
لاکھوں ہیں گو ادھر یہ خدا ہے تری طرف
دیں ہے بلند کفر کی بنیاد پست ہے
ہر طرح تیری فتح ہے ان کی شکست ہے

پیاسا جو تین روز رہا تو کنار جو
دین نبی کی رہ گئی دنیا میں آبرو
مقبول کردگار ہے نور خدا ہے تو
ناجی ہیں تیرے دوست تو ناری ہیں سے عدو
جائینگے یہ کہاں جو ہیں تجھ سے پھرے ہوئے
ہیں سب کے سب خدا کے غضب میں گھرے ہوئے

ایوب تیرے صبر کے ہیں آج مدح خواں
یعقوب و نوح و آدم و یحییٰ ہیں اک زباں
عیسےٰ پکارتے ہیں کہ حق کا ظہور ہے
عباس جب سے قتل ہوا ہے فرات پر
نانا ہیں بے حواس حسن ہیں برہنہ سر
تجھ پر نثار ہونے کی کس کو ہوس نہیں

کی عرض شاہ دیں نے پدر سے بانکسار
یہ پرورش یہ غور زہے عز و افتخار
بیٹے پہ چاہئیں یونہیں اشفاق باپ کے
بندہ تو قابل اس کے نہیں یا شہ زماں
کیا میرا صبر اور مری ہمت کا کیا بیاں
لب پر جو وہ بزرگ مرا ذکر لائے ہیں

اب کچھ نہیں ہراس اگر لاکھ ہوں ستم
جب ذبح ہو حسین تہِ خنجرِ دو دم
سب گھر لٹے مگر وہ اسیر بلا نہ ہو
فرما کے یہ فرس سے اشارہ کیا کہ ہاں
وہ غیظ وہ رجز وہ جلال و شکوہ و شان
دونوں زبانیں تیغ کی بھی شعلہ ریز تھیں

نعرہ یہ تھا کہ دلبر مشکل کشا ہوں میں
شمس الضحیٰ علی ہیں تو بدر الدجیٰ ہوں میں
کس آیۂ کریم میں ذکرِ علی نہیں

لب پر خلیل کے ہے ترے حلم کا بیاں
ہے کل کا فخر دلبرِ پیغمبرِ زماں
موسیٰ کا ہے یہ قول کہ خالق کا نور ہے
حاضر ہے کربلا میں اسی وقت سے پدر
ماں بے قرار پھرتی ہے تھامے ہوئے جگر
تقدیر سے کسی کا مری جان بس نہیں

مولا میں اس عنایت و اشفاق کے نثار
کیا سرفراز ہو گیا اس دم یہ خاکسار
جان آ گئی غلام میں آنے سے آپ کے
جو ہوں مقربانِ خدا میرے مدح خواں
اک بندۂ حقیر و گنہگار و ناتواں
یہ سب شرف حضور کے صدقے میں پائے ہیں

ہاں ایک ہے تباہیِ زینب کا مجھکو غم
اس کی ردا بچائیگا کون اے شہِ امم
میں بے کفن رہوں یہ بہن بے ردا نہ ہو
کوندا مثالِ برق کمیتِ سبک عناں
تھی دم بدم وہ سیف زبانی کہ الاماں
بیتیں رجز کی تیغِ دو دم سے بھی تیز تھیں

جوہر کشائے تیغِ شہِ لافتا ہوں میں
قرآں گواہ ہے کہ زبانِ خدا ہوں میں
قرآں میں کیا خفی ہے کہ ہم پر جلی نہیں

ہم تو ہیں اُس کلام میں اور ہم میں وہ کلام
لاریب فیہ گر ہی وہ ہادی تو ہم امام
جو منحرف ہوا وہ مطیع خدا نہیں
کچھ یاد ہی وصیت محبوب ذوالجلال
بھولے کلام حق کو بھی ای قوم بدخصال
کیوں منہ پھرا لیا ہی حدیث و کتاب سے
تم یہ نہ جانیو کہ مجھے کچھ ہی خوف جاں
قبضے میں ہی حسین کے تیغ شرر فشاں
لاکھوں سے منہ پھرے نہ کبھی وہ دلیر ہوں
بخشا ہی مجھکو حق نے شہ لافتا کا زور
ہی انگلیوں کے بند میں خیبر کشا کا زور
اُلٹوں فلک کو یوں جو ہو قصد انقلاب کا
آگے بڑھوں جو تیر کو چلے میں جوڑ کے
بیکار کر دوں شیر کا پنجہ مروڑ کے
اُلٹوں طبق زمین کے یوں جھک کے زین سے
اعلیٰ ہی عرش سے بھی مری ہمت بلند
رستم ہی ذوالفقار کی دہشت سے دردمند
یہ جس شقی کے سینے سے گذرا وہ فوت ہی
دنیا ہو اک طرف تو لڑائی کو سر کروں
نے جبریل کا رفقا و قدر کروں
طاقت اگر دکھاؤں رسالت مآب کی

جس طرح لام میں ہی الف اور الف میں لام
اُمت کو فرض عین ہی دونوں کا احترام
قرآن و اہلبیت ازل سے جدا نہیں
فرما گئے تھے خلق سے کیا وقت انتقال
ہم اہلبیت ہیں سو ہمارا کیا یہ حال
محشر میں کیا کہوگے رسالت مآب سے
لازم ہی یہ سخن کہ میں ہوں ہادی جہاں
دشمن کو جس کی ضرب سے ملتی نہیں اماں
میں بیشۂ شجاعت و ہمت کا شیر ہوں
اس دست مرتعش میں ہی دست خدا کا زور
پانی ہی میرے زور کے آگے ہوا کا زور
جس طرح ٹوٹ جاتا ہی ساغر حباب کا
بھاگیں خطا شعار کمانوں کو چھوڑ کے
ٹیکوں زمین پر در خیبر کو توڑ کے
جس طرح جھاڑ دیتے ہیں گرد آستین سے
بجلی ابھی گرے جو بڑھوں چھیڑ کر سمند
کھلتا نہیں ہی دیو سے نیزے کا میرے بند
اس کی سنان تیز سر انگشت موت ہی
آئے غضب خدا کا ادھر رخ جدھر کروں
انگلی کے اک اشارے میں شق القمر کروں
رکھدوں زمیں پہ چیر کے ڈھال آفتاب کی

یہ تیغ سر پہ گر کے ٹھہرتی ہے زین پر
جب ہاتھ اٹھائے برق گری ہے زمین پر
خیبر میں کیا گزر گئی روح الامین پر
کاٹے ہیں کس کی تیغ دو پیکر نے تین پر
جس وقت ضرب شیر خدا یاد آتی ہے
ماہی سمیت گاو زمیں تھرتھراتی ہے

میں شیر ہوں چھ لاکھ اگر ہو تو کیا ہو تم
اٹھا جو میرا ہاتھ تو دم میں فنا ہو تم
واللہ میرے سامنے بیدست و پا ہو تم
پر کیا کروں کہ امت خیر الوریٰ ہو تم
لو واسطہ رسول خدا کا پناہ دو
اب بھی کسی طرح مجھے جانے کی راہ دو

یہ کہہ کے چپ ہوئے جو امام فلک سریر
اس فوج قاہرہ سے اٹھا شور دار و گیر
کھولے ہوئے نشانوں کو آگے بڑھے شریر
فرزند فاطمہ پہ چلے دس ہزار تیر
دہشت سے عافیت نے منھ اپنا چھپا لیا
کالی گھٹا نے ڈھالوں کی جنگل کو چھا لیا

وہ شور کوس حرب کا وہ بوق کا غریو
شرمندہ برچھیوں کی چمک سے سنان گیو
تبر دراز صورت خنجر زبان ریو
وہ صورتیں کہ دیکھ کے ڈر جائے جن دیو
سب فوج یوں بڑھی تھی وغا کو امام سے
آندھی سیاہ آتی ہے جس دھوم دھام سے

برسے ادھر سے تیر تو کوندی ادھر سے برق
وہ برق چھپتی پھرتی تھی خود جس کے ڈر سے برق
چمکی وہ یوں کہ گر گئی سب کی نظر سے برق
روکیں کسے رکی ہے کسی کی سپر سے برق
جل تھل بھرے لہو کے نہ دیر اک گھڑی لگی
کیا ابر تیغ تھا کہ سروں کی جھڑی لگی

معجز نما تھی شاہ کی شمشیر آبدار
دکھلائی ماہ ضیف میں برسات کی بہار
ہاں برق واں ہوا تو ادھر ابر رود بار
بہنا کہیں لہو کی کہیں خوں کی آبشار
یوں سر برس گئے یہ روانی تھی باڑھ میں
پڑتا ہے دونگڑا کبھی جیسے اساڑھ میں

بہتے تھے خوں میں چار طرف سر کٹے ہوئے
بڑھتے تھے جو بہت وہ کھڑے تھے ہٹے ہوئے
جو گھاٹ پر تھے زور تھے ان کے گھٹے ہوئے
تھے جا بجا سے ڈھالوں کے بادل پھٹے ہوئے
لڑنے میں اوج تیغ کا وہ چند ہو گیا
نکلی کمان تیروں کا مینھ بند ہو گیا

بازو ہر اک کمان کا کمزور ہو گیا
تیروں کے مینہ برسنے کا اک شور ہو گیا
ڈھالوں کا ابر خوں میں شرابور ہو گیا
جو تھا کنارِ نہر لبِ گور ہو گیا
مشق شناوری تھی قیامت بڑھی ہوئی
اتری وہ تیغ خون کی ندی چڑھی ہوئی

کیا کیا چھلک دکھاتی تھی سر کاٹ کاٹ کے
تنتی تھی کیا تنوں سے زمیں پاٹ پاٹ کے
پانی وہ خود پیے ہوئے تھی گھاٹ گھاٹ کے
دم اور بڑھ گیا تھا لہو چاٹ چاٹ کے
کیا جانیے ملا تھا مزا کیا زبان کو
کھا جاتی تھی ہما کی طرح استخوان کو

ہر ہاتھ میں اُڑا کے کلائی نکل گئی
کوندی گری زمین میں سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی
مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی
چار آئینے کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

کٹ کٹ کے ذوالفقار سے گرتے تھے خاک پر
پہونچوں سے ہاتھ شانوں سے بازو تنوں سے سر
قبضے سے تیغ برسے زرہ ہاتھ سے سپر
برچھی سے پھل کمان سے زہ زیں سے تبر
ترکش کہیں پڑے تھے نشان زری کہیں
پیکاں کہیں تھے شست کہیں تھی سری کہیں

مقتل میں ہوش فوجِ عمر کے اُڑا دیئے
ٹکڑے ہر ایک کے تن و سر کے اُڑا دیئے
پُرزے ستمگروں کے جگر کے اُڑا دیئے
پرکالے ایکدم میں سپر کے اُڑا دیئے
جب ڈھال پر چمک کے در آتی تھی خود میں
سر کٹ کے آن پڑتا تھا ترکش کی گود میں

وقت وغا عصا تھی کبھی اژدہا کبھی
تلوار بن گئی وہ کبھی اور قضا کبھی
بجلی کبھی تھی ابر کبھی اور ہوا کبھی
بنتی تھی نفی کفر کے خاطر ملا کبھی
پھرتے تھے جب حسین پیادوں کو رول کر
کھا لیتی تھی سروں کو دہن کھول کھول کر

اللہ کے غضب کی نشانی دکھا گئی
دریائے قہر حق کی روانی دکھا گئی
جل جل گئے وہ شعلہ فشانی دکھا گئی
کٹ کٹ گئے وہ سیف زبانی دکھا گئی
لب صورتِ شگاف قلم بند کر دیئے
فقروں نے ذوالفقار کے دم بند کر دیئے

پہونچی سُم فرس پہ جو بالائے سر گری
چمکی ادھر زمیں سے نکل کر اُدھر گری
ناری چلے ادھر وہ جدھر کوند کر گری
جس صف سے گر چلی یہ وہ صف خاک پر گری
دکھلا کے اوج جاتی تھی یوں ہر سوار پر
جنگل میں باز گرتا ہے جیسے شکار پر

دم میں گئی فلک پہ اور آئی ہزار بار
معراج دست شاہ میں پائی ہزار بار
دکھلا گئی صفوں کو صفائی ہزار بار
گرمی یہ تھی کہ خوں میں نہائی ہزار بار
جب تک چلی وہ زرد سیاہِ عدو رہی
اُس دن کے معرکہ میں وہی سرخرو رہی

غل تھا خطِ سیاہ نہ سمجھو یہ ناگ ہے
جو دشمن علی ہیں اُسے ان سے لاگ ہے
جلتا ہے دشت چار طرف بھاگ بھاگ ہے
جانیں بچاؤ تیغ کے پانی میں آگ ہے
پھونکے نہ یہ دم اس سے ہمارے نکلتے ہیں
اژدر کی طرح منہ سے شرارے نکلتے ہیں

ہلچل وہ ان صفوں کی وہ گھوڑے کی جست خیز
تھا ترک و تاز میں کہیں صرصر سے تند و تیز
صدقے گندھی ایال پہ گیسوئے مشک بیز
گرداوری میں ابر تو بجلی دمِ ستیز
ذرّے قدم کے فیض سے سارے چمک گئے
جب بجلیاں اٹھیں تو ستارے چمک گئے

جرات میں رشکِ شبر تو ہیکل میں پیل تن
بولی کے وقت کبک دری جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن
بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

آنکھیں وہ جن کو دیکھ کے حیران ہے غزال
گردن وہ جس کی شرم سے ہے سرنگوں ہلال
آہو کی جست شیر کی چتون پری کی چال
دل اس کے دست و پا سے حنائی ہے پائمال
ہر نعل پا کا حسن یہ تھا اس جلوس میں
آئینہ جس طرح سے ہو دستِ عروس میں

کیوں اعتقاد میں حکما کے نہ آئے فرق
اشراقی اس سے بحرِ تفکر میں سب ہیں غرق
راکب گر اس کو غرب سے دوڑائے سوئے شرق
اور آسماں سے ساتھ ہی چمکے نکل کے برق
بجلی کی واں چمک نہ فلک پر تمام ہو
یاں کب سے غرب میں فرس تیز گام ہو

دیکھی نہیں کسی نے یہ نرمی شتاب میں
سرعت کا اس کی وصف لکھیں گر کتاب میں
اس کی ثنا اگر کوئی لائے زبان پر
رو میں سوار ہاتھ سے کھینچی اگر گرائے
وہ تازیانہ یاں نہ زمیں تک پہنچنے پائے
تنگی سے آسمان کی خفا یہ سمند ہے
کل کی طرح اشارے میں سو بار پھیر لو
کاوے میں شکل گنبد دوار پھیر لو
دوڑے بروئے آب تو ٹاپ بھی تر نہ ہو
طاؤس سا جدھر گیا دُم کو چنور کیے
کچلے کبھی بدن کبھی پامال سر کیے
میداں میں تھا کسی کو نہ یارا ستیز کا
زیبا ہے گر کہیں شعرا بادپا اُسے
طائر جہاں کے جانتے ہیں سب ہما اسے
فتراک گر ہوا سے کبھی اک ذری اڑی
مصروفِ جنگِ تیغ سے تھے سرورِ حجاز
نامرد نے کیا جو ہیں دست ستم دراز
ہاں ای اجل گرفتہ کمر استوار کر
کس طنطنہ سے شاہ پہ آیا وہ خود پسند
نیزے سے اس کے آپ کو پہونچی نہ کچھ گزند
تھا گو کہ نیزہ بازی پہ ظالم تلا ہوا

ہے جس کے زین صاف سے مخمل بھی خواب میں
سطریں ہیں یہ صورتِ موجِ اضطراب میں
ساکن جو حرف ہو وہ نہ آئے زبان پر
اور یہ فرس جنوب سے سوئے شمال جائے
اس حد سے ایکدم میں وہ حد دیکھ کر پھر آئے
کیونکر اُڑے پری ہے کہ شیشے میں بند ہے
بجلی ہے جس طرف دمِ پیکار پھیر لو
نقطے کے گرد صورتِ پرکار پھیر لو
آنکھوں میں یوں پھرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو
دم میں پرے سپاہ کے زیر و زبر کیے
کشتوں کو روندے روند کے سم خوں میں تر کیے
عالم ہر ایک نعل میں تھا تیغ تیز کا
آہستہ گر چلے تو نہ پائے ہوا اُسے
مہمیز و تازیانہ کی حاجت ہے کیا اُسے
یوں اُڑ گیا کہ سب نے یہ جانا پری اُڑی
چمکا کے اسپ واں سے بڑھا ایک نیزہ باز
نیزہ اُٹھا کے کہنے لگے شاہ سرفراز
نیزے کا ہے غرور تو آ کوئی وار کر
کل کی طرح سے پھرنے لگا ہر طرف سمند
مشکل کشا کے لال نے کھولے تمام بند
یاں تھا سب اس کے عزم کا عقدہ کھلا ہوا

نیزے کی اس لعیں سے لڑائی جو آ پڑی — دونوں طرف سے جنگ میں کوشش ہوئی بڑی
انیوں سے اڑ رہے تھے شرارے گھڑی گھڑی — تھی چوب سے تو چوب سناں سے سناں لڑی
اک معرکہ تھا بیچ میں دشتِ قتال کے — دو مار گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے
پیہم ہوئیں نکاں پہ نکانیں جو یک دگر — ظالم کبھی ادھر تھا تو حضرت کبھی ادھر
کس نوک جھوک سے وہیں نیزے کو پھیر کر — فرزند شیر حق نے دکھایا عجب ہنر
ظالم پہ آسماں سے بلا ناگہاں گری — دو تین نیزے اڑ کے زمیں پر سناں گری
تھرّا گیا بدن نہ رہی طاقتِ قرار — گھوڑے کی باگ پھیر کے بھاگا وہ نابکار
بچ کر نکل چلا تھا کہ چمکا کے راہوار — نیزے کا اک کمر پہ کیا شاہ دیں نے وار
موذی تھا وہ لعیں پہ انی فتنہ کوب تھی — سر میں سناں تھی پشت کے مہروں میں چوب تھی
قربان زور بازوئے سلطانِ ارجمند — زیں سے اٹھا کے اس کو سناں پر کیا بلند
پہونچا سقر میں دارِ جہاں سے وہ خود پسند — ٹپکا زمیں پہ جب تو ہوا چور بند بند
اپنے ہنر پہ ناز تھا اس نیزہ باز کو — دکھلا دیا جہاں کے نشیب و فراز کو
کام اس خطا شعار کا جب ہوگیا اخیر — نکلا پرے سے اک قدر انداز بے نظیر
بدکیش و کج نہاد و خطا پیشہ و شریر — چلّے سے توڑ جاتا تھا جوشن کو جس کا تیر
کیا کوئی اس کے آگے بھلا سر اٹھا سکے — رستم بھی جس کماں کی نہ سیسر اٹھا سکے
قبضے میں تیغ لیکے پکارے شہِ زماں — ہاں ناوک افگنی مجھے دکھلا تو اے جواں
ہاں نکلی منہ سے یاں کہ کھنچی اس طرف کماں — کھنچنا کماں کا تھا کہ چلا تیر بے اماں
حلقہ ادھر کماں کا خم ہو کے رہ گیا — یاں تیغِ شہ سے تیر قلم ہو کے رہ گیا
خالی اسی روش سے ہوا ترکش شریر — تودے لگا دئے کاٹ کے حضرت نے سارے تیر
چاہا تھا کشمکش میں ہو جائے گوشہ گیر — چلّائے شہ کہ بھاگ نہ او سرکشوں کے پیر
پیچھے ہٹے نہ پاؤں مزا ہی یہ جنگ کا — تو بھی تو توڑ دیکھ لے میرے خدنگ کا

یاں دوش سے کماں کو اتارا جناب نے
قبضے میں ماہِ نو کو کیا آفتاب نے
بیٹے کے ہاتھ چوم لیے بوتراب نے
تاکا خطا کو تیرِ نگہ سے صواب نے
ترکش بھی اژدہا سا دہن کھولنے لگا
نکلا عقاب تیر تو پر تولنے لگا

چلّے میں رکھ کے تیر بڑھے قبلۂ امم
اک ہاتھ راست کر کے کیا دوسرے کو خم
کچھ کہہ کے گوشِ شہ میں چلا تیر تیز دم
آواز دی کماں نے زہے شاہِ با کرم
چلّہ تو شستِ شاہِ زمن سے نکل گیا
واں تیر دل کو توڑ کے سن سے نکل گیا

گرز و سنان و تیغ و تبر کانپنے لگے
نیزے مثالِ شاخِ شجر کانپنے لگے
ڈر سے کماں کشوں کے جگر کانپنے لگے
گو ترکشوں میں تیر تھے پر کانپنے لگے
پیچھے ہٹے کھڑے تھے جو ظالم بڑھے ہوئے
گوشوں سے خود اتر گئے چلّے چڑھے ہوئے

اللہ ری زد گذرتا تھا ہنگامِ دار و گیر
سو دل سے مثلِ رشتۂ تسبیح ایک تیر
کرتے تھے واہ وا صفوں میں جوان و پیر
بازو کو چومتے تھے رسولِ فلک سریر
روحِ علی یہ کہتی تھی پاس آن آن کے
صدقے ہر ایک تیر کے قرباں کمان کے

شہ کے غضب سے چاہتی تھی ہر کماں اماں
مضطر زمیں تھی مانگتا تھا آسماں اماں
دینے نہ تھے کسی کو امامِ زماں اماں
ہر صف میں تھا یہ شور کہ مولا اماں اماں
جب شاہ حملہ کرتے تھے شیرِ خدا کی طرح
دانتوں میں خس پکڑتے تھے سب کہربا کی طرح

کہتا تھا ہاتھ جوڑ کے یوں کوئی پُر غرور
اس وقت رحم اپنے غلاموں پہ ہے ضرور
موقوف کر جلال کو ای کبریا کے نور
صدقہ علی کی روح کا اب بخشیے قصور
آنکھیں ہم اپنی دور سے قدموں پہ ملتے ہیں
تلوار روکیے کہ بس اب دم نکلتے ہیں

ای نورِ چشمِ احمدِ مختار رحم کر
ای یادگارِ حیدرِ کرار رحم کر
ای امتِ نبی کے مددگار رحم کر
ای بحرِ غیظِ حضرتِ قہار رحم کر
ای نوحِ عصر ہم سے نہ تو انتقام لے
امت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو تھام لے

اے افتخار حضرت آدم پناہ دے
اے زیب بخش عرش معظم پناہ دے
اے فخر نوح و عیسیٰ و مریم پناہ دے
اے باعث پناہ دو عالم پناہ دے
مولا تجھے قسم ہے رسول کبیر کی
چمکا نہ ذوالفقار جناب امیر کی

اس غیظ میں سنا جو بزرگوں کا شہ نے نام
صدمہ ہوا یہ دل کو کہ رونے لگے امام
گردن پھرا کے یاس سے دیکھا سوئے خیام
تھاما جگر کو ہاتھوں سے اور چھوڑ دی لگام
آنکھوں کو بند کر کے فرس ہانپنے لگا
روکی جو ذوالفقار بدن کانپنے لگا

لڑنے میں تھا نہ آپ کو کچھ پیاس کا خیال
رکھدی جو تیغ ہاتھ سے جی ہو گیا نڈھال
آئی صدا کہ حضرت محبوب ذوالجلال
تو صابروں کا فخر ہے اے فاطمہ کے لال
سمجھا تھا میں کہ اب مری امت تمام ہے
یہ جبر اختیار پہ تیرا ہی کام ہے

صبر و رضا و حلم کا رتبہ دکھا دیا
دم میں ہزار طرح کا جلوہ دکھا دیا
نانا کا خلق زور پدر کا دکھا دیا
خالق کے رحم و قہر کا نقشہ دکھا دیا
باطل شقاوت و حسد و کینہ ہو گیا
ایسی جلا ہوئی کہ حق آئینہ ہو گیا

شبیر واہ کیوں نہ ہو کس کا پسر ہے تو
تھا کہ آسمان شرف کا قمر ہے تو
کھولا ہے جس کو حق نے وہ رحمت کا در ہے تو
ہیں اصل جس شجر کی ہوں ان کا ثمر ہے تو
امت کے ظلم سہتے ہو نانا سے چھوٹ کر
کیا ان کو پھل ملے گا مرا باغ لوٹ کر

کیسی ہوا جہان کی بے اعتدال ہے
سرسبز سب ہیں باغ مرا پائمال ہے
سایے سے جس نہال کے طوبیٰ نہال ہے
مرجھا گیا ہے دھوپ سے اس کا یہ حال ہے
ہیں جن کی فکر میں کبھی سویا نہ چین سے
پالی انھیں عزیز ہے میرے حسین سے

فاقوں میں جن کے واسطے باندھا شکم پہ سنگ
ان دشمنوں نے لال کا میرے کیا یہ رنگ
کیونکر نہ ہو یہ غنچہ دہن زیست سے یہ تنگ
اک فاقہ کش نحیف سے یہ صف کشی یہ جنگ
بچپن سے ہیں نثار ہوں اس نور عین کے
میرا گلا بھی ساتھ کٹے گا حسین کے

رو کر کہا حسین نے یا سیدِ عرب
لڑتا کبھی نہ ان سے یہ مظلوم و تشنہ لب
فریاد ہی کہ مجکو ستایا ہی بے سبب
للّلہ لیتے چلیے مجھے ساتھ اپنے اب
دشمن ہوا ہی سارا زمانا غلام کا
امّت میں اب نہیں ہی ٹھکانا غلام کا

جس دن سے آپ اُٹھ گئے پایا نہ میں نے چین
سب گھر تباہ ہو گیا یا شاہِ مشرقین
پیری میں چھٹ گیا علی اکبر سا نور عین
کب تک جہاں میں ٹھوکریں کھایا کرے حسین
پھیلا کے پاؤں خاک پہ سونا نصیب ہو
راحت ملے جو قبر کا کونا نصیب ہو

یہ کہتے تھے کہ فوجِ ستمگر پھر آگئی
خیر النسا کے چاند پہ بدلی سی چھا گئی
بھائی جو گھر گیا تو بہن بلبلا گئی
فریادِ فاطمہ کی فلک تک صدا گئی
یاں گھر نبی کی آل کا بے نور ہو گیا
زخموں سے واں تنِ شہِ دیں چور ہو گیا

یاں ایک تن ضعیف اُدھر لاکھ نابکار
تیروں کے زخم تیغوں کے پھل برچھیوں کے وار
سینہ شکستہ پسلیاں مجروح سر فگار
کیا درد کا حساب جراحت کا کیا شمار
یوں تو دل و جگر کے بھی جانکاہ زخم تھے
تن پر ہزار و نہ صد و پنجاہ زخم تھے

حربے ہزار ہا کسے روکے کسے بچائے
بے یار و آشنا کسے ڈھونڈے کسے بلائے
دکھ میں سپر ہو کون حمایت کو کون آئے
کیا وقت ہی نبی کے نواسے پہ ہائے ہائے
جھکتے ہیں زیں پہ منہ سے لہو ڈال ڈال کے
گھوڑے سے غش میں کون اُتارے سنبھال کے

گھوڑے سے گاہ غش میں ادھر گہ اُدھر جھکے
تیغیں چلیں جدھر کو شہِ بحر و بر جھکے
سیدھے کبھی ہوئے کبھی پکڑے جگر جھکے
تھامی کبھی ایال کبھی زین پر جھکے
صدمہ جو تھا بہن کے نکلنے کا شاہ کو
گردن پھرا کے دیکھتے تھے خیمہ گاہ کو

ہنگام عصر تھا کہ شہِ نیکخو گرے
زخموں سے لڑکے قطرۂ خوں چار سو گرے
کیا سنبھلے جس کے زخموں سے سیروں لہو گرے
سجدے کا اشتیاق جو تھا قبلہ رو گرے
آنکھیں تھیں بند جلوۂ حق تھا نگاہ میں
گرتے ہی محو ہو گئے یادِ الٰہ میں

اعدا میں غل ہوا کہ ہماری ظفر ہوئی
زینب ردا کو پھینک کے عریان سر ہوئی
ہی ہی کوئی نہیں شہِ والا کی لاش پر
مسند پہ شہ کے لوٹتی تھی کوئی سوگوار
چلّاتی تھی کوئی مرے سیّد ترے نثار
غل تھا فلک نے دفترِ دنیا الٹ دیا
دیکھا یہ ذوالجناح کا سیدانیوں نے حال
گردن پہ اس طرح سے ہے بکھری ہوئی ایال
روتا ہے یوں وہ غم میں شہِ نامدار کے
دنیا نظر میں بیبیوں کے ہو گئی سیاہ
عابد پکارے ہائے غضب گھر ہوا تباہ
بتلا سوارِ دوشِ پیمبر کو کیا کیا
زیں سے ترے رسول کا پیارا کہاں گرا
وہ عرشِ کبریا کا ستارا کہاں گرا
سایہ ہے کچھ کہ لاش ہے جلتی زمین پر
سر خاک پر پٹک کے پکارا وہ راہوار
جلدی اتار لو یہ تبرک یہ ذوالفقار
زہرا قریبِ لاشِ پسر خاک اڑاتی ہے
راوی رقم یہ کرتا ہے احوالِ رزمگاہ
خنجر ادھر تو شمر نے رکھا گلے پہ آہ
نانو دھرا جو سینہ پہ ایذا سوا ہوئی

گھوڑے سے تو حسین گرے جنگ سر ہوئی
چلّائی یوں سکینہ کہ میں بے پدر ہوئی
امّاں بس اب چلو مرے بابا کی لاش پہ
ہی ہی کا شور تھا کہ قیامت تھی آشکار
ڈیوڑھی پہ آکے گر پڑے سجادِ دل فگار
فضّہ نے خیمہ گاہ کا پردا الٹ دیا
خالی ہے زین اور ہے ماتھا لہو سے لال
جس طرح کھولتی ہے زنِ سوگوار بال
جیسے پسر کو روتی ہے ماں ڈاڑھیں مار کے
سمجھے یہ سب کہ قتل ہوا فاطمہ کا ماہ
چلّائی بنتِ فاطمہ ای ذوالجناحِ شاہ
ہی ہی مرے غریب برادر کو کیا کیا
دو دن کی بھوک پیاس کا مارا کہاں گرا
آقا ترا امام ہمارا کہاں گرا
لختے یہ کس کے خون کے ہیں تیرے زین پر
سیدانیو بچھڑ گیا مجھ سے مرا سوار
کٹتا ہے واں گلوئے شہنشاہِ نامدار
خیمے میں جاؤ لوٹنے کو فوج آتی ہے
دن ہو گا تین چار گھڑی وقتِ قتل گاہ
آندھی اٹھی کہ سارا جہاں ہو گیا تباہ
غل تھا کہ لو قیامتِ کبرا بپا ہوئی

تھا غش میں قبلۂ روحِ دو عالم کا مقتدا
سجدہ بھی اس ولی کو نہ کرنے دیا ذرا
گردن پہ تیغ اور لبوں پہ یہ تھی دعا
واجعفراہ واابتاہ وا محمدا
صدمے ہوئے رگوں پہ جو خنجر کی دھار کے
چپ ہو گئے نبی و علی کو پکار کے

اس حشر میں خیام کی جانب جو کی نظر
دیکھا وہ سانحہ کہ نہ دیکھے کوئی بشر
نکلی حرم سے ایک ضعیفہ برہنہ سر
چہرہ تو آفتاب سا اور کان میں گہر
چادر نہ اضطراب میں تھی جسم پاک پر
تھا اک سرا تو دوش پہ اور ایک خاک پر

چلاتی تھی ارے کوئی رستہ مجھے بتائے
کچھ سوجھتا نہیں یہ ضعیفہ کدھر کو جائے
اکبر کہاں ہو ہاتھ مرا تھامنے کو آئے
بھائی سے چھوٹتی ہے بہن ہائے ہائے ہائے
مہماں کیا تھا بادشہِ مشرقین کو
اے کربلا تجھی سے میں لونگی حسین کو

اے نہر پیاس سے مرا بھائی ہے بے قرار
اے دشت گرد میں نہ بھرے تشنہ کا جسم زار
اے نینوا حسین کے لاشے سے ہوشیار
اے خاکِ پاک حرمتِ مہماں نگاہدار
اے طائرو نہ دھوپ ہو بھائی کی لاش پر
سایہ کرو پروں کا تنِ پاش پاش پر

طے کر چکی تھی نصف مسافت وہ سوگوار
آئی صدائے حضرتِ خاتونِ روزگار
بیٹی ملے گا اب نہ محمد کا یادگار
پھر جا خدا کے واسطے پھر جا ترے نثار
تن سے جدا سرِ پسرِ فاطمہ ہوا
اب آکے کیا کرے گی یہاں خاتمہ ہوا

گھبرا کے اس نے جانبِ مقتل جو کی نظر
دیکھا اک آفتاب کو نیزے پہ جلوہ گر
لڑکی جو ساتھ تھی وہ پکاری یہ پیٹ کر
میں لٹ گئی پھوپھی مرے بابا کا ہے یہ سر
زلفیں لہو بھری ہوئیں رخ پر لٹکتی ہیں
ہے ہے رگوں سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں

خاموش اے انیس جگر ہو گیا دو نیم
کام آئے گی یہ مدح بروزِ امید و بیم
عسرت کا غم نہ کھا کہ ہے آقا ترا کریم
اب جلد یاں سے روضۂ سرور پہ ہو مقیم
حاصل حضوریِ شہِ گردوں اساس ہو
ہو وہ غلام خاص جو آقا کے پاس ہو

مرثیہ ۲۱

جب تیغ ید اللہ کھنچی دشتِ وغا میں
اک برق غضب کوند گئی ارض و سما میں
چمکے جو شرر چار طرف اڑ کے ہوا میں
اعدا میں ہوا غل کہ گھرے قہرِ خدا میں
سایہ جو پڑا تیغِ دو پیکر کا زمیں پر
جبریلِ امیں کانپ گئے عرشِ بریں پر

خورشید کو رعشہ ہوا کانپا فلکِ پیر
رنگِ رخِ جلادِ فلک ہو گیا تغیر
آنکھوں کے تلے پھرنے لگی موت کی تصویر
تھرا کے عطارد نے صدا دی کہ چلا تیر
غل تھا کہ الٹتا ہے زمانہ کوئی دم میں
چھپتا تھا قلم لوح میں اور لوح قلم میں

جبریل کو چلانے لگے عرش کے حامل
کرسی کو سنبھالو کہ قیامت ہوئی نازل
کہتے تھے سرافیل کہ قابو میں نہیں دل
ہے قہرِ الٰہی غضبِ سرورِ عادل
کونین سے ضربِ شہِ عالم نہ رکے گی
یہ تیغ وہ بجلی ہے کہ اک دم نہ رکے گی

برہم ہے جو طبع پسرِ سیدِ لولاک
سیاروں پہ ثابت تھا کہ اب گرتے ہیں افلاک
گھبرا کے نظر کرتے تھے عیسیٰ طرفِ خاک
ڈر تھا سپرِ مہر نہ ہو جائے کہیں چاک
سر چرخ پہ آپہنچا ہے شمشیرِ دو سر کا
شق ہوئے نہ سینہ کہیں پھر آج قمر کا

سکانِ سمٰوات میں برپا تھا ادھر غل
رو رو کے ادھر ہوتا تھا گیتی کو تزلزل
معشوق کو تھا صبر نہ عاشق کو تحمل
گلشن پہ اداسی تھی جدا تھے گل و بلبل
تاریک تھا دل تک کسی دل کو نہیں تھی
پروانہ کہیں جلتا تھا اور شمع کہیں تھی

تھا خوف کے عالم میں ہر اک بند کا آزاد
شمشاد کی قمری کو فراموش ہوئی یاد
غنچوں کے چٹکنے میں نکلتی تھی یہ فریاد
ہے ہے چمنِ کن فیکون ہوتا ہے برباد
ناحق گلِ زہرا پہ جفا ہوتی ہے کل سے
باقی نہیں برآنے کے اس تیغ کے پھل سے

اڑنے سے پرندوں کے جہاں ہوگیا اندھیر
چیتوں میں یہ غل تھا کہ قیامت میں نہیں دیر
پھر جان کہاں آگئی سایہ میں گراس کے
لرزاں تھا ہر ایک خوفِ شہِ جن و بشر سے
ہیبت تھی کہ اژدر بھی نکل آئے تھے ڈر سے
شمشیر شرربار سے منھ سب کے مڑے تھے

ہر بحر میں طوفاں تھا تو ہر بر میں تلاطم
جنت میں تزلزل تھا تو کوثر میں تلاطم
جو خاک نشیں تھا وہ ہراسان اٹھا تھا
سب ساکنِ افلاک و زمیں کانپ رہے تھے
ہلتا تھا نجف رکنِ رکیں کانپ رہے تھے
اللہ رے ڈر ضربتِ اولادِ علی کا

کس شان سے تولے ہوئے شمشیرِ شرربار
ہے چہرۂ نورانیٔ مولا سے نمودار
عالم شبِ معراج کا دکھلاتی ہیں زلفیں
شمشیر کی تابیں ہیں کہ ماتھے پہ شکن ہے
وہ چشمِ سیہ آہوئے صحرائے ختن ہے
گہ شامِ مصیبت ہے گہے صبحِ طرب ہے

کچھ دھوپ سے کچھ غیظ سے تھے سرخ جو رخسار
دیتے تھے جو دانتوں کے تلے لعلِ گہربار
مختارِ دو عالم کے جہاں زیرِ نگیں تھا

تھا عالمِ وحشت یہ ہرن ہوگئے تھے شیر
بھاگو کہ چلتی ہے ید اللہ کی شمشیر
ہستی کو جلا دیوینگے دم میں شرر اس کے
فریاد کی آتی تھی صدا سنگ و شجر سے
جنات کی جانوں پہ بنی جان کے ڈر سے
اڑ سکتی نہ تھیں ہوش پہ پریوں کے اڑے تھے

تھا شور جزیروں میں سمندر میں تلاطم
برپا تھا بنی جان کے لشکر میں تلاطم
آب دمِ شمشیر سے طوفان اُٹھا تھا
لرزہ تھا مکانوں کو مکیں کانپ رہے تھے
تھے امن میں پر روحِ امیں کانپ رہے تھے
غل فرش سے تھا عرش تلک نادِ علی کا

میدانِ شہادت میں کھڑے ہیں شہِ ابرار
اجلالِ محمد غضبِ حیدرِ کرار
غیظ آتا ہے سرور کو تو بل کھاتی ہیں زلفیں
ابرو جو کماں ہے تو مژہ تیر فگن ہے
غصے سے جو ہو سرخ تو پھر شیر ہرن ہے
رحمت ہے سپیدی میں سیاہی میں غضب ہے

تھا صاف شفق سے گلِ خورشید نمودار
تھے پرچۂ یاقوت میں گویا دُرِ شہوار
یہ نقش سلیماں کی بھی خاتم پہ نہیں تھا

وہ ریشِ مطہر کی سپیدی وہ سیاہی
دیتی تھی زمانے کی دورنگی پہ گواہی
یہ آئینۂ جسم پہ تھی گردِ تباہی
تھیں بازوؤں میں مچھلیاں یا ریگ میں ماہی
مانند ید اللہ لڑائی پہ تُلے تھے
سو عقدۂ مشکل انھیں ہاتھوں سے کھُلے تھے

لو قبضے پہ ہے دستِ زبردستِ شہنشاہ
جن کی رگ و پے میں ہے بھرا زورِ یداللہ
غیر از یدِ قدرت کوئی اس سے نہیں آگاہ
گر کوہِ گراں ہو تو اکھاڑیں صفتِ کاہ
بھاری ہے یہ گر سارا جہاں جنگ پہ تُل جائے
زور اس کا ہو گر قلعۂ خیبر پہ تو کھل جائے

اعدا بھی ہیں چپ شمعِ رسالت بھی ہے خاموش
سینے میں تلاطم ہے شجاعت کا ہے یہ جوش
تیرِ نگہِ شہ سے جوانوں میں نہیں ہوش
چھپ جاتے ہیں ڈھالوں کی پناہی میں زرہ پوش
جوہر نظر آتے ہیں جو اس تیغِ دودم کے
پانی ہوئے جاتے ہیں جگر اہلِ ستم کے

ٹوٹے ہوئے شمشیر کو پڑھتے ہیں یہ اشعار
دنیا بھی ہے بے مہر زمانہ بھی ہے غدار
تف تجھ پہ ہے اے دہرِ ستمگار و جفاکار
بلبل تری اس سفلہ پرستی سے ہیں بیزار
زہرا سے محمد سے علی سے نہ وفا کی
شاکی رہے سب تو نے کسی سے نہ وفا کی

تو نے غمِ فرزند میں آدم کو رلایا
عیسیٰ نے جہاں میں کوئی دم چین نہ پایا
خنجر سے لہو حضرتِ یحییٰ کا بہایا
کس چاہ میں یعقوب سے یوسف کو چھڑایا
وہ کون سے دکھ تھے جو دکھائے نہیں تو نے
کیا کیا کنوئیں پھیری ہیں جھنکائے نہیں تو نے

توڑے دُرِ دندانِ نبی سنگِ جفا سے
مسجد ہوئی تر خونِ سرِ شیرِ خدا سے
فرصت نہ ملی فاطمہ کو رنج و بکا سے
ٹکڑے ہوا شبّر کا جگر زہرِ دغا سے
باقی تھا فقط میں سو عزیزوں سے چھٹا ہوں
پانی کو ترستا ہوں غریبی میں لٹا ہوں

نزدیک یہ اعدا کو پکارے شہِ ذی جاہ
اب جنگ میں کیا دیر ہے اے فرقۂ گمراہ
شاید مری قوت سے ابھی تم نہیں آگاہ
رستم تو یہاں زال ہے اور شیر ہے روباہ
تلوار کا مالک ہوں ولی ابنِ ولی ہوں
جرأت مرا حصہ ہے کہ فرزندِ علی ہوں

عاقل ہو تو مکار کی باتوں پہ نجاؤ
صابر ہوں میں صابر کو نہ تم غیظ میں لاؤ

دم میں غضب آ جائیگا دیکھو نہ ستاؤ
جینا ہو تو ہٹ جاؤ جو مرنا ہو تو آؤ

خیر اپنے سروں کی جو ہو منظور تو سرکو
دیکھو ابھی روکے ہوئے ہوں تیغ دوسر کو

مجھسا کوئی گمراہ اور ہو تم لوگوں کا رہبر
بہتر ہے پھرا دو مرے اس حلق پہ خنجر

اُمت کے جو کام آئے تو حاضر ہے مرا سر
پر میرے سوا کوئی نہیں سبط پیمبر

کھو کر مجھے ڈھونڈوگے تو فریاد کروگے
جب میں نہ ملونگا تو بہت یاد کروگے

جو زندہ ہے قدر اُس کی کسی کو نہیں زنہار
زندوں سے کچھ ان مردہ پسندوں کو نہیں کار

عبرت کی ہے جا فاعتبروا یا اولی الابصار
سو جاتا ہے جب وہ تو یہ سب ہوتے ہیں بیدار

روئے تو اسے کیا جو ثنا کی تو اسے کیا
تعریف اگر بعد فنا کی تو اُسے کیا

گر زیست میں فاقہ ہو تو غم کوئی نہ کھائے
اور وقت مصیبت میں کوئی پاس نہ آئے

یوں پیاس میں لاکر کوئی پانی نہ پلائے
اور بعد فنا فاتحہ شربت پہ دلائے

پروا نہیں پیوند ہو گر رخت بدن میں
مرتے ہیں اسی پر کہ تکلف ہو کفن میں

یوں ہاتھ نہ بڑھائیں جو گرے بندۂ معبود
تابوت کو دینا ہو جو کاندھا تو ہیں موجود

یوں جانتے ہیں قرض حسن دینے کو بے سود
زر صرف ہو میت کے جو ماتم میں تو خوشنود

یوں بھول کے بھی ذکر نہیں کرتے ہیں اس کا
مرجاتا ہے جب کوئی تو دم بھرتے ہیں اس کا

ہشیار ہو اے قوم کہ دنیا ہے گذرگاہ
رہتا ہے گدا اس میں ہمیشہ نہ شہنشاہ

کیا مرحلۂ صعب ہے العظمۃ للہ
تھرّاتے ہیں رہبر بھی وہ پر خوف ہے یہ راہ

نے خوف ہے وہ جن کو تولائے علی ہے
ہاں زاد سفر دوستی آل نبی ہے

کچھ دن بشر اس خانۂ دنیا میں ہے مہماں
دست ملک الموت میں ہے سب کا گریباں

زندوں میں ہیں گر آج تو کل ہونگے بیجان
پہلے سے ہے لازم سفر مرگ کا ساماں

اعمال و عقائد میں نہ ہرگز خلل آئے
کیا جانیے کس وقت پیام اجل آئے

کچھ وقت معین نہیں انساں کی اجل کا
بندہ وہ ہی پابند رہے نیک عمل کا
کیا خاک کا بوجھ اس کے لیے قبر میں کم ہی
لو پند بھی آخر ہی نصیحت بھی ہوئی ختم
الفت بھی مروت بھی محبت بھی ہوئی ختم
دل رکھتے ہو فولاد یہ جوہر ہیں تمھارے
بے قتل مجھے چین کب آتا ہی خبردار!
فرزند امیر عرب آتا ہی خبردار!
فوجوں کی صفیں دم میں الٹ دیتا ہوں آکے
خالق نے مرے قوت حیدر مجھے دی ہی
مختار نے مختاری کوثر مجھے دی ہی
کھل جائیگی دم میں برش اس تیغ دوسری
غصے میں مرے طور ہیں سب قہر خدا کے
بچتا نہیں تلوار ہماری کوئی کھا کے
کس معرکہ میں تیغ کو تولا نہیں ہم نے
تم نار ہو میں نور خدائے دوجہاں ہوں
تم جنگ میں روباہ ہو میں شیر ژیاں ہوں
لاکھوں ہوں تو ہی فتح تو ہر کیف ہماری
اس تیغ سے رستم سا دلاور نہیں بچتا
مغفر ترا فرق پہ جب سر نہیں بچتا
بجلی ہی یہ رکتے کبھی دیکھا نہیں اس کو

آج اٹھ گئے وہ کرتے تھے سامان جو کل کا
پلہ وہی بھاری ہی جو ہو جرم سے ہلکا
ہو اور گناہوں کی گرانی تو ستم ہی
حجت نہ مجھے منظور تھی حجت بھی ہوئی ختم
لو باب ترحم کی عبارت بھی ہوئی ختم
اب تیغ ید اللہ ہی اور سر ہیں تمھارے
سب فوج پہ ادبار اب آتا ہی خبردار!
لشکر پہ خدا کا غضب آتا ہی خبردار!
دیکھوں تو کہاں جاتے ہو پنجے سے قضا کے
فیاض نے توقیر پیمبر مجھے دی ہی
کرار نے شمشیر دوپیکر مجھے دی ہی
کنجی تو مرے ہاتھ میں ہی فتح و ظفر کی
غارت ہو نظر جس پہ کروں غیظ میں آکے
ناخن میں ہمارے ہیں ہر عقدہ کشا کے
تھا کونسا در بند جو کھولا نہیں ہم نے
تم ننگ جہاں میں شرف کون و مکاں ہوں
تم کاہ سے کمزور ہو میں کوہ گراں ہوں
کرتی ہی صفیں صاف سدا سیف ہماری
سن سے جو یہ چلتی ہی تو مغفر نہیں بچتا
سر کیا ہی کہ اک ضرب میں پیکر نہیں بچتا
گر ہوں پر جبریل تو پروا نہیں اس کو

لاسیف اسی حجت قاطع کی ثنا ہے
یہ لشکر باغی کے لیے دار عنا ہے
جوہر میں جو ہے فتح تو قبضے میں ظفر ہے
فخر عرب و روم و عجم کی ہے یہ تلوار
کاٹ اس میں غضب کا ہے ستم کی ہے یہ تلوار
ہلتی تھی زمیں ہاتھ جو قبضے پہ دھرا تھا
پائی نہ اماں لشکر صفین و جمل نے
نہ لات نے مرحب کو بچایا نہ ہُبل نے
گر پاس نہ ہوتا پر جبریل امیں کا
جس وقت سر چاہ علی کے قدم آئے
فریاد کناں ساکن بیر الالم آئے
دیکھے گا سزا پھر اگر اس راہ سے نکلیں
اک ہاتھ میں وہ ہونگی سنانوں کو بچاؤ
مٹ جائیگی یہ شان نشانوں کو بچاؤ
رُکتی ہے نہ جوشن پہ نہ تھمتی ہے کمر پہ
نے جان لیے خانۂ تن سے نہیں پھرتی
کچھ ہو یہ شجاعت کے چلن سے نہیں پھرتی
مُنھ خود و زرہ سے کبھی موڑا نہیں اس نے
بیٹھی ہے تو سر تن سے جدا کرکے اٹھی ہے
کافر کے سراپا کو دوتا کرکے اٹھی ہے
چمکی ہے یہ جس دم تو صفیں چاٹ گئی ہے

آسیب سے کیا سیب سے پھل اس کا بنا ہے
سائے میں جو اس تیغ کے آیا وہ فنا ہے
دشمن کے لیے تیغ ہے مومن کی سپر ہے
کاٹے ہیں نشاں جس نے علم کی ہے یہ تلوار
مثل مہ نو بدر میں چمکی ہے یہ تلوار
خندق کو اسی تیغ نے لاشوں سے بھرا تھا
عنتر کو جلایا ہے اسی تیغ اجل نے
کاٹا شجر کفر کو اس تیغ کے پھل نے
ملتا نہ پتا زیر زمیں گاو زمیں کا
جنات ہزاروں تہ تیغ دودم آئے
یا شیر خدا دین محمدؐ میں ہم آئے
یوسف کی قسم لو جو کبھی چاہ سے نکلیں
ڈھونڈو نہ کہیں گاہ کمانوں کو بچاؤ
جب جانیں کہ اس تیغ سے جانوں کو بچاؤ
یہ مرگ مفاجات سے جلد آتی ہے سر پہ
نے صاف کیے فوج کو رن سے نہیں پھرتی
نے سیر گل زخم بدن سے نہیں پھرتی
دشمن کو کبھی جنگ میں چھوڑا نہیں اس نے
دشمن کو اشارے میں فنا کرکے اٹھی ہے
ہر معرکہ میں حشر بپا کرکے اٹھی ہے
اک ہاتھ میں سو سو کے گلے کاٹ گئی ہے

پڑھکر یہ رجز شام کے بادل میں در آئے
بے دینوں کے دل ہل گئے جس دل میں در آئے
تھرّا گیا میداں کہ ہزبرِ احد آیا
اعدا کے سروں پر جو وہ تیغِ دو سر آئی
بجلی سی چمک کر ادھر آئی اُدھر آئی
دستانے میں یوں کاٹ گئی دستِ ستم کو
نے دست ہر اک صف میں تھی نے سر تھا ہر اک غول
شمشیرِ دو دستی نے نکالی تھی نئی تول
اس تیغ سے فولاد کا دل نرم ہوا تھا
چار آئنہ والوں کو نہ تھا تیغ سے چارا
کہتے تھے زرہ پوش نہیں جنگ کا یارا
جوشن کو سنا تھا کہ حفاظت کا محل ہے
بدکیش لڑائی کا چلن بھول گئے تھے
سب چلّہ کشی عہد شکن بھول گئے تھے
معلوم نہ تھا جسم میں جاں ہے کہ نہیں ہے
تولے ہوئے بھالوں کو جفا کار تھے ہر چند
کیا روکتے تیروں کو جو انانِ تنومند
بیرق تھے نہ بھالے تھے نہ پرچم نہ علم تھا
دم کی تھی دعا شاہ نے کیا تیغِ دو دم پر
گردن سے جو سینے پہ تو سینے سے شکم پر
جوشن میں تھی جیب میں بکتر میں نہ زیں پر

چمکا کے فرس کو صفِ اوّل میں در آئے
اک شیر سے تلواروں کے جنگل میں در آئے
لشکر میں پڑا شور کہ بھاگو اسد آیا
اک تیز چھری تھی کہ کلیجوں میں در آئی
دو ہو گئی جب تیغ کے نیچے سپر آئی
جس طرح سے کاٹے کوئی جلدی میں قلم کو
خود اُلٹے ہوئے خاک پہ تھے صورتِ کشکول
سر بکتے تھے ارزاں پہ نہ لیتا تھا کوئی مول
تن سرد تھے بازارِ اجل گرم ہوا تھا
چو رنگ تھے سینے تو کلیجے تھے دو پارا
بچ جائیں تو جانیں کہ ملی جان دوبارا
اس کی نہ خبر تھی کہ یہی دامِ اجل ہے
ناوک فگنی تیر فگن بھول گئے تھے
بیہوشی میں ترکش کا دہن بھول گئے تھے
چلّاتے تھے قبضے میں کماں ہے کہ نہیں ہے
تھی عقدہ کشا تیغ نہ بند تھا نہ تھا کوئی بند
تھا شیرِ نیستانِ اسد اللہ کا فرزند
اک ہاتھ میں پانی تھا کبھی نیزہ کبھی قلم تھا
نے خود پہ رکتی تھی نہ تھمتی تھی جھلم پر
توسن سے رکابوں پہ رکابوں سے قدم پر
سُم کاٹ کے گھوڑے کے جو دیکھا تو زمیں پر

غل تھا کہ زمانہ میں نہیں صف شکن ایسا
تلوار جو ایسی ہو تو ہو تیغ زن ایسا
دنیا میں لڑا ہے کوئی تشنہ دہن ایسا
کچھ حرف شکایت کا نہ آئے چلن ایسا
سکہ نہ ہو کیوں ضرب شجاع ازلی کا
کونین میں ہے نام حسین ابن علی کا

نیزوں کو ہلاتے تھے جو رہواروں پہ تن کے
ٹکڑے بھی زمیں پر نہ ملے اُن کے بدن کے
جنگل میں چھپے آئے وہاں شیر جو بن کے
بھاگے وہ ہرن ہو کے بہادر تھے جو رن کے
صفدر نے جواں مردوں کے دل توڑ دیے تھے
نیزوں کے دم تیغ نے منھ موڑ دیے تھے

انبار تن و سر کے سراسر تھے زمیں پر
تن تھے کسی جا اور کہیں سر تھے زمیں پر
کاٹے ہوئے ہتھیار برابر تھے زمیں پر
جوشن کہیں ٹکڑے کہیں مغفر تھے زمیں پر
بیجاں کہیں وہ اہل ستم ساتھ پڑے تھے
ریتی پہ کہیں پاؤں کہیں ہاتھ پڑے تھے

کس سر پہ چڑھی تیغ کہ توسن پہ نہ اُتری
وہ کونسا توسن تھا کہ بے سن سے نہ اتری
بے جان ہے جسم تہمتن سے نہ اتری
اتری جو نہ وہ موت بھی گردن سے نہ اُتری
دشمن کو نہ زندہ کسی جا موت نے چھوڑا
تیغ اُتری کمر سے تو گلا موت نے چھوڑا

چلتی تھی چپ و راس جو شمشیر دو دھاری
ریتی پہ تڑپتی تھی دو رستہ صف ناری
خنجر تھے گلوں پر تو کلیجوں پہ کٹاری
کٹ کٹ گئیں تیغیں ستم آرا ہوئے عاری
نوکیں جو پڑیں دل پہ کسی بانی شر کے
دو برچھی کے پھل پار ہوئے ایک جگہ کے

افعی کی طرح منھ سے نکالے تھی زباں تیغ
ہر دم صف کفار پہ تھی شعلہ فشاں تیغ
گرتی تھی جھپک کر کبھی یاں اور کبھی واں تیغ
چھپتے تھے جفا جو پہ نہ دیتی تھی اماں تیغ
قبضے میں جو سب فوج تھی اس تیغ دو سر کے
بچ سکتے تھے دشمن نہ ادھر کے نہ اُدھر کے

غل تھا کہ نہ ڈھالوں سے یہ تلوار رُکے گی
روکے سے نہ یہ برق شرر بار رُکے گی
سو بار گرے گی یہ نہ اکبار رُکے گی
برق غضب ایزد قہار رُکے گی
انگشت قضا کہتے ہیں اس تیغ کے پھل کو
سر پر کبھی آتے نہیں دیکھا ہے اجل کو

پشتہ وہ کہ لشکر کو پریشان کیا جس نے
آب ایسی کہ خشکی میں یہ طوفان کیا جس نے
دم ایسا کہ سب فوج کو بیجان کیا جس نے
زہر ایسا کہ جنگل کو گلستاں کیا جس نے
سر سے کڑوں کاٹے تھے یہ رنگ اس کا لہر تھا
ہر ناب میں ناگن کی طرح زہر بھرا تھا

قبضہ وہ جسے رکھتے تھے قبضے میں ید اللہ
نابوں سے عیاں تھا کہ عدم کی ہے یہی راہ
جوہر وہ کہ ہر فرد بشر جس سے ہو آگاہ
قد آفتِ دوراں برش العظمۃ للہ
باڑھ ایسی مقابل کبھی دریا نہیں جس سے
گھاٹ ایسا کہ جیتا کوئی اترا نہیں جس سے

مومن کے لیے نور ہے کافر کے لیے نار
یہ رنگ نیا تھا کہیں آتش کہیں گلزار
اعجاز تو دیکھو کہیں راحت کہیں آزار
قدرت کا تماشا ہے کہیں گل تو کہیں خار
دم بند تھے دہشت سے شجاعانِ جہاں کے
مسدود تھے سب رستے وہاں امن و اماں کے

ناری کو سقر تک کبھی پہونچا کے پھر آئی
دیکھا کسی موذی کو تو بل کھا کے پھر آئی
ناگن کی طرح سن سے کبھی جا کے پھر آئی
جانا تھا کہ بس فوج پہ لہرا کے پھر آئی
غل تھا کبھی یوں تیغ کو چلتے نہیں دیکھا
افعی کو بھی یہ زہر اگلتے نہیں دیکھا

خوں ناریوں کا چاٹ کے گرمائی ہوئی تھی
بجھتی جو نہ تھی پیاس تو جھنجلائی ہوئی تھی
دریا کی طرف جانے پہ لہرائی ہوئی تھی
سب فوج پہ اک برقِ غضب چھائی ہوئی تھی
منہ کیا تھا کہ اک قہر تھا خم تھا کہ غضب تھا
لشکر کا لہو پی گئی دم تھا کہ غضب تھا

دو کر کے سر و صدر و شکم ناف سے نکلی
تعریف دلِ صاحبِ انصاف سے نکلی
بجلی سی جو چار آئنۂ صاف سے نکلی
یا فاتح خیبر کی صدا قاف سے نکلی
چل جاتا تھا جب وار امامِ مدنی کا
غل ہوتا تھا افلاک پہ اللہ غنی کا

جب تن کے چلی حال عدو غیر کر آئی
جس صف پہ گری خاتمہ بالخیر کر آئی
کشتوں کے تڑپنے کی کبھی سیر کر آئی
دریا کی طرف خوں میں کبھی پیر کر آئی
سب گھاٹ سے دنیا کے تلک خوں میں تر تھی
تلوار نہ تھی ماہی دریائے ظفر تھی

وہ سیل جدھر آئی تلاطم نظر آیا
آنکھوں سے نہاں مجمع مردم نظر آیا
ہلچل میں سواروں کا پرا گم نظر آیا
جو تھا بہ سر زیں وہ تہ سم نظر آیا
منہ کھول کے اژدر نے نوالہ کیا سب کو
بجلی کی تڑپ نے تہ و بالا کیا سب کو

دو شخصوں نے اک غول سے رہوار نکالے
اک ہاتھ میں نیزہ لیے اک تیغ سنبھالے
چار آئنہ بر میں سپریں کاندھوں پہ ڈالے
امداد کو پہونچے کئی سو برچھیوں والے
کس دھوم سے وارد سر میداں ہوئے دونوں
پڑھ پڑھ کے رجز جنگ کے خواہاں ہوئے دونوں

ایک ایک ستم پیشہ و سرہنگ و دغا جو
مغرور و سیہ کار و سیہ رنگ و سیہ رو
بد صورت و بد ہیئت و بد سیرت و بد خو
سینے جو کشادہ تو قوی ساعد و بازو
پیاسے تھے لعیں خون امام ازلی کے
دونوں کو عداوت تھی گھرانے سے علی کے

برچھوں کو ہلاتے ہوئے آئے جو وہ بدکار
ہر گشت میں پھرتے تھے فرس صورت پرکار
شبدیز کو چمکا کے پکارے شہ ابرار
آتی ہے اجل سر پہ خبردار خبردار
حافظ ہے خدا کچھ مجھے پروا نہیں جو ہو
یہ بھی ہو شگون نیک کہ پہلے ہی سے دو ہو

یوں کہنے لگے طعن سے دونوں ستم ایجاد
حضرت بھی بلا لیں جسے چاہیں پئے امداد
فرمایا پکاروں کسے میں بیکس و ناشاد
اب تو نہ بھتیجا ہے نہ بھائی ہے نہ اولاد
سب مر گئے تنہا ہیں لاکھوں میں کھڑے ہیں
یہ خاک پہ لاشے انھیں پیاروں کے پڑے ہیں

گو کوئی نہ بھائی نہ پسر ساتھ ہے میرے
ہاں ایک خدا آٹھ پہر ساتھ ہے میرے
ہیں سیف الٰہی ہوں ظفر ساتھ ہے میرے
ہمدم کی طرح تیغ دو سر ساتھ ہے میرے
تم دونوں ہو کیا فتح کبھی پا نہیں سکتے
لاکھوں ہوں تو قبضے سے مرے جا نہیں سکتے

ناگاہ بڑھے تول کے نیزے وہ خونریز
مہمیز جو کی برق مجسم ہوئی شبدیز
تا پوں سے ہلا دور تلک دشت بلا خیز
فولاد میں در آئیں سنانیں تھیں جو تیز
آمد میں یہ دعوے تھا ہر اک بانی شر کو
نوکوں پہ اٹھا لیتے ہیں زہرا کے پسر کو

مکاروں نے دکھلائی بہت شعبدہ بازی
دیکھا کیے ہنس ہنس کے شہنشاہ حجازی
تھے عقل کے کوتاہ جو کی دست درازی
ہاتھ آتا ہے کب ابن ید اللہ سا غازی
جو منہ پہ چڑھا خاک کا پیوند ہوا ہے
نیزوں سے کہیں عقدہ کشا بند ہوا ہے

وار آپ نے جب رد کیے ان کے کئی باری
تھرانے لگے ہاتھ یہ دہشت ہوئی طاری
تھی تیغ شہ دیں غضب ایزد باری
کانپا جو کلیجا دو دلے ہو گئے ناری
نیزوں کی سناں کو دم شمشیر نے کاٹا
غل تھا کہ سر شمع کو گلگیر نے کاٹا

اک ضرب میں دونوں کے جو نیزے ہوئے بیکار
تلواریں علم کر کے پھر آئے وہ ستمگار
تیغیں جو چپ و راس سے چلنے لگیں اک بار
روکے سپر حضرت حمزہ پہ وہ سب وار
دونوں کو ڈرایا بھی نہ شمشیر دو سر سے
پسپا ہوئے وہ خود تو ہٹے آپ نہ ڈر سے

اک ضرب میں ہاتھ اس کا اڑا اور سپر اس کی
دو تھا جو سر اس کا تو جدا تھی کمر اس کی
اس کو خبر اس کی تھی نہ اس کو خبر اس کی
کی موت نے دعوت ادھر اس کی ادھر اس کی
گرمی میں لڑے تھے شہ دلگیر سے دونوں
ٹھنڈے ہوئے آب دم شمشیر سے دونوں

اک ہاتھ میں بیجان ہوئے دونوں جو ستمگر
حضرت نے کہا اور بھی ہے کوئی دلاور
دعوے ہو تو دیکھے مری تلوار کے جوہر
پھر تاب کسے تھی کہ مقابل ہو جو آکر
دونوں کو اجل لائی تھی شمشیر کے منہ پر
صید آپ سے جاتا ہے کوئی شیر کے منہ پر

ہاتھ ایسا چلے دست خدا کہیے تو حق ہے
ضرب ایسی کہ جس ضرب سے دل کفر کا شق ہے
جب چاہیں الٹ دیں کہ زمیں ایک ورق ہے
یہ سب ہے مگر آپ کو امت کا قلق ہے
دیتے تھے دعا ہائے جو پرسے اہل جفا کے
آنسو نکل آتے تھے امام دوسرا کے

ہر چند کہ بیٹوں کے تھے قاتل وہ ستمگار
مانگی جو اماں سب نے تو خود روک لی تلوار
بد عہد تھی کیا امت غدار و جفاکار
یاں ہاتھ رکا واں سے ہوئی نیزوں کی بوچھار
یاں رحم تھا اور امت عاصی کی دعا تھی
واں صلح میں تھا مکر لڑائی میں دغا تھی

واں ظلم و ستم تھے ادھر الطاف و مدارا
باطل پہ وہ تھے حق پہ یہ اللہ کا پیارا
وہ خاک کے ذرّے سے بھتے یہ تھا عرش کا تارا
واں لاکھ ستمگر ادھر اک پیاس کا مارا
واں قتل کا غل فوج مخالف میں اٹھا تھا
سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ ادھر شکرِ خدا تھا

سب سے پسرِ سعد یہ کہتا تھا کہ جاؤ
جلدی سرِ فرزندِ نبی کاٹ کے لاؤ
لینا ہے زرِ سرخ تو خوں شہ کا بہاؤ
فرماتے تھے شبیر کہ حاضر ہوں ہیں آؤ
طوفاں سے کہیں کشتیٔ تن پار اتر جائے
سر تن سے جدا ہو تو بڑا پار اتر جائے

نقصان مرا کیا ہے اگر تم نے دغا کی
جاگیر شہادت مجھے خالق نے عطا کی
اللہ سے وعدہ کیا جو اس پہ وفا کی
میرا نہیں سر یہ تو امانت ہے خدا کی
سر دینے میں حجت نہیں تکرار نہیں ہے
ہم لوگوں کے اقرار میں انکار نہیں ہے

فرما کے یہ قبضے سے رکھا تیغِ دو سر کو
لٹکا دیا ہر نے پہ دلاور نے سپر کو
پایا تھا جو تنہا شہِ مرداں کے پسر کو
بس گھیر لیا شام کے بادل نے قمر کو
لشکر کی سیاہی تھی کہ گھبر لئے شبیر
سب فوج کی تیغوں کے تلے آگئے شبیر

اک نور کو گھیرے ہوئے ظلمت نظر آئی
دن کو شبِ تیرہ کی علامت نظر آئی
خود شافعِ محشر پہ قیامت نظر آئی
قرآن کے بچنے کی نہ صورت نظر آئی
کٹتی تھیں رگیں ظلم کا دروازہ کھلا تھا
اجزائے تنِ پاک کا شیرازہ کھلا تھا

بت گرد تھے اور بیچ میں وہ کعبۂ ایماں
تھا نوح پہ خشکی میں عجب طرح کا طوفاں
دو لاکھ دل آزار اور اک عیسیٔ دوراں
کیا مورچہ بندی تھی پئے قتلِ سلیماں
فرعونوں کا حضرتِ عیسےٰ پہ یہ ستم تھا
سب فوج کی تیغیں تھیں اور اک شاہ کا دم تھا

بیکس پہ ہزاروں جو چلے تیر سہ پہلو
غربال ہوا سینۂ شاہنشہ خوش خو
نیزے جو برابر سے لگاتے تھے جفاجو
چھد جاتے تھے دونوں کبھی شانے کبھی بازو
بند آنکھیں کیے جھومتے تھے گھوڑے پہ ان میں
تلواروں کے پھل لگتے تھے اس پھول سے تن میں

پھولے ہیں گلِ زخم کوئی جا نہیں خالی
شرماتی ہے جن سے گلِ صد برگ کی لالی
یوں کٹ کے لٹک آئے تھے دستِ شہِ عالی
جیسے کوئی کرتا ہے قلم پھول کی ڈالی
جگر جو بھر آئینگے نہیں باغِ جہاں میں
عالم کو دکھاتے ہیں بہار اپنی خزاں میں

جب مارتا تھا سنگ دہن پر کوئی غدار
فرماتے تھے فریاد ہے یا احمدِ مختار
پڑتی تھی قفا سے جو کوئی فرق پہ تلوار
سر تھام کے چلاتے تھے یا حیدرِ کرار
چھدتا تھا جو تیروں سے جگر شاہِ زمن کا
نعرہ لبِ خشکیدہ پہ تھا ہائے حسن کا

تھا خون کا دریا جو ہر اک زخم سے جاری
منھ زرد تھا اور تن کی قبا سرخ تھی ساری
پہلو پہ جو لگ جاتا تھا بھالا کوئی بھاری
جھک جھک کے سنبھل جاتا تھا وہ عاشقِ باری
مجروح سراپا جو امامِ دو جہاں تھے
دو خون کے پرنالے رکابوں سے رواں تھے

یاں ایک تنِ زار ادھر سیکڑوں خونخوار
کھایا کبھی نیزہ کبھی برچھی کبھی تلوار
طاقت جو نہیں ہرنے پہ جھکجاتے ہیں ہر بار
نکلے ہیں رکابوں سے قدم ہاتھ ہیں بیکار
سینے سے کوئی تیر نکالا نہیں جاتا
اب تو دلِ مجروح سنبھالا نہیں جاتا

غش سے کبھی چونکے کبھی جھومے کبھی تھرّائے
کی آہ کبھی اور کبھی اشک آنکھوں میں بھر آئے
تلواروں سے جو چور ہو بیکس وہ کدھر جائے
دم ہونٹوں پہ تھا اور کوئی ہمدم بھی نہ تھا ہائے
یوں تیروں کی بوچھار کسی تن پہ نہ ہوئے
جو شاہ پہ گذری کسی دشمن پہ نہ ہوئے

رہوار سے ناگاہ گرے قبلۂ کونین
تڑپا جو ذرا سا تو نبی ہو گئے بے چین
ماتم کا ہوا غل فلک و ارض کے مابین
اعدا میں ہوا فتح کا غل بیبیوں میں بین
تھرّا گئے چودہ طبقے ارض و سما کے
نعروں کی صدا آنے لگی شبیرِ خدا کے

خنجر کو لیے شمر چلا جب طرفِ شاہ
آئی یہ صدا رحم کر اس پیاسے پہ للہ
خاتونِ قیامت ہوں میں کیا تو نہیں آگاہ
فریاد جفا جو نے کسی کی نہ سنی آہ
بالائے سرِ شاہ جو وہ بے ادب آیا
غل تھا کہ الٹتا ہے زمانہ غضب آیا

رکھنے جو لگا سینے پہ زانو ستم آرا
پتھر کے تلے دبگیا ہی ہی مرا پیارا
ظالم جگرِ شبیرِ خدا کاٹ کے اُٹھا

چہرے پہ سکینہ کے یتیمی سی جو چھائی
رستے میں خبر آکے یہ فضہ نے سنائی
مادر کو تڑپتا ہوا جنگاہ میں دیکھا

ہاں اہل عزا مرثیہ اب ہوتا ہی آخر
ہی ہی دشتہ آوارہ وطن ہائے مسافر
زلفیں وہ تری خاک میں سب اَٹ گئیں آقا

آقا ترے عمامۂ گلگوں کے تصدق
ان زخموں کے صدقے دلِ محزوں کے تصدق
خنجر کے تلے سجدۂ رب کرنے کے صدقے

ہاں اہلِ عزا روؤ کہ ماتم ہوا آخر
سامان عزائے شہِ عالم ہوا آخر
یہ مجلس آخر ہی جگر بندِ نبی کی

کیا خوب کٹے آٹھ دن اور دو یہ مہینے
کوتاہ کیا ہاتھ نہ ماتم سے کسی نے
دل روتا ہی صدمہ ہی عجب طرح کا جاں پر

آقا ترے قربان خدا حافظ و ناصر
ای فاطمہ کی جان خدا حافظ و ناصر
مجبور ہیں گر قبر میں ہم ہوئینگے مولا

زہرا کی صدا آئی برابر سے دوبارا
سفاک نے زانو کو نہ سینے سے اتارا
خنجر سے مسافر کا گلا کاٹ کے اُٹھا

زینب درِ خیمہ سے تڑپ کر نکل آئی
مارے گئے شبیر دوہائی ہی دوہائی
آگے جو بڑھی بھائی کا سر راہ میں دیکھا

پرسا دو کہ ہی فاطمہ اس بزم میں حاضر
مذبوح قفا تشنہ دہن صابر و شاکر
ہی ہی تری خنجر سے رگیں کٹ گئیں آقا

سید ترے پیراہنِ پرخوں کے تصدق
ریتی پہ تڑپتے قدِ موزوں کے تصدق
سرور ترے پانی کے طلب کرنے کے صدقے

ای مجلسیو پیٹو کہ یہ غم ہوا آخر
کیا مجمع احباب تھا برہم ہوا آخر
تم لوگوں سے رخصت ہی حسین ابن علی کی

نیلے رہے ماتم سے عزادار کے سینے
ہر روز دعائیں تمھیں دیں روحِ نبی نے
دیکھو تو کہ کیا آج اُداسی ہی مکاں پر

ای شیعوں کے مہمان خدا حافظ و ناصر
ای دیں کے سلطان خدا حافظ و ناصر
جیتے ہیں تو پھر اگلے برس آئینگے مولا

خاموش انیس اب کہ ہے سینے میں جگر چاک
حق ہے ترا مداحیِ سبطِ شہِ لولاک
حاسد سے نہ کچھ خوف نہ دشمن سے ہے کچھ باک
نافہم ہے وہ چاند پہ ڈالے جو کوئی خاک
سب مدح کریں نظم کی یہ نظم و نسق ہے
باطل ہے سو باطل ہے جو حق ہے سو وہ حق ہے

سلام

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے
اُڑ گیا جب رنگ رُخ سے استخواں پیدا ہوئے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں
اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

علم خالق کا خزانہ ہے میانِ کاف و نون
ایک کن کہنے سے یہ کون و مکاں پیدا ہوئے

ہاتھ خالی آئی لاشوں پر شہیدوں کے نسیم
پھول بھی اس فصل میں ایسے گراں پیدا ہوئے

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں
خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

جو عدم سے آگیا دنیا میں بولی ہنس کے موت
اور لو دو چار دن کے میہماں پیدا ہوئے

ضبط دیکھو سب کی سُن لی پر نہ اپنی کچھ کہی
اس زباں دانی پہ گویا بے زباں پیدا ہوئے

جان دی حُر نے تو حضرت نے دیا باغِ ارم
میہماں ایسے نہ ایسے میزباں پیدا ہوئے

یک بیک ایسا زمانے میں ہوا ہے انقلاب
قدرداں سب اُٹھ گئے ناقدرداں پیدا ہوئے

بود و نابود علی اصغر کا کیا کیجے بیاں
بے زباں دنیا سے اُٹھے بے زباں پیدا ہوئے

دیکھ کر لاشوں کو حضرت کہتے تھے واغربتا
موت لے آئی کہاں ان کو کہاں پیدا ہوئے

احتیاطِ جسم کیا انجام کو سوچو انیس
خاک ہونے کو یہ مشتِ استخواں پیدا ہوئے

مرثیہ ۲۲

جب قیدیوں کو خانۂ زنداں میں شب ہوئی
بچوں کی مارے خوف کے حالت عجب ہوئی
گھٹ گھٹ کے دخترِ شہِ دیں جاں بلب ہوئی
مضطر کمال بنتِ امیرِ عرب ہوئی
آفت کا سامنا تھا نئی واردات تھی
زہرا کی بیٹیوں پہ قیامت کی رات تھی

پہلے پہل کی قید وہ اور وارثوں کے داغ
یہ رنگ تھا کہ ہووے خزاں دیدہ جیسے باغ
رونے سے اہلِ بیت کو اک دم نہ تھا فراغ
نے چاندنی نہ شمع نہ مشعل نہ واں چراغ
غل تھا کہ ایسے گھر بھی الٰہی جہاں میں ہیں
ثابت نہیں کہ قبر میں ہیں یا مکاں میں ہیں

یوں وہ شکستہ حال تڑپتے تھے ہر نفس
دشوار جیسے صید پہ ہو تنگیٔ قفس
جانوں کو تھی بدن سے نکل جانے کی ہوس
بازو بندھے ہوئے تھے نہ تھا کچھ کسی کا بس
دل چھاتیوں میں صورتِ بسمل پھڑکتے تھے
زنداں کے در سے جا کے سروں کو پٹکتے تھے

اس گھر میں اہلِ بیتِ محمد ہوئے تھے بند
جز کہنگی جسے نہ کسی نے کیا پسند
تنگی سے ایک ایک کو تکلیف تھی دوچند
تھوڑی سی جا مگر کہیں پست اور کہیں بلند
وہ بیبیاں اسیر تھیں اُس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لیے گھر بہشت میں

زنداں میں جبکہ آلِ پیمبر ہوئے اسیر
کونین کے امیر کھلے سر ہوئے اسیر
سب رشتہ دارِ حیدرِ صفدر ہوئے اسیر
وحشت سرا میں عرش کے اختر ہوئے اسیر
وہ بیبیاں اسیر تھیں اُس قصرِ زشت میں
ہیں جن کی لونڈیوں کے لیے گھر بہشت میں

بستی وہ فاطمہ کی کہاں اور وہ گھر اُجاڑ
جانوں پہ تھی بنی ہوئی قسمت کا تھا بگاڑ
کیا دل کھلیں کہ شام سے جب بند ہوں کواڑ
دیواریں تھیں بلند کہ چھاتی پہ تھے پہاڑ
گھبرا کے چھت کو بیبیاں ہر بار تکتی تھیں
ٹوٹے مکاں کی رات کو کڑیاں کو تکتی تھیں

کیجے شکستگی خرابی کا کیا بیاں — ثابت نہ جس میں سقف نہ در اور نہ سائباں
وحشت کا گھر اس کی جا خوف کا مکاں — وہ شب کہ الحذر، وہ اندھیرا کہ الاماں
ظلمت کدے کو بھی زنداں کا گھر نہ تھا — حجرے یہ تنگ تھے کہ ہوا کا گذر نہ تھا

مثل دل یزید تھا وہ سب مکاں سیاہ — تاروں کی روشنی کو بھی ملتی تھی واں نہ راہ
چھایا تھا دل جلی ہوئی رانڈوں کا دود آہ — حجرے تھے چشم تر کہ نکلتی نہ تھی نگاہ
دیکھے کسی کی شکل کوئی یہ محال تھا — روزن بھی تھا کوئی تو وہ چشم غزال تھا

شب کا تو ذکر کیا ہے کہ لگتا تھا دن کو ڈر — ظاہر تھے جا بجا حشرات زمیں کے گھر
تھے وقف آشیان ابابیل سقف و در — نکلا وہ مر کے قید ہوا اس میں جو بشر
گھر تھا اجل کا خانہ رنج و بلا نہ تھا — برسوں سے واں چراغ کسی شب جلا نہ تھا

وہ تیرگی کہ ہو شب ظلمات اس سے دنگ — ہر در بسان حجرۂ چشم بخیل تنگ
تھی اس کی صبح و شام سواد دیار زنگ — دیوار و سقف و بام و زمیں سب سیاہ رنگ
قید اس میں تھے حرم شہ گردوں مقام کے — کیا صبح ل گئی تھی خرابے کو شام کے

گرمی کی فصل اور ہوا کا وہ حبس — وہ ضیق اس مکان کی اور قید کا ہراس
اندوہ کا وفور دلوں پر ہجوم یاس — مائیں جو تہلکہ میں تو بچے تھے بے حواس
دیواریں بھی شکست تھیں در بھی جھکے ہوئے — جانیں بھی غم سے تنگ تھیں دل بھی رکے ہوئے

ہر دم زمیں سے لو کی نکلتا تھا یوں بخار — جیسے دھواں تنور سے اٹھتا ہے بار بار
گرمی سے یوں زمیں پہ تڑپتے تھے سوگوار — جس طرح سے سپند ہو آتش پہ بے قرار
جھک جھک کے آسماں کو حسرت سے تکتے تھے — کیسے ہوائے سرد کو بچے بلکتے تھے

جھڑتی تھی وہ اس کی سقف سے ہر دم سروں پہ خاک — تھے گرد سے بھرے ہوئے رانڈوں کے جسم پاک
بھاگی تھی روشنی بھی یہ حجرے تھے ہولناک — کہتے تھے اب مکاں یہ گرا اب ہوئے ہلاک
قسمت میں ہے کہ قبر اسی جا نصیب ہو — اچھا تو ہے جو خاک کا پردا نصیب ہو

ایک ایک سے یہ کہتی تھی زینب جگر فگار
لائق نہ اس مکان کے تھے ہم گناہگار
مجبور جو غریب ہوں کیا ان کا اختیار
سایہ تو ہو سروں پہ کرو شکر کردگار
ہو جائے گر یہ حال شہ مشرقین پر
کیا گزری ہوگی دھوپ میں لاش حسین پر

غارت گروں نے لوٹ لیا کہنہ پیرہن
وہ ریگ گرم اور وہ عریانی بدن
ہے ہے وہ شب پہاڑ سی اور کربلا کا بن
کس طرح جائے بھائی تلک کیا کرے بہن
پیاسا گلا کٹا کے موئے جس کی راہ میں
سونپی ہے میں نے لاش اسی کی پناہ میں

رسی مرے گلے کی کوئی کھول دے اگر
مقتل کو ڈھونڈھتی ہوئی جاؤں برہنہ سر
نکلی میں جب تو پھر نہیں درکار راہبر
رستے میں پوچھ لونگی کہ ہے کربلا کدھر
ممکن ہے یہ کہ لاش کو زینب نہ پائیگی
بھائی کے خوں کی بو مجھے کوسوں سے آئیگی

کہنے لگی یہ اٹھ کے سکینہ جگر فگار
لینی چلو مجھے بھی پھوپھی تم پہ میں نثار
چھپ کر چلی گئیں تو میں روؤنگی زار زار
تم نے بھی کیا بھلا دیا دل سے ہمارا پیار
مر جاؤنگی اگر نہ پدر سے ملاؤ گی
کیا اس اندھیرے گھر میں مجھے چھوڑ جاؤگی

رو کر تب اس یتیم سے زینب نے یہ کہا
واری کہاں میں اور کہاں دشت کربلا
بیکس اسیر دام بلا غم کی مبتلا
قیدی کو کون جانے کی دیگا بھلا رضا
بھائی کی لاش پاس اگر رہنے پاتی میں
زنداں میں قید ہونے کو کاہے کو آتی میں

ہے دشت کربلا تو کئی دن کی یاں سے راہ
ایسے کہاں نصیب کہ حاصل ہو وصل شاہ
گھر میں یزید کے ہے سر شاہ دیں پناہ
ہم قید اس مکاں میں ہیں بے جرم و بے گناہ
ہم سا کوئی جہاں میں نہ آفت نصیب ہے
ممکن نہیں کہ سر کی زیارت نصیب ہے

یہ تفرقہ بھی ہوتا ہے کم زیر آسمان
ہے ایک شہر پائے ہیں لیکن الگ مکاں
ہم ہیں کہیں کہیں ہے سر شاہ انس و جاں
میں کس کے آگے اپنی مصیبت کروں بیاں
بے بس ہیں رشتہ دار شہ ذوالفقار کے
حاکم کے ڈر سے رو نہیں سکتے پکار کے

کہنے لگی یہ سن کے سکینہ بچشم تر ہے ہے پھوپھی نہ آئینگے کیا اب مرے پدر
حاکم کے گھر میں قید ہیں سلطان بحر و بر اب مجکو نیند کاہیکو آئے گی رات بھر
سچ کہتی ہو نہ شاہ خوش انجام آئینگے اماں تو کہتی تھیں کہ سر شام آئینگے

جب رو کے پوچھتی ہوں کہ بابا گئے کدھر بہلاتی ہیں مجھے کہ سدھارے ہیں نہر پر
کہتا ہے کوئی دور نہیں شاہ بحر و بر روؤ نہ تم اب آئینگے اب آئینگے پدر
خاطر کی بات کیا کوئی پہچانتا نہیں سن لیتی ہوں میں سب کی پہ دل مانتا نہیں

سمجھاتی ہیں پھپی کہ اب آنسو نہ تم بہاؤ آرام سے سلاؤں میں گودی میں بی بی آؤ
اب عنقریب ہے کہ چچا اور پدر کو پاؤ کہتی ہوں ان سے میں کہ بھلا تم قسم تو کھاؤ
سچ ہے اگر تو کس لیے بیتاب ہوتی ہو کیوں منھ کو پھیر کر مری جانب سے روتی ہو

ماں سے جو پوچھتی ہوں کہ تم بھی تو کچھ کہو وہ کہتی ہیں کہ آؤ مری جان سو رہو
اس شب کو اور شہ کی جدائی کا غم سہو کہیو تب ہی جو شہ سے ملاقات کل نہ ہو
دل صبح سے اچاٹ ہے بستی اجاڑ ہے مجکو تو کاٹنا اسی شب کا پہاڑ ہے

معلوم ہو گیا مجھے بہلاتے ہیں یہ سب تا مرنجائے قید میں گھٹ کر یہ تشنہ لب
کیا حاصل اس چھپانے سے شاید جیوں گی اب میں کس بلا میں پھنس گئی یاں آ کے ہے غضب
یہ لوگ تو کبھی نہ مفصل بتائینگے میں اپنی جان دونگی جو بابا نہ آئینگے

یہ ذکر تھا ابھی کہ ہوا بند قفل در زنداں میں اور ہو گئی ظلمت زیادہ تر
گھبرا کے دیکھنے لگیں رانڈیں ادھر ادھر جز تیرگی کسی کو نہ آتا تھا کچھ نظر
تڑپے یہ دل کہ سینوں میں سانسیں اکھڑ گئیں ماؤں سے بچے بچوں سے مائیں بچھڑ گئیں

نظروں سے صورتیں جو ہوئیں ایک بیک نہاں ہاتھوں سے ڈھونڈھنے لگیں بچوں کو بیبیاں
چلائی نے جو ہے میں بانوئے خستہ جاں دیکھو تو بیبیو کہ ہے اصغر مرا کہاں
دل پر سکینہ جان کے صدمے گذر نہ جائیں بچے مرے دہل کے اندھیرے میں ڈر نہ جائیں

پھرتا تھا گھٹنیوں بھی یاں میرا نونہال
بچے کا میرے صاحبو رکھیو ذرا خیال

کہنے لگی یہ زینب بیکس بصد ملال
کس کی تلاش میں ہو کہاں ہی تمھارا لال

ملتا نہیں ہی پھر جسے ہاتھوں سے کھوتے ہیں
تم جن کو ڈھونڈھتی ہو وہ مقتل میں سوتے ہیں

چھاتی کو پیٹ کر یہ پکاری وہ سوگوار
لو جانتی تھی میں کہ یہیں ہی وہ گلعذار

ہی دور مجھسے ہاے مرا طفل شیر خوار
اصغر تمھارے ننھے سے لاشے کے میں نثار

ای لال دامن شہ خوشخو میں سوتے ہو
ماں سے بچھڑ کے باپ کے پہلو میں سوتے ہو

راتوں کو اُٹھ کے دودھ یہ ماں کیسے پلائے
کس کی بلائیں پیار سے لے کس کے صدقے جائے

آجاؤ ماں کے پاس اگر نیند واں نہ آئے
ان چھوٹے چھوٹے پاؤنکو ہاتھوں سے ماں دبائے

اُلفت جو ہی پدر کی تو ماں کا بھی درد ہو
گود ان کی گرم ہو مری چھاتی بھی سرد ہو

بانو کے اس بیان پہ بلکتے تھے سب حرم
باقر پکارتے تھے کہ کیونکر جئینگے ہم

چلاتی تھی سکینہ کہ گھٹتا ہی میرا دم
زنداں کا در بھی ہو گیا معمور ہی ستم

کھولے گا قفل کون جو عباس آئینگے
لو اب پدر کدھر سے مرے پاس آئینگے

مکڑ کے سر اندھیرے میں چلائینگے اسیر
اب روشنی کہاں سے بھلا لائینگے اسیر

گرمی کے مارے اور بھی گھبرائینگے اسیر
ہی ہی یہ کیا غضب ہوا مر جائینگے اسیر

دربانوں کو پکارو پیمبر کے واسطے
کھلوا دو قفل فاتح خیبر کے واسطے

زنداں کا در کدھر ہی مجھے لیچلو شتاب
دربانوں سے کہونگی میں با دیدۂ پرآب

دادا مرا ہی شہر علوم نبی کا باب
مجھ پر کروگے رحم تو ہوگا تمھیں ثواب

پھر کل سے بیکسوں کو نظر بند کیجیو
آلیویں بابا جان تو در بند کیجیو

بولا نہ جب کوئی تو ہوا غم زیادہ تر
دیوار پکڑے پکڑے گئی وہ قریب در

پٹ کو ہلا ہلا کے پکاری وہ نوحہ گر
دربانو جاگتے ہو کہ سوتے ہو بیخبر

بیکس ہوں تشنہ لب ہوں فلک کی ستائی ہوں
کچھ تم سے اپنا حال میں کہنے کو آئی ہوں

بولا کوئی کہ کون ہے تو اے نحیف و زار
دل ہو گیا ہے تیری صدا سُن کے بیقرار
اک آہ سرد بھر کے یہ بولی وہ دلفگار
آفت زدہ اسیر پریشان و سوگوار
چھوٹے سے سن میں قیدی زندانِ شام ہوں
میں دخترِ حسین علیہ السلام ہوں

پوتی ہوں اُس کی جو کہ ہے کونین کا امیر
شبیرِ الٰہ بادشہِ آسماں سریر
ایسا کریم تھا وہ دو عالم کا دستگیر
جس نے ہزاروں قید سے چھڑوا دیئے اسیر
شہرت جہاں میں ہمتِ مشکلکشا کی ہے
ہم آج ہیں اسیر یہ قدرت خدا کی ہے

کہتی نہیں میں یہ کہ کرو قید سے رہا
چھٹ جائینگے کبھی کہ اسیروں کا ہے خدا
کھانے کی کچھ طلب ہے نہ پانی کی التجا
ہاں قفل کھولدو گے تو دونگی تمھیں دعا
جائینگے ہم کہاں کہ تمھارے حوالے ہیں
بابا حسین آج کی شب آنے والے ہیں

اصغر ہیں ان کے ساتھ یقیں ہے کہ جلد آئیں
ایسے نہیں ہیں وہ کہ مجھے رات بھر رُلائیں
چوکی کے لوگ سو رہیں در پر مجھے بٹھائیں
دھڑکا مجھے یہ ہے کہ کہیں آکے پھر نہ جائیں
نیند آئیگی نہ مجکو بہت بیقرار ہوں
بھاگے کوئی اسیر تو میں ذمہ دار ہوں

منظور ابھی نہ ہو تمھیں در کھولنا اگر
آکر پکاریں شاہ تو تم کھولیو در
دیجاتی ہوں پتا تمھیں ان کا میں نوحہ گر
معلوم ہوگا صاف کہ طالع ہوا قمر
جو زلف مشک فام کی مہکیگی دور سے
چھٹکیگی چاندنی رُخِ روشن کے نور سے

باندھے ہے مصطفےٰ کا عمامہ وہ تاجدار
اور ہے نشانِ سجدہ ستارہ سا آشکار
ہالہ سا گرد ماہ کے ہے خط مشکبار
زیبِ کمر ہے شیر الٰہی کی ذوالفقار
گہہ ذکر حق ہے گاہ زبان پر درود ہے
سوکھے لبوں سے پیاس کی شدت نمود ہے

ساتھ ان کے ہوئیگا علی اکبر سا گلعذار
گیسو لٹکتے ہیں رخ روشن پہ اس کے چار
تصویر ہے نبی کی سراپا وہ ذی وقار
یوسف ہیں مصر حسن کے بھائی کے میں نثار
نجم فلک پسینے کے قطروں سے ماند ہیں
دنیا کی روشنی ہیں اندھیرے کے چاند ہیں

ہونگے جلو میں حضرت عباس نوجواں
ہوتا ہے جس سے دبدبۂ شیر حق عیاں

اس شیر کا نشان بہ ہر اور شکوہ وشاں
اک دوش پر تو مشک ہے اک دوش پر نشاں

قمری تو قد پہ چال پہ صدقے تدرو ہیں
نام خدا علی کے گلستاں کے سرو ہیں

مجھ بن نہ سوئے ہونگے شہنشاہ خوش خصال
بیخواب میں ہوں ان کو بھی ہوگا مرا خیال

تم دیکھ لیجیو مجھسے ہے الفت انھیں کمال
آتے ہی تم سے پوچھینگے پہلے ہی میرا حال

میں خود کہونگی مجھ پہ جو آفت گذر گئی
مر جائینگے پدر یہ نہ کہنا کہ مر گئی

ہوتے نہیں عزیز کسے دختر و پسر
پر مجھکو چاہتے ہیں وہ سب سے زیادہ تر

سوتی تھی ان کی چھاتی پہ منھ رکھکے رات بھر
زنداں میں اب بین پہ تڑپتی ہوں تا سحر

موقوف ان پہ میری حیات و ممات ہے
آنے کا ہے یہ دن یہی وعدے کی رات ہے

بولے نگاہباں کہ ترا دھیان ہے کدھر
جا ماں کے پاس بیٹھ کہاں تو کہاں پدر

بے صبح کے ہوئے نہیں کھلنے کا قفل در
کیا شمر کے طمانچوں کا تجھکو نہیں ہے ڈر

دن کو بھی روتی رہتی ہے شب کو بھی روتی ہے
نہ ہم کو سونے دیتی ہے نہ آپ سوتی ہے

ناحق ابھی سے کاہیکو کرتی ہے شور و شین
جا قفل کھولدینگے بھلا آئیں تو حسین

رونے سے تیرے شب کو بھی ملتا نہیں ہے چین
ہر وقت کے سنے نہیں جاتے ہیں تیرے بین

بلوائیں شمر کو تری تعزیر کے لیے
رونا نہ کم کرے گی تو شبیر کے لیے

ماں بہنیں قید ہو گئیں آتش سے گھر جلا
آیا بچانے کوئی برے وقت میں بھلا

کھائے طمانچے جب تو ترا زور کب چلا
کس دیوے آکے شمر نہ رسی سے پھر گلا

ان سے چھٹے تو اور بھی صدمہ دو چند ہو
ایسا نہ ہو جدا کسی حجرے میں بند ہو

یہ بات سن کے سہم گئی وہ جگر فگار
دروازے سے سرک کے لگی رونے زار زار

دالان سے پکاری یہ بانوئے نامدار
بی بی کدھر گئیں ادھر آؤ یہ ماں نثار

کھولے گا کون در کسے چلاتی پھرتی ہو
واری کہاں اندھیرے میں ٹکراتی پھرتی ہو

زنجیرِ درِ سُدات کو کھولینگے یہ لعیں
پستی بلند خانۂ زنداں کی ہے زمیں
دشمن ہر اک ہے لشکرِ اہلِ عناد میں
بولی سکینہ جان رہے تن میں یا کہ جائے
بے جرم کان زخمی ہوئے اور طمانچے کھائے
واں کیا ہے یاں نہ بیٹھ کے آنسو بہاؤں میں
کُبرا کے صدقہ جاؤ بھلاؤ ہمارا پیار
مشکل ہے صبر دل پہ مرا کیا ہے اختیار
راحت بہت نصیب میں کم لیکے آئے ہیں
اصغر کو اپنی گود میں لو مجھ سے کیا ہے کام
تم اپنے دل میں سمجھو کہ میں ہو گئی تمام
سبطِ رسول سے مجھے پیارا نہیں کوئی
بیٹی سے رو کے بولی یہ بانوے تشنہ لب
میں نے ہی شہ سے تم کو چھڑایا ہے بے سبب
جو چاہو کہہ لو ایسی ہی تقصیروار ہوں
صدقے ہی جان تک مری گھر بار کیا ہے چیز
سب سے سوا ہے یوسفِ زہرا تھیں عزیز
واری گلہ جو ماں کا کیا سب بجا کیا
بابا کے آگے سچ ہے بھلا ماں کی قدر کیا
بیزار تم ہو مجھ سے میں صغرے سے ہوں خفا
بیٹیوں کا کیا گلہ ہے بھلا وہ تو دور ہیں

ماں صدقے جائے گھڑکیاں کھانے کو کیوں گئیں
گھبرا کے گر پڑو نہ اندھیرے میں تم کہیں
سونا بھی آج بھول گئیں شہ کی یاد میں
بیٹھی ہوں جب تلک کہ سواری یہ پھر کے آئے
جو چاہے مجھ فلک کی ستائی کو پھر ستائے
اچھا مجھے پدر سے ملا دو تو آؤں میں
سمجھو کہ ایک بیٹی ہوئی باپ پر نثار
اب کوئی دم میں تن سے نکلتی ہے جانِ زار
اتنی ہی عمر خلق میں ہم لیکے آئے ہیں
پیاری تھی سارے گھر کی میں جیتے تلک امام
اماں بس اب پکارو نہ لیکے میرا نام
بابا ہی جب نہیں تو ہمارا نہیں کوئی
ہاں بی بی سچ ہے میری ہی تقصیر ہے یہ سب
لو آؤ بس معاف کرو جرم ماں کا اب
سمجھو نہ ماں یہ جانو کہ خدمت گزار ہوں
میں اک تمھارے باپ کی ادنیٰ سی ہوں کنیز
میں جانتی ہوں کیا مجھے اتنی نہیں تمیز
میں نے تمھارے باپ کو تم سے جدا کیا
کسرائی میں وہ احمدِ مرسل کا دلربا
پوچھی خبر نہ ماں کی دیا ساتھ باپ کا
تقصیروار ہیں ہمیں سب بے قصور ہیں

مشہور ہے کہ چاہتے ہیں باپ کو پسر
اک بانصیب ہم ہیں کہ مر جائیں بھی اگر
گو ہم نہ ہوں عزیز وہ ہم کو تو پیارے ہیں

روتی ہوئی یہ کہہ کے اٹھی بانوئے حزیں
روتی تھی منہ کو کرتے سے ڈھانپے وہ مہ جبیں
سر کو جھکا کے پہلے تو وہ پیچھے ہٹ گئی

لے آئی ماں گلے سے لگا کر بچشم تر
بیٹھیں اسیر بیبیاں سب گرد آن کر
ماں لیتی تھی بلائیں پھوپھی صدقے جاتی تھی

ماں کہتی تھی تھپک کے مری جان سو رہو
فرماتی تھیں پھوپھی کہ میں قربان سو رہو
جی چاہتا ہے چین ملے کوئی دم تمھیں

کہتی تھی ایک ایک سے رو کر وہ ماہرو
کیا نیند آئے غم سے جگر ہو گیا لہو
تھوڑا ستم سہا ہے بچھڑ کر حسین سے

لو گو بس اب کھو نہ مری زندگی کی آس
ماں نے کہا کہ دو نہ مری جاں کلام یاس
اصغر تو جا کے بھول گئے ماں کی یاد کو

بی بی تمھیں بتاؤ بھلا ماں کا کیا قصور
صادق ہے اپنے قول کا وہ کبریا کا نور
کیا دو گی ہم کو آج جو بابا کو پاؤ گی

بیٹی کو ماں سے ہوتی ہے الفت زیادہ تر
بیٹوں کو کچھ خیال نہ بیٹی کو کچھ خبر
ماں سمجھیں یا نہ سمجھیں آنکھوں کے تارے ہیں

بیٹی کو ڈھونڈھتی ہوئی دروازے کے قریں
پاس آکے ماں نے سر سے قدم تک بلائیں لیں
پھر ننھے ہاتھ اٹھا کے گلے سے لپٹ گئی

چپ ہو کے بیٹھی گود میں ماں کی وہ نوحہ گر
ہاتھوں سے کوئی پاؤں دباتی تھی کوئی سر
بابا بغیر نیند اسے لیکن نہ آتی تھی

زخمی ہیں پھر نہ دکھنے لگیں کان سو رہو
کبرا یہ کہتی تھیں بہن اک آن سو رہو
بابا جب آئینگے تو جگا دینگے ہم تمھیں

تھی شہ کے ساتھ شام سے سونے کی مجھکو خو
سینہ کہاں وہ چاند سا اور اب کہاں وہ بو
سوؤنگی اب تو قبر میں جا کر میں چین سے

بابا تو آ چکے ہیں جائینگے ان کے پاس
باتیں یہ سن کے اور میں ہوتی ہوں بےحواس
کیا تم بھی بھول جاؤ گی اس نامراد کو

بابا اگر ہیں دور تو میں تو نہیں ہوں دور
اتنا کہوں گی میں کہ حسین آئینگے ضرور
پر یاد رکھیو یہ کہ ہمیں بھول جاؤ گی

تم کو سکھاے رکھتی ہوں حسین دم پدر سے ملے
ماں واری سچ ہی غنچۂ دل کس طرح کھلے
دفتر مصیبتوں کا ابھی اپنے نہ کھولونگی
سچ ہے نہ صاحب ان کی نہ بھائی یہ مجکو بات
بوسے جو منھ کے لینے لگیں شاہِ خوش صفات
آزردگی کی ہی یہ جگہ کیوں چلے گئے
اک آہ سرد بھر کے یہ بولی وہ نوحہ گر
رونے لگیں گے ڈھونڈ کے جب ادھر اُدھر
اُتنا تو کہدو مجھ سے اگر مر نہ جاؤنگی
میرے طمانچے کھانے کا ان سے نہ کہیو حال
ہوئیگا غیظ سے علی اکبر کا رنگ لال
منظور ہی کہ قیدِ ستم سے رہائی ہو
کیوں اماں جان قبلۂ عالم ابھی جو آئیں
جیتا خدا کرے علی اصغر کو ساتھ لائیں
سو جان سے میں نثار شہِ خوش خصال کے
لیکر بلائیں بانوئے بیکس نے یہ کہا
سمجھو ہمیں تم اب انھیں عرصہ نہیں ذرا
بابا سے ہم بغل تمھیں ہونا نصیب ہو
صدقے گئی جب آئیں شہنشاہِ انس و جاں
تقصیر جو ہوئی وہ تمھیں بخشوا دی ماں
لشکر یزید کا دم غارت نہ لے سکا

صدقے گئی نہ آنے کے کچھ بہت سے گلے
یوں اس کو بھول جاتے ہیں جو باپ سے ملے
تم جب تلک نہ بولو گی میں بھی نہ بولونگی
بچی کو میری غم ہے مجھے تلخ ہے حیات
رکھ لیجو اپنے چہرے پہ تم چھوٹے چھوٹے ہات
اصغر کو ساتھ لے گئے تم کو نہ لے گئے
امّاں میں چپ رہونگی بھلا آئیں تو پدر
اس وقت گر پڑونگی میں قدموں پہ دوڑ کر
صدقے تمھارے منہ کے میں بابا کو پاؤنگی
اماں بہت کڑھینگے شہنشاہِ خوش خصال
عباس نامدار کو آجائیگا جلال
ایسا نہ ہو کہ پھر کہیں ان سے لڑائی ہو
رو رو کر اشتیاق سے مجکو گلے لگائیں
صدمے جو گزرے ہیں ابھی سب مجکو بھولجائیں
کیا سوؤں ہاتھ چاند سی گردن میں ڈال کے
اے عاشقِ پدر تری باتوں کے ہیں فدا
آئے کوئی گھڑی کو شہنشاہِ کربلا
چھاتی پہ ان کی رات کو سونا نصیب ہو
میرا گلا نہ کچھ تم ان سے سکینہ جان
آزردہ مجھ سے ہونگے بہت سرورِ زماں
سیلی لگائی جب تو مرا بس نہ چل سکا

بیٹی سے ماں نے کہیں جو یہ باتیں بچشم تر
سب ہو گئے خموش اسیرانِ نوحہ گر
فاقوں میں قیدیوں نے ادھر شکرِ رب کیا

زنداں میں مضطرب تھے اسیرانِ نوحہ گر
بیٹھیں تھیں فرشِ خاک پہ رانڈیں برہنہ سر
فاقوں میں قیدیوں نے ادھر شکرِ رب کیا

جلدی محلسرا میں روانہ ہوا طعام
ہاں ہند کو بلاؤ یہ بولا امیرِ شام
خاصہ نہ دن کو نوش کیا ہے نہ سوئی ہیں

لیٹی رہی ہیں منہ کو لپیٹے بصد ملال
کنگھی نہ سر میں کی ہے نہ سرمے کا ہے خیال
حمام بھی کیا ہے نہ کپڑے بدلتی ہیں

گہنا اتار ڈالا ہے یوں جی میں آئی ہے
تکیہ ہے تر یہ اشکوں کی ندی بہائی ہے
یہ شکل رنج و غم کی ہے اس باتمیز کی

بولا خبر یہ سنتے ہی وہ بانیِ ستم
دوڑیں یہ حکم سن کے خواصیں کئی بہم
ہرگز یزید کے تو نہ جانب نگاہ کی

پوچھا یزید نے کہ ہے کچھ بد مزہ مزاج
ہے ظلم اور ستم کا ترے عہد میں رواج
تجکو تو عید ہے مجھے صدمے گذرتے ہیں

جاگی بہت تھی سو رہی وہ عاشقِ پدر
بدلی نگاہبانوں نے چوکی بجا پہر
اور اُس طرف یزید نے خاصہ طلب کیا

وہ ہولناک شب وہ اندھیرا کہ الحذر
بدلی نگاہبانوں نے چوکی بجا پہر
اور اُس طرف یزید نے خاصہ طلب کیا

خاصہ چنا خواصوں نے با زینت تمام
تب اک کنیزِ خاص نے اس سے کیا کلام
بی بی سحر سے آج کئی بار روئی ہیں

چہرہ ہے زرد رونے سے آنکھیں ہیں دونوں لال
کیوں دل گرفتہ ہیں نہیں کھلتا کسی پہ حال
مہندی کے بدلے وہ کفِ افسوس ملتی ہیں

بے وجہ سوگواروں کی صورت بنائی ہے
مسند پہ بیٹھنے کی قسم کل سے کھائی ہے
جیسے سنائی آئے کسی کے عزیز کی

جا کر کہو کہ دیر سے یاں منتظر ہیں ہم
ناچار ہند آن کے بیٹھی بچشم نم
دیکھا طعام گرم تو اک سرد آہ کی

بولی یہ ہند ہوتا ہے کیا دردِ دل میں آج
اپنے جگر کے زخم کا میں کیا کروں علاج
یہ کون ہیں جو راتوں کو فریاد کرتے ہیں

بتلا یہ سب اسیر مسلماں ہیں یا نہیں
محبوب کبریا کے ثنا خواں ہیں یا نہیں
سنتی ہوں یکیں ان سے نہ ہونگے زمانے میں
ہیں کیا یہ لوگ منکر پیغمبر اله
کیوں ہاتھ سب کے باندھے ہیں کھلتا نہیں یہ آہ
کافر ہی وہ عناد جسے پنجتن سے ہی

کوئی اگر کہے بھی تو میں مانتی ہوں کب
میں سن چکی ہوں آپ صدائے نماز شب
گرمی سے گو کہ سینوں میں دم اٹک رکتے ہیں
قیدی ہیں پر قضا کبھی ہوتی نہیں نماز
آواز میں سنا نہیں یہ سوز یہ گداز
چھوٹے بڑوں کو عادت طاعت گذاری ہی

قیدی ہی خاہرا کوئی بیمار و ناتواں
آواز اک ضعیف سی آتی تھی ہر زماں
یہ درد ہی صدا میں کہ دل ٹکڑے ہوتے ہیں
کرتا ہی جب تلاوت قرآن وہ حق کا نور
رشتہ کچھ اس کو مصحف ناطق سے ہی ضرور
تقریر کیا فصیح ہی کیا خوش بیان ہی

دن بھر تو اس کو رہتا ہی غش اور درد سر
واللہ کیا دعاؤں کے فقروں میں ہی اثر
شاید کوئی عزیز شہ مشرقین ہی

قوم ان کی کیا ہی صاحب ایماں ہیں یا نہیں
آیا یہ لوگ قایل قرآں ہیں یا نہیں
یہ کس خطا پہ قید ہوئے قید خانے میں
شاید نہیں علی کے گھرانے سے ان کو راہ
کاٹا ہی کس کا سر کسے لوٹا ہی بے گناہ
کیا دشمنی کچھ ان کو حسین و حسن سے ہی

ابرار و حق پرست ہیں قیدی یہ سب کے سب
فاقوں میں بھی وہ کرتے ہیں تا صبح شکر رب
ماؤں کے ساتھ سجدے میں بچے بھی جھکتے ہیں
رکھتے ہیں پانچ وقت زمیں پر سر نیاز
سجدے میں حق سے کہتے ہیں کچھ اپنے دل کا راز
آٹھوں پہر درود زبانوں پہ جاری ہی

معلوم کچھ نہیں کہ وہ لڑکا ہی یا جوان
کیسا کراہتا ہی سحر تک وہ نیم جان
رونے پہ اس کے لوگ محلے کے روتے ہیں
ہوتا ہی لحن حضرت داؤد کا ظہور
قرآں کے حرف حرف کے معنی پہ ہی عبور
گویا زبان اس کی خدا کی زبان ہی

کرتا ہی نصف شب سے مناجات تا سحر
بہ جائے آب ہوکے جو پتھر کا ہو جگر
صوت حسن میں حسن صدائے حسین ہی

کہتے ہیں صبر و شکر اسے اللہ رے حوصلہ
جاری ہے صبح و شام عبادت کا سلسلہ
گردن جھکی ہوئی ہے خدا پر نگاہ ہے
سنتی ہوں ننھے بچے بھی دو چار ہیں اسیر
رونے سے اس کے لگتے ہیں سینے جگر پہ تیر
دکھ دے کسی کو یہ نہیں عادت کریم کی
ای سست رائے قلب کو اتنا بھی کر نہ سخت
رہتے ہیں سر جھکائے ہوئے بارور درخت
حاکم کو خوف چاہیے قہر الہ سے
کرتے ہیں لطف و رحم فقیروں پہ اغنیا
خالق نے اپنے ملک کا حاکم تجھے کیا
زنداں میں قیدیوں کا بہت حال غیر ہے
قاروں کا گنج او ستم ایجاد کیا ہوا
تھا پہلے وہ جو بانی بیداد کیا ہوا
وہ قبر میں ہیں آج جو کل تھے رواق میں
گرمی کی فصل اور یہ مکاں تنگ ہائے ہائے
فاقے سے ہوں وہ قید میں تو نعمتیں یہ کھائے
دل سے بھلا نہ وعدۂ روز نخست کو
کھانے کو میں نہ ہاتھ لگاؤں گی بھوک
ان کے بغیر مجھ کو یہ کھانا ہے مثل خوک
خوش ہوگا حق دلوں کو یتیموں کے شاد کر

شکوہ نہ طوق کا ہے نہ زنجیر کا گلہ
ہر دم رواں ہے چشم سے اشکوں کا قافلہ
لب پر کبھی تو آہ کبھی لا الہ ہے
لڑکی بھی کوئی قید ہے رشک مہ منیر
کیا قہر ہے یہ ظلم غریبوں پہ اے امیر
قرآں میں حق نے کی ہے سفارش یتیم کی
عقبیٰ میں رو سفید ہو تا او سیاہ بخت
ڈر ہے مجھے کہیں نہ الٹ جائے تیرا تخت
اکثر گری ہے برق یتیموں کی آہ سے
عقبیٰ میں کام آتا ہے یاں کا دیا لیا
جز نام نیک کون جہاں میں سدا جیا
کچھ خیر کر کہ خیر سے عقبیٰ بخیر ہے
نمرود کس طرف گیا شداد کیا ہوا
فرعون بدنہاد سا جلاد کیا ہوا
ڈھونڈو تو خاک بھی نہیں کسریٰ کے طاق میں
اب رحم کر اسے کوئی معصوم مر نہ جائے
پانی تو پیاس میں کوئی جا کر انھیں پلائے
بیمار کو دوا نہ غذا تندرست کو
اٹھتی ہے بار بار کلیجے میں میرے ہوک
بیکسوں پہ ظلم غریبوں سے یہ سلوک
کیا رحم تھا کرم کو محمد کے یاد کر

کافر کے گھر کو بھی کبھی لوٹا نہ بعد جنگ
چادر گلے میں ڈال کے کھینچا ہوئے نہ تنگ

جو ہاتھ آیا دیدیا سایل کو بے درنگ
عسرت یہ تھی کہ فاقوں میں باندھا شکم پہ سنگ

اس بادشاہِ دیں کو نہ کچھ فکر اور تھی
رانڈوں کی پرورش تھی یتیموں کی غور تھی

یکساں تھا خلق آپ کا شاہ و فقیر سے
بٹھلاتے تھے فقیر کو برتر امیر سے

باتیں تھیں پرورش کی یتیم و اسیر سے
کرتے تھے سیر انھیں رطب و شہد و شیر سے

ہر شب کو قیدیوں کی خبر لینے جاتے تھے
دو دن کے بعد نانِ جویں آپ کھاتے تھے

ہے آج تک جہاں میں علی کے کرم کا شور
ہر ایک کی زباں پہ ہے نقل فقیر کور

تھا بازوئے رسول میں دستِ خدا کا زور
پرواہ رے کرم نہ گوارا تھا رنج مور

کی اس نے کچھ زباں سے شکایت تو ڈر گئے
کاندھے پہ رکھ کے مشک ضعیفہ کے گھر گئے

رانڈوں کے وارث اور یتیموں کے تھے پدر
قاتل پہ مرتے مرتے رکھی رحم کی نظر

ہر دم حسین پر یہ تقید تھی اے پسر
قیدی کے بھی طعام کی رکھیو ذرا خبر

راضی نہ اس کے قتل پہ مشکلکشا ہوئے
مشکیں جو باندھ دیں تو حسن سے خفا ہوئے

خلقِ خدا ہے معترفِ خلقِ مجتبا
دریائے فیض ابر کرم منبع سخا

یا وش بخیر ذکر کروں کیا حسین کا
آقا کو دیر گاہ سلامت رکھے خدا

دونوں جہاں میں کیا برکت ایک دم سے ہے
قایم جو ہے زمین تو انھیں کے قدم سے ہے

دنیا ہو اور حسین ہیں اس نام کے نثار
فیضِ نبی تو عصمت خاتونِ روزگار

ہے بات بات میں کرمِ شاہِ ذوالفقار
اور خلق میں نظیر حسن ہے وہ ذی وقار

خو ہے پیمبروں کی شہِ مشرقین میں
ہیں جمع کس قدر حسنات ایک حسین میں

کمسنی میں بھی فیض صحبتِ مولا سے بہرہ ور
پیدا کیا ہے حق نے عجب طرح کا بشر

نیلے نشان ہیں چاند سے کاندھوں پہ جلوہ گر
لیکر اناج جاتے ہیں خود بیکسوں کے گھر

اس پر بھی ہر گھڑی یہ دعا ہے اللہ سے
یارب بچائیو مجھے بارِ گناہ سے

اس سالکِ طریقِ ہدایت کے میں فدا
یثرب سے حج کو آتے ہیں اکثر پیادہ پا

نلقے تو پیچھے ہوتے ہیں آگے وہ مقتدا
خالق نے ان پہ ختم کیا زہد و اتقا

اس سال بھی سنا ہے کہ تشریف لائے ہیں
کعبے میں اہل بیت بھی ہمراہ آئے ہیں

کیا جانے حج کے بعد سدھارے ہیں وہ کدھر
لونڈی نے پھر سنی نہیں آقا کی کچھ خبر

رہتی ہوں اس خیال میں پہروں میں نوحہ گر
کعبے میں گھر گئے ہوں نہ سلطانِ بحر و بر

ہے دھوم کچھ دنوں سے جدال و قتال کی
یارب تو خیر کیجیو زہرا کے لال کی

اس خانداں میں کون ہے سوائے شاہ
قایم رکھے جہان میں شہ کو مرا الٰہ

آگاہ ہوں کہ شاہ سے کینہ تجھے تھا آہ
ہے ہے کیا نہ ہو کہیں زہرا کا گھر تباہ

بیتاب ہوں خیالِ شہِ نیکنام میں
شہزادیاں اسیر نہ ہوں فوجِ شام میں

وسواس کا مقام تردد کی ہے یہ جا
روتے ہیں نام لیکے یہ قیدی حسین کا

پھر تھا نہ شک مجھے کوئی ہوتا جو دوسرا
گر ہے تو اک حسین ہے زہرا کا دلربا

اس نام پاک سے برکت ہے جہان میں
عقدے وہ کھول دیتے ہیں سب ایک آن میں

کیں ہند نے یہ درد کی باتیں جو ایک بار
ہر قلب پر ستم کی چلی تیغ آبدار

اللہ رے جوش ماتمِ سلطانِ نامدار
رویا جھکا کے سر کو یزیدِ زبوں شعار

خنجر غمِ حسین کا دشمن پہ چل گیا
کیا نام میں اثر ہے کہ پتھر پگھل گیا

رو کر پھر اس سے کہنے لگی ہند خوش سیر
ہوں بے قرار صورتِ بسمل میں نوحہ گر

گر کہہ تو دیکھ آؤں انہیں جا کے اک نظر
شاید انہیں سے شہ کی مفصل سنوں خبر

ہیں غیر یا عزیز شہِ انس و جاں کے ہیں
دریافت تو کروں کہ یہ قیدی کہاں کے ہیں

ناچار ہو کے ہند سے ظالم نے یہ کہا
جا دیکھ آ انہیں مرا نقصاں ہے اس میں کیا

واں جا کے اور ہوئیگا تجھ کو قلق سوا
سنتے ہی یہ کلام اٹھی ہند با وفا

پہلو میں مضطرب تھا دل ان حق پرست کا
اٹھتے ہی جلد حکم دیا بند و بست کا

سب عورتوں کو لیکے چلی جب وہ حق شناس
کہنے لگیں یہ سب جو کنیزیں تھیں اس پاس
کپڑے یہ ملگجے ہیں بدل ڈالیئے لباس
اس نے کہا کہ ہے مرے دل پہ ہجوم یاس
اک دم میں سوگواروں کو میں دیکھ آتی ہوں
کیسا لباس کیا کسی شادی میں جاتی ہوں

میلے ہی کپڑے چاہئیں جب دل پہ ہو ملال
کچھ سوچ ہے مجھے نہیں کچھ اور ہے خیال
کنگھی وہ کیا کرے کہ پریشاں ہو جس کا حال
ہے سر کا گوندھنا بھی نہ مجھے اس گھڑی وبال
جی چاہتا ہے یہ کہ گریبان چاک ہو
کپڑے تو سب سیاہ ہوں اور سر پہ خاک ہو

لازم ہے بزم غم میں عزادار بن کے جائے
خود روئے پیٹے بین کرے اور انھیں رلائے
واں وارثوں کا سوگ ہے کپڑے کسے دکھائے
روتا ہے دل مقام ہے عبرت کا ہائے ہائے
کپڑے بدل کے رانڈوں میں جانا روا نہیں
ان میں چلی ہوں جن کے سروں پر ردا نہیں

نکلی محلسرا سے یہ کہکر وہ خوش سیر
تھیں ساتھ ساتھ چند خواصیں بھی نوحہ گر
پہونچی جناب حضرت زینب کو یہ خبر
رنگ اڑ گیا یہ کہنے لگیں سر کو پیٹ کر
اپنا نہیں خیال بزرگوں کا پاس ہے
ہے ہے کہاں چھپوں وہ مری روشناس ہے

ہے شرم کی جگہ کہ میں ہوں خواہر امام
غمگین و سوگوار و پریشان و تشنہ کام
ہم ہیں فقیر ہم میں امیروں کا کیا ہے کام
لوگو بتا نہ دیجو کہیں اس کو میرا نام
پوچھے جو وہ کسی سے کہ زینب کدھر گئی
کہدیجیو کہ بھائی کے ہمراہ مر گئی

رو کر ہر اک سے بانوئے ناشاد نے کہا
کیا حاصل اضطراب سے قسمت کا جو لکھا
لوگو خدا کے واسطے چپکے رہو ذرا
رو رو کے سو گئی ہے ابھی میری دلربا
پھر حشر قید خانہ میں ہوگا جو روئیگی
چونکی اگر تو صبح تلک پھر نہ سوئے گی

چپ ہو گئے یہ سن کے اسیران نوحہ گر
جا بیٹھی ایک گوشہ میں زینب جھکا کے سر
آئی سواری زن حاکم قریب در
درباں بھی دور ہٹ گئے دروازہ کھولکر
وحشت یہ قید خانہ کی جس دم نگاہ کی
ہاتھوں پہ ہاتھ رکھ کے خواصوں نے آہ کی

دل ہند کا تو رندھ گیا تھرا گیا جگر
بولی ٹھہر کے ڈیوڑھی پہ یہ قہر ہے کہ گھر
دیکھا نہیں مکاں کوئی تاریک اس قدر
پوچھو کوئی کسی سے کہ ہیں بیبیاں کدھر
ایسا بھی ظلم کرتا ہے کوئی جہان میں
بندے خدا کے بند ہیں ایسے مکان میں

بڑھکر کسی کنیز نے تب یہ کیا بیاں
بی بی کوئی اسیروں میں شہ نہیں ہے یاں
چلیے محل میں آپ بھلا جائینگی کہاں
قابل نہیں حضور کے جانے کے یہ مکاں
گر غش ہوئے تو آپ میں آیا نہ جائیگا
ہم سے تو اس خرابے میں جایا نہ جائیگا

آزردہ ہو کے کہنے لگی ہند نوحہ گر
عبرت کا یہ مقام ہے لونڈی خدا سے ڈر
آخر جو اس میں قید ہیں وہ بھی تو ہیں بشر
تاراج یوں جہاں میں نہ ہوے کسی کا گھر
جانے وہی کلیجے پہ جس کے چھری لگے
ایسی نہ بات کہہ کہ خدا کو بری لگے

یہ بات کہہ کے آگے بڑھی وہ بصد الم
اک آفتاب دین نظر آیا اسیر غم
حلقہ گلے میں طوق کا زنجیر میں قدم
بولی ٹھہر کے وہ کہ زہے شوکت و حشم
انساں ہے یہ اندھیرے میں یا شمع طور ہے
آئی ندائے غیب کہ خالق کا نور ہے

پڑھتی ہوئی درود گئی جب قریب تر
اللہ رے حسن کرنے لگی خیرگی نظر
غل عورتوں میں تھا یہ فرشتہ ہے یا بشر
اترا ہے آسماں سے خرابے میں یا قمر
رتبے میں ہے بزرگ نسب میں جلیل ہے
ثابت ہے ضعف سے کہ نہایت علیل ہے

کوئی بلائیں لیکے یہ کہتی تھی بار بار
اے بیکس و اسیر بلاکش ترے نثار
ہنو ہے گلا یہ چاند سا اور طوق خاردار
یہ گوری گوری پنڈلیاں زنجیر سے فگار
لوگو بزرگ اس کے مقرر امیر ہیں
گویا جناب یوسف کنعاں اسیر ہیں

بولی کوئی کہ عابد و زاہد ہے یہ جواں
گٹا جبیں پہ کثرت طاعت کا ہے نشاں
ایماں کا نور چہرۂ انور سے ہے عیاں
دیکھا نہیں ہما سے کہ ہیں کون بیبیاں
برحق شریف قوم یہ گردوں اساس ہے
اشراف کو ہر ایک کی حرمت کا پاس ہے

جو غیر کی طرف نہ حیا سے کرے نظر
ماں نہیں ایسے شخص کی بلوے ہیں ننگے سر
یہ خیر ہووے جس کی طبیعت میں اُس سے شر
ٹوٹے غضب خدا کا لعینوں کی جان پر
تقوے پہ اس کے عفت و عصمت گواہ ہے
قرآن ہم اُٹھالیں کہ یہ بے گناہ ہے

افسوس ایسے بندۂ صالح پہ یہ تعب
زنداں میں کاٹتا ہے تڑپ کر تمام شب
بستر زمیں کا اور یہ تنِ زار ہے غضب
آنکھیں جو بند ہیں یہ نقاہت کا ہے سبب
ہے خامشی دلیل عبادت کے شوق کی
گردن جھکی ہوئی ہے گرانی سے طوق کی

باتیں یہ کرکے بیبیاں روتی تھیں زار زار
سینے میں تھا مگر نہ دلِ ہند کو قرار
کہتی تھی دیکھ کر رُخِ اقدس کو بار بار
کس ملک کا رئیس ہے یارب یہ ذی وقار
آنکھوں میں صاف پھرتی ہے صورت امام کی
تصویر ہے حسین علیہ السلام کی

آخر دبا کے پاؤں یہ بولی وہ نیکنام
اُٹھیے کہ دیر سے ہیں کھڑی ہوں پئے سلام
بولے یہ آنکھیں کھول کے مولائے خاص و عام
اس بیکس و یتیم و بلاکش سے کیا ہے کام
ہجر پدر میں تلخ ہے لذت حیات کی
طاقت نہ آنکھیں کھولنے کی ہے نہ بات کی

بولی یہ ہند کب سے علالت ہے میں نثار
فرمایا ساتویں سے محرم کی ہے بخار
اس نے کہا طبیب کو دکھلاؤ حالِ زار
فرمایا خیر شافی مطلق ہے کردگار
راضی ہیں اس پہ ہم جو رضائے حبیب ہے
دی ہے یہ تپ اسی نے جو سب کا طبیب ہے

رنج و بلا کو لطفِ خدا جانتے ہیں ہم
دُکھ میں کراہنے کو گلا جانتے ہیں ہم
ہر درد جانستاں کو دوا جانتے ہیں ہم
عارض ہو عارضہ تو شفا جانتے ہیں ہم
کچھ غم نہیں مرض سے اگر حال غیر ہے
صحت ہماری یہ ہے کہ عقبیٰ بخیر ہے

ایذا کو چین رنج کو راحت سمجھتے ہیں
شیریں کو تلخ شور کو لذت سمجھتے ہیں
صابر ہیں نانِ جو کو بھی نعمت سمجھتے ہیں
مرنے کو راہِ حق میں سعادت سمجھتے ہیں
عسرت ہو دکھ ہو قید ہو فاقہ کشی رہے
دولت یہی بڑی ہے کہ خالق خوشی رہے

یہ ذکر سن کے رونے لگی ہند باوفا
کی عرض کیا ہے اسم مبارک حضور کا
گردن جھکا کے قبلۂ چارم نے یہ کہا
بیکس عزیز مردہ گرفتار و بے نوا
کیا پوچھتی ہے نام و نشاں خاکسار کا
اک بندۂ حقیر ہوں پروردگار کا

زیبا ہے نام پاک پۓ خالقِ ودود
روزی رسانِ عالمیاں واجب الوجود
جو معرضِ فنا میں ہیں کیا ان کی ہست و بود
قطروں کی کیا بساط حبابوں کی کیا نمود
درپیش منزلِ لحدِ خوفناک ہے
آغاز اپنا خاک ہے انجام خاک ہے

تھے مرتضیٰ علی کے جہاں میں بہت خطاب
شیرِ خدا امیرِ عرب مالک الرقاب
کارہ تھا پر ترقی ظاہر سے وہ جناب
ہوتے تھے شاد کہتا تھا جو یا ابو تراب
جس کو فروتنی ہے وہی سربلند ہے
خالق کو خاکساریِ انساں پسند ہے

اس نے کہا بتائیے والد کا اپنے نام
فرمایا فاقہ کش وطن آوارہ تشنہ کام
مقتول نیزہ و تبر و خنجر و حسام
جس کو ملا نہ پیاس میں پانی کا ایک جام
بے گور و بے کفن جسدِ پاش پاش ہے
عریاں ہے کربلائے معلیٰ میں لاش ہے

پوچھا وطن کو اس نے تو بولے شہِ زمن
دارِ فنا مقامِ فنا منزلِ محن
بیٹھے فقیر تھک کے جہاں ہے وہی وطن
بے خانماں اسیر و پریشان و خستہ تن
پردیس میں تباہ ہوئے شہر چھٹ گیا
جنگل میں ہم بھی لٹ گئے اور گھر بھی لٹ گیا

اس نے کہا کہ طوق سے ہوئیگا دم خفا
فرمایا جس میں خالقِ کونین کی رضا
گھٹتا ہے گر گلا تو کچھ اس کا نہیں گلا
بندے ہیں امرِ حق میں ہمیں اختیار کیا
صابر ہیں غیر شکرِ خدا کیا سخن کریں
ہم وہ نہیں کہ شکوۂ طوق و رسن کریں

وہ بولی اور بھائی بھی کیا تھے مہِ منیر
فرمایا ہاں جواں تھا اک اور اک صغیر
جرأت میں بے عدیل تھے صورت میں بے نظیر
دونوں کو تین روز نہ پانی ملا نہ شیر
اعدا کو دشمنی تھی صغیر و کبیر سے
برچھی سے ایک قتل ہوا ایک تیر سے

غش ہو گئے یہ کہہ کے امام فلک اساس
پہونچی ٹھہر ٹھہر کے جو سیدانیوں کے پاس
چہرے سبھوں کے غیرت خورشید و ماہ ہیں
پیدا ہے ان کی شان سے سیدانیوں کی شاں
یا ہاشمی ہیں یا علوی ہیں یہ خستہ جاں
یہ لاکھ گر چھپائیں تو کب مانتی ہوں میں
مٹی میں گو بھرے ہوئے ہیں ان کے روئے پاک
ہر چند ہیں یہ شدت زنداں سے سب ہلاک
ہیں کس طرح کہوں کہ یہ آل عبا نہیں
چہروں کی آب و تاب پہ لوگو کرو تو غور
باندھو ہیں ایک رسی میں ہے ہے یہ ظلم و جور
مٹی میں مل گیا یہ چمن وا مصیبتا
آ کر قریب کہنے لگی ہند خوش خصال
مجھ سے تو کچھ بیان کرو اپنے دل کا حال
کیوں پکڑے گئے عدو تمہیں بلوائے عام میں
سنتی ہوں میں مدینے میں ہے آپکا وطن
ہیں خیریت سے حضرت شبیر کی بہن
وہ بی بی روح بنت رسالت پناہ ہے
کیوں بیبیو بتاؤ خدا کے لیے ذرا
سنتی ہوں اب جوان ہیں ہمشکل مصطفےٰ
شہرت ہے ابن فاطمہ زہرا کے ماہ کی

تھرا کے واں سے آگے بڑھی ہند جو اس
رانڈوں کی شان دیکھ کے بولی وہ حق شناس
گویا کہ اہل بیت رسالت پناہ ہیں
ظاہر ہے صبر و شکر سے سادات کا نشاں
کس میں یہ معرفت کے سخن اور یہ بیاں
خوشبو کو اہل بیت کی پہچانتی ہوں میں
چھپتا ہے کوئی چاند پہ ڈالے ہزار خاک
روشن ہے قید خانۂ تاریک و ہولناک
ہاں فرق اتنا ہے کہ سروں پر ردا نہیں
دیکھا ہے قیدیوں کا کسی نے کبھی یہ طور
بچے بھی ہیں بندھے ہوئے دیکھو ستم پہ اور
ان گوری گردنوں میں رسن وا مصیبتا
اے بیبیو ہٹا دو ذرا رخ سے اپنے بال
کیفیت تمہاری ہو گئی کس بن میں پائمال
کس جرم پر اسیر ہوئے ملک شام میں
للہ کچھ کہو خبر سرور زمن
زندہ رکھے جہاں میں انھیں رب ذو المنن
عصمت پہ جس کی خالق اکبر گواہ ہے
ہے خیر سے مدینے میں فرزند مرتضیٰ
سر سبز رکھے باغ جہاں میں انھیں خدا
حسرت تو شہ کو ہوئیگی اکبر کے بیاہ کی

حق سے یہی ہے شام و سحر اب مری دعا
آقا مرے جہاں میں سلامت رہیں سدا
اکبر کا سہرا بانو کو دکھلائے اب خدا
گھر میں بہو کو لائے جگر بندِ مصطفےٰ
ارمان نکلے بادشہِ مشرقین کا
آباد گھر ہو فاطمہ کے نور عین کا

جب ہند ختم کر چکی رو رو کے یہ کلام
بانو کے پاس آ کے یہ بولی وہ نیکنام
صدقے گئی بتائیے کیا آپ کا ہے نام
للہ کچھ کہو میں ہوئی جاتی ہوں تمام
زنداں میں سب اسیروں کی سردار آپ ہیں
ان قیدیوں کی قافلہ سالار آپ ہیں

بانو نے اس سے پھر یہ کہا تھام کر جگر
ہم قیدیوں کے نام ہیں مظلوم و نوحہ گر
زینب کو پھر بتا کے یہ بولی بچشم تر
یہ بی بی جو کہ روتی ہیں نہوڑائے اپنا سر
تو دل میں جانتی ہے کہ ان کی عزیز ہوں
مختار یہ مری ہیں میں ان کی کنیز ہوں

وہ بولی کہ ہیں آپ کے فرزند خوش سیر
فرمایا رو کے لٹ گیا بی بی ہمارا گھر
تیر و سناں سے قتل ہوئے ان میں دو پسر
زنداں میں اک اسیر ہے مظلوم نوحہ گر
ٹکڑے جگر کے صدمۂ فرقت سے ہوتے ہیں
جو گود میں پلے تھے وہ جنگل میں سوتے ہیں

یہ سن کے ہند رونے لگی تب بہ اشک و آہ
پھر مڑ کے روئے حضرت زینب پہ کی نگاہ
رخ سے ہٹائے بال تو حالت ہوئی تباہ
بے ساختہ کہا کہ زہے قدرتِ الٰہ
ہرگز غلط نہیں جو مجھے اشتباہ ہے
زینب تمہیں ہو خالقِ اکبر گواہ ہے

کہنے لگی یہ ہند سے زینب جگر فگار
کیوں فال بد نکالتی ہے منہ سے بار بار
اے ہند ان کا نام نہ لے بہر کردگار
نسبت تمہیں ان سے دے گی وہ ہے فاطمہ وقار
اعدا تو مجھ کو لے گئے بلوائے عام میں
دشمن نہ ان کے قید ہوں زندانِ شام میں

وہ شاد کام اور میں بیکس جگر فگار
آباد وہ ہیں اور میں زنداں میں سوگوار
بلوے میں لے گئے مجھے اعدا بحال زار
باہر کنیز ان کی نہیں نکلی زینہار
وہ بی بی پردہ دار ہے اور خوش خصال ہے
زینب میں ہی ہوں یہ ترا بیجا خیال ہے

یہ سن کے بے قرار ہوئی ہند خوش خصال
ای میری شاہزادی چھپاؤ نہ مجھ سے حال
تم کو قسم ہے فرقِ شہِ مشرقین کی
یہ کہہ کے پیٹنے جو لگی ہندِ ذی وقار
چلائیں سر کو پیٹ کے باچشمِ اشکبار
پانی دیا نہ سبطِ رسالت پناہ کو
ای ہند کیا کہوں خبرِ شاہِ تشنہ لب
مطلق ڈرا نہ خالقِ اکبر سے بے ادب
رونے نہ پائے ماتمِ شاہِ شہید میں
کیا پوچھتی ہے تو خبرِ شاہِ بحر و بر
باندھا درخت میں کبھی خولی نے بے خطر
یاں تک تھی دشمنی سپہِ بدخصال کو
ای ہند رن میں شاہ کے یاور ہوئے شہید
بن بیاہے دشت میں علی اکبر ہوئے شہید
مرجھا کے فاطمہ کی نہ کھیتی ہری ہوئی
میداں میں بے کفن ہے ابھی لاشِ شاہِ پاک
واحسرتا وہ گرم ہوا اور وہ فرشِ خاک
چہلم تلک ہوا نہ شہِ مشرقین کا
منگوایا ہند نے جو سرِ شاہِ بحر و بر
جب سر پہ شاہِ دیں کے سکینہ نے کی نظر
دنیا سے تشنہ کام سفر کر گئے حسین

دیکھا بغور رخ تو یہ بولی بصد ملال
زینب تمہیں ہو خواہرِ شبیر باکمال
جلدی کہو خبر مرے آقا حسین کی
فرطِ قلق سے دل ہوا زینب کا بیقرار
ای ہند لٹ گیا ہے شبیرِ نامدار
ظالم نے بے گناہ کیا قتل شاہ کو
ہنگامِ عصر لٹ گیا زہرا کا باغ سب
چوبِ یزید اور لبِ شبیر ہے غضب
سر ننگے لے گئے ہمیں بزمِ یزید میں
فرقِ حسین تھا کبھی نیزے پہ جلوہ گر
لٹکا درِ یزید پہ سبطِ نبی کا سر
پتھر لگائے راہ میں زہرا کے لال کو
عباس قتل ہو گئے اصغر ہوئے شہید
شبر کا لال اور مرے دلبر ہوئے شہید
بچوں سے گود ہو گئی خالی بھری ہوئی
ہے ہے وہ اُودا ابر وہ میدان ہولناک
کس طرح دل نہ ہو مرا سینے میں چاک چاک
ابتک پڑا ہے دھوپ میں لاشہ حسین کا
مجرے کو اٹھ کھڑے ہوئے قیدی بچشمِ تر
چلائی رو کے ہائے غضب مر گئے پدر
لو مجھ پہ یہ راز کھلا مر گئے حسین

پھر سر کو پیٹتی ہوئی دوڑی وہ سوگوار
دامن میں لے لیا سر شبیر نامدار

منہ رکھ کے منہ پہ شہ کے جو روئی وہ دلفگار
صدمہ ہوا نکلنے لگی تن سے جان زار

دنیا سے سب کی زیست کا نقشہ بدل گیا
جنبش ہوئی لبوں کو بس اور دم نکل گیا

بانو نے سر کو پیٹ کے تب یہ کیا بیاں
بس مل چکیں حسین سے قربان جائے ماں

ای نور عین بس نہ کرو نالہ و فغاں
ایسا نہ ہو کہ گھٹ کے نکل جائے تیری جاں

بچھڑے ہیں کب سے بادشہ مشرقین سے
ہم بھی تو مل لیں فاطمہ کے نور عین سے

اٹھی یہ کہہ کے بانوئے بیکس برہنہ سر
دیکھا پڑی ہے خاک پہ بے جان وہ نوحہ گر

زینب کو پھر دکھا کے یہ بولی بچشم تر
بچی کو میری لیگئے سلطانِ بحر و بر

زنداں کے تھے وہ ظلم کہ عاجز تھی جان سے
افسوس چل بسی مری پیاری جہان سے

بی بی تمھاری ننھی سی میت کے میں نثار
منھ سے اٹھاؤ کرتے کا دامن بھرا ایکبار

جی بھر کے تجھ کو دیکھ لے مادر جگر فگار
اماں کو اپنے پاس بلا لو تو ہو قرار

فرصت کبھی نہ ہو گی ہمیں شور و شین سے
تم یاں سے جا کے قبر میں سوؤ گی چین سے

ہے ہے اٹھائے قید میں کیا کیا نہ رنج و غم
باندھا گلے کو شمر نے رسی سے ہے ستم

بابا کو یاد کر کے جو روتی تھیں دمبدم
دیتے تھے گھڑکیاں تجھیں یہ بانیِ ستم

زخمی ہیں کان پھول سے عارض کبود ہیں
ابتک نشان طمانچوں کے رخ پر نمود ہیں

بی بی خدا پہ خوب ہے روشن ہمارا حال
چادر تلک نہیں ہے چھپاؤں جو سر کے بال

کس طرح دوں کفن تجھے ای میری خردسال
نادار ہوں میں پاس نہ دولت ہے اور نہ مال

سنگِ الم سے شیشۂ دل پاش پاش ہے
دو گز کفن کے واسطے محتاج لاش ہے

ہوتا جو واری پاس مرے کچھ بھی مال و زر
تربت بنائی ننھی سی میں سوختہ جگر

تابوت پر میں باندھتی سہرا بچشم تر
جو پوچھتا تو بس یہی کہتی میں نوحہ گر

میت یہی ہے بنتِ شہِ مشرقین کی
دنیا سے آج اٹھ گئی عاشق حسین کی

بس ای انیس بزم میں ہی گریہ و بکا
وقتِ دعا ہی خالق اکبر سے کر دعا

یارب بحق احمد و زہرا و مجتبا
دکھلا دے جلد روضۂ سلطانِ کربلا

دم لب پہ ہی زیارت مولا نصیب ہو
بیمارِ غم کو قرب مسیحا نصیب ہو

رباعی

عزّت ہی یار و آشنا کے آگے
محجوب نہ ہوں شاہ و گدا کے آگے

یہ پاؤں چلیں تو راہ مولا میں چلیں
یہ ہاتھ جب اُٹھیں تو خدا کے آگے

رباعی

گو صورتِ دریا ہمہ تن جوش ہوں میں
لب خشک ہیں چشم تر ہی خاموش ہوں میں

کیا پوچھتے ہو مقام و مسکن میرا
مانندِ حباب خانہ بر دوش ہوں میں

رباعی

مر آئینۂ خاطر کی جلا ہی رونا
اور دیدۂ مردم کی ضیا ہی رونا

پوچھا جو علاج دل مسیحا نے کہا
ہر درد کی دنیا میں دوا ہی رونا